(شخصیت)

(جلد چہارم)

ترتیب وتدوین

عطاء الرحمٰن قاسمی

کلیات ماجدی

(شخصیت)

(جلد چہارم)

ترتیب وتدوین

عطاء الرحمٰن قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 2017
تعداد : 550
قیمت : -/230روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1961

Kulliyat-e-Majidi Vol.IV
By: Ataur Rahman Qasmi

ISBN :978-81-934243-5-3

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھر پور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

حرفِ چند

مولانا عبدالماجد دریابادی اردو زبان وادب کے جامع علوم وفنون ادیب وانشا پرداز تھے، جنھوں نے اردو زبان کی متنوع اصناف ادب پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں، وہ اپنے مخصوص ساحرانہ واد یبانہ اسلوب تحریر کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، ان کے اسلوب نگارش اور اچھوتے طرز تحریر کی دلکشی ودلآویزی ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' میں نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

یہ ''نقوش وتاثرات'' دراصل آپ کے پیرومرشد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات ومکتوبات کے حوالے سے سپرد قرطاس وقلم ہوئے ہیں، ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کے متعلق ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ بالآخر یہ کتاب سوانحی اصناف ادب کے کس زمرے میں آتی ہے، اس کے موضوع کے تعین وتحدید کے سلسلہ میں مختلف اصحاب علم ودانش کی مختلف آرا ہیں، لیکن خود صاحب تصنیف کی رائے ہم سبھوں کے لئے اس وقت جاذب نظر اور توجہ طلب ہوجاتی ہے جبکہ فاضل مصنف ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' میں کچھ اس طرح رقمطراز ہوتے ہیں،

''یہ مجموعۂ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد، اور نہ سیرۃ الشیخ، اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے۔

''حضرت شیخ'' کے کمالات وفضائل جو کچھ بھی ہوں، بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں، ان کی عمر کے آخری 15، 16

سال کے زمانہ میں نامہ سیاہ کوان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا۔ اور اس نے اپنے لمبے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا۔ بس ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان ''نقوش وتاثرات'' کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی اور چونکہ ان کی انسانیت ان کی مفسر وفقیہ و درویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جاسکتی، اس لئے ضمناً ذکر ان کے علم وفضل، تفقہ وسلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

بنتی نہیں ہے، بادہ وساغر کہے بغیر

ورنہ حقیقتاً مصوری صرف ان کی انسانیت کی کرنی تھی، وہ بھی اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کے حدود کے اندر''

صفحہ 2 حکیم الامت نقوش وتاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی کے بارے میں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ کسی مدرسہ کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ تھے (دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے اعزازی ڈگری ضرور دی تھی)، بلکہ وہ کینگ کالج لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، آپ برسہا برس انگریز پروفیسروں اور انگریزی کتابوں کے زیر اثر رہے ہیں جس کی وجہ سے یوروپین مفکرین ومصنفین کے افکار ونظریات نہ صرف ان کے ذہن ودماغ پر حادی ہو گئے تھے بلکہ ان کے اسلامی عقائد واعمال پر بھی اثر انداز ہو گئے تھے اور غضب تو یہ ہے کہ مولانا دریابادی کی حیات مستعار میں ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب آپ مذہب بیزار کی حیثیت سے اہل علم کے سامنے آگئے، حالانکہ آپ کا تعلق ایک مذہبی خانوادہ سے تھا خود آپ کے والد ماجد سخت مذہبی آدمی تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی بڑے صاف گو اور صداقت پسند انسان تھے، آپ نے اپنے اس دور کو ''دور الحاد وتشکیک'' سے تعبیر کیا ہے اور اپنی آپ بیتی میں اپنی لامذہبیت اور آزاد خیالی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ گرچہ الحادی وتشکیکی دور تھا جس کے اسباب وعلل کچھ بھی رہے ہوں اس کے باوجود مولانا عبدالماجد دریابادی کو عین دور الحاد وتشکیک میں بھی مذہبی اور

روحانی شخصیات سے ان کے گہرے تعلقات ومراسم رہے ہیں۔ اور مذہبی امور پر تبادلۂ خیال ہوتے رہے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً مذہبی وروحانی شخصیتوں کی مذہبی وروحانی باتوں سے متاثر بھی ہوتے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ الحادولادینیت کے دورِشباب میں، جن لوگوں سے قدرے متاثر ہوئے اور نفس مذہب کی معنویت پر کان دھرے، ان میں لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر تھے، حضرت اکبرالہ آبادی نے الحادولادینیت کے دورشباب میں بڑے حکیمانہ انداز میں مطالعہ قرآن کریم کی ترغیب دلائی تھی اور اس کی عربیت اور اس کی فصاحت وبلاغت کی تعریف وتوصیف کی تھی، اور محض ادبی نقطہ نگاہ سے اس کو مطالعہ کرنے کے لئے کہا تھا اور باوضو ہونے کی شرط بھی عائدنہیں کی تھی۔ جب مولانا دریابادی نے بادل نخواستہ قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور اس میں عربی زبان وادب کی چاشنی وشیرینی اور نفسیاتی باتوں کی لذت محسوس کی، تو پھر از سر نو اسلام اور قرآن کریم کا مطالعہ کرنے کا جذبہ بیدار ہوا اور مختلف انگریزی تراجم وتفاسیر کے ذریعہ مطالعہ شروع کیا۔ الحمد اللہ ایک طویل عرصہ کے بعد اسلام کی طرف از سرنو مراجعت ہوئی تو ایک مرشد ومصلح کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ اور تلاش مرشد میں سرگرداں ہوگئے، جو ان کی فطرت کا حصہ تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا محمد علی جوہر سے بار بار بیعت ہونے کا ارادہ اور فسخ ارادہ کیا اس کے بعد دوسرے علما ومشائخ سے بیعت کا ارادہ کیا، مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے بھی بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن ان میں سے کسی سے بھی اتنی عقیدت نہ ہوسکی ہے جس سے بیعت کی جاسکی۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی خود ہی لکھتے ہیں:

''مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ، جتنا کچھ بھی فارسی اور اردو اور عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا، پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی، حیدرآباد اور دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر اور اجمیر اور کلیر، دیوہ اور بانسہ، ردولی اور صفی پور چھوٹے بڑے آستانے، خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سن گن جہاں کہیں کسی بزرگ کی پائی حاضری میں دیر نہ لگائی۔ حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور

قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض دکان دار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر میں دل نے کہا کہ حق حلقہ دیوبند میں محصور ہے، انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے اب تفصیلی جائزہ اس حلقے کا لیجئے اور جس نے بہترین متن سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی (1) اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق و معارف کی روح بھی بھر دی ہے، دامن کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیئے"

صفحہ 3 حکیم الامت نقوش وتاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی کا رجحان حلقہ دیوبند کی طرف ضرور ہوا تھا، مگر دیوبند کے بزرگوں میں سے کس بزرگ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا جائے، مولانا دریابادی کے بعض دوستوں نے پہلے مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ کیا، جن سے خود مولانا دریابادی بھی واقف تھے۔

1927 کا قصہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تلاش مرشد میں صفی پور، اناؤ کا سفر کیا تھا، رفیق سفر وصل بلگرامی تھے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور بڑے باغ و بہار اور سوز و درد میں ڈوبے ہوئے انسان تھے، اناؤ سے واپسی میں وصل بلگرامی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا، ان کا ذکر کرتے ہوئے خود مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

> "واپسی میں بولے کہ "بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تو تجربہ کیجیے، سب کو بھول جائیے گا۔ تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل، تربیت السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں انھیں تو دیکھ ڈالئے اچھا، تو ان خشک مولوی صاحب (2) نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ ہے بشرطیکہ کہیں مل گئیں"

صفحہ 4 حکیم الامت نقوش وتاثرات

---

(1) اشارہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی مشہور شارح مثنوی کی جانب ہے جو بزرگان دیوبند و تھانہ بھون کے شیخ یا شیخ الشیوخ تھے۔ (مولانا دریابادی)

(2) مولانا دریابادی کا یہ طنزآمیز جملہ (قاسمی)

وصل بلگرامی مرحوم دوسری صبح ہی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب قصد السبیل اور تربیت السالک لئے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کے گھر لکھنؤ پہنچ گئے اور ان کے پاس کتابیں رکھ دیں، مولانا دریابادی تلاش حق میں تھے ہی، فوراً ہی مطالعہ میں مصروف ہوگئے اور ان پر کیا کیفیت طاری ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے خود مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''کتابیں پڑھ کر جب بند کیں، تو اب عالم ہی دوسرا تھا ع

اب نہ کہیں نگاہ ہے   اب نہ کوئی نگاہ میں

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف آج پہلی بار دل و دماغ کے سامنے آئی، قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا، 16 برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے''

صفحہ 4 حکیم الامت نقوش و تاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا تھانوی کی مذکورہ بالا کتابیں پڑھنے کے بعد غائبانہ طور پر ان کے گرویدہ معتقد ہوگئے اور دربار تھانوی میں حاضری کے لئے بے قرار تھے، بالآخر مولانا دریابادی اور مولانا تھانوی کے مابین مراسلت شروع ہوئی، خانقاہ تھانوی کے ضابطے کے مطابق خانقاہ تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت ملی تو مولانا عبدالماجد دریابادی خانقاہ تھانہ بھون میں حاضری دی۔ آپ کے ہمراہ مولانا عبدالباری ندوی بھی تھے۔ دیوبند سے مولانا مدنی بھی ساتھ ہوگئے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے دربار تھانوی میں باریابی کے بعد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کو انسانی و روحانی اقدار کے کن اعلیٰ مقام پر جلوہ افروز پایا کہ انھیں ''حکیم الامت نقوش و تاثرات'' کے سرورق مندرجہ ذیل مصرع رقم کرنا پڑا!!

اے تو افلاطون و جالینوس ما

قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض دکان دار قسم کے گیسو دراز
بھی، آخر میں دل نے کہا کہ حق حلقہ دیوبند میں محصور ہے، انتخاب کے دائرہ کو محدود
کر کے اب تفصیلی جائزہ اس حلقے کا لیجئے اور جس نے بہترین متن سلوک (مثنوی
معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی (1) اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں
حقائق ومعارف کی روح بھی بھر دی ہے، دامن کے کسی تربیت یافتہ کا تھامئیے''

صفحہ 3 حکیم الامت نقوش وتاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی کا رجحان حلقہ دیوبند کی طرف ضرور ہوا تھا، مگر دیوبند کے
بزرگوں میں سے کس بزرگ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیا جائے، مولانا دریابادی کے بعض دوستوں
نے پہلے مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ کیا، جن سے خود مولانا دریابادی بھی واقف تھے۔

1927 کا قصہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تلاش مرشد میں صفی پور، اناؤ کا سفر کیا
تھا، رفیق سفر وصل بلگرامی تھے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور بڑے باغ وبہار
اور سوز ودرد میں ڈوبے ہوئے انسان تھے، اناؤ سے واپسی میں وصل بلگرامی نے مولانا عبدالماجد
دریابادی کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا، ان کا
ذکر کرتے ہوئے خود مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''واپسی میں بولے کہ ''بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تو
تجربہ کیجیے، سب کو بھول جائیے گا۔ تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل، تربیت
السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں انھیں تو دیکھ ڈالئے اچھا، تو ان خشک مولوی
صاحب (2) نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ
ہے بشرطیکہ کہیں مل گئیں''

صفحہ 4 حکیم الامت نقوش وتاثرات

---

(1) اشارہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی مشہور شارح مثنوی کی جانب ہے جو بزرگان دیوبند وتھانہ بھون کے شیخ یا
شیخ الشیوخ تھے۔ (مولانا دریابادی)

(2) مولانا دریابادی کا یہ طنز آمیز جملہ (قاسمی)

وصل بلگرامی مرحوم دوسری صبح ہی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب قصد السبیل اور تربیت السالک لئے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کے گھر لکھنؤ پہنچ گئے اور ان کے پاس کتابیں رکھدیں، مولانا دریابادی تلاش حق میں تھے ہی، فوراً ہی مطالعہ میں مصروف ہوگئے اور ان پر کیا کیفیت طاری ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے خود مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''کتابیں پڑھ کر جب بند کیں، تو اب عالم ہی دوسرا تھا ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف آج پہلی بار دل ودماغ کے سامنے آئی، قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا، 16 برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے''

صفحہ 4 حکیم الامت نقوش وتاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا تھانوی کی مذکورہ بالا کتابیں پڑھنے کے بعد غائبانہ طور پر ان کے گرویدہ معتقد ہوگئے اور دربار تھانوی میں حاضری کے لئے بے قرار تھے، بالآخر مولانا دریابادی اور مولانا تھانوی کے مابین مراسلت شروع ہوئی، خانقاہ تھانوی کے ضابطے کے مطابق خانقاہ تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت ملی تو مولانا عبدالماجد دریابادی خانقاہ تھانہ بھون میں حاضری دی۔ آپ کے ہمراہ مولانا عبدالباری ندوی بھی تھے۔ دیوبند سے مولانا مدنی بھی ساتھ ہوگئے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے دربار تھانوی میں باریابی کے بعد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کو انسانی وروحانی اقدار کے کن اعلیٰ مقام پر جلوہ افروز پایا کہ انھیں ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کے سرورق مندرجہ ذیل مصرع رقم کرنا پڑا!!

اے تو افلاطون وجالینوس ما

مولانا عبدالماجد دریابادی نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات کے بعد اپنے ہفت روزہ صدق میں قسط وار لکھنا شروع کیا تھا، جس سے خود بھی متاثر ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے تھے۔ آپ حضرت تھانوی کے دوسرے خلفا کی طرح ان کی یاد کو بھلائے نہیں پاتے تھے۔ جب بھی حضرت تھانوی یاد آتے تو ایک مضمون لکھ ڈالتے تھے، اس طرح ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' جیسی عظیم تاثراتی تصنیف معرض وجود میں آگئی۔

حکیم الامت نقوش وتاثرات پہلی مرتبہ 1952 میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی حیات میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے طبع ہوئی تھی جو 614 صفحات پر مشتمل تھی اور دوسری مرتبہ 1967 میں ایم شمس الدین، مسلم مسجد لاہور سے شائع ہوئی تھی، پھر 1990 میں مولانا سعادت علی قاسمی کے زیر اہتمام سعدی بک ڈپو وصی آباد الہ آباد سے چھپی، یہ وہی نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے جو 1952 میں طبع ہوا تھا، سعدی بک ڈپو الہ آباد نے اسی نسخۂ قدیم کو دوبارہ شروع میں عرض ناشر کے عنوان سے تین صفحہ کے اضافہ اور آخر میں 9 صفحات پر مشتمل ضمیمہ کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

نسخہ قدیم مطبوعہ نسخہ سعدی بک ڈپو الہ آباد کے صفحہ 486 کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے جو یقیناً عرض ناشر کی طرف سے لکھی گئی ہے:

''حکیم الامت'' کے پاکستانی ایڈیشن میں یہاں چند صفحات کا اضافہ ہے۔ طباعت کی مجبوریوں کے باعث وہ اضافہ یہاں شامل نہیں کیا جاسکا، مطالعہ کا تسلسل باقی رکھنے کے لئے آخری صفحات میں ابھی ملاحظہ فرمالیں۔ صفحہ 484

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم الامت نقوش وتاثرات مطبوعہ نسخہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں یہ ساڑھے 8 صفحات کی عبارت متروک ہوگئی تھی، جو کتاب کے آخر میں 615 پر ضمیمہ درج ہے، جو اصل کتاب اور ضمیمہ کی عبارتوں کے طرز تحریر میں نمایاں فرق ہے۔ ضمیمہ کے عنوان میں مندرجہ وضاحتی عبارت بھی درج ہے۔

''ایک قدیم مکتوب اشرفی، حال میں ایک پرزہ پر لکھا ہوا، ایک اور چھوٹا سا مکتوب پرانے کاغذات کے انبار سے نکل آیا، یہ میرے عریضہ کے جواب میں اسی کے

حاشیہ پر ہے۔ تاریخ اس میں بجائے عیسوی کے میں نے ہجری درج کی تھی۔ 16 شوال 343 اڈاکخانہ دریاباد کی مہر پر 15 مئی 1925 درج ملی"

صفحہ 615 حکیم الامت نقوش وتاثرات

حکیم الامت نقوش وتاثرات کی تیسری اشاعت 2011 میں دوبارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے عبدالمنان ہلالی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، درالمصنفین اعظم گڑھ کی دوسری اشاعت دوبارہ کمپوزنگ کے بعد ہوئی ہے۔ الحمد اللہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے قدیم مطبوعہ نسخہ اور دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے جدید مطبوعہ نسخہ ان دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر کلیات ماجدی کی چوتھی جلد (جو حکیم الامت نقوش وتاثرات پر مشتمل ہے) کا صحیح ترین نسخہ مرتب ومدون کرنے کی سعی کی ہے اور پورا اہتمام کیا ہے کہ کلیات ماجدی جلد چہارم تمام تر صحت الفاظ، تحقیق و تصحیح اور تنقیح کے ساتھ منظر عام پر آسکے۔

مجھے یقین ہے کہ کلیات ماجدی کی یہ چوتھی جلد بھی دوسری مطبوعہ کلیات ماجدی کی طرح علمی وادبی حلقوں میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی نیک نامی وشہرت کا باعث ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ومتحرک ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کی قیادت وسیادت میں یہ قومی کونسل مزید ادبی فتوحات حاصل کر کے افق ادب پر نیر تاباں ہوکر چمکے گی اور ضوفشانی کرتی رہے گی۔ واللہ المستعان

مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حکیم الامت امام اشرف علی تھانویؒ بزرگ کسی مرتبہ اور ولی اللہ کس پایہ کے تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لیے اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت وولایت کی تفصیل درج ہوگی یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدراج روحانی کا بیان ہوگا، تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔ حضرت کے مریدین ومسترشدین میں بڑے بڑے پایہ کے لوگ گذر چکے ہیں اور ماشاء اللہ اب بھی سلامت با کرامت ہیں۔ بعض ان میں سے حضرت کی سوانح نگاری کا حق ادا کر چکے ہیں اور بعض حضرت کی تعلیمات کی بہترین شرح وترجمانی کر رہے ہیں۔

یہ مجموعۂ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد اور نہ سیرۃ الشیخ اس کا موضوع، ان سب سے الگ ہی نہیں، سب سے پست بھی ہے۔

''حضرت شیخ'' کے کمالات وفضائل جو کچھ بھی ہوں، بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں۔ ان کے عمر کے آخری 15، 16 سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ کو ان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا۔ اور اس نے اپنے لبے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا۔ بس ان کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان ''نقوش

وتاثرات'' کے اندر بند کر دینے کی کوشش اُلٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی اور چونکہ اُن کی انسانیت ان کے مفسر وفقیہ ودرویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جا سکتی اس لیے ضمناً ذکر ان کے علم وفضل، تفقہ وسلوک کا لانا بھی ناگزیر ہوگیا۔ ع

بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

ورنہ حقیقتاً مصوری صرف ان کی انسانیت کی کرنی تھی، وہ بھی اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کے حدود کے اندر۔

ان گذارشوں کے بعد بھی اگر کوئی خوش عقیدہ بزرگ مطالعۂ کتاب پر اصرار ہی جاری رکھیں اور آگے چل کر کہیں اپنے جذبات عقیدت کو مجروح ہوتا ہوا پائیں یا لاابالی مصنف کے انداز بیان میں انھیں کہیں سوءادب کی جھلک نظر آئے تو اس کی ذمہ داری خود ان ہی بزرگوار پر رہے گی۔

ان اوراق کی ترتیب وتسوید سے فراغت، حضرت کی وفات کے دو سال بعد 1945 میں ہوگئی تھی۔ مدتیں مسودہ کی صفائی میں گذر گئیں۔ اب وسط 50 میں نوبت نظر ثانی کے بعد اس دیباچہ نگاری کی آرہی ہے۔ طبع واشاعت کی منزلیں اب بھی بہت دور ہیں۔ والامر بیداللہ۔

مئی 1950	عبدالماجد
رجب 1369	دریاباد۔ بارہ بنکی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(1)

مہینہ یہی جولائی کا تھا(1) ہائے یہی مہینہ جس نے پندرہ سال بعد دل وجگر خون کر ڈالا اور شروع بالکل شروع کی کوئی تاریخ، عجب نہیں کہ 30 جون ہی کی شب ہو کہ سہارنپور، شاہدرہ لائن کے قدیم اسٹیشن تھانہ بھون(2) پر تین مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ سہارنپور کی طرف سے کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا، سالار قافلہ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب اور باقی دو میں سے ایک مولانا عبدالباری ندویؒ (استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) اور دوسرا یہ نامہ سیاہ، سچ کا ایڈیٹر(3) ہمدرد (دہلی) کا ڈائریکٹر(4) اور صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کا صدر۔ داستان سفر کی طویل اور پیچ در پیچ منزلیں طے کرنے سے قبل، بہتر یہ ہوگا کہ ایک نظر سفر کے پس منظر پر ہوتی چلے اور نازل ہونے والے قافلے کی شان نزول، ذہن وحافظہ دونوں کی گرفت میں لے آئی جائے، وقت اس میں لگے گا، لیکن یہ وقت ضائع انشاء اللہ نہ ہوگا۔

نام، مولانا اشرف علی تھانویؒ کا، اجنبی ونا موس زندگی کے کسی بھی دور میں یاد نہیں پڑتا، چرچے اور شہرے بچپن ہی سے سننے میں آرہے تھے، لیکن ذکر، ہمیشہ ذکر خیر ہی کا مرادف نہیں ہوتا، کبھی اگر یہ سننے میں آیا کہ بڑے پایہ کے مولوی ہیں، کانپور میں درس دیتے ہیں اور فتویٰ

---

(1) حضرت کا وصال جولائی 1943 میں ہوا(2) تھانہ بھون ٹاؤن کے نام سے جدید اور چھوٹا اسٹیشن، اس کے بعد بنا ہے۔ اس وقت قدیم اسٹیشن صرف تھانہ بھون کے نام کا تھا۔ (3) صدق کا قدیم نام(4) مولانا محمد علیؒ جو 1928 میں جب یورپ علاج کے لیے روانہ ہوئے تو اپنا مشہور روزنامہ "ہمدرد" میرے سپرد کر گئے تھے۔

لکھتے ہیں، تو دوسری طرف بریلی کی سمت سے یہ آواز بھی کان میں پڑ گئی کہ بڑے بدعقیدہ ہیں، پکے وہابی ہیں، ''بہشتی زیور'' کے کل حصے اسی زمانہ میں دیکھے بلکہ بعض حصوں کے سبق بھی سن میں ایک بہت بڑی عزیزہ کو پڑھائے، فقہ کی کتاب سمجھ کر نہیں محض اردو زبان کی ایک کتاب کی حیثیت سے، شکل، کلید مثنوی کی بھی اسی سن میں دیکھنے میں آئی تھی، بہر حال دل میں یہ جم گئی کہ یہ کوئی کٹر قسم کے مولوی ہیں، تشدد میں بسے ہوئے اور تقشف میں رچے ہوئے، بات بات پر گھڑکی، قدم قدم پر جھڑکی، فلاں عمل حرام، فلاں عمل بدعت، یہ چیز ناجائز، وہ چیز معصیت!

روایتیں، مخالفوں اور دشمنوں ہی کی پہنچائی ہوئی نہ تھیں، بڑے بڑے مخلص و جاں نثار، اسی لپیٹ میں تھے، دوست مگر نادان، معتقد مگر نافہم، مخلص مگر کج رائے، گویا نعتِ مسیح نصرانیوں کی زبان سے، مناقب شہید کربلاؓ، مرثیہ خوانی کے منبر سے، ہائے ہائے!

مردم اندر حسرت فہم درست

یہ تو سب تھا ہی کہ اُدھر ہوا یہ اُڑ گئی کہ مولانا نے ترک موالات وتحریک خلافت کی مخالفت کردی، مخالفت تحریک خلافت کی! وہ تحریک جو وقت کے ہر غیرتمند مسلمان کے لیے عین دین وایمان تھی، دیوبند اس میں پیش پیش، شیخ الہند اس کے مقدمۃ الجیش، جمعیۃ العلما اس کی علمبردار، بڑے چھوٹے سارے متدین ومعتبر علما اس کے ساتھ، مخالف تنہا ایک خانقاہ تھانہ بھون۔

خلقے بہ سنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

اس کا کیا اثر پڑا ہوگا، اس انگریزی خواں 30-35 کے سن والے خادم خلافت پر جس کے پاس فخر کا سب سے بڑا سرمایہ محمد علیؒ کی رفاقت وپیروی تھی؟ اس کی تلاش یہاں لفظ وعبارت میں نہ کی جائے، بس اپنے دل کو ٹٹول کر وہیں محسوس کر لی جائے۔ 1927 میں ''سچ'' کی شہرت کا شباب تھا، ایک نوٹ گرما گرم، کچھ اسی بحث پر نکلا، ایک فقرہ آج تک دماغ میں گونج رہا ہے۔

''جب ''بہشتی زیور'' کے لکھنے کا نہیں، پہننے کا وقت آئے گا، تو اس وقت معلوم ہوگا''۔ الخ

نوٹ کے الفاظ بحمد اللہ اُس وقت بھی مہذب رہے اور پیرایہ بیان کچھ زیادہ غیر مہذب نہ

ہونے پایا پھر بھی تنقید تنقید ہی تھی اور اعتراض بہرحال اعتراض۔

مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ جتنا کچھ بھی فارسی، اردو اور عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا بہت کچھ پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی، حیدرآباد، دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر اور اجمیر کلیر، دیوہ اور بانسہ، ردولی اور صفی پور، چھوٹے بڑے ''آستانے'' خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سن گن جہاں کہیں کسی بزرگ کی بھی پائی حاضری میں دیر نہ لگائی، حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض نرے دکاندار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر میں دل نے کہا کہ حق حلقۂ دیوبند میں محصور ہے۔ انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے اب تفصیلی جائزہ اسی حلقے کا لیجیے اور میں نے بہترین متن سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق و معارف کی روح بھر دی ہے دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیے۔(1)

1927 کا ستمبر یا اکتوبر تھا، اس بیچ والے نوٹ کی سیاہی کو خشک ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اسی تلاش مرشد کے سلسلہ میں ایک سفر صفی پور ضلع اناؤ کا ہوا، رفیق سفر اب کی وصل بلگرامی مرحوم تھے، واپسی میں بولے کہ ''بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تو تجربہ کیجیے، سب کو بھول جائیے گا۔ تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل، تربیت السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں، انھیں تو دیکھ ڈالیے''۔ اچھا! تو ان خشک مولوی صاحب نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر، دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ ہے، بشرطیکہ کہیں مل گئیں۔

''کہیں مل گئیں'' اس کی سند وصل صاحب کے ہاں نہ تھی، دوسری ہی صبح کتابوں کا ایک پورا پلندہ لیے ہوئے وصل صاحب میرے ہاں لکھنؤ میں موجود! ہائے کیا خوب شخص تھا یہ وصل مرحوم بھی، عجب ہرجہتی ہستی تھی، ہر صحبت میں، ہر مذاق کی مجلس میں موجود، موجود ہی نہیں، گھلے ملے ہوئے، میں تو خیر ان کی گودوں کا کھلایا ہوا تھا، بیگانوں، راہ چلتوں کا کام ہر طرح کا نکالنے کو پیش

---

(1) اشارہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ مشہور شارح مثنوی کی جانب ہے، جو بزرگان دیوبند و تھانہ بھون کے شیخ یا شیخ الشیوخ تھے۔

لکھتے ہیں، تو دوسری طرف بریلی کی سمت سے یہ آواز بھی کان میں پڑ گئی کہ بڑے بدعقیدہ ہیں، پکے وہابی ہیں، ''بہشتی زیور'' کے کل حصے اسی زمانہ میں دیکھے بلکہ بعض حصوں کے سبق بھی سن میں ایک بہت بڑی عزیزہ کو پڑھائے، فقہ کی کتاب سمجھ کر نہیں محض اردو زبان کی ایک کتاب کی حیثیت سے، شکل، کلید مثنوی کی بھی اسی سن میں دیکھنے میں آئی تھی، بہر حال دل میں یہ جم گئی کہ یہ کوئی کٹر قسم کے مولوی ہیں، تشدد میں بسے ہوئے اور تقشف میں رچے ہوئے، بات بات پر گھڑکی، قدم قدم پر جھڑکی، فلاں عمل حرام، فلاں عمل بدعت، یہ چیز ناجائز، وہ چیز معصیت!

روایتیں، مخالفوں اور دشمنوں ہی کی پہنچائی ہوئی نہ تھیں، بڑے بڑے مخلص و جاں نثار، اسی لپیٹ میں تھے، دوست مگر ناداں، معتقد مگر نافہم، مخلص مگر کج رائے، گویا نعتِ مسیح نصرانیوں کی زبان سے، مناقب شہید کربلاؓ، مرثیہ خوانی کے منبر سے، ہائے ہائے! ؂

مردم اندر حسرت فہم درست

یہ تو سب تھا ہی کہ اُدھر ہوا یہ اُڑ گئی کہ مولانا نے ترکِ موالات وتحریک خلافت کی مخالفت کردی، مخالفت تحریک خلافت کی! وہ تحریک جو وقت کے ہر غیرتمند مسلمان کے لیے عین دین وایمان تھی، دیوبند اس میں پیش پیش، شیخ الہند اس کے مقدمۃ الجیش، جمعیۃ العلما اس کی علمبردار، بڑے چھوٹے سارے متدین ومعتبر علما اس کے ساتھ، مخالف تنہا ایک خانقاہ تھانہ بھون۔

خلقے بہ منت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

اس کا کیا اثر پڑا ہوگا، اس انگریزی خواں 30-35 کے سن والے خادم خلافت پر جس کے پاس فخر کا سب سے بڑا سرمایہ محمد علیؒ کی رفاقت وپیروی تھی؟ اس کی تلاش یہاں لفظ وعبارت میں نہ کی جائے، بس اپنے دل کو ٹٹول کر وہیں محسوس کرلی جائے۔ 1927 میں ''سچ'' کی شہرت کا شباب تھا، ایک نوٹ گرما گرم، کچھ اسی بحث پر نکلا، ایک فقرہ آج تک دماغ میں گونج رہا ہے۔

''جب ''بہشتی زیور'' کے لکھنے کا نہیں، پہننے کا وقت آئے گا، تو اس وقت معلوم ہوگا''۔ الخ

نوٹ کے الفاظ بحمداللہ اُس وقت بھی مہذب رہے اور پیرایۂ بیان کچھ زیادہ غیر مہذب نہ

ہونے پایا پھر بھی تنقید تنقید ہی تھی اور اعتراض بہرحال اعتراض۔

مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ جتنا کچھ بھی فارسی، اردو اور عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا بہت کچھ پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی، حیدرآباد، دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر اور اجمیر کلیر، دیوہ اور بانسہ، ردولی اور صفی پور، چھوٹے بڑے ''آستانے'' خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سن گن جہاں کہیں کسی بزرگ کی بھی پائی حاضری میں دیر نہ لگائی، حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض نرے دکاندار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر میں دل نے کہا کہ حق حلقہ دیو بند میں محصور ہے۔ انتخاب کے دائرہ کو محدود کر کے اب تفصیلی جائزہ اسی حلقے کا لیجیے اور میں نے بہترین متن سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں حقائق و معارف کی روح بھر دی ہے دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیے۔(1)

1927 کا ستمبر یا اکتوبر تھا، اس بیچ والے نوٹ کی سیاہی کو خشک ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اسی تلاش مرشد کے سلسلہ میں ایک سفر، صفی پور ضلع اناؤ کا ہوا، رفیق سفر اب کی وصل بلگرامی مرحوم تھے، واپسی میں بولے کہ ''بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا کا بھی تو تجربہ کیجیے، سب کو بھول جایئے گا۔ تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل، تربیت السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں، انھیں تو دیکھ ڈالیے''۔ اچھا! تو ان خشک مولوی صاحب نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر، دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ ہے، بشرطیکہ کہیں مل گئیں۔

''کہیں مل گئیں'' اس کی سند وصل صاحب کے ہاں نہ تھی، دوسری ہی صبح کتابوں کا ایک پورا پلندہ لیے ہوئے وصل صاحب میرے ہاں لکھنؤ میں موجود! ہائے کیا خوب شخص تھا یہ وصل مرحوم بھی، عجب ہرجہتی ہستی تھی، ہر صحبت میں، ہر مذاق کی مجلس میں موجود، موجود ہی نہیں، گھلے ملے ہوئے، میں تو خیر ان کی گودوں کا کھلایا ہوا تھا، بیگانوں، راہ چلتوں کا کام ہر طرح کا نکالنے کو پیش

---

(1) اشارہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ مشہور شارح مثنوی کی جانب ہے، جو بزرگان دیو بند و تھانہ بھون کے شیخ یا شیخ الشیوخ تھے۔

پیش، دوست دشمن سب کے حق میں ''مشکل کشا''

کتابیں پڑھ کر جب بند کیں تو اب عالم ہی دوسرا تھا، ع

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں!

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف، آج پہلی بار دل ودماغ کے سامنے آئی، قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر، پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا۔ 16 برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے۔ خوش قسمتی کہ عین اسی زمانہ میں مولانا کے ایک خلیفۂ خاص اور عاشق صادق لکھنؤ میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے، خواجہ عزیز الحسن غوری نام، علی گڑھ کے بی اے، تخلص کے اعتبار سے مجذوب اور سیرت ومزاج کے لحاظ سے نیم مجذوب، لیکن مرشد کی نظر فیض اثر سے سالک بنے ہوئے تھے، ایک روز اپنے رفیق قدیم حاجی ظفر الملک بہادر کو ساتھ لے ان کے ہاں جا پہنچا اور کچھ دیر میں انھیں بھی پڑھ لیا، نقش یونہی ہلکا نہ تھا اب اور گہرا ہو گیا۔ یہ ٹھہری کہ خط مولانا کی خدمت میں لکھیے اور کچا چٹھا کہہ سنایئے، اپنی کہانی اپنی ہی زبانی۔

عقیدت گہری ہوئی مگر اندھی نہیں، نظر اپنی خطاواریوں پر بھی رہی اور مکتوب الیہ کی بشریت پر بھی، سیاسی اختلافات، خصوصاً تحریک خلافت سے مخالفت کا کانٹا دل میں کھٹکے گیا، عقل نے سمجھایا کہ معالج کا انتخاب ان ہی سے کرایئے، ہمصران سے زیادہ گہرا اور کون ملے گا، یہ نہ کہا کہ ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں آنکھ بند کر کے دے دیجیے، نظر کے سامنے مولانا حسین احمد صاحب تھے، ان کا سیاسی مسلک خوب جانا ہوا، پہچانا ہوا تھا، شخصی نیاز بھی ان سے ایک عرصہ سے حاصل، خلافت کمیٹی کے جلسوں اور سفر وغیرہ میں ان کے ساتھ کا تجربہ ایک بار کا نہیں بارہا کا، تواضع، انکسار، خدمت خلق میں اپنی نظیر آپ، پھر ملک کے نامور فاضل ومحدث مولانا انور شاہ کاشمیری تھے، تبحر علمی میں لاجواب اور دیوبند ہی کے حلقہ کے ایک آدھ بزرگ اور بھی۔ خط لکھنے بیٹھا تو رک رک کر، ڈر ڈر کر، لیکن ساتھ ہی خوب کھل کر بھی!

5

(2)

خط پورے دو صفحے کا تھا، وہ بھی باریک انگریزی قلم سے، صرف خلاصہ سن لیجیے:

''ایک انگریزی خواں ہوں، مدتوں مغربی فلسفہ کے اثر ضلالت بلکہ الحاد کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا، خدا اور رسول کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا، برسوں کے بعد اسلام وایمان کی طرف مراجعت نصیب ہوئی، زیادہ تر مثنوی کی برکت سے، گو اسے بھی بے سمجھے ہی پڑھا، اکبر الہ آبادی کی صحبتیں (1) بھی اصلاحی اثر ڈالتی رہیں، اب سچ ہفتہ وار کے ذریعہ اپنی بساط کے لائق دین کی خدمت میں لگا لپٹا ہوا ہوں اور اپنے لکھے ہوئے کو آپ ہی مٹاتا رہتا ہوں۔

ماضی کی بیہودگیوں کا تو ذکر وحساب ہی نہیں، بڑی فکر حال کی ہے، خدا معلوم اب بھی صراط مستقیم سے کتنی دور ہوں، اب تک کسی بزرگ سے نہ بیعت نصیب ہوئی نہ طویل صحبت، دل کی کشش صاحب مثنوی کے بعد، شارح مثنوی، حاجی صاحب مہاجر مکیؒ (2) کی جانب رہی، زندہ ہستیوں میں نظر بار بار مولانا حسین احمد صاحب کی جانب اٹھتی ہے، بعض احباب کا مشورہ مولانا انور شاہ صاحب سے متعلق ہے۔ مشیر ومبصر آپ سے بڑھ کر اور کون مل سکتا ہے، جناب کی تصانیف سلوک حال میں دیکھیں اور دل پھڑک گیا۔ اب تک آپ کو صرف مولوی کی حیثیت سے جانتا تھا، عارفانہ کمال کا حال تو اب کھلا، گو گستاخی معاف، جناب کی سیاسی رائیں اب بھی میرے لیے ایک معما ہیں۔

بہرحال اب درخواست امور ذیل میں رہنمائی کی ہے:

(1) موجودہ بزرگوں میں سے کس کا انتخاب بیعت یا صحبت کے لیے کروں؟

(2) اپنی اصلاح قلب کے لیے خود جناب والا سے بھی مراسلت اور تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں''۔

یہ خلاصہ حافظہ کے بھروسا پر نہیں، اصل خط کو دیکھ کر درج ہوا ہے، مولانا کے ہاں کا ایک دستور یہ تھا کہ خط جب جاتا تو لفافہ کے اندر ایک جوابی لفافہ بھی پتہ لکھا ہوا ملفوف کرنا ہوتا، اسی

---

(1) یہ مولانا کے بڑے معتقد ومداح تھے اور مولانا بھی ان کے بڑے معترف۔

(2) حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا کے پیر ومرشد۔

لفافہ میں جواب کے ساتھ اصل خط بھی واپس آجاتا بلکہ عموماً جواب تحریر ہی اسی خط پر ہوتا، تجربہ سے معلوم ہوا کہ حکیم الامت کے دستور العمل کی اکثر جزئیات کی طرح یہ قاعدہ بھی بڑے کام کا ہے۔

خط پر میں نے صرف سنہ ہجری تحریر کیا تھا، تاریخ 23 جمادی الاوّل 1346 کی پڑی ہوئی ہے، ابھی جنتری سے ملایا تو 18 نومبر 1927 نکلی، خط ڈاک میں پڑا اور جواب کا انتظار شروع ہو گیا، مولانا کا دستور یہ تھا کہ خط کا جواب عموماً فوراً ہی مرحمت فرما دیتے، ہاں خط کا مضمون ہی الجھا ہوا ہو یا جواب کے لیے کتابوں کی الٹ پلٹ کی ضرورت ہو تو اس کی بات ہی دوسری تھی، مولانا کے خطوط کی ڈاک گڈ گڈ ہوا کرتی لیکن مولانا جواب ایک ایک کا اپنے ہی قلم سے لکھتے، آخر جب تک ضعف نے بالکل ہی معذور نہ کر دیا، یہی روش قائم رہی۔ سارے انتظامات اور مستعدی کے باوجود خط کو بہر حال تین ساڑھے تین سو میل سے زائد سہارنپور کے آگے ضلع مظفر نگر تک فاصلہ طے کرنا تھا اور پھر اسی قدر فاصلہ واپسی میں، یہ توقع ہی آپ نے کیوں قائم کر لی کہ جہاں خط درج ہے، اسی کے متصل جواب خط بھی مل جائے گا؟ جواب 25 نومبر کو موصول ہوا، خلاصتاً نہیں پورے کا پورا سنیئے گا اور ابھی ابھی سنیئے گا لیکن ایک ذرا ٹھہر کر۔ ایک شیخ وقت کے حالات سننے سنانے آپ بیٹھے ہیں، تو خود بھی ایک ہلکا سا مجاہدہ صبر کا اور شوق و اشتیاق کے ضبط کا کرتے چلیے نہ:

ماجرا 1927 کا بیان ہو رہا ہے، 1943 کا نہیں۔ جو آج بھی نادان ہے، وہ سولہ سال قبل نادان تر تھا، دنیا بھی دوسری تھی اور دل کی دنیا بھی دوسری، جن خیالات پر اس وقت ناز تھا، آج ان پر ہنسی آ رہی ہے، جن سے انکار تھا، وہ اب مسلمات میں داخل ہیں، مولانا کی ہستی، اس وقت ایک راز، ایک معما تھی، جمعیۃ العلما کا زور تھا، گو گھٹا ہوا، محمد علی، شوکت علی کا دور تھا، گو شباب سے اترا ہوا، مسلمان خلافت کمیٹی کے ساتھ تھے اور خلافت کمیٹی کانگریس اور گاندھی جی کا ساتھ دے رہی تھی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی اور ان کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ دونوں اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کی آنکھوں کے تارے بن کر رہے اور اب جانشین شیخ الہندؒ کی حیثیت مولانا حسین احمد صاحبؒ کو حاصل ہو رہی تھی۔ جواب 25 کو لکھنؤ میں موصول ہوا، اشتیاق کے ہاتھوں سے کھولا، عقیدت کی آنکھوں سے پڑھا، آیئے آپ بھی شریک ہو جائیں:

''از اشرف علی، السلام علیکم

آپ کی راستی وسادگی سے جی خوش ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو حقائق امور تک پہنچائے، ہر جز کا مفصل جواب غیر ضروری ہے، بعد انتخاب مہمات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

(1) بیعت کا معیار آپ نے کیا تجویز کیا ہے؟ اس کی تنقیح اوّل ضروری ہے تا کہ اسی معیار پر مصلح کا انتخاب ہو سکے۔

(2) تھانہ بھون کا ارادہ کس خیال سے ہے، ضرورت تحقیق کی یہ ہے کہ میں دیکھ سکوں کہ آپ کا وہ مقصود یہاں آنے سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں، نیز اس کا ظاہر فرمانا بھی ضروری ہے کہ آپ یہاں تشریف لا کر خاموش رہیں گے یا کچھ بولیں گے بھی۔

(3) امراض قلبی کا علاج، ترتیب میں تجویز شیخ سے مؤخر ہے۔ والسلام از تھانہ بھون''۔

اس قلّ و دل جواب کا آنا تھا کہ دل کی بساط پر انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، خوش ہو کر خدا جانے کتنوں کو دکھایا، سنایا اور اپنی سادہ دلی سے دوسرا خط، دوسرے ہی دن 26 نومبر کو لکھ ڈالا، اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(1) ''بیعت سے مقصود اپنے ذہن میں یہ ہے کہ نجات کی حقیقی ویقینی سیدھی راہ عملاً نصیب ہو اور تسکین قلب و پختگیٔ ایمان حاصل ہو جائے۔

(2) حاضری سے غرض ایک تو یہی ہے کہ ایک برگزیدہ بزرگ کی زیارت۔

(الف) یک زماں بودن حضور اولیا الخ (ب) اور بہر حال جتنی دیر حاضری رہے گی بہت سی اچھی باتیں دیکھنے اور سننے میں آئیں گی۔ (ج) ساتھ ہی اپنے حق میں دعائے خیر کرنا اور (2) ارشادات حسنہ سے مستفید ہونا بھی مقصود ہے۔ (ہ) جناب کی عملی زندگی کی بھی بہت تعریف سننے میں آئی ہے۔ (و) علمی حالت کا پتہ تو تصانیف سے چل جاتا ہے لیکن عملی زندگی کا تجربہ بغیر حاضری ممکن نہیں۔

(3) ارادہ اپنی طرف سے تو محض خاموشی کے ساتھ دیکھنے اور سننے کا ہے، ہاں جناب کا ارشاد ہو گا تو کچھ عرض بھی کر دیا کروں گا اور وہ ہے کہ اوّل بار مختصر قیام کی نیت سے آؤں گا، پھر اگر طبیعت نے اچھا اثر قبول کیا اور جناب والا کی بھی مرضی ہوئی تو دوبارہ طویل قیام کا قصد کروں گا۔

(4) جناب سے بیعت ہونے پر جو زیادہ زور نہیں دیتا تو وہ اس لیے کہ جناب ہی کی تصانیف میں پڑھا ہے کہ 'حصول فیض' کے لیے بیعت کوئی لازمی شرط نہیں، بلا بیعت بھی امراض نفس کا علاج ہوسکتا ہے''۔

یہ ''الف، ب'' اصل خط میں نہ تھی، اس نقل میں یہ نمبر اس لیے ڈال دیے گئے کہ بغیر اس کے جواب سمجھ میں نہ آتا، جواب آیا، ملاحظہ ہو:

(1) ''میں نے مقصود نہیں پوچھا تھا، معیار پوچھا تھا، جس کی بنا پر شیخ کی تعیین میں سہولت ہو، مکرر عرض کرتا ہوں کہ شیخ کامل کی پہچان آپ کے ذہن میں کیا ہے۔

(2) (الف) میں سچی اطلاع کرتا ہوں کہ میں اس صفت کا نہیں۔

(ب) یہ محض ذہنی حساب ہے ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح نہ ثابت ہو۔

(ج) یہ خط سے بھی ممکن ہے۔

(د) حسنہ کی قید مثل سابق کے ذہنی ہے۔

(ہ) مجھ سے اس کے خلاف سن لیجیے کہ بیہودہ زندگی ہے، اب کس سننے کو صحیح سمجھیے گا؟

(و) میں نے تجربہ کا نتیجہ، بلا مشقت تجربہ عرض کر دیا۔

(3) ابھی تو آنے ہی کی غرض متعین نہیں ہوئی، مجھ کو اس میں جو کلام تھا اوپر عرض کر دیا، اس نمبر کا درجہ اس کے بعد ہے۔

(4) جب تک معیار بیعت کا تجویز نہ ہو جائے، کسی پر بھی زور نہ دینا چاہیے۔

مولانا نرے، صوفی محض عارف، صرف زاہد نہ تھے، متکلم بھی تھے، معقولی بھی تھے اور سب سے بڑھ کر مصلح و معلم تھے، اتنا جان لینے کے لیے اتنی مراسلت بھی بس تھی۔

(3)

اس دوسرے مکتوب گرامی کے بعد مراسلت جاری رکھنا ذرا ہمت کا کام تھا، سلسلہ بند ہو گیا اور ایک عرصہ تک بند رہا۔ 1928 کی فروری تھی کہ پنجاب کے ایک روزنامہ میں ایک ہزاروی بزرگ کی روایت سے یہ مضمون شائع ہوا کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حج کے لیے گئے تو اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاں ٹھہرے، حاجی صاحبؒ کے سامنے استفتا پیش ہوا کہ

ترغیب وترہیب کے موقع پرآیا موضوع حدیث سے استناد جائز ہے؟ حاجی صاحبؒ نے فتوائے جواز دے دیا اور تائید کے لیے مولانا سے اصرار کیا اور مولانا نے شدومد سے انکار کیا اور مرشد کا گھر چھوڑ دیا، شب میں عالم رویا میں حاجی صاحبؒ کو تنبیہ کی گئی اور صبح کو انھوں نے آکر مرید سے معافی مانگی۔ قصہ طویل تھا، محض خلاصہ درج ہوا۔ اس وقت دلچسپی کے موضوع اسی قسم کے قصے، تذکرے تھے اور حاجی صاحبؒ کی ذات سے تو بہت ہی گرویدگی تھی، مثنوی کے بہترین شارح تھے اور حکیم الامت کے مرشد، جی میں آیا کہ روایت کی تحقیق مولانا سے کر ڈالیے، وہ دونوں بزرگ اب زندہ نہیں، نہ سہی، یہ تیسرے تو موجود ہی ہیں، ان دونوں کی یادگار دونوں کے عاشق زار اور خود بھی ماشاءاللہ محقق نامدار۔

خط اسی انبار کے تراشے کے ساتھ روانہ کیا، جواب 23 فروری کو حسب ذیل موصول ہوا:

''مکرمی سلمۂ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

میں مسرور ہوا کہ آپ نے روایت میں احتیاط فرمائی، جواباً عرض ہے کہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد لَا تَـقْفُ مَالَيْسَ لَکَ بِهٖ عِلْم سے ثابت ہے کہ جس خیال یا مقال کی کوئی دلیل صحیح وسند معتبر نہ ہو اس کا اعتقاد اور اس پر عمل اور اس کی روایت سب ناجائز ہے اور روایت ایسی ہی ہے جس کی کوئی سند موثوق نہیں، لہٰذا اس کے ثبوت کا دعویٰ یا اعتقاد ناجائز ہے۔

علاوہ اس کے یہ روایت اصول محدثین پر معلول ہے، کیونکہ جن لوگوں کو حضرت حاجی صاحبؒ کا مذاق معلوم ہے، وہ قیامت تک بھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتے، حضرتؒ حد درجہ متبع سنت ومتبع علما اور ضروری اصول دین سے ماہ تھے، پس قصہ یا مخترع ہے یا اس میں کچھ غلط ہو گیا ہے۔

اشرف علی''

تھانہ بھون کا خانقاہ نشین نرا صوفی صافی نہیں، دماغ بیدار رکھنے والا، روایتوں کو جانچنے والا، پرکھنے والا، صاحب علم ہے، یہ سبق اس مختصر خط سے ایک بار پھر تازہ ہوا۔

''مرشد کی تلاش'' کے عنوان پر، قلم ذرا تفصیل کے ساتھ، سچ کے صفحات میں چل چکا تھا اب دل بے چین تھا کہ اس تلاش میں حرکت قلم سے زیادہ قدم کو ہو، قدم متحرک پہلے ہی سے تھا، تقاضا یہ پیدا ہوا کہ حرکت تیز سے تیز تر کی جائے، نام ذہن میں گھوم پھر کر وہی دیوبند کے دونوں بزرگوں

کے آرہے تھے، مئی میں دلی جانا ہوا، محمد علیؒ ہر چیز کے رازدار اور بہترین ومخلص ترین مشیر تھے، ذکر ان سے آیا تو انھوں نے بلا تامل ووٹ مولانا حسین احمد صاحب کے حق میں دے دیا۔ مولانا انور شاہ کی بزرگی اور علم وفضل کے وہ بھی قائل تھے، لیکن رائے وہی رکھتے تھے جو بعض اکابر حنفیہ نے ابن تیمیہؒ سے متعلق ظاہر کی ہے کہ ان کا علم وفضل ان کی فہم سے بڑھا ہوا ہے۔ بہرحال اس ترجیحی ووٹ نے تذبذب کی صورت ختم کردی، دل پہلے سے بھی اسی طرف جھک رہا تھا، شروع جون میں بڑے تیز قسم کا بخار آیا، اس زمانہ میں قوالی سنا کرتا تھا، شدت کے وقت قوال سے مثنوی کے اس شعر کی فرمائش کی:

چوں خلیل آمد خیال یار من　　　صورتش بت معنی او بت شکن

اور عالم تصور میں خیال ان ہی جانشین شیخ الہندؒ کا جمایا، خوب رقت طاری ہوئی اور طبیعت نسبتاً ہلکی ہوگئی۔

دوستوں سے، رفیقوں سے گفتگو گھنٹوں اسی موضوع پر رہا کرتی، لڑکپن کے ایک رفیق (اور اب مولانا حاجی شاہ) عبدالباری ندویؒ تھے (انھیں، ان کے ہم نام فرنگی محلی عالم اور لیڈر سے خلط نہ کردیجیے گا) ان سے برابر چرچے، تذکرے یہی ہوتے رہتے، عقیدت اس وقت سب سے زیادہ مولانا تھانویؒ ہی سے تھی، بزرگی سب سے بڑھ کر ان ہی کی مسلم تھی، دل سب سے زیادہ ان ہی کی طرف کھنچ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اختلافات کی بھی ایک خلیج اپنے اور ان کے درمیان حائل پا رہا تھا، ان میں سب سے بڑھ کر سیاسی اختلاف تھا، دل اس پر آمادہ نہ ہوا کہ آنکھ بند کرکے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے، مولانا حسین احمد صاحب سے عقیدت اس درجہ کی نہ تھی لیکن ساتھ ہی کوئی اختلاف کسی بھی شدید قسم کا نہ تھا اور سیاسیات میں تو بالکل ہم رنگی تھی، پھر نفس نے یہ بھی سجھایا۔ شعور کے ساتھ ساتھ تحت الشعور بھی تو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کیا حرج ہے، اگر آپ طبیعت کی حذاقت کے کارناموں کی داستان کے ساتھ ساتھ مریض کی تحلیل نفسی کی سرگذشت بھی مریض ہی کی زبان سے سنتے چلیں۔ کہ حضرت تھانویؒ حاذق ترین طبیب سہی، ان کا معالجہ موثر ترین وکامیاب ترین سہی، لیکن ان کے باقاعدہ علاج ومنضبط پرہیز کی پابندیاں کس سے برداشت ہوں گی؟ طبیب کی حذاقت سے قطع نظر مریض کی ہمت وبرداشت بھی تو آخر ایک چیز ہوتی ہے، مولانائے دیوبندی

کے مزاج کی سادگی، تواضع، فروتنی دیکھ، خیال یہ پیدا ہوا کہ یہاں کوئی پابندی کسی شدید قسم کی نہ ہوگی، پس ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ نفع کامل میں کچھ دیر سہی، لیکن دوا کی تلخیوں سے تو جان بچی رہے گی۔ مریض کے لیے یہ لالچ کچھ کم ہوتا ہے؟

رفیق قدیم مولوی عبدالباری صاحب ندویؒ کے ساتھ مل کر دیوبند چلنے کی ٹھہر گئی اور جون 1928 کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ صبح کے وقت ہم دونوں لکھنؤ سے لمبا سفر کر کے دیوبند اسٹیشن پہنچ گئے، یہاں کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا، اسٹیشن پر دیکھا تو مولانا خود استقبال کے لیے موجود، مولانا کی بزرگی کے قائل خوش عقیدہ حضرات جس بنا پر بھی ہوں، اپنی نظر میں تو ان کی بڑی کرامت ان کا ایثار، انکسار، تواضع، بےنفسی ہی ہے، علم وفضل، فقر ودرویشی کی بحثوں کو چھوڑیے، لیکن جہاں تک ۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا ۔۔۔ خاکساری اپنی کام آئی بہت!

کا تعلق ہے مولانا 1928 ہی میں نہیں 1943 بلکہ عین اس وقت یعنی 1948 میں بھی، اس دیکھنے والے کی نظر میں اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں اور محمد علی جوہرؒ نے یہ شعر کہا تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے حق میں ہے، لیکن صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ آرہا ہے ۔

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ یاں ۔۔۔ کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

دوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا ہو، جو ان مولانا کو دوسروں کا کام کر دینے میں آتا ہے، گھر پر آکر ملیے تو آپ کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے جا کر لائیں، آپ کے لیے بستر بچھا دیں، سفر میں ساتھ ہو جائے تو دوڑ کر آپ کے لیے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگے کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کر دیں اور آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کا بستر کھول کر بچھائیں، آپ کے لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں۔ تین دن کے قیام دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں اور شنیدہ دیدہ میں تبدیل ہو کر تکلفات اور خاطریں اور مہمانداریاں، کھانے پر کھانا اور چائے پر چائے، بیعت کے سوال پر ارشاد ہوا کہ یہاں کیا رکھا ہے، ذرا تھانہ بھون تو چلیے، یہاں تو نیت ہی یہی تھی، ایک روز سہ پہر کو یہ مختصر سا قافلہ چل کھڑا ہوا، گویا:

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

البتہ یہاں اپنے ساتھ پارسا ایک نہیں دو تھے اور سفر کعبہ کا نہیں، کعبۂ مقصود کا تھا۔ ایسی منزل کے لیے رہبر بھی، اس سے بہتر اور کون مل سکتا تھا! اللہ اللہ! ایسے سفر کی سعادت ہی کب نصیب میں معلوم ہوتی تھی۔

ہے آرزو کہ ابروئے پرخم کو دیکھیے　　　اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے!

(4)

''آمدم برسر مطلب'' - کیا حرج ہے، اگر یہ پرانا، بہت پرانا فرسودہ فقرہ ایک بار پھر نئی زبانوں پر چڑھ جائے۔ جملۂ معترضہ بڑا طویل، لیکن لاطائل نہیں، تین قسطوں میں کہیں جا کر ختم ہوا، اب ناظرین کرام تکلیف اٹھا کر ایک بار پھر تھانہ بھون اسٹیشن پر پہنچیں، تاریخ 30 جون 1928 وقت کوئی ساڑھے نو بجے شب۔

قافلہ مختصر سا تین آدمیوں کا اسٹیشن پر اترا، تین میں سے ایک خود ہی نامور لیڈر اور شیخ الحدیث، باقی دو میں سے ایک عالم دوسرا عامی، اسٹیشن اس وقت تک ٹاؤن کا کھلا نہ تھا، وہی پرانا بڑا اسٹیشن تھا، جو اب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام سے مشہور ہے، یہاں سے قصبہ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کا ہوگا، تانگہ کرایہ پر کیا اور سنسان راستوں سے گزرتے کوئی آدھ گھنٹہ میں قصبہ کے اندر پہنچ گئے۔ جذبات میں جب بجائے جزر کے مدّ ہو اور خیالات میں تلاطم تو یہی آدھ گھنٹہ کئی گھنٹوں کا معلوم ہونے لگتا ہے، عقیدت تازہ بھی تھی اور تیز بھی، تخیل خوب خوب نقشے پیش کرتا رہا، تانگہ خانقاہ امدادیہ کے دروازہ پر رکا اور کرایہ مولانا حسین احمد صاحب نے دیا، سہارنپور اسٹیشن پر کھانا بھی تو ان ہی نے مسلم ہوٹل میں لے جا کر کھلایا تھا اور دیوبند اسٹیشن پر ٹکٹ بھی تو وہی جھپٹ کر لے آئے تھے اور ہم دونوں سن میں ان سے کہیں چھوٹے، منہ دیکھتے ہی رہ گئے تھے، جس سفر میں وہ ساتھ ہوں، چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی خدمت گزاری میں کون ان سے پیش پا سکتا ہے۔

''امدادیہ'' کو یہاں کوئی صاحب انگریزی لفظ ''کوآپریٹو'' (Co-operative) کا ترجمہ نہ سمجھ لیں۔ (جیسا کہ آگرہ کے ایک مشہور شاعر چند سال ہوئے یہی سمجھے تھے) حکیم الامت کے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا وطن بھی یہی قصبہ تھا، یہیں ان کا حجرہ اور مسکن تھا، حجرہ اب

تک اسی حالت پر قائم ہے اور صحن، مسجد، عمارت اور خانقاہ میں بہت زیادہ اضافہ کر کے، مجموعہ کا نام ان ہی کے اسم مبارک پر خانقاہ امدادیہ رکھ دیا گیا ہے، رات زیادہ جاچکی تھی، خانقاہ کا پھاٹک قدرتاً بند ملا، مولانا حسین احمد صاحبؒ کی رفاقت پھر کام آئی، چند منٹ کی تلاش کے بعد حکیم الامت کے ایک خادم کو ڈھونڈ نکالا، وہ بیچارے سوتے سے اٹھے، آئے اور ایک پڑوس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں، تین چار پائیوں کا انتظام کر دیا، مستعدی کے باوجود وقت اچھا خاصا لگا، اب بقیہ رات کسی طرح گزارنا تھی، یکم جولائی کی مختصر سی رات، اس کے گھنٹے ہی اب کے باقی رہ گئے تھے، عقیدت کا جوش اتنے گھنٹے بھی کب سونے دیتا ہے۔ حکیم الامت ولی کامل ہیں، ساری رات جاگتے ہوں گے، اولیاء اللہ بھی کہیں سوتے ہیں، اس وقت بھی قطعاً جاگ رہے ہوں گے، صاحب کشف بھی یقیناً ہوں گے، اس وقت کے مسافروں کی آمد کا حال، ان پر بالکل روشن ہو گیا ہوگا، آمد کیا معنی دلوں کے اندر تک کے بھید ان سے کون چھپا سکتا ہے، ضرور ان پر سب کچھ روشن ہوگا، یہ اللہ والے بھی اللہ ہی کی طرح دانا بینا ہوتے ہیں اور یہ اینٹ چونے کی دیواریں اور مسافتیں، ان کی غیب بیں نگاہ کی راہ میں حائل تھوڑے ہی ہوسکتی ہیں۔ خوش عقیدگی کے خیالات اسی طرح کے کچھ صحیح اور زیادہ تر غلط و مہمل دماغ پر اور دل پر مسلط رہے، اس وقت عقیدے تھے ہی ایسے، ساتھ ہی جسم بھی خوب تھکا ہوا تھا، کچھ سوتے، کچھ جاگتے، باقی رات بھی کٹ گئی اور نماز فجر کا ابھی بالکل اول ہی وقت تھا کہ ہم لوگ دیدار اشرف کے لیے تیار ہو گئے، مولانا تو خیر، ان کے بڑے پرانے ملنے والے اور رفیق ہی تھے، دوسرے ساتھی مولوی عبدالباری ندویؒ بھی، چند سال قبل زیارت سے مشرف ہو چکے تھے، نادیدہ مشتاق بالکل اپنا، ع

اے اسیرانِ قفس، میں نو گرفتاروں میں ہوں

کی تسبیح پڑھنے والا بس یہی ایک نامہ سیاہ تھا!

جس مکان میں حضرت حکیم الامت اس وقت قیام فرما تھے، اس سے خانقاہ و مسجد (مسجد کو خانقاہ حلقہ میں لیے ہوئے ہے) کوئی سو گز کے فاصلہ پر ہوگی اور جہاں ہم لوگ رات کو ٹھہرائے گئے تھے وہ حضرت کے کاشانہ سے کوئی دس ہی گز کے فاصلہ پر تھا اور حضرت کا راستہ اسی طرف سے تھا، میں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل، عین راستہ پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ

زیارت جمال پہلے یہیں ہوجائے، چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ آرزو پوری ہوئی، ایک بزرگ ادھر سے گزرے، حسن لیکن خوش رو، نظریں نیچی، چال متین، نورانی چہرہ، نورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید براق، سر پر نازک سی گول اکہری ٹوپی، جسم پر لمبا کرتا، نازک ونفیس غالباً تنزیب کا، تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا، نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا اور کہنا چاہیے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی، اس پر دلکشی، رعنائی، زیبائی، بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی، دل تو بے اختیار آواز دے ہی اٹھا۔ ع

قربان یک نگاہِ تو عمر دراز ما!

کم وبیش 15 سال اس منظر پر گزر چکے اور معلوم ہو رہا ہے کہ بات کل کی ہے اور دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دل پر تاثر اتنا زبردست کم ہی ہوتا ہے۔

نماز ہوئی، حضرت ہی نے پڑھائی، خود ہی پڑھانے کا معمول تھا، فرمایا کرتے تھے کہ بار بار امام بدلتے رہنے سے جماعت کے نظم ونسق میں فرق آجاتا ہے، اکثر عادت فجر کے وقت کسی قدر طویل قرأت کی تھی، مثلاً سورۂ الدہر یا سورۂ المنافقون، صورت کی دلکشی کا تجربہ ابھی ہو چکا تھا، آواز کی دلکشی کا اندازہ اب ہوا اور غالب کے دیوان سے ندا آئی۔ ع

وہ جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے!

تجوید خود ایک مستقل فن ہے، اس کے معیار سے اظہار رائے صرف ماہرین فن کا کام ہے، یہاں ذکر آواز کی صرف دلکشی اور تاثیر کا ہے، اس عامی محض کو اپنی عمر میں اتفاق ہندوستان، عرب ومصر کے اچھے اچھے قاریوں کے سننے کا ہوا ہے، مشہور وغیر مشہور دونوں قسم کے بعض باکمالوں کی داد بھی دل کھول کر دی ہے۔ بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے لیکن اس درجہ موثر لہجہ، اتنے خوبصورت بول، شاید ہی کبھی کسی کے سننے میں آئے ہوں، ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے اور پھر بالکل ہی سادہ وبے تکلف کہیں سے شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ صاف یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے، نماز کے طویل قیام میں میں بڑا کچا اور بودا ہوں، یہ قرأت اشرفی کا اعجاز تھا کہ طویل قرأت سے بھی جی

اکتانا کیسا، جی یہی چاہے گا کہ ابھی اور سنتے جائیے، ادھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی اور ادھر حسرت باقی رہی جاتی تھی۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور شاخ میں شاخ کیسی نکل آئی، ذکر اس خاص نماز اور پہلی نماز کا تھا اور چھڑ گئی مولانا کی عام خوشنوائی کی داستان۔ نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دعا مانگ کر جونہی حضرت اٹھے ہیں، نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی، ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے، بڑے خشک مزاج ہیں، خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے اور ان کے بے لطفی ہے، ناچاقی ہے، کانوں نے بیشک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست گلے مل رہے ہیں۔ تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی، عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی، لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب و مراسم تکریم میں کوئی کمی نہ تھی۔ لاحول ولاقوۃ لوگ بھی کیسی کیسی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں اور لوگ بھی کون؟ عوام کالانعام نہیں اچھے اچھے پڑھے لکھے، خاصے ثقہ راوی خود ان ہی دونوں حضرات کے خدام و مریدین! بعض راوی زبان قال سے اور بعضے راوی زبان حال سے۔ الحمد للہ کہ دونوں روایتیں آج غلط نکلیں، مولانا نے تعارف ہم دونوں کا کرایا، ہم دونوں سے بھی شگفتہ اخلاق والتفات اتفاق سے چند ہفتے قبل ٹائیفائڈ (میعادی بخار) میں مبتلا ہوا تھا۔ حضرت نے کمال شفقت سے اس کا حوالہ دے کر خیریت دریافت فرمائی، میں دنگ کہ اس کی انھیں کیونکر خبر، علالت کی اطلاعیں تو بس ہمدرد (دہلی) ہمدم (لکھنؤ) یا خود میرے سچ میں نکلتی رہی تھیں ان اخباروں کا یا ایسے اخباری لوگوں کا یہاں کہاں گزر۔ لیجیے نہ! لوگوں کی چلائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی روایت اس باب میں بھی غلط یا کم از کم بہت مبالغہ آمیز نکلی۔ مجھے تو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میرا نام بھی کبھی حضرت کے کان میں پڑا ہوگا، رہی دو ایک بار کی خط و کتابت تو ایسے خط تو خدا معلوم کتنے روز ہی آتے رہتے ہوں گے۔ کس کس کے نام ذہن میں رہ سکتے ہیں، لیکن نہیں، ناواقفیت کیسی، یہاں تو میری تازہ علالت تک سے واقفیت وباخبری نکلی!

خانقاہ میں آپ داخل ہو چکے ہیں اور نماز سے بھی اب فراغت ہو چکی ہے، تو ایک نظر اس عمارت پر نہ کرتے چلیے، خانقاہ کی عمارت قصبہ کی بالکل مغربی سرحد پر ہے، اس کے بعد اس لین میں کوئی آبادی نہیں، کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے اسٹیشن ہے، قصبہ کی اکثر پرانی شاندار عمارتوں کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے، عین خانقاہ کے دروازہ تک آئی ہے، پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ یا ٹین کا سائبان، اس سلیقہ کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگا لے، نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض، زیادہ حصہ پٹا ہوا، ایک لمبا حصہ کھلا ہوا، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے، چھوٹے لیکن ضرورت کے لیے کافی، جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں، بر دھا طے کر کے آپ اندرونی دروازہ میں داخل ہوئے، جوتے اتارے کہ صحن مسجد شروع ہو گیا، جوتا رکھنے کے لیے ایک چیڑ کا بڑا بکس کھلا ہوا رکھا ہوا۔ اب آپ مشرق سے اپنے بائیں طرف یعنی جنوب کی جانب مڑے، یہیں کنواں، اس کے آگے بیت الخلا جانے کا راستہ، اس کے بعد مہمان خانہ کا زینہ، مہمانوں کے لیے کمرہ کوٹھے پر، سادہ مگر ہوادار۔ گنجائش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں آسانی سے ٹھہر سکیں۔ زینہ سے چند ہی قدم اور آگے چلے کہ رخ جنوب میں چلتے چلتے اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب کرنا پڑا اور ایک لمبا برآمدہ ملا، اس برآمدہ میں دو سہ دریاں ہیں، پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرہ، دوسری سہ دری خاص حضرتؒ کی نشست گاہ، ایک حجرہ اس کے عقب میں، دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونے پر، یہی حجرہ حضرت حاجی صاحبؒ کا تھا اور ایک کوٹھری اس کے جواب میں برآمدہ کے مشرقی کونے پر، اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آ گئے، مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں، لیکن بڑی پر رونق اور پر انوار اور ساتھ ہی گنجائشی اور آرام دہ، ختم مسجد کے بعد، اسی مغربی لائن میں دالان اور اس کے عقب میں طالبین و سالکین کے لیے حجرے۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لیے لڑکوں کا مدرسۂ قرآنی، خاتمہ پر زینہ اور کچھ اور حجرے، اوپر اور نیچے کے یہ سب حجرے طالبوں کے لیے ہیں، اب آپ پھر اپنی داہنی طرف یعنی مشرق کی جانب مڑے اور شمالی برآمدہ میں آ گئے۔ اس کا نصف حصہ مدرسہ اور مہمان کے لیے ہے، اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی گنجائش، برآمدہ کے

دوسرے حصہ میں مدرسہ کی اونچی جماعتیں یعنی ہدایہ خواں طلبہ کی درسگاہ، اس کے عقب میں رسالہ النور کا دفتر، حضرت کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم ونگراں مولوی شبیر علی صاحب کا کتب خانہ تجارتی، اس کے بعد آپ جنوب کی جانب ایک بار پھر مڑے اور مشرقی مین کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد، دروازہ پر واپس پہنچ گئے، حجروں کی قطار ادھر بھی موجود اور وضو کے لیے باقاعدہ نالیاں اس مستطیل کے شرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئی۔ لیجیے مکان کی ناپ جوکھ میں ہم آپ کچھ ایسے محو ہوئے کہ مکین ہی کی طرف سے غافل ہو گئے۔

(5)

''مکین کی خیر ہو یارب مکان رہے نہ رہے''

کہنے والا تو بیشک ایسا ہی کہہ گیا ہے لیکن جہاں مکین اور مکان دونوں بابرکت ہوں، دونوں برکت کے مجتسے ہوں، وہاں یہ شاعرانہ نفی واثبات کام نہیں دیتا، وہاں خیر تو دونوں ہی کی مانگنا پڑتی ہے۔ مکان کی یہ مستریوں کی انداز کی پیائش بیکار نہ گئی!

حضرت، ہم تینوں کو لیے ہوئے صحن مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے، سہ دری کے آگے والے سائبان کے نیچے جہاں سنتیں پڑھنے کا معمول تھا، میں اس مصلّٰی سے کوئی دو قدم ہٹ کر، اب اخلاق والتفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہوا، اشفاق والطاف کی تفصیل اب کہاں یاد، اتنا یاد ہے کہ بار بار فرماتے تھے۔ ''اچھی طرح بیٹھیے'' ''کھل کر بیٹھیے'' یہاں ہیبت شروع ہی سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، لطف وکرم کا ہر فقرہ اس کیفیت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جاتا تھا، ازخود بولنے اور کسی بات کے شروع کرنے کی ہمت بھلا کیا ہوتی، غنیمت یہی تھا کہ سوال کا جواب کسی طرح دیے جاتا، ہونٹ خشک، زبان میں کچھ لکنت سی، رعب وہیبت کی اس کیفیت کا تجربہ، اپنی یاد میں دو ہی بار ہوا ہے، ان دو میں پہلی بار تو یہی اور دوبارہ دوسرے سال مجاہد اعظم حضرت شیخ احمد سنوسیؒ کے مواجہہ میں مکہ معظمہ میں، ہیبت حق کا لفظ مثنوی کے اس شعر میں عمر فاروقؓ کی ذات پاک کے سلسلہ میں نظر سے گزر چکا تھا۔

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست — ہیبتِ ایں مرد صاحب دلق نیست

''ہیبت حق'' کے معنی جو کچھ تھوڑے بہت روشن ہوئے وہ ان ہی دونوں موقعوں پر۔

خانقاہ میں طالبین وسالکین کا ایک گروہ ذکر و شغل میں مشغول ہمیشہ موجود رہا کرتا، حکیم الامتؒ کا معمول یہ تھا کہ بعد نماز فجر سب سے پہلے ان ہی کے کام کی طرف متوجہ ہوتے، یہ لوگ اپنے حالات باطنی لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس (صندوق خطوط) میں ڈال دیتے، بعد فجر حضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے کھولتے، ایک ایک پرچہ کو پڑھ کر، ہر ایک کے مناسب حال، اسی پر جواب اور ہدایتیں لکھ کر پرچوں کو مسجد کے منبر پر رکھا دیتے، اس سے فارغ ہو ہوا، کلام مجید کی تلاوت کرتے، اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لیے سیر و ہوا خوری کے لیے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ آج یہ معمول کچھ دیر کے لیے ملتوی رہا۔ حضرت ہم لوگوں کی خاطر میں لگے رہے، چائے منگائی گئی، حالانکہ حضرت خود چائے نہیں پیتے تھے اور مکالمت پر شفقت مکالمت کا سلسلہ کوئی پون گھنٹہ تک جاری رہا، حضرت کے بدنام کرنے والوں نے مشہور کر رکھا ہے (اور اس بدنامی کی ذمہ داری سے خود حضرت کے مریدین اور خلفا بھی بری نہیں) کہ آپ بڑے خشک مزاج اور تند خو تھے۔ اس جھوٹ میں صرف سچ اتنا ہے کہ مریدوں، طالبوں، متوسلوں پر، ان ہی کی فلاح واصلاح کی خاطر آپ قاعدوں کے نفاذ میں، ضابطوں کی پابندی میں یقیناً سخت تھے، لیکن خود ان قاعدوں اور ضابطوں کے بنانے میں ہرگز سخت نہ تھے، بلکہ وہ قاعدے ضابطے تو ہوتے ہی ہر فریق کی راحت وسہولت کے لیے تھے اور عام مہمانوں، دوستوں، ملنے جلنے والوں کے حق میں تو آپ خلق مجسم تھے، خشونت وتنگی کا شائبہ تک نہ تھا، ان کی راحت وسہولت کے ایسی ایسی جزئیات تک کی رعایت رکھتے، جہاں تک خود ان مہمانوں کی نظر بھی نہ پہنچ سکتی، اسی خصلت عام کا ظہور اس وقت ہم لوگوں کے ساتھ ہو رہا تھا، مہمانوں کی خاطر داری اور ضیافت بھی تو اسی طرح ایک عبادت ہے، جس طرح مریدوں، سالکوں کی تربیت، یا قرآن مجید کی تلاوت، روز کا معمول وہ رہتا تھا، آج کا معمول یہ ہو گیا، جنت کی راہ نہ جب چھوٹی نہ اب۔

کچھ دیر بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کے لیے ہم لوگوں سے رخصت چاہی۔ اس التجا اور لجاجت کے لہجہ میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم لوگ بڑے، اب وقت اشراق کا ہو چکا تھا، لیکن قبل اس کے کہ حضرت روانہ ہوں، مولانا دیوبندی نے دیوار کی آڑ میں روک، گفتگو شروع کردی، گویا ہم دونوں نو واردوں سے بطور راز کے، مولانا کا لہجہ تو سرگوشی کا تھا،

البتہ حضرتؒ کی آواز نسبتاً بلند تھی اور میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، حضرتؒ کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا:

''اچھا تو آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں، میں تو خیال کر رہا تھا کہ آپ ہی مناسب ہوں گے، باقی میرا معمول تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، میں بہت سی مصلحتوں کی بنا پر عجلت اس باب میں پسند نہیں کرتا، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو صاحب اس کے خواہشمند ہوں، ان کا اور میرا سابقہ کم از کم چھ ماہ کا رہ لے اور جانبین ایک دوسرے کو خوب جانچ اور پرکھ لیں۔ قیام اگر طویل مدت تک نہ رہ سکے تو کم از کم مراسلت ہی رہے، بغیر طویل سابقہ کے ایک دوسرے کی مناسبت کا علم نہیں ہوسکتا اور اس طریق میں اہم اور مقدم شرط مناسبت ہی ہے، بغیر اس کے محض بزرگی یا حسن اعتقاد بالکل ناکافی ہے، آپ میرا یہی پیغام ان حضرات کو پہنچا دیجیے گا''۔

یہ راز اب کھلا! ہم دونوں نو واردان ہوائے بساط دل ایک دوسرے کا منہ حیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، یہ مولانا دیوبندی، بایں تقدس وتقویٰ سازش بھی کر سکتے ہیں، وہ سازش ''مقدس'' سہی اپنے تواضع وانکسار کی بنا پر سہی۔ اللہ بھلا کرے حضرت تھانویؒ کا انھوں نے بات بالکل صاب دبے لاگ کہہ دی اور دانستہ یا نادانستہ سازش کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا۔

دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوئی اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے، دوپہر کے وقت تک رہی، اس میں حضرت نے خوب کھل کر باتیں کیں، مختلف بزرگوں کے واقعات، عام دینی ہدایات، اخلاقی وروحانی مذاکرات، سب بڑے دلچسپ، دلکش، موثر انداز میں، واعظانہ خشکی کا کہیں نام ونشان نہیں۔ مولانا سے ارشاد ہوا کہ آپ نے میرا پیام ان حضرات تک پہنچا دیا؟ پھر کیا رائے قرار پائی! جواب مولانا کیا دیتے ہیں خود ہی ہمت وجرات کرکے بولا کہ:

''حضرت معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمی ہوگئی، درخواست تو صرف اس قدر تھی اور یہی میں کئی مہینے ہوئے خط کے ذریعہ بھی پیش کر چکا تھا کہ حضرت ہمیں انتخاب مرشد میں اپنے ارشاد ومشورہ سے مستفید فرمائیں، ہم لوگوں کی ناقص نظر میں جو چند بزرگ ہیں ان میں سے نمبر اوّل پر مولانا حسین احمد صاحب ہیں، اب آگے جناب کا جیسا ارشاد ہو، یہی میں نے اس عریضہ میں بھی عرض کیا تھا اور اسی لیے یہ سفر بھی تھا''۔

اب معاملہ بالکل صاف تھا، مقدس سازش اس غیر مقدس زبان کے آگے نہ چل سکی، حضرتؒ نے تبسم کے ساتھ مولانا کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''پھر آپ نے یہ کیا فرمادیا تھا''؟ اور ہم لوگوں سے ارشاد ہوا کہ ''آپ کا انتخاب بالکل صحیح ہے، میں اس سے بالکل اتفاق کرتا ہوں، آپ مولانا ہی کے ہاتھ پر بیعت کیجیے''۔

''لیکن مجھ میں تو اس کی بالکل اہلیت نہیں اور جناب کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف رخ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں''۔

مگر ''مجھ پر تو آپ کو اعتماد ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ میں اہلیت ہے، آپ ہی ان حضرات کو لیجیے''۔

اس سوال و جواب کے بعد مزید مکالمت کی گنجائش ہی اب کہاں تھی۔ یہ نشست حضرتؒ کی خاص سہ دری میں ہوئی، درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل، ڈیسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما، ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے، ڈیسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی دوسری بڑی گھڑی (دھوپ گھڑی کے حساب سے) دیوار میں لگی ہوئی، داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامۂ اوقات لگا ہوا، غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا، بائیں طرف مولانا بٹھائے گئے اور اس کے بعد ہم لوگ۔

بیٹھنے بٹھانے سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے، ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ، ہر بات میں نظم اور آہنگ، یہ تو مجلس خاص اور خصوصی تھی، بعد ظہر مجلس عام میں بھی قاعدہ یہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو وسیع جگہ پڑی ہوئی تھی وہ عام طالبین و واردین کے لیے تھی، ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے، کسی دوسرے کو نہ اٹھائے، نہ کھسکائے، بائیں طرف جگہ نسبتاً تنگ تھی، کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی، ادھر مخصوصین بیٹھائے جاتے تھے، دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے، ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں، بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے۔ باتیں خوب ہوئیں، یاد کر لیجیے کہ 1928 تھا، اور ایک مخاطب روزنامہ ہمدرد کا ڈائرکٹر تھا، صبح اور دوپہر کی ملا کر طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا، گفتگو آئی، حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں، کون کہتا ہے کہ حضرت

''گورنمنٹی'' آدمی ہیں، لاحول ولاقوۃ، جس نے بھی ایسا کہا، جان کر یا بے جانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا، یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی، مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی ''خلافتی'' سے ہرگز کم نہیں، پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں، پہلے پہل اس قسم کی آوازیہیں کان میں پڑی، بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا، لیکن یہ اختلاف تو کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں، نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلوخلاصی (1) اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے، عجب نہیں جو، کچھ آگے ہی ہوں۔

گفتگو کا غالب حصہ، قدرتاً دین وتصوف ہی سے متعلق تھا، بعض بزرگوں کے حالات حضرت نے اپنی زبان سے اس طرح ارشاد فرمائے کہ گویا ''درحدیث دیگراں'' یعنہٖ ہم لوگوں کے خیالات وجذبات کی ترجمانی ہورہی ہے، دل نے کہا کہ ''دیکھو روشن ضمیر ہیں نہ، ساری ہماری مخفیات ان پر آئینہ ہوتی جارہی ہیں، صاحب کشف وکرامت ان سے بڑھ کر کون ہوگا''۔ بعد کو، برسوں بعد کو اور وہ بھی اسی صحبت بابرکت کے فیض سے کھلا کہ مومن کی بصیرت وفراست کے سامنے یہ کشف تکوینی، یہ جوگیوں اور مسمریزم والوں کا کشف بھی بھلا کوئی کرامت ہے! اس علوی کے سامنے، اس سفلی کی حقیقت کیا ہے، اس حقیقت کے آگے، اس ملمع کی ہستی کیا ہے؟ خیر، اس وقت تو بڑا گہرا اثر اسی غیب دانی اور کشف صدر کا لے کر اٹھا، مجلس برخاست ہوئی، کھانا اس کے قبل ہی ہو چکا تھا، ہم لوگوں کی واپسی کا وقت آ گیا، تانگہ آیا اور ہم لوگ خانقاہ سے رخصت ہوئے، حضرت کمال اخلاق سے رخصت کرنے پھاٹک تک تشریف لائے۔ عین رخصتی کے وقت اس نامہ سیاہ نے سب کی آنکھ بچا، مصافحہ کے بہانے سے ایک گزراش کان میں کی اور اسی سیکنڈ منظور بھی ہوگئی۔

''درخواست، حضرت ایک ہی درخواست ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا'' یہ یاد آج اور یہاں تو بہرحال رہی اور وہاں بھی انشاء اللہ ضرور رہے گی، دعاؤں میں یاد کی درخواست اسی عالم کے

---

(1) حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا، حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی، وہ اس کے ''کافرانہ'' ہونے کی بنا پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔

لیے محدود نہ تھی، اللہ کے ولی نے مسجد میں کھڑے ہوکر، اللہ کے فرشتوں کی گواہی میں قبول کی ہے، بے مایہ کو سرمایہ کتنا قیمتی کیسا انمول، بات کی بات میں ہاتھ آ گیا!

(6)

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

مصرع سنا ہوا ہزار مرتبہ کا تھا، ''شنیدہ'' اور ''دیدہ'' کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا، رعب و ہیبت کی کیفیات میں اب خاصا فرق آ گیا تھا اور حاضری کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے کروبیوں میں نہیں، آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے، انسانی دل، بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں، بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَحِيْمٌ کے سچے جانشین، ضرورت کے وقت اور مصلحت کے ماتحت جتنے بھی سخت اور سخت گیر ہو جائیں لیکن اپنی عام طینت و خلقت کے لحاظ سے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کے مصداق ہوشیار سرجن رگوں کو چیرتا ہے، پٹھوں کو پھاڑتا ہے، جسم سے خون نکالتا جاتا ہے، نشتر کو اندر سے اندر گہرائیوں میں اتارتا جاتا ہے، بیدردی سے، شقاوت سے، قساوت سے نہیں، عین مریض کو ہمدردی میں، ہواخواہی میں، دلسوزی میں! حاضری ہوئی تھی عظمت و عقیدت کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ، واپسی ہوئی تو اس ذخیرہ میں ذرہ بھر کمی کے بغیر، محبت کے عنصر کی آمیزش کے ساتھ۔ بَشَرٌ مِثْلُكُمْ میں مِثْلُكُمْ کی صراحت نوید رحمت سے کتنی لبریز اور جلوۂ شفقت کی کیسی آئینہ بردار ہے۔

بہر حال اب مراسلت کی راہ نسبتاً آسان ہوگئی اور جو ہراس اس حاضری کے قبل خط و کتابت کے سلسلہ میں پیدا ہوگیا تھا، چند ہفتوں کے بعد ٹوٹ کر رہا۔

پہلا عریضہ 13 اکتوبر 1928 کو لکھا، سب سے پہلے تو اس کا شکریہ کہ آپ ہی کی توجہ فرمائی سے مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے سلسلہ میں داخل فرمانا قبول فرمایا، اس پر یہ جواب آیا کہ:

''مبارک، لیکن یہ محض آپ کا حسن ظن ہے، آپ کا خلوص خود کافی شفیع تھا، مگر آپ کی برکت سے مجھ کو بھی مفت کا ثواب مل گیا، اب ضرورت اس کی ہے کہ جناب مولانا سے فیوض و برکات حاصل کیے جائیں اور مولانا سے انقیاد و تقلید کا تعلق رکھا جائے کہ اصل تحقیق کی تقلید ہے''۔

اسی عریضہ میں اپنا ایک خواب چند ماہ قبل کا درج کیا کہ ''جیسے بچپن کا زمانہ ہے، پلنگ کے

وسط میں لیٹا ہوا ہوں اور ایک طرف جناب والا لیٹے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مولانا حسین احمد صاحب اور دونوں صاحب صورتاً بالکل میرے والد مرحوم سے مشابہ (جو خود ایک دیندار شخص تھے اور حج کے معا بعد 14 ذی الحجہ 1330 کو وقت صبح صادق مکہ معظمہ میں وفات پائی)۔

اس جز کا جواب:

''تعبیر اب ظاہر ہوگئی، اصل تو مولانا ہی تھے، میں ایسا تھا جیسے حشو الفاظ برائے بیت ہوتے ہیں'' تصوف کی کتابوں کا مطالعہ ان دنوں جاری تھا، ''صلوٰۃ معکوس'' کا لفظ بار بار نظر سے گزرا، اول تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ''الٹی نماز'' آخر عملاً ادا کس طرح ہوتی ہوگی، دوسرے اس کا ثبوت حدیث وسیر کی کتابوں میں کہیں نظر سے نہ گزرا خط میں ایک سوال اس سے متعلق بھی، فوائد الفواد (ملفوظات حضرت محبوب الٰہیؒ مرتبہ امیر حسن علاء سنجری) اور قول الجلیل (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) کے حوالہ سے کر دیا کہ حضرت کی اس بارے میں کیا تحقیق ہے؟ جواب ملا:

''میں ان تحقیقات کی کیا لیاقت رکھتا ہوں مگر بے تکلفی عامل ہوئی کہ اپنی معلومات عرض کردوں۔ اس کو صلوٰۃ مجازاً کہہ دیا جاتا ہے، اصل میں یہ ایک مجاہدہ ہے اور مجاہدہ ایک معالجہ ہے اور معالجہ کے لیے منقول و ماثور ہونا ضروری نہیں، ہاں منہی عنہ نہ ہونا ضروری ہے، سو یہ منہی عنہ نہیں، لیکن اس وقت امزجہ اس کے متحمل نہیں ہوسکتے، لہٰذا مشائخ نے اس کو ترک فرمادیا ہے''۔

''انقیاد و تقلید'' کے متعلق ہدایت اوپر کے والا نامہ میں مل چکی تھی اور نہ ملتی جب بھی اس کی ضرورت اپنی حدود کے اندر بالکل واضح وعیاں تھی، لیکن یہاں ایک عجیب پیچیدگی حائل تھی، مخدوم، خود خادم بنا ہوا تھا اور جن کا منصب آمر ہونے کا تھا وہ فخر و مسرت اپنی ماموریت میں محسوس کر رہا تھا، دیوبند جایئے تو مولانا اسٹیشن پر پیشوائی کو موجود، چلنے لگیے تو اسٹیشن تک مشایعت پر آمادہ، کھانا کھانے بیٹھیے تو وہ لوٹا لیے ہاتھ دھلانے کو کھڑے ہوئے، پانی مانگیے تو گلاس لیے خود حاضر، تانگہ کا کرایہ وہ اپنے پاس سے دے دیں، ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں، ہوٹل میں کھانا کھایئے تو بل وہ خود ادا کر دیں، سفر میں ساتھ ہو تو بستر وہ کھول کر بچھا دیں، غرض یہ کہ مالی اور بدنی، چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی تھیں سب میں مرید تو مراد کے درجہ پر پہنچ گیا اور جو صاحب امر وارشاد تھا وہ چاکری اور حکم برداری میں لگا ہوا! دل نے سمجھایا کہ اس مشکل کا حل بھی ان ہی ''مشکل

کشا'' سے کرائیے، دوسرا عریضہ باریک خط کے پورے دو صفحوں پر لکھا ہوا، ان ہی مشکلات کی تفصیلات سے لبریز، اسی ہفتہ کے اندر روانہ ہو گیا اور ادھر سے جواب بھی بلا تاخیر موصول ہو گیا۔

''آخر میں جواب مشورہ کا معروض ہے اور مشورہ کے قبل اجمالاً اتنا اور معروض ہے کہ مولانا کا یہ طرز ہم لوگوں کو مخالفین و معترضین کے روبرو افتخاراً پیش کر کے موقع احتجاج کرنے کا ہے کہ تم لوگ علما پر عموماً اعتراض کیا کرتے ہو، دیکھو محقق علما کے یہ نمونے ہیں، جواب مشورہ، اس کی تدبیریں دو ہیں، ایک کثرت حاضری، کیونکہ طبعاً کثرت مخالطت سے تکلف کم ہو جاتا ہے، مگر اس تدبیر کا ثمرہ مدت دراز میں ظاہر ہوگا، دوسری چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ مولانا کی خدمت میں بے تکلف یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ صورت حاضری سے مانع ہو جائے گی اور حاضری کی ضرورت قابل انکار نہیں ہے، اس لیے درخواست کو منظور فرمایا جائے، مگر یہ سب جب ہے کہ مولانا کا یہ طرز طبعی نہ ہو ورنہ تبدل مشکل ہے، اس صورت میں تیسری تدبیر یہ ہے کہ آپ ہی اس کو گوارا فرمالیں، آپ کا حرج ہی کیا ہے، کیونکہ مختلف طبائع کے مختلف مقتضیات ہوتے ہیں، چنانچہ اس احقر کا طرز طبعی یہ ہے کہ جس امر میں شبہ بھی ہو کہ دوسرے پر گرانی ہوگی گو وہ خدمت اور تعظیم ہی کیوں نہ ہو، اس امر کو اختیار نہیں کرتا، جناب نے مشاہدہ فرمایا ہوگا کہ کوئی امر جو کسی کی آزادی میں مخل ہو نہیں کیا''۔

ان ہدایتوں پر عمل کہاں تک ہوا اور پھر نتائج کہاں تک کامیاب رہے؟ اس قسم کے سوالات دل میں جتنے پیدا ہوں، ان کے جوابات کا انتظار ان اوراق میں نہ فرمائیے۔ ''نقوش و تاثرات'' کا تعلق، صرف حکیم الامتؒ کے واقعات زندگی سے ہے، دوسرے سوالات کیسے ہی دلچسپ ہوں اور دلچسپ ہی نہیں بجائے خود ضرور سہی، لیکن بہر حال اس موضوع سے بے تعلق ہیں۔

یہ نقوش و تاثرات جن پر آج 15-16 سال کے بعد بھی کہنگی طاری نہیں ہوئی، تو عین اس وقت تو ظاہر ہے کہ بالکل تر و تازہ تھے، تھانہ بھون سے واپسی کے بعد ہی، دوست احباب کے سوالات کا تانتا لگ گیا، کیا دیکھا، کیسا پایا؟ کیا دیکھ کر آئے؟ کیا لے کر آئے؟ یہاں جوابات میں کسی بخل، کسی تکلف، کسی اخفا کی کیا ضرورت تھی، آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا، دل نے جو کچھ پایا تھا، سب الٹا سیدھا، کچا پکا اگل دیا، مولانا کے فضائل و کمالات کی تھاہ اتنے عرصہ کے بعد اب مل پائی ہے تو اس وقت کیا مل سکتی تھی، بڑی کرامت، سمجھ کر اپنا تجربہ و مشاہدہ یہ بیان کر رہا تھا کہ ''وہ تو

صاحب کشف ہیں، دوران گفتگو گویا دل کے بھید پڑھ لیے اوران باتوں کا جواب دے دیا جوزبان پر آنے بھی نہیں پائی تھیں‘‘۔ آج بحمد اللہ مولانا ہی کی برکت اور صحبت سے یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ ایمان کی پختگی اور تقویٰ پر استقامت کے سامنے، کشف تکوینی یا اشراقیت کی حقیقت ہی کیا ہے، لیکن اس وقت اپنے خیال میں گویا یہی عین درویشی بلکہ معراج درویشی تھی۔

غلطیہائے مضامین مت پوچھ!

شدہ شدہ یہ خبر حضرت کو بھی ہو گئی۔ لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے والوں اور روایت پہنچانے والوں کی کوئی کمی نہ تھی اور شفقت اس طرف لائی کہ اپنے ایک خادم کو اس جہل سے نکالا جائے۔ کسی نے مضمون کو چھیڑنے کی عادت، مکتوبات گرامی میں عام طور سے نہ تھی، لیکن یہ صورت خاص تھی، جس مکتوب کا طویل اقتباس اوپر درج ہو چکا ہے، اسی میں ارشاد ہوا ہے:

’’میں نے دو واسطے کی سند سے سنا کہ جناب کو مجھ پر صاحب کشف ہونے کا گمان ہے، سو اس کی نسبت عرض ہے کہ میں ایسا بے تکلف ہوں کہ اگر بات صحیح ہوتی تو فوراً اس کا اقرار، بلکہ دعویٰ کرنے میں بھی تکلف نہ کرتا، اب بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں حلف کے لیے آمادہ ہوں، میرے پاس تو بڑا ذخیرہ اہل دل کی محبت کا ہے، اور دونوں طرف سے۔

جہل اور عقیدت میں غلو بھی کیا چیز ہوتی ہے، ذہن اس انکار صریح سے بھی متاثر نہیں ہوا، دل میں تو وہی جما ہوا تھا کہ کشف مرتبہ انتہائی عظمت کا ہے، اس لیے اس مقام سے انکار اور تبری حقیقت پر نہیں، صرف تواضع وانکساری پر محمول کی جا سکتی ہے! یہاں تک کہ حضرت کی صریح آمادگی حلف پر بھی نظر نہ گئی، بلکہ اور تو اور، خود اس اطلاع وخبر کو بجائے درمیانی واسطوں اور راویوں کی روایتوں کے حضرت کے کشف ہی پر محمول کیا! ’’دل کس قدر روشن ہے، اپنی روشن ضمیری سے میرے اس عقیدہ کو سیکڑوں میل کے فاصلہ سے دل کے اندر بھانپ لیا‘‘! انسان کا نفس جب تاویل کرنے پر تل جائے تو کوئی دلیل نقلی یا عقلی، آج تک اسے مطمئن کر سکی ہے؟

بے تمیزی کے ساتھ اسی ہفتہ ایک طویل خط میں حضرت کی اس تبری کی پوری تردید لکھ ماری، خلاصہ یہ کہ ’’میں نے جو رائے قائم کی تھی وہ کسی دعویٰ اور بیان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے تجربہ اور

وجدان کی بنا پر اور اس میں ضعف وتزلزل جبھی پیدا ہوسکتا ہے جب اپنے تجربہ وجدان کی غلطی ظاہر ہو جائے، کسی متقی نے آج تک کبھی اپنی زبان سے اپنے کو متقی کہا ہے اور اپنے تقویٰ کے باب میں تو ضعیف ترین شہادت اس متقی ہی کی رہے گی اور پھر یہ مسئلہ تو میں نے جناب کی خدمت میں تصویب یا تغلیط کے لیے پیش بھی نہیں کیا تھا، میں بالفرض غلطی پر بھی ہوں تو جناب تصحیح کی زحمت اپنے سر کیوں لیں''؟

(7)

جہل ونادانی کا دور بھی اللہ کی بڑی رحمت ہے، اپنے محل پر اور بعض حالات میں، چھوٹے بچے نادانی کی عمر میں کیسی کیسی گستاخیاں اپنے بڑوں سے کرتے رہتے ہیں اور معاف ہوتے رہتے ہیں۔ حشر میں کتنوں کی شفیع ان کی نادانی ہی بن جائے گی۔ اسی نادانی نے ایسے خط کی جسارت پیدا کردی تھی۔

خط کا آغاز اس مضمون سے تھا، خاتمہ اس سوال پر تھا کہ طویل طویل ڈھیلی ڈھالی عبارت میں کہ سلسلۂ چشتیہ کے دو ہمعصر اکابر نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور علاء الدین صابر کلیریؒ میں باہم نسبت تفاضل کیا ہے؟ اپنے کو کشش تو حضرت دہلوی کی جانب ہوتی ہے، حالانکہ فضائل حضرت صابر کے بھی بہت سے سننے میں آئے ہیں، سوال ایک خواب کی لپیٹ میں تھا، خط کے اوّل وآخر، دو مضمون یہ ہوگئے، درمیان کا مضمون باقی رہ گیا۔

عقیدت میں اب ایک صاحبہ بھی شریک ہوگئی تھیں، ''صاحبہ'' محض اردو محاورہ میں نہیں، اصطلاح قرآن میں بھی، عمر بھر کی رفیق، ازدواجی زندگی کی شریک، 12 سال کی مشترک زندگی کا ثمرہ، دو لڑکیاں تھیں، کئی اولادیں ''ذخر'' اور ''فرط'' اور شافع مشفع'' بن کر وطن اصلی کو روانہ ہو چکی تھیں، سب سے آخری بچہ کا داغ بالکل تازہ تھا، ماں بلبلا اٹھی کہ اتنا شدید صدمہ برداشت کس طرح ہوگا اور کہیں طبعی محبت ایمانی علاقوں پر غالب نہ آجائے، مائیں اولاد کے حق میں بیتاب اور بیقرار سب ہی رہتی ہیں، بعضوں کے ہاں یہ تعلق اور بھی قوی تر وشدید تر ہوتا ہے، یہاں یہی کیفیت تھی اور خیال قدرتاً گزرا کہ کہیں یہ وفور تعلق معصیت نہ سہی، مقدمۂ معصیت نہ بن جائے، خط کا درمیانی یا تیسرا مضمون یہی تھا، سوال اپنی طرف سے نہیں، ان ہی صاحبہ کی طرف سے تھا اور

درخواست دعا اور تدبیر دونوں کے لیے تھی۔ مولانا اب ''ڈراؤنے'' نہیں رہے تھے، ہیبت ایک خاصی حد تک انس میں بدل چکی تھی، دیہاتی زبان میں ''ہیاؤ'' کھل چکا تھا، کم از کم تحریر کی حدود تک اور مرشد سے سوالات صرف اوراد و وظائف، اشغال واذکار ہی کے نہیں خانگی زندگی کی جزئیات سے متعلق بھی، آزادی اور بے تکلفی سے ہو چلے تھے۔

عریضہ 28 اکتوبر 1928 کو روانہ ہوا تھا، جواب 30 اکتوبر کو ڈاک میں پڑ گیا، مدلل، مکمل، مفصل، مدلل و مکمل تو معمول کے موافق اور مفصل معمول سے زائد، حضرت کی ڈاک میں خطوط کی تعداد اوا کائیوں میں نہیں درجنوں میں روز ہوتی تھی، پھر نہ کوئی محرر نہ منشی، نہ نظام اوقات میں اس مد کے لیے کسی علاحدہ مخصوص وقت کی گنجائش۔ دوپہر کو ڈاک آئی، بعد ظہر حضرت مجلس عام میں بیٹھے ہوئے ہیں، اچھا خاصا مجمع لگا ہوا ہے، مریدین و مسترشدین کے علاوہ بے تکلف احباب کی بھی ایک تعداد خاص، باتیں ہر قسم کی ہو رہی ہیں، سوالات جوابات کا سلسلہ قائم، تعویذ مانگنے والوں کو نقش، گنڈے، تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں کہ اسی عالم میں وہ ڈاک کا انبار بھی کھلتا ہے، ایک ایک خط خود پڑھتے ہیں، خود ہی جواب لکھتے ہیں، خود ہی لفافہ بند کرتے ہیں، کوئی کہے یا نہ کہے میں تو اسے ایک قسم کی کرامت ہی کہوں گا، کرامت حاضر دماغی کی، جواب کافی و شافی، جامع و مانع تو ہمیشہ ہوتے ہیں، البتہ مفصل ذرا کم ہی ہو سکتے ہیں، اس عریضہ کا جواب خلاف معمول مفصل بلکہ مطول، جواب ابھی آگے آ رہا ہے، اقتباس و انتخاب نہیں، اصل جواب من و عن اوّل سے آخر تک:

''مشفقی مکرم دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ معلوم نہیں کیوں آپ کئی روز سے یاد آ رہے تھے اور زیادہ یاد آ رہے تھے، حتیٰ کہ جب ضبط نہ ہوتا تھا تو زبان سے بھی دوسروں کے سامنے تذکرہ کرنے لگتا تھا اور عجب بات یہ ہے کہ وہ سب میرے ساتھ دل سے موافقت کرتے تھے اور دلچسپی لیتے تھے، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا سبب آپ کا یاد فرمانا ہے جس کی علامت خط کا آنا ثابت ہوا، خط سے بہت مسرت ہوئی اور بے اختیار یہ واقعہ بھی قلم پر آ گیا اور آنے کے بعد ہی یہ کھٹک ہوئی کہ کہیں زبردستی اس کو بھی کشف کی ایک دلیل نہ بنا لیا جائے جس کے اثبات و نفی میں میرا اور آپ کا اختلاف ہو رہا ہے، مگر اب میں اپنے دعوائے نفی پر اس لیے زور نہیں دیتا کہ میں نفی کر کے اپنے

فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں، اب دعوائے اثبات میں میرا کوئی ضرر نہیں، اگر خلاف واقعہ اعتقاد رکھنے کا کوئی ضرر ہو تو اعتقاد رکھنے والے اس کے ذمہ دار ہیں۔ میرا تو فائدہ ہی ہے ایک صاحب دل کی محبت کے برکات مجھ کو حاصل ہو رہے ہیں، اگر کوئی تاجر اپنے متاع کا عیب بتلا دے اور مشتری اس عیب کی نفی کر کے اس کو خرید لے تو بائع معصیت سے بچ گیا اور اس کو کھرے دام مل گئے، یہی حالت بعینہ اس اختلاف کی بھی ہے، مجھ کو طبعاً مناظرہ سے، خصوص دوستوں کے ساتھ مناظرہ سے ابا رہا ہے ورنہ میں تقویٰ پر قیاس کا جواب عرض کر سکتا تھا کہ تقویٰ تو ایک کمال ہے، اس کا دعویٰ خود ایک نقص ہے، اس لیے وہ دعویٰ مسموع نہیں ہو سکتا، بخلاف کشف کے کہ وہ کوئی کمال نہیں، اس کا دعویٰ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرے سر پر بال نہیں تو اس نفی کو تواضع پر محمول نہ کریں گے اور اس کی نفی کو قبول کر لیں گے، یہ کشف ہے حقیقت کا لیکن اس کی تسلیم پر آپ مجبور نہیں۔ بس یہ قصہ تو ختم ہوا اور مجھ کو اپنے حلفی دعویٰ پر پھر بھی اور آپ کو اپنے خیال پر قائم رہنے کا حق حاصل ہے''۔

یہ ایک ٹکڑا مکتوب اشرف کا ہوا، ابھی دو ٹکڑے اور باقی ہیں اور آپ کی نظر سے گزریں گے۔ ابھی اور فی الفور نہ سہی کچھ تھوڑے سے انتظار، اشتیاق بڑھانے والے انتظار کے بعد سہی، لیکن ان تک پہنچنے سے قبل، ذرا اسی جز پر مکرر نظر کر لیجیے، گھاٹے میں نہیں، نفع ہی میں رہیے گا، غور کرنے سے لذت وحلاوت کم نہیں ہوگی، بڑھ ہی جائے گی۔

کیسے ظالم اور بیدرد تھے وہ جنھوں نے مولانا کو خشک اور عبوس مشہور کر رکھا تھا اور کیسے بدنصیب تھے وہ جنھوں نے خشونت کی روایتیں اور حکایتیں سن سن کر اپنے کو اس آیۂ رحمت تک پہنچانے سے محروم رکھا، دنیا میں افسانہ کیسا پھیلتا اور کیسا پھولتا ہے۔

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

(8)

یہ مکتوب گرامی کا ادھورا رہنا تو کھل گیا، طبیعتیں جھنجھلائیں، بھنائیں، دست بستہ معافیوں اور معذرتوں کے ساتھ اب دوسرا جز معاً اور بلا توقف حاضر خدمت ہے:

''گھر میں کی کیفیت قلبی تعلق بالاولاد کی معلوم ہو کر سچے دل سے اور بصیرت سے ان کو

مومن کامل ہونے کی بشارت دینے کو جی چاہتا ہے، اوّل تو اولاد کی محبت موافق سنت کے سبب موجب اجر ہے رہا درجہ افراط کا، وہ بھی خلاف سنت جب ہے کہ اس کے کسی مقتضائے غیر مشروع پر اختیار سے عمل ہونے لگے اور اگر کوئی مقتضا مشروع ہو یا غیر مشروع ہی ہو مگر اس کا بلا اختیار صدور ہو جائے تو بالکل قابل ملامت نہیں اور اس اقتضائے غیر مشروع کو اگر روک لیا تو مجاہدہ کا اجر عظیم مزید براں اور اتصاف بالسنّت اور مجاہدہ دونوں کا علامات ایمان کامل سے ہونا ظاہر ہے۔

اور اگر نفس محبت کے مسنون ہونے کی تحقیق ان کے جی کو نہ لگے تو کم از کم اتنا تو مان لینا ضروری ہوگا کہ ایسی محبت، بلکہ اگر اس سے بھی زائد ہوتی تو مذموم نہیں، یعنی شریعت مطہرہ نے اس پر کوئی عتاب نہیں فرمایا اور ہم محتاجان نجات کے لیے یہی کافی ہے کہ عقاب وعتاب سے بچ جائیں گو درجات نصیب نہ ہوں اور اس دعویٰ کی توضیح یہ ہے کہ شریعت میں مواخذہ امور اختیاریہ پر ہے، چنانچہ نص قطعی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اس پر شاہد بین ہے اور یہ اختیاری نہیں اس لیے قابل مواخذہ نہیں، البتہ طبعی کلفت اور نفسانی تالم اس میں ضرور ہے، تو اوّل تو شریعت نے ایسی کلفتوں کی ذمہ داری نہیں فرمائی، لیکن کس قدر رحمت ہے کہ باوجود ذمہ داری نہ کرنے کے پھر بھی تبرعاً اس کی بھی تدبیر بتلا دی وہ یہ کہ حق تعالیٰ سے تعلق قوی کیا جائے، اس سے سب تعلقات ضعیف ہو جائیں گے اور کلفت کا احتمال ہی نہ رہے گا یعنی کلفت مودیہ نہ رہے گی گو ضعیف درجہ میں رہے، جو مضر نہیں اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھانے کے طریق مشہور و معلوم ہیں، یہ سب ان کو سمجھا دیجیے، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ خود اس مضمون کو سمجھتے ہی محبت میں اعتدال پیدا ہو جائے گا اور اگر تقویت تعلق مع الحق کی تدبیر میں لگ گئیں تو بالکل ہی غبار ہٹ جائے گا''۔

یہ ایک نجی مکتوب تھا یا ایک مستقل درس معرفت وتصوف؟ کتنی باتیں کام کی اور کتنی گہری حقیقتیں مکتوب کے ان دونوں اجزا کے اندر آ گئیں، آج یہ صداقتیں بالکل مسلم نظر آ رہی ہیں، ان پر ایمان ہے، اُس وقت آج سے سولہ سال قبل بالکل نئی اور انوکھی باتیں تھیں، کان پہلی بار ان اصول حقائق سے آشنا ہو رہے تھے، خوش نصیب تھا وہ مکتوب الیہ جو ان حقائق سے نوازا گیا، بدنصیب تھا وہ مخاطب جسے اس وقت ان علوم کی قدر تو کیا ہوتی، اپنے جہل ونادانی سے معمولی شکریہ ادا کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ علوم کی دولت جو گھر بیٹھے اور آسانی سے مل جاتی ہے اس کی قدر

دنیا میں کب اور کس کو ہوئی ہے!

مکتوب مبارک کے دو جز، دو سوالوں کے یہ مستقل جوابات درج ہو چکے، اب تیسرا جز حاضر ہے، عریضہ کے تیسرے سوال کے جواب میں اصل سوالات اگر پیش نظر نہ ہوں تو ٹھنڈا پانی بغیر پیاس کے، لذیذ کھانا بغیر بھوک کے رہے گا، اس لیے ورق الٹ کر نمبر 7 کا پہلا پیراگراف پھر پڑھ لیجیے۔ اور اس کا یہ فقرہ بھی رہ نہ جانے پائے کہ ''سوال ایک خواب کی لپیٹ میں تھا''۔

''خواب نہایت مبارک ہے اور اثر ہے باہمی مناسبت کا اور بدرجۂ رجا موثر ہے زیادت مناسبت میں، باقی تحقیق سوال کے دوسرے پرچہ پر معروض ہے، والسلام، اشرف علی، از تھانہ بھون 17 ج 47 ہجری، خط کا کاغذ دونوں طرف بھر چکا تھا، اس لیے ضرورت دوسرے پرچہ کی پیش آئی، نقل مطابق اصل اس کی بھی ملاحظہ ہو:

''(بقیہ مضمون خط) اصل یہ ہے کہ ہر گل را رنگ و بوئے دیگر ست اور ہر گل اپنی جگہ محبوب ہے اور اس کی خوشبو بھی اپنی جگہ مرغوب۔

بہ گوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست　　　　بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالان ست

حضرت مخدوم صاحبؒ پر سکر غالب تھا اور ان کے لیے یہی مناسب تھا اور سکر کے یہی آثار ہیں جو ان کے نقد وقت تھے، اور حضرت سلطان الاولیاءؒ پر صحو غالب تھا اور ان کے لیے یہی مناسب تھا اور صحو کے لیے یہی آثار ہیں جو ان کے نصیب حال تھے، اب رہ گیا مسئلہ تفاضل کا، سو جب حدیث میں ہے، لاتفاضلوا بین انبیاء اللہ، اسی طرح اس حدیث کی ایک فرع ہے لاتفاضلوا بین اولیاء اللہ مگر فرق اتنا ہے کہ انبیا میں تو دلائل وحی کی بنا پر تفاضل کی اجازت ہے، رائے سے تفاضل ناجائز ہے اور اولیا میں جب ہوگا رائے سے ہوگا، اس لیے علی الاطلاق ناجائز ہے اور یہ سب تحقیق متعلق اعتقاد اختیاری کے ہے، باقی محبت وہ غیر اختیاری ہے، وہ اگر فرضاً مفضول کے ساتھ زیادہ ہو، افضل کے ساتھ کم ہو تب بھی جائز ہے''۔

سن کے اضافہ کے ساتھ سنہ وسال کے انقلابات کے ساتھ دل و دماغ پر کیسے کیسے دور گزرتے رہتے ہیں اور جگ بیتی تو جگ پر چھوڑیے، کم از کم آپ بیتی تو یہی ہے، ایک سن الحاد، عقلیت، لامذہبیت کے زور کا تھا، پھر تصوف نے مذہب کی راہ دکھائی، بات کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہ

آئی، ٹھنڈی، سبک، خوشگوار، جان بخش ہوا، اپنے ساتھ کچھ خس وخاشاک، کوڑا کرکٹ بھی لگالائی، تصوف آیا تو بدعات تصوف لیے ہوئے، نورد ھویں کے پھندے میں! لطیف، کثیف کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے۔ ''عقلیت'' گئی تو خوش عقیدگی آئی، دل دین سے زیادہ بزرگان دین' اسے اٹکا ہوا اور اہل حال کے ذوق ووجدان کی اہمیت دماغ پر، دین کے حقائق اور اصول سے کچھ زیادہ ہی بیٹھی ہوئی۔ زندگی کے عین اسی دور میں توفیق الٰہی نے رسائی آستانہ اشرفی پر کرادی قدرتاً سوال وجواب زیادہ تر ان ہی مباحث پر رہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی تاریکیاں اسی واسطہ سے دور ہوئیں اور کتنی الجھنیں اسی ذریعہ سے سلجھیں۔ دریا آباد سے سہارنپور کا سفر کچھ ایسا آسان اور مختصر نہیں، ایکسپریس سے بھی 12۔14 گھنٹے لگ جاتے تھے اور کرایہ بھی اسی مناسبت سے ساڑھے تین سو میل کی مسافت کچھ تھوڑی ہوتی ہے؟ اور پھر تھانہ بھون تو سہارنپور سے بھی کوئی 30-35 میل اور آگے اور اتنا راستہ بڑی لائن سے نہیں، چھوٹی سے بھی چھوٹی لائن (لائٹ ریلوے) سے طے کرنا، جولائی کے اس پہلے سفر کے بعد دوبارہ جلد ہمت مشکل ہی سے ہو رہی تھی، حالانکہ شوق روز افزوں تھا اور جی میں یہ تھا کہ اب کی سفر تنہا نہ ہو، بلکہ جو رفیق زندگی ہے وہ رفیق سفر بھی ہو، تائید غیبی دیکھیے کہ عین اسی وقت بھائی صاحب کا تبادلہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر یوپی کے مشرقی ضلعوں سے یک بیک سہارنپور کا ہوگیا اور اس نے سفر اور قیام کے مرحلہ کو کچھ نہ کچھ آسان تو ضرور ہی بنادیا۔ پست ہمتوں کی دستگیریاں کن کن حکمتوں اور لطیف تدبیروں سے کی جاتی ہیں اور بزدلوں کی ہمت افزائیاں کس کس لطف ومرحمت سے ہوتی رہتی ہیں!

نومبر کا مہینہ تھا، چند ہفتے بعد سفر کی ٹھن گئی، 14 نومبر کے عریضہ میں چند باتیں عرض کیں، حسب معمول طوالت بیانی کے ساتھ، پہلی تو یہ کہ پچھلا افتخار نامہ پاکر دل آب آب ہوگیا، دوسرے جوار کے ایک اسم بامسمّیٰ بزرگ مولانا عابد حسین فتح پوری مرحوم کی عنایتوں اور شفقتوں کا ذکر، تیسرے یہ ڈر کہ کہیں اہل اللہ کی یہ خواہ مخواہ کی شفقت وتوجہ اپنی ناقدر شناسی کی بنا پر وجہ عتاب نہ بن جائے، چوتھے مزار حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ پر حاضری کے سلسلہ میں خود ان کے مزار اور پھر امیر خسروؒ سے تاثر خاص، پانچویں اس تاثر خاص کے موقع پر مفاد ملت وفلاح امت کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ چند مخصوص اشخاص کے لیے بھی دعائیں بشمول حضرت مولانا چھٹے مخدوم صابر کلیریؒ

کے مزار پر حاضری کے وقت اس تاثر میں بہت کمی، شاید اس لیے کہ عین اس وقت بعض شریعت شکن حرکتوں پر نظر پڑ گئی تھی، ساتویں چند روز بعد میاں بیوی دونوں کا قصد تھانہ بھون اور قیام کے لیے مولانا کے حفظ اوقات کے خیال سے ان ہی کے ایک عزیز کا انتخاب جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے اور ایک مکان ان کا تھانہ بھون میں بھی تھا، جواب ہر بات کا نمبر وار پڑھیے کہ اسی لیے تو اپنی ہر بات کو یہاں گن گن کر لکھا ہے:

"محبی ومحبوبی دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل جمعہ کے سبب جواب کا وقت نہ ملا، معاف فرمائیے گا۔

1۔ یہ سب آپ کی محبت ہے، جس کی میرے دل میں خاص قدر ہے اور آپ سے خاص محبت ہے، ایک تو آپ کی محبت کے سبب، دوسرے آپ کی بے تکلفی، انکسار و توافق ظاہر و باطن کے سبب، میں اس مذاق کو ڈھونڈتا ہوں اور کم ملتا ہے، آپ میں پایا اور محبت ہوگئی، آپ پر کوئی احسان نہیں۔

2۔ میں نے گو ان کی زیارت نہیں کی، مگر میں ان کو اپنے زمانہ قیام کانپور سے جانتا ہوں۔

3۔ ایسا خوف تو لوازم ایمان سے ہے اور ماشاء اللہ آپ نفع بھی اٹھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ترقی فرمادے اور جب آپ کا یہ خیال ہے انشاء اللہ تعالیٰ عمل میں بھی ترقی ہوگی۔

4۔ (الف) مناسبت کا بھی اثر ہے اور خیال کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر ایسا خیال بھی مطلوب ہے۔

(ب) میرے خیال میں یہ بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کا اثر ہے کہ امیر خسروؒ ان کے محبوب اور محبّ تھے۔

5۔ ادائے حق محبت عنایت ست ز دوست
ورگرنہ عاشقِ مسکین بہ ہیچ خرسند است

6۔ توبہ توبہ۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اصلاح فرمائے، یہ بھی سبب محتمل ہے اور فطری مناسبت سے بھی کمی وبیشی ہوتی ہے۔

7۔ (الف) دوہری مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ بخیر لائے۔

(ب) اگر آپ میں صرف محبت ہی کی صفت ہوتی تو میں بھی اس تجویز سے موافقت کرتا، لیکن جب خدا تعالیٰ نے دوسری صفت بھی عطا کی ہے یعنی بے تکلفی تو اب یہ توافق سے مانع ہے، آپ ایسا پوچھتے ہیں، میں تصریح کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کی رفیق زندگی آئیں اور میرے اور میری اہل خانہ کے مہمان بنیں، ان کو ان سے ملنے کا اشتیاق ہے، باقی اوقات کا قصہ تو میرے بزرگوں کی تعلیم ہے کہ بعد مشغولی فرائض کے سب سے اچھا وہ وقت ہے جو احباب کے پاس گزرے اور فرائض میں میں اور آپ دونوں شریک ہوں گے، پھر حرج اوقات کیسا اور ڈپٹی صاحب خود ہی مہمان ہوں گے ان کو میزبان کون ہونے دے گا۔

ع۔ بیا بیا د فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

دوسرے مصرع کا شاید غایت تواضع سے آپ تحمل نہ کر سکتے۔ والسلام۔ اشرف علیؒ"

(9)

دن اور تاریخ تو بھلا اب کہاں یاد، آخر نومبر یا شروع دسمبر تھا، سنہ وہی 1928 عیسوی کہ ہم میاں اور بیوی مع ایک خادم نما رفیق کے، تین آدمیوں کا مختصر سا قافلہ بنائے ہوئے دن میں کوئی 10 بجے کے قریب، تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اترے، اسٹیشن اب کی تھانہ بھون نہیں، تھانہ بھون ٹاؤن تھا، اسٹیشن نہیں، اسٹیشن کا دھوکا! نہ پلیٹ فارم اونچا یا نیچا کسی قسم کا نہ بڑی چھوٹی، پکی کچی کسی قسم کی عمارت یا سائبان، ایک چٹیل میدان، گاڑی چلتے چلتے بس وہاں دم کے دم رک جاتی، اسے دھوکا نہیں تو آخر حقیقت کیسے کہیے، بات ذرا قصہ طلب آ گئی، سمجھ لیجیے تو آگے بڑھیے، تھانہ بھون سے جو ریل (لائٹ ریلوے) گزری ہے اپنی چال ڈھال میں اپنی مثال آپ! ع

اے ہم نفس نزاکتِ رفتار دیکھنا

لیکن بہر حال جیسی کچھ ہے ریل تو ہے، مولانا کی بڑی تمنا ایک زمانہ میں تھی کہ ریل ان کے قصبہ سے گزرے، تمنا پوری ہوئی اور ریل جاری ہوئی، لیکن تھانہ بھون کے نام سے جو اسٹیشن تھا وہ اصل قصبہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس سے کوئی دو میل ادھر ہی، حالانکہ لائن جو گزری وہ مولانا کی خانقاہ اور مسجد سے کل دو فرلانگ پر! عجب پر حسرت منظر تھا کہ دہلی کی طرف سے آنے والے پاس سے گزرتے چلے جاتے اور اترتے کہیں دو میل دور جانے کے بعد اور وہاں سے جنگل طے کرتے

ہوئے خراب وخستہ آستانِ اشرفی پر حاضر ہو پاتے، اسی طرح سہارنپور کی طرف سے آنے والوں کو دو میل قبل ہی اتر پڑنا پڑتا!

مولانا کو بڑی فکر اب اس کی ہوئی کہ اسٹیشن کاش قریب بنتا، یعنی اسٹیشن تو تھانہ بھون کے نام کا تھا، لیکن تکلیف پھر بھی قائم رہی۔ چاند ہوگیا اور عید ہے کہ پھر بھی فوراً نہ آئی۔ دعا اور کوشش دونوں اس پر صرف ہونے لگیں کہ دوسرا اسٹیشن، چھوٹے سا چھوٹا سہی، خانقاہ کے محاذ میں بن جائے۔ دعا قبول ہوئی اور کیوں نہ قبول ہوتی، اللہ نے وہی چاہا جو اس کے ایک مقبول بندہ نے چاہا تھا۔

تو چنین خواہی خدا، خواہد چنین ۔۔۔ می دہد یزدان مرادِ متقین

یا یوں کہہ لیجیے کہ مقبول اور اطاعت شعار بندہ بھی وہی چاہنے لگتا ہے جو اس کے مالک و مولا کا چاہا ہوا ہوتا ہے، بہرحال قبولیت دعا کا پہلا ثمرہ یہ ہوا، گاڑی اسی مقام پر رکنے لگی اور اسی کا نام عارضی اسٹیشن پڑ گیا۔ حضرت کو اس میں اس درجہ دلچسپی تھی کہ اس عارضی اسٹیشن کو مستقل کرنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں ان میں برابر عملی حصہ لیا، خود دعا کی، خانقاہ کے ذاکرین وشاغلین سے باضابطہ دعائیں کرائیں اور ٹریفک منیجر کے نام خطوط بھیجنے کی جو تحریک خانقاہ ہی سے جاری ہوئی، اس پر اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے۔

دنیا والوں کی راحت رسانی کی کوشش کرنا، دینداری کے منافی نہیں یہ تو عین دین ہے، لیکن دنیا ہے کہ درویشی وطریقت کو ''جوگ'' یا زیادہ سے زیادہ استغراق کے مرادف سمجھنے پر مصر ہے!

18 نومبر 1928 کو یہ عارضی اسٹیشن کھلا ایک گنہگار نے مولانا کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا نام ''تھانہ بھون شریف'' تجویز کیا تھا، لیکن حضرت نے تبسم کے ساتھ اس سے اختلاف کیا اور ''تھانہ بھون ٹاؤن'' سے اتفاق کیا اور چند ہی روز گزرے تھے کہ میاں بیوی کا یہ قافلہ اسی اسٹیشن پر وارد ہوا۔ کم ہمتوں کی ہمتیں کیسی کیسی بندھائی جاتی ہیں اور آرام طلبوں کے لیے راحت کے کیسے کیسے سامان غیب سے بہم پہنچا دیے جاتے ہیں۔ سواری کا انتظام ایک خادم خاص کی نگرانی میں، مولانا کی طرف سے اسٹیشن پر موجود، کہ آنے والے مسافر کو زحمت کسی قسم کی بھی نہ ہونے پائے، لیکن وہ مسافر کم نصیب اپنے ضعف قلب وضعف ہمت کو کیا کرے، راستہ بھر دھڑکا یہی لگا رہا کہ دیکھیے

اب کی کیا صورت پیش آتی ہے، آنا گو ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا، لیکن اس وقت مولانا حسین احمد صاحب کی معیت میں تھا اور صرف چند گھنٹوں کے لیے تھا اب کی ساری ذمہ داری اپنے ہی اوپر تھی، ذمہ داری اپنی ہی نہیں، ساتھ والی صاحبہ کی بھی اور پھر قیام کی مدت بھی اب کی بجائے چند گھنٹوں کے دو چار دن کی تھی، یا اللہ یہ دن خیریت سے کٹ جائیں، ایسا نہ ہو کہ اپنی کسی بے تمیزی سے حضرت کو ناراض کر دیا جائے، دعائیں کیں بھی خوب اور پڑھیں بھی خوب راستہ دعائیں کرنے اور پڑھنے میں کٹ گیا، ریل سے قدم جب اترے ہیں تو کچھ عجب نہیں کہ جاڑے کے موسم کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی رہے ہوں۔

زنانہ کو حضرت کے زنانہ مکان سے بالکل متصل ایک مختصر سے علاحدہ گھر میں اتارا، حاضری مولانا کی خدمت میں دی، نشست حسب معمول خانقاہ کی سہ دری میں تھی (کسی پچھلے نمبر میں دیا ہوا جغرافیہ ایسے ہی موقعوں پر کام آنے کا ہے) معمول مزاج پرسی کے بعد پہلا سوال یہ ہوا کہ قیام کا طریقہ کیا رہے گا؟ آپ یہاں مردانہ مہمان خانہ میں رہیں گے اور آپ کے گھر میں اسی الگ مکان میں یا دونوں یکجا؟ سوال ظاہر ہے کہ بالکل صاف اور مناسب تھا لیکن جواب دینے میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ پتھر کو پہاڑ پر چڑھانا ہے، لڑکپن کا وہ سماں یاد آ گیا، جب اسکول کے نیچے درجوں میں ''انسپکٹر صاحب'' معائنہ کے لیے آتے تھے اور لڑکے تو لڑکے ماسٹر بلکہ ہیڈ ماسٹر تک تھرائے ہوتے تھے، کس مشکل سے سارے کھوئے ہوئے حواس جمع کر کے عرض کیا کہ ''جیسا ارشاد عالی ہو''۔ جواب معاً لیکن خشونت کے ساتھ نہیں یکسر لطف وشفقت کے ساتھ ملا کہ ارشاد یہی ہے کہ ''آپ اپنی زبان سے ارشاد فرمائیں''۔ لیجیے امیدوں کا آخری قلعہ بھی مسمار ہو گیا، یا اللہ! اب کیا جواب دیا جائے۔ آپ ان سطور کو پڑھتے جاتے ہیں اور زیر لب مسکراتے جاتے ہیں، خدا نہ کرے کہ آپ کو ایسی بے بسی اور گھبراہٹ کا تجربہ کبھی ہوا ہو یا آئندہ کبھی ہو، اللہ کا کرنا دیکھیے کہ عین اسی گاڑی سے سہارنپور سے مولانا عبداللطیف صاحب (صدر مدرسہ مظاہر علوم) اور مولانا محمد زکریا صاحبؒ کاندھلوی شیخ الحدیث بھی وارد ہوئے تھے اور دونوں صاحب وہیں مجلس میں پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے تو وارد کو اس مصیبت میں دیکھ نرم دل شیخ الحدیث کو رحم آ گیا اور حضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ حضرت یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں کو ساتھ رہنے میں سہولت زیادہ رہے گی مشکل آسان ہو گئی

اور بات، بات کی بات میں ختم ہوگئی، راقم نامہ سیاہ کا ضعف ہمت تو ظاہر ہی ہے لیکن بڑی شخصیت کا رعب اور ہیبت دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے، بس جتنا بھی لیا جائے لیکن یاد اس کام کی بات کو بھی رکھا جائے۔

ہیبت حق است این از خلق نیست ہیبت این مرد صاحب دلق نیست

قیام تین دن رہا، کچھ کم یا زائد واپسی غالباً چوتھے دن ہوئی مکان کچھ معمولی ہی سا تھا، مادی راحت کے سامان کچھ زیادہ نہ تھے، اس پر بھی وہ لطف وسرور کہ الفاظ سے اس کا اظہار دشوار، قناعت کی مطمئن زندگی کا کوئی اندازہ ہی اونچی حویلیوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے اہل ہوس کو نہیں ہوسکتا، مولانا کی مرتب ومنظم زندگی کا نظارہ پہلی بار ہوا، حاضری کے اوقات معین ومقرر تھے، چاشت سے لیکر قریب دوپہر تک، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے مخصوصین کی حاضری، پھر بعد ظہر سے لیکر عصر تک کوئی دو گھنٹے کے لیے عام نشست، ایک دن قیام گاہ پر قبل عشاء خود بدولت کی تشریف آوری بھی ہوئی، یہ بالکل مخصوص عزت افزائی وکرم فرمائی تھی کہ شاید باہر سے آنے والے کو کوئی بات نجی میں کہنے کی ہو اور اس کا موقع عام مجلسوں میں نہ مل رہا ہو، مہمان داری حضرت ہی کے ذمہ رہی، عام وارد وصادر خانقاہ میں مقیم ہوکر اپنا خود ہی کوئی انتظام کھانے کا کرتے تھے، یہاں یہ صورت خاص رہی کہ مولانا نے اپنا مہمان بنائے رکھا۔

گفتگوئیں کن کن بحثوں پر ہوئیں، مقالات وملفوظات کیسے کیسے سننے میں آئے، اب سولہ برس کے بعد بھلا کسے یاد لیکن ایک سوال وجواب کا نقش دل میں بیٹھا ہوا، حافظہ میں ایسا تازہ کہ گویا کل ہی کا واقعہ ہے۔ شب کی تنہائی میں پوچھنے والے نے اپنی سادہ دلی بلکہ سادہ لوحی سے پوچھ لیا کہ حضرت کوئی ایسا بھی طریقہ ہے جس سے زندگی میں اپنا مقام بعد موت منکشف ہوجائے؟ سنا ہے کہ بعض بزرگ اپنے مریدوں کو ان کے مقام کا مشاہدہ کرادیتے ہیں، جواب میں ارشاد ہوا کہ ایسا ہی سوال ایک بار میں نے اپنی کم عمری میں اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے کردیا تھا، مولانا نے فرمایا کہ ''اجی توبہ کرو توبہ ایمان چھوڑ کر، کفر کی طلب کررہے ہو، ایمان کے تو یہی معنی ہیں کہ حالت امید وبیم کے درمیان قائم رہے، انجام کی طرف سے یکسوئی کیسی؟ اور پھر دو سیکنڈ کے وقفہ کے بعد فرمایا یہ مشاہدہ کا طریقہ بھی محض ظنی وتخمینی ہے اعتماد کے قابل ذرا بھی نہیں''

ارشادات عالی سے زبان نے سکوت تو اسی وقت اختیار کرلیا تھا، دل کو سکون بھی بحمداللہ ایک عرصہ کے بعد ہوگیا۔

بچہ کی ولادت کئی بچیوں کے بعد اسی 1928 کے مارچ (مطابق ماہ رمضان) میں ہوئی تھی، اور قدرتاً ماں، دادی وغیرہ کے دلوں کی کلیاں خوب کھل گئی تھیں لیکن امانت چند ہی ہفتوں میں واپس لے لی گئی تھی، باپ قسی القلب کو تو خیر لیکن ماں جس کی گود اولاد نرینہ سے بڑی تمناؤں، آرزوؤں کے بعد بھرنے میں آئی تھی اور یوں آناً فاناً خالی کرالی گئی تھی، ہک دھک رہ گئی، صدمہ بہت ہی زائد ہوا اور غم کا بوجھ مہینوں گزر جانے پر بھی ہلکا نہ ہوا۔ سفر تھانہ بھون کے محرکات میں سے ایک چیز یہ بھی تھی۔

حاضری کا دوسرا یا شاید تیسرا دن تھا کہ حضرت نے اعلان فرمادیا کہ کل مسجد میں وعظ ہے، وعظ عموماً اب بہت کم ہوگئے تھے اور سفر پر باہر جانا تو اب بند ہی ہوچکا تھا، وعظ کا یہ اعلان سن کر لوگ خوش بہت ہوئے، ساتھ ہی کچھ متعجب بھی، وعظ ہوا دیر تک ہوا، حسب معمول خوب ہوا، موضوع اور عنوان تو اب یاد نہیں (چھپ کر شائع ہوچکا ہے) یہ اچھی طرح یاد ہے، طبعی غم اور صدموں کا ذکر بار بار آتا تھا اور طریقے تسکین وتسلی کے ارشاد ہورہے تھے، وعظ کی غایت سننے کے بعد یہ کھلی کہ ایک زخمی دل کی تسکین ودلدہی تھی، اللہ اکبر! اپنے مخلصوں کے جذبات کی کیسی رعایت اور کیا دلداری تھی۔

واپسی ہوئی تو دل گویا نشہ سے چور، طبیعت فرحت ونشاط سے معمور، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خزانہ ہاتھ آگیا ہے، کولمبس کو امریکہ دریافت ہوگیا ہے، میاں بیوی کا ساتھ زندگی بھر کا ہوتا ہے، چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن ایسا ساتھ کم ہی نصیب ہوتا ہے، ایسی رفاقت نصیب ہی سے ہاتھ آتی ہے، دونوں اپنے اپنے ظرف وبساط کے لحاظ سے شاد وبامراد، دونوں اپنی اپنی جگہ مست ومسرور ع

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے!

یہ لفظ بلفظ حسب حال! مصرعہ، اس پر نہ جایئے کہ کس بدنام شاعر کا کہا ہوا، کس بدنام گلے سے نکلا ہوا یا کس بدنام گلی میں سنا ہوا ہے حسب حال اتنا کہ اجازت مکرر عرض کرنے کی دیجیے۔

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے!

(10)

"اللھم انی اتخذ عندک عھداً لن تخلفینہ فانما انا بشر فای مومن اذیتہ او شتمتہ او جلدتہ او لعنتہ فاجعلھا لہ صلوۃً وزکوۃً وقربۃً تقربہ بھا الیک".

اے اللہ! میں تجھ سے ایک عہد لیتا ہوں کہ تو ہرگز اس کے خلاف نہ کرے گا، وہ یہ کہ میں بھی بشر ہی ہوں، تو جو کوئی مسلمان ایسا ہو کہ میں اسے تکلیف دوں یا اسے برا بھلا کہوں یا اسے ماروں پیٹوں یا اسے بددعا دوں، تو تو اس سب کو اس کے حق میں ذریعہ بنادے رحمت اور پاکیزگی اور اپنی طرف قربت کا کہ اس سے اسے اپنا مقرب بنالے!

یہ دعا اور جناب باری میں استدعا محض "بشر" کی نہیں سید البشر کی زبان سے نکلی ہوئی ہے۔ عرض یہ ہو رہی ہے کہ میں بھی آخر بشر ہی ہوں، غصہ میں کسی کو مار سکتا ہوں، پیٹ سکتا ہوں، سخت سست، برا بھلا کہہ سکتا ہوں، بہرحال جب کبھی بھی میری زبان یا ہاتھ سے اس طرح کی لغزش ہوجائے تو آپ تو ہر طرح صاحب اختیار ہیں، اپنی رحیمی اور کریمی کے طفیل میں بس اتنا کردیا کیجیے کہ میری ہر زیادتی کو اس مظلوم مسلمان کے حق میں ایک رحمت بنادیجیے۔ اس کے گناہوں کو دھودیجیے، اس کے مراتب قرب بڑھادیجیے، غرض یہ کہ ایسا کچھ کردیجیے کہ وہ بیچارہ نقصان میں نہیں نفع میں رہے، کچھ کھوئے نہیں، کچھ پاہی جائے، ضائع نہ کرے، حاصل ہی کرے۔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

قربان رحمت عالمؐ کی اس شان رحمت کے۔ ع

لطف وقہر او سراپا رحمتے!

اب کی جو تھانہ بھون پہنچنا اور تین دن کا رہنا ہوا تو ہاتھوں میں چھپا ہوا ایک دوورقہ نظر آیا، دوسرے کے ہاتھوں میں چلتا ہوا، دست بدست گشت کرتا ہوا، پہلا عنوان "معذرت از اشرف بخدمت اہل حقوق" دوسرا عنوان اس سے جلی تر "العذر والنذر" یہ کیا؟ عام طور سے تو پیروں، مرشدوں، مشائخ کے ہاں مضمون تعلّی کے چھپتے رہتے ہیں، کراماتیں اور بزرگیاں پیر صاحب کی بیان ہوتی رہتی ہیں، اشتہار اس قسم کے نکلتے رہتے ہیں کہ آؤ اور ہمارے پیر صاحب کا دامن پکڑو

کہ وہ سب گناہ تمھارے بخشوادیں گے یہاں اس کے برعکس پیر صاحب الٹے خود اپنی تقصیروں کو، کوتاہیوں کو گنا رہے ہیں اور ایک ایک سے لجاجت کے ساتھ اپنے ہی قصور معاف کرا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مجرموں، قصورواروں، ظالموں کو یہ بشارت سناتے جاتے ہیں:

''بامید عفو خداوندی میں اپنے حقوق غیر مالیہ جو کسی کے ذمہ ہوں بلا استثنا سب کو معاف کرتا ہوں اور حقوق مالیہ میں غیر مستطیع کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرے، انشاء اللہ کوئی سبیل سہل نکال دوں گا، خواہ تخفیف، خواہ مہلت یا کچھ اور''۔

یا اللہ! بزرگوں سے بھی خطاؤں کا امکان ہے؟ سید البشر کی دعا ومناجات، جواب اسی وسوسہ کا ہے، جب زیادتی وعصیان کا امکان، اس معصوم نے اپنے لیے تسلیم کرلیا تو پھر غیر معصوم بیچارے کس شمار وقطار میں ہیں؟ کیسی بزرگی اور کہاں کا تقدس، خاک کے پتلے کا اصل کمال صرف اس قدر ہے کہ نظر اپنی بے کمالی پر رہے اور ہزار ہنر کا ایک ہنر یہ ہے کہ نگاہ اپنی بے ہنری پر جائے!

''یہ احقر الفقرا، اذل ارذل کام کا اکثف، نام کا اشرف، تمام اُن حضرات کی خدمت میں جن کا کوئی حق میرے ذمہ ہو، خواہ وہ حق مالی ہو (جس کا احتمال ضعیف وقلیل ہے) اور خواہ وہ حق غیر مالی ہو جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو یا انتقام میں حد مساوات سے متجاوز ہو گیا ہو، یا کسی کو ناحق بدنی ایذا پہنچائی ہو (ایسے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی اور کثیر ہے) ان سب اہل حقوق کی خدمت میں دست بستہ نہایت لجاجت وسماجت سے درخواست کرتا ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبتاً للہ معاف فرمادیں، میں ان دو حالتوں میں ان کا شکر گزار ہوں گا کہ مجھ کو محاسبۂ آخرت سے بری فرمایا اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا''۔

اقتباس اس دوورقہ کے صفحہ 3 کے شروع سے وسط تک کا تھا، دوسرا اقتباس صفحہ 4 کے آخر کا ملاحظہ ہو اور اس کا بیشتر حصہ جلی قلم سے چھپا ہوا تھا:

''خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے واسطے اہل حقوق میری حیات تک خواہ اپنے گذشتہ اور آئندہ حقوق معاف فرمادیں، خواہ شرعی طریق اور شرائط پر اس کا عوض بالمثل لے لیں اور حیات کے بعد معاف ہی فرمادیں۔ اب آخر میں ناظرین سے اس دعا کی

درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قبل سفر آخرت تمام حقوق ومظالم سے اداءً یا ابراءً سبکدوش فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرمادے اور آخرت میں ہر قسم کے مواخذہ سے محفوظ فرمادے۔ ویرحم الله عبداً قال: آمنا''۔

خطاب کے بعد ہی یہ استدعا بھی چھپی ہوئی تھی:

''خود بھی ملاحظہ فرمائیے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو بھی دکھلا کر ثواب لیجیے میری حیات میں بھی اور بعد حیات بھی''۔

پورے چو صفحے کی نقل کرنے کی گنجائش کہاں، لب لباب آگیا، عنوان پر تاریخ 20 رمضان 1344 پڑی ہوئی ہے، انگریزی حساب سے 3 اپریل 1926 ہوتی ہے، حضرت کی عمر ہجری حساب سے اس وقت 64، 65 کی تھی اور سنہ عیسوی سے کوئی 62، 63 کی، وفات کوئی سترہ سال بعد، جولائی سنہ 1943 میں ہوئی، کیسا مبارک ہے وہ بندہ جو اتنے روز قبل ہی اپنے کو مولیٰ کے دربار میں حاضری کے لیے یوں تیار کرلے۔

حضرت کی مالی ومعاشی حالت اگر کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، تو بری بھی نہیں کہی جاسکتی تھی، بہتوں سے بہتر تھی، متوسط درجہ کے شرفا کا جو طرز معاشرت ہے، خصوصاً قصبات میں اور شیخ زادوں کے ہاں، حضرت اسی معیار پر فراغت آسائش سے گو یقیناً بغیر اس معیار کے اسراف وآرائش کے بسر فرماتے تھے، اولاد کوئی نہ تھی لیکن محل دو تھے، جی ہاں بزرگ ہو کر دو، دو محل! معاندین، خوب خوش ہو ہو کر نوٹ کرلیں، طنز وتعریض کے لیے کتنا زبردست حربہ ہاتھ آگیا۔ دونوں کے لیے الگ مکان، ایک دوسرے سے فاصلہ پر ملازم بھی دو تھے، دونوں ایک ایک ڈیوڑھی پر۔ دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابل دید تھا، بجائے خود ایک درس ہدایت، کام کو جب فرماتے تو خوب ٹھہر ٹھہر کر سمجھا کر۔ اکثر تکرار کے ساتھ فرماتے کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے، ملازمین جب آتے تو حکم تھا کہ زبان سے السلام علیکم کہہ کر (ہاتھ سے سلام کرنے کے عجمی دستور کی گنجائش، اس عربی سادگی ماحول میں کہاں تھی؟) قریب آکر بیٹھ جائیں، بات چیت بیٹھ کر کریں، بلا ضرورت کھڑے نہ رہیں، کام کی مشقت کبھی بہت زائد نہ ڈالتے، کام بگاڑتے تو حضرت غصہ بھی فرماتے اور غصہ کرنا ایسے موقع پر تو امر طبعی ہے لیکن اس میں بھی حدود کے اندر ہی رہتے، مسجد سے

چھوٹے زنانہ مکان کا فاصلہ اچھا خاصا ہے، لیکن شب میں بعد عشا جب گھر تشریف لے جاتے تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لیے رہتے، کسی ملازم کو اس کے لیے نہ بلاتے، کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی ان سے فرما دیتے، جس سے ان کا دل کھل جاتا، برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے، ان کے کپڑوں، ان کے بیوی بچوں سب کا لحاظ رکھتے بلکہ وہ جو ایک بہت قدیم ملازم، میاں نیاز نامی، بڑے مخلص اور سادہ دل تھے، ان کا ذکر تو کبھی کبھی نیم مزاجی انداز میں وعظ میں بھی کر دیا کرتے اور ''دہقان'' کی ''کلاہ افتخار'' آفتاب تک پہنچا دیتے! (1)

بزرگوں کی زیارت کا اتفاق اس سے قبل بھی ہو چکا تھا، لکھنؤ میں مولانا عین القضاةؒ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے تارک، زاہد، مرتاض بزرگ تھے، صفی پور (ضلع اناؤ) کے شاہ عزیز اللہ بھی اپنے رنگ میں فرد تھے، وقس علیٰ ہذا، لیکن یہاں کا مضمون ہی کچھ اور تھا، ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگرے

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی، نہ فقر و فاقہ نہ تجرد، نہ بیوی بچوں کا ترک اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشیت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیاداری ہی کا موجود، اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان، نوکر چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے، لباس خاصا اجلا شفاف، بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت، غرض بظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا، لیکن وہ دنیا ایسی کہ اس کے ہر جز پر دین کی حکومت غالب، طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں لیکن وہی شریعت کی پابندی میں تین دن کے قیام میں ان مادّی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا اور دل کی بصیرت نے اپنی بساط کے لائق کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیا اور سب سے بڑھ کر قاتل وہ چھپا ہوا معذرت نامہ! بزرگی کے دعوے نہیں، درویشی کی تعلیاں نہیں، مشیخت کی شیخیاں نہیں، جذب کی شوخیاں نہیں بلکہ الٹا تقصیروں کا اعلان، لغزشوں کا اشتہار ہائے! ہائے کوئی اس عبدیت کی دلآویزی لا کہاں سے سکتا ہے۔

لاکھوں لگاؤ، اک چرانا نگاہ کا!

---

(1) سعدیؒ ۔ زقدر و شوکت سلطان نہ گشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

عبدیت کا مرتبہ اور انابت کا جو درجہ ہے، کون سا حال اور کون سا مقام اسے پاسکا ہے؟ ربنا ظلمنا انفسنا کی آہ وزاری نے ابوالبشر کے جو مرتبے بڑھائے کس بشر کی مجال ہے کہ انھیں بھلائے؟ بڑی سے بڑی ریاضتیں بڑے سے بڑے مجاہدے بھی اس ایک شکستگی، اس ایک افتادگی، اس ایک بیچارگی کے مقابلہ پر لائے جاسکتے ہیں؟

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ، حور کی　　　اک خونچکاں کفن میں ہزار دن بناؤ ہیں

(11)

انگریزی کالجی تعلیم سے طبیعت میں جو ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے وہ پوری طرح مشکل ہی سے جاتی ہے اور پھر بعض میں طبعاً عدم اطاعت یا بے انقیادی ہوتی بھی معمول سے کچھ زائد ہے، اپنا حال ایسا ہی تھا، تھانہ بھون سے واپسی پر دل وہاں کے قیام کی مسرتوں اور مولانا کی عنایتوں دونوں سے لبریز تھا، (معروضہ یکم جنوری 1929 اور چنانچہ یہ بھی اسی وقت ٹھہر گئی تھی کہ آئندہ حاضری کم ازکم ایک ماہ کے لیے رہے گی (ایضاً) تربیت السالک کے بھی متعدد حصے اور مطالعہ کر لیے تھے اور ان کے لفظ لفظ سے استفادہ کیا تھا (ایضاً) تاہم اپنے اسی عریضہ مورخہ یکم جنوری 1929 میں یہ عرض بھی کر گزرا:

''امداد الفتاویٰ کی چاروں جلدوں کا بڑا حصہ (یعنی بجز اُن اجزا کے جن کی ضرورت مجھے نہیں پڑتی) دیکھ گیا، سلوک، اصلاح نفس سے متعلق جو کچھ قلم مبارک سے نکلا ہے میرے حق میں آب حیات ہے، البتہ بعض دوسرے مسائل مثلاً حیات خضرؑ وغیرہ سے متعلق جناب کی تحقیقات سے ابھی قلب کو اطمینان نہیں ہوا''۔

16 برس کی مدت کے بعد اب کسے یاد کہ مولاناؒ کی تحقیق اس باب میں کیا پڑھی تھی اور اس کے کس جز سے کس بنا پر اطمینان نہیں ہوا تھا، سننے کے قابل تو حضرت کے جواب ہی بہت سے طلبا و مسترشدین کے کام کے قابل:

> ''حیات خضرؑ میں تو اہل کشف خود مختلف ہیں، ہر شق میں گنجائش ہے۔ اگر دوسرے مسائل بھی ایسے ہی مختلف فیہ ہیں تو اختلاف کا مضائقہ نہیں''۔

اسی عریضہ میں ایک سوال اپنے ایک دوست کی طرف سے ان کی تجدید بیعت کے

متعلق بھی درج تھا:

''میرے ایک دوست ہیں اپنی کم عمری میں جب وہ بیعت کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے، ایک ایسے صاحب سے انھوں نے بیعت کرلی تھی، جن میں اب وہ ایک مرد متقی کی صفات تو خیر کیا، معمولی درجہ کے مسلمان کی صفات بھی نہیں پاتے اور مرشد صاحب ابھی زندہ ہیں، اب یہ مرید صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کروں، آیا ان شیخ کے زندہ ہوتے ہوئے انھیں چھوڑ کر کسی دوسرے سے بیعت کرلوں؟''

جواب ایک ہی ہوسکتا تھا اور وہی زبان سے آیا:

''ضرور واجب ہے، تاکہ پہلی بیعت کی غلطی کا تدارک ہو''۔

بات اب معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت یہی بحث بڑے معرکہ کی تھی کہ زندہ مرشد کو کسی حال میں کیسے ہی تجلیات ومشاہدات کے باوجود بھی چھوڑا جاسکتا ہے؟ خدا کی پناہ، شرک نے کیسی باریک راہ، اہل توحید کے یہاں پیرپرستی کے نام سے نکال چھوڑی ہے!

یاروں نے بت شکن کو بت ہی بنا کے چھوڑا

تحریک خلافت کا زمانہ بھی، ہندی اسلام کی تاریخ میں ایک یادرہ جانے والا دور گزرا ہے اور جس نے اسے دیکھا نہیں ہے، اس کے سامنے اس دور کا نقشہ کھینچنا بھی دشوار ہے، ایک بے پناہ ہیجان تھا، طوفان تھا، جوش میں آکر بھائی بھائی سے جدا ہورہے تھے، باپ بیٹوں سے، بیٹے باپ سے، اللہ اکبر کے نعرے اور ''محمد علی شوکت علی کی جے'' کی آوازیں گھر گھر سے بلند ہورہی تھیں، علمائے حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا، حضرتؒ کا مسلک اس سے مختلف تھا، مسلک اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے اور عامہ صحابہؓ کیا معنی خلفائے راشدین تک کا دور اس سے مستثنیٰ نہ رہا اور اگر اختلاف کی بنیاد محض حق واخلاص ہے تو یہ ذرہ بھر بھی عیب نہیں بلکہ عین رحمت ہے، لیکن محققین کے اتباع وپیرو خود سب کب محقق ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ محق ہوتے ہیں، اور محقق اور محق کی حدود میں اکثر وہی فرق ہوتا ہے جو دانا اور نادان میں ہوا کرتا ہے۔ ع

زیں انا تا آن انا فرقے ست زفت!

محق اہل حق میں سے کسی ایک سردار یا شیخ کی پیروی اندھادھند کرنے لگتا ہے اور اس ایک راہ کے سوا سب کچھ باطل سمجھتا ہے محقق اہل حق کے اختلاف باہمی کے سبب ومنشا پر نظر رکھتا ہے، تحریک خلافت کا شباب آخر 1919 سے 1922 تک رہا اور پھر رفتہ رفتہ وہی سرد مہری جو بد نصیبی سے مسلمانوں کی قومی خصوصیت بن گئی ہے، چنانچہ 1925 میں جب اودھ کی صوبہ خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار اس نااہل کے سر آپڑا تو تحریک کی سرد بازاری کو دیکھ کر ایک خانگی نیاز نامہ میں سردار قافلہ محمد علی کے نام لکھنا پڑا تھا۔

ہر کس خمے کشیدہ در مجلس وصالش　　　　چوں دور خسرو آمد جام وسبو نہ ماندہ

اور جواب یہ ملا تھا کہ "کام کرنے کا لطف تو اسی دور خسروی ہی میں ہے"۔ لیجیے بات کہاں سے کہاں پہنچنے لگی، عین اسی تحریک خلافت کے زمانہ میں دہلی سے متصل علاقہ پنجاب کے ایک قومی کارکن کو بھی اپنے مرشد سے قطع تعلق کرنا پڑا، اچھے خاصے عالم، قاری، حافظ اور بڑے مخلص، اخباری ملاقاتیں مدت سے ہو رہی تھیں، دہلی میں ان کی صوری زیارت بھی ہوگئی اور ان کا کام بھی خوب دیکھنے میں آیا، پھر شروع 1927 میں لکھنؤ میں خلافت کانفرس کے سلسلہ میں ان کی جانفشانی کی داد دل کھول کر دینی پڑی تھی۔

اب 1929 ہے اور جنوری میں اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد آیا ہوا ہوں، مارچ میں ارادہ حج وزیارت پر روانہ ہونے کا ہے، زیادہ تر عزیزوں، دوستوں سے ملنے، رخصت ہونے آیا ہوا ہوں، یہاں پھر ان ہی خلافتی بزرگ کی زیارت ہوتی ہے اور اب کی زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اس لیے اب کی ان کا زہد وتقویٰ اور زیادہ نظر کے سامنے آجاتا ہے، کثرت صوم، کثرت تلاوت، کثرت اوراد وغیرہ وہ تمام خصوصیات جو صوفیا صافیا میں ہوتی ہیں، ایک روز آخر سوال کر ہی گزرا کہ حضرت کسی سے بیعت بھی ہے؟ بولے اب اس قصہ کو نہ چھیڑیے، بڑی پر درد داستان ہے، پوچھنے والے کا اشتیاق اور بڑھا، آخر مجبور ہو کر وہ کھلے کہ "میں بھی حکیم الامت ہی سے نسبت غلامی رکھتا ہوں، تحریک خلافت کے زمانہ میں کچھ ایسی کوتاہیاں اور حماقتیں مجھ سے ہوئیں یا یوں کہیے کہ ان کی اطلاعیں اس رنگ میں وہاں پہنچائی گئیں کہ اب میں وہاں کی حاضری اور مجالست، مراسلت سب سے محروم کر دیا گیا ہوں، برسوں ہو گئے ہیں اور یہ سزا بھگت رہا ہوں

دیکھیے معافی کب نصیب ہوتی ہے اور میری قسمت کبھی اس کی نوبت آنے دیتی بھی ہے یا نہیں"۔

یہ خلاصۂ تقریر درج ہوا، اصل گفتگو بہت موثر الفاظ میں موثر انداز سے تھی، دل بہت کڑھا اور حیدر آباد کی ہمہ وقتی مشغولیت میں تو بھلا وقت کیا ملتا، لیکن وطن پہنچتے ہی 9 فروری کو ایک عریضہ تھانہ بھون کو روانہ کیا، نقل تو نہیں، خلاصہ حاضر ہے:

"مرشد و مسترشد کے باہمی معاملات میں دخل دینا ہے تو بڑی بے تمیزی 1- لیکن آپ ہی کے الطاف و عنایات پر تکیہ کر کے گستاخ 2- بن کر بصد ادب کچھ عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں 3- مولوی...... صاحب سے میری ملاقات 4، 5- سال کی ہے، صالح و دیندار تو انھیں ہمیشہ ہی پایا تھا، 4- اب کی حیدر آباد میں ان کی کثرت عبادت دیکھ کر براہِ راست سوال کر بیٹھا، بیعت سے متعلق، پہلے تو ٹالا، پھر آخر کو کھلا، بڑی پر درد روئداد تھی، ان کے اور ان کے شیخ کے موجودہ تعلقات کی نوعیت کو بجز ان کی حرماں نصیبی کے اور کس چیز سے تعبیر کروں، اللہ سے دعا ہے کہ اب ان کے حال پر رحم ہو اور جس چشمۂ فیض تک ان کی رسائی ہو چکی تھی اس سے وہ پھر سیراب ہونے لگیں"۔5-

یہ دعا تو اس سے تھی جو معصوموں اور سیہ کاروں دونوں کی سنتا ہے، باقی جناب والا کی خدمت میں گزارش صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو جناب کی ذات کے ساتھ خلوص و عقیدت اب تک جوں کی توں ہے اور اپنی معتوبی و مجبوری کا ذکر اس حسرت کے ساتھ کرتے تھے کہ ان کی ہمدردی میں بے اختیار ہو جاتا تھا، 6- اس امر واقعہ سے زیادہ کچھ عرض کرنا ہرگز مقصود نہیں کہ خواجہ خود روش بندہ پروری دانند، 7- اگر اتنی گزارش میں بھی کوئی پہلو سوادب کا ہو تو التجائے عفو ہے۔8-

جواب آیا اور حسب معمول پہلی ڈاک سے، مضمون جواب کے سمجھنے کے لیے مکتوب پر نمبر ڈال دیے ہیں۔ ان سے مقابلہ کر کے پڑھا جائے:

(1) "بعضی بے تمیزی جب اس کا منشا صحیح ہو، تمیز سے محبوب ہوتی ہے۔

(2) یہ گستاخی نہیں بے تکلفی ہے۔

(3) ضرور، ہمیشہ کے لیے اجازت ہے۔

(4) میں خود ان کو صالح سمجھتا ہوں، مگر صالح کی چند اقسام ہیں، اعتقاد تو سب اقسام سے ہے، مگر مناسبت بعض ہی اقسام سے ہے۔

(5) آپ کی خیر خواہی و رحم دلی میں تو شبہ نہیں، لیکن اس میں کچھ کام ان کے کرنے کا بھی ہے، انھوں نے نہیں کیا اور نہ مجھ سے کبھی پوچھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے، اب غور فرمایئے اس حالت میں میرے ذمہ کیا ہے۔

(6) کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنے مرض پر صرف حسرت کافی ہے یا معالجہ بھی ضروری ہے۔

(7) آپ نے تو اتنا بھی فرمایا انھوں نے تو اتنا بھی نہ کیا۔

(8) مسلمان کو نفع پہنچانا تو عین ثواب ہے"۔

(12)

بڑی عمر کو پہنچ کر بچپن کی باتیں ایک ایک کر کے کیسی یاد آتی ہیں اور ہر یاد میں ایک لذت، چاہے وہ باتیں بجائے خود کیسی ہی غیر اہم، حقیر اور معمولی ہی کیوں نہ ہوں، اور جی بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ وہی سن، وہی دن پھر لوٹ آئیں، چاہے ان ہی حماقتوں، ان ہی شرارتوں، ان ہی جہالتوں کے ساتھ، بزرگوں سے تعلق پر عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کچھ ایسی ہی کیفیت دل کو پیش آتی ہے، ابتدائے تعلق میں جو جو حماقتیں اپنے سے سرزد ہوتی ہیں، ان میں بھی ایک لذت ملنے لگتی ہے اور دل یہ کہتا ہے کہ ان ہی کو دوہرائے جایئے، خارج میں تو ممکن نہیں عالم خیال ہی میں سہی، مولانا کی خدمت میں جیسے عریضے لکھے، ان کا ایک خاصا انبار آج اپنے سامنے ہے اور جی میں آتا ہے کہ اپنے ہر سوال، طفلانہ سے طفلانہ سوال کو دہرایا جائے اور بات کوئی چھوٹی سے چھوٹی بھی نہ چھوٹنے پائے، چاہے نوبت اپنی سبکی اور کسی کی ناگواری اور کسی کی رسوائی ہی کی آجائے، نازک مزاج، حساس سننے والے، صبر کے ساتھ اور دل پر تھوڑے سے جبر کے ساتھ سنتے جائیں اور داستان گو کی ہرزہ سرائیاں معاف کرتے جائیں!

ذکر 9 فروری 1929 کے مکتوب کا تھا، اس کے آخر کے دو فقرے باقی رہ گئے تھے، ایک تو یہ تھا کہ "شروع شوال (وسط مارچ) میں انشاءاللہ مع اہل خانہ قصد حج بیت اللہ ہے، دعائے خیر سے

فراموش نہ فرمائیں'' جواب ملا کہ ''بہت مسرت ہوئی، جوش سے دعائے کامیابی کی'' اور دوسرا یہ تھا کہ ''اب کی حیدرآباد میں ایک اہل دل بزرگ سے بہت دیر تک صحبت رہی، کئی گھنٹے تک مسئلۂ توحید پر تقریر فرماتے رہے، ان کا تیار کیا ہوا مقامات سلوک کا ایک شجرہ یا نقشہ خدمت والا میں حاضر کررہا ہوں اس کا جواب ملا کہ ''زیارت کرلی مگر کوئی برکت محسوس نہیں ہوئی، دونوں جانب کمی کا احتمال ہے''۔ اس کے قبل نوعمری اور کالجی طالب علمی کے دور میں، لکھنؤ میں اکثر شام کو حاضری، مولانا شبلی کے ہاں رہتی تھی اور معمول یہ تھا کہ بنا سنا ہوا اور اپنا پسند کیا ہوا شعر انھیں کسی نہ کسی حیلہ سے سنادیتا، اگر انھوں نے بھی پسند فرمالیا تو گویا شعر پر مہر استناد لگ گئی اور اب وہ دوسری جگہوں پر فخر سے پڑھنے کے قابل ہوگیا اور اگر انھوں نے داد نہ دی یا اسے پست کہہ دیا تو بس اپنی نظر سے بھی وہ شعر اسی وقت گر جاتا، اسی نوعیت کا تعلق اب برسوں بعد حضرت مولانا سے قائم ہو چلا تھا، شعر وادب سے متعلق نہیں، مسائل شریعت اور اس سے زیادہ مسائل سلوک وطریقت سے متعلق جسے انھوں نے پاس کردیا، بس وہی ''پاس شدہ'' رہے باقی سب، ع

این دفترِ بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

کا مصداق عمل ہمیشہ اس پر یقیناً نہیں رہا، لیکن کوشش عمل میں معیار کے طور پر تو یہی رہا۔

سفر حج کے سلسلہ میں راستے میں تلاوت کے لیے ایک مترجم حمائل کی فکر ہوئی، بازار میں ایک مترجم حمائل ''معجز نما حمائل شریف'' کے نام سے ملی، دہلی کی چھپی ہوئی، نور محمد نامی کسی تاجر صاحب کی چھاپی ہوئی۔ ترجمہ مولانا کی جانب منسوب، پڑھا تو معلوم ہوا کہ ترجمہ ہے کسی دوسرے صاحب کا اور نام مولانا کا، سبحان اللہ قرآن تک سے یہ حضرت نہ چوکے، متن قرآن نہ سہی، ترجمۂ قرآن سہی۔ ''چو کفر از کعبہ'' کی مثال:

> 11 رمضان (غالباً 23 فروری) کے خط میں پوچھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ ''بیشک مدت سے یہ خبریں سننے میں آرہی ہیں، کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا، بجز اس کے کہ کوئی مجھ سے سوال کرے اور میرا جواب شائع کردے''۔

''قطب ارشاد'' کی اصطلاح، تصوف کی کتابوں میں بارہا پڑھی تھی، علامتیں بھی پڑھ لی تھیں، دل نے کہا کہ اس دور کے ''قطب ارشاد'' تو یہی معلوم ہوتے ہیں، اس کی تحقیق خود ان ہی

سے کیوں نہ کر لی جائے۔ استفسار ان الفاظ میں کیا:

"............ میرا اپنا ظن وقیاس اس وقت کے قطب ارشاد ہونے کے متعلق ان ہی بزرگ کی جانب ہے، جن کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، اگر یہ گمان غلط ہے تو اس کی تردید فرمادی جائے اور یہ بھی ارشاد فرمادیا جائے کہ کن علامات سے اسے شناخت کیا جاسکتا ہے"۔

جواب سننے کے قابل ہے، احتیاط میں ڈوبا ہوا:

"قطب ارشاد کو بھی اپنے قطب ارشاد ہونے کا علم ضروری نہیں، اس لیے میں اس سوال کا جازم جواب نہیں دے سکتا، علامات تو ہیں، مگر ان علامات کا تحقق خود ظنی ہے"۔

اسی عریضہ میں، نماز میں جی نہ لگنے کا اپنا پرانا مرض عرض کیا تھا اور پھر ایک عطائیوں کا سا علاج بھی درج کر دیا تھا:

"نماز میں جی نہ لگنے کا مرض بہت پرانا ہے، لیکن کبھی یہ تجربہ ہوا ہے کہ عین حالت نماز میں جب کبھی بجائے اپنے جناب کو یا...... کو نماز پڑھتے فرض کر لیا، تو اتنی دیر تک نماز میں دل لگ گیا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ خود یہ تصور بھی عرصہ تک قائم نہیں رہتا، بہرحال اگر یہ عمل محمود ہو تو تصویب فرمائی جائے ورنہ آئندہ احتیاط رکھوں"۔

جواب ملا "محمود ہے جب دوسروں کو اطلاع نہ ہو، ورنہ سم قاتل ہے"۔

آخری گزارش سرپرست مدرسہ دیوبند سے مدرسہ کی تازہ عالیشان عمارتوں سے متعلق تھی کہ یہ "پرشکوہ عمارتیں علی گڑھ کے مناسب ہوں تو ہوں، یادگار قاسمی(1) کے لیے تو وہی کچے حجرے بھلے معلوم ہوتے ہیں" جواب آیا:

"خیال صحیح ہے، مگر ایک دوسرا خیال بھی صحیح ہے، وہ یہ کہ اگر اس میں کوئی مصلحت ہو تو مضائقہ نہیں اور حسن ظن مقتضی ہے کہ مصلحت کا احتمال رکھا جائے گو اس کی تعیین نہ کر سکیں"۔

"معجز نما حمائل" کے "نئے اعجاز" کا ذکر ابھی آچکا ہے کہ ترجمہ کسی کا اور منسوب کسی کی جانب، ایما ہو چکا تھا کہ اس کی بابت تصریح سے استفتا کیا جائے، تعمیل معا کی گئی اور سورۂ فاتحہ اور

---

(1) یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

سورۂ بقرہ کے رکوع اوّل کے ترجمہ کی نقل بجنسہٖ ارسال خدمت کر کے سوال کیا کہ کیا اس ترجمہ کی نسبت جناب والا کی جانب درست ہے؟ جواب آیا:

''مکرمی دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں نے آپ کے نقل کیے ہوئے ترجمہ کو اپنے ترجمہ سے ملایا، خواہ میرے ترجمہ سے اچھا ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ میرا ترجمہ نہیں، نہ اصلی اور نہ بدلا ہوا کیونکہ بدلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے، یہ تو بالکل ہی مغائر ہے، مجھ کو یاد آتا ہے کہ اس کے متعلق پہلے ہی تحقیق کی گئی ہے اور ناشر سے درخواست کی گئی ہے کہ تم اپنی غلطی کو شائع کر دو اور میری رائے اب بھی یہی ہے کہ اگر خود وہ اس واقعہ کو شائع کر دیں تو غالباً اس میں خفت ہو جائے ورنہ کسی کی طرف ایسی غلط نسبت کرنا بہتان صریح اور کذب قبیح ہے، اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دے۔ والسلام اشرف علی 23 رمضان 1347''۔

اس داستان کو تو چھوڑیے کہ سچ (پرانے صدق) نے اس پر کیا کارروائی کی اور ناشر صاحب کو آخر کیا کرتے بن پڑی یہ خط مارچ 1929 کے پہلے ہفتہ کا تھا، دوسرے ہفتہ روانگی سفر حج پر ہو گئی۔ لکھنؤ سے گاڑی رات میں چلی، صبح تڑکے جھانسی سے دوسری گاڑی ملی، ادھر دن نکلا، ادھر ایک رفیق سفر کے ہاتھ میں مولانا ہی کا وعظ 'الحج المبرور' نظر پڑا، خوشی کا کیا پوچھنا، اپنی خوش نصیبی پر آپ رشک آ گیا، گویا طریق حج و رفیق حج دونوں میسر! دو کتابیں حضرتؒ کی، مسائل السلوک (قرآنی تصوف) اور التشرف (حدیثی تصوف) پہلے ہی ساتھ تھیں، یہ تیسری بہت خوب مل گئی۔ **فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ** کی مصداق!

بمبئی پہنچ کر ٹھہرنا کئی دن پڑ گیا، اندازہ سے کہیں زائد۔ اللہ کی یاد تو دل میں کیا آتی، اتنا ظرف ہی کس کا تھا، البتہ اس اللہ والے کے تذکرے وہاں بھی خاصے رہے، آخری دن ایک رفیق قافلہ خط تھانہ بھون لکھ رہے تھے، چلتے چلاتے اسی میں سلام اور التماس دعا میں نے بھی ڈال دی۔ حج میں ''زاد راہ'' لینے کا حکم تو نصوص میں موجود ہے ''زاد راہ'' نئے قسم کا سہی، ایک بے مایہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک مقبول کی دعائیں، سفر بھر ساتھ رہیں۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست   تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

پرانے شعر میں، نئی ضرورت ضمیر کی ترمیم کی تھی، حاضر کی جگہ متکلم کی۔

(13)

جون 1929 کی 6 تاریخ تھی کہ واپسی کا جہاز ساحل بمبئی پر آ لگا اور جو ابھی کل تک صرف عبدالماجد تھا اب دنیا والوں کی نظر میں حج وزیارت سے مشرف، حاجی عبدالماجد تھا۔ آہ نہ پوچھیے کہ حج کس بے ترتیبی سے ادا ہو پایا تھا، اعمال کی کوتاہی اور بخت کی تیرگی کے لیے، ہند وحجاز سب یکساں ہیں، آسمان کی گردش سے کوئی بھی مستثنیٰ ومحفوظ نہیں، آتے ہی لمبا چوڑا عریضہ حکیم الامت کی خدمت میں لکھا، گھر پہنچنے سے قبل بہت قبل ساحل بمبئی پر قدم رکھتے ہی۔ مریض بد پرہیزیوں کی، بے احتیاطیوں کی اطلاع، طبیب کو دینے میں جتنی بھی عجلت کر سکے بہتر ہے۔

خط پورا سن کر کیا کیجیے گا۔ مریض کے گھناؤنے حالات کی تفصیل سے دوسروں کو دلچسپی ہی کیا ہوسکتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ پورا سنانے کی ہمت بھی یہاں کس کو ہے؟ اس عریضہ کے تو صرف مختصر خلاصے سنتے جائیے، باقی مولانا کے جوابات پورے کے پورے حاضر ہیں، نسخہ لکھا جاتا ہے کسی ایک مریض کے لیے اور اس کے چھپ جانے کے بعد فیضیاب اس سے سیکڑوں، ہزاروں دوسرے مریض بھی ہوتے ہیں، فقروں پر نمبر، سہولت تفہیم کے لیے ڈال دیے گئے ہیں:

"کل ساحل بمبئی پر واپس پہنچا ہوں 1- آج وطن انشاء اللہ روانہ ہوں گا...... کے ساتھ ہی جناب والا کی خدمت میں بھی یہ عریض ارسال کر رہا ہوں 2-...... مدینہ منورہ میں قیام ایک مہینہ سے کچھ زیادہ نصیب رہا 3-،...... ایک رفیق سفر کے پاس جناب کا رسالہ الحج المبرور 4- نکل آیا، اسے ریل ہی پر پڑھ ڈالا جناب کی دو اور کتابیں...... بھی رفیق سفر رہیں 5- خیر اللہ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی دعا وتوجہ سے حج تو جوں توں نصیب ہو گیا 6- لیکن للہ دعا فرمایئے 7- کہ ان سب بیہودگیوں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ اس نمائشی حج کو قبول فرمائے 8- محجوب ونادم ہوں کہ تحفہ تحائف کے قسم میں کوئی شے خدمت والا کے لائق نہ لا سکا 9-...... مدینہ منورہ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر نا جائز خواہش پر کسی نے مہر لگا دی 10- واپسی میں جہاز پر جناب کے ایک خلیفۂ مجاز نے انتقال فرمایا، لوگ انھیں صوفی صاحب کہتے تھے، مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ میں انھیں اکثر صف اوّل میں دیکھا تھا۔ 11-

جواب:

(1) الحمدللہ (2) بہت ضروری تھا (3) مبارک (4) مجھ کو اس نام کا کوئی رسالہ اپنا یاد نہیں آیا، مگر مجھ کو اپنے رسائل کے نام یاد بھی نہیں (1) (5) آپ کی قدردانی ہے (6) مبارک ہو (7) دل سے دعا ہے (8) ان حالات کو آپ بے سروپا اور موجب تاسف فرمارہے ہیں اور میں ان پر مسرور ہوں، اس لیے کہ ان ہی حالات سے یہ حج عاشقانہ ہوگیا، ورنہ عاقلانہ ہوتا عاشق کے حصہ میں تو مایوسی اور حسرت اور ناکامی اور نامرادی ہی ہے، عاشق کو کبھی سیری اور تسلی نہیں ہوتی، پریشانی اور پشیمانی کبھی مفارق نہیں ہوتی، حج کرکے اگر یہ سمجھا جاتا کہ حج کیا تو عجب تھا اور اب یہ سمجھنا کہ کیا حج کیا، یہی تو عبدیت اور فنا ہے اور اگر بالفرض کوتاہی ہے بھی تو اس کا تدارک استغفار سے سہل ہے اور عجب کا کوئی تدارک ہی نہیں کرتا، اس کا تو پتہ ہی نہیں لگتا مولانا کی شہادت سن لیجیے۔

گر مرادت رامذاق شکر است　　　　بے مرادی با مراد اکبر است

اور مدینہ منورہ میں فنا کی شان خود ہی محسوس ہوگئی حتیٰ کہ شوق بھی فنا ہوگیا، ہیبت افضل ہے شوق سے (9)

ادائے حق محبت عنایت ست ز دوست

اللہ اللہ! کیا وہ تحفہ تحائف، قربانی اور دعا سے زیادہ قیمتی ہوتا، اس وقت تو اس احسان کا بدلہ میرے ذمہ ہے کہ میں کوئی تحفہ پیش کروں اور ناداری ہی نہیں، کم ہمتی ہے اس لیے دعا پر اکتفا کرتا ہوں (10) برکت ظاہر ہے اب اس برکت کو یاد رکھ کر اس کو باقی رکھا جائے (11) دہلی خط لکھا ہے، غالباً یہ صوفی رحیم بخش تھے۔

انسان کی زندگی نشیب وفراز کا مجموعہ ہے، ابھی ذکر وعبادت میں مشغول دیکھیے تو شاید فرشتے بھی رشک کرنے لگیں، ابھی نفس کو، نفس کے پنجہ میں گرفتار ملاحظہ کیجیے تو عجب نہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگ جائے۔ اس نشیب وفراز سے بڑے بڑے زور آوروں کو مفر نہیں، اچھے اچھے تندرستوں اور پہلوانوں کو چارہ نہیں، بجز انبیائے معصوم کے، تو پھر غریب ومسکین ناتوانوں کا کیا

(1) حضرت کی یاد صحیح تھی کوئی تصنیف حضرت کی اس نام کی بیشک نہیں ہے، یہ ایک وعظ تھا اور حضرت کے مواعظ مطبوعہ کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ غالباً ایک ہزار کتابیں اور رسائل ان کے نام سے چھپتے ہیں۔ (قاسمی)

ذکر ہے، پستیاں روز مرہ کا معمول ہیں، بلندیاں اتفاق ہی سے کبھی نصیب میں آ جاتی ہیں۔
حکیم الامت کے مطب (1) میں نسخے بڑے سے بڑے بدحال مریض کو ملتے تھے، یہ نہ تھا کہ اس دربار میں صرف ابرار و اتقیا آئیں اور محض ذکر و شغل کی تعلیم لے کر چلے جائیں یا فقط شب بیدار اور تہجد گزار حاضر ہوں اور اوراد و وظائف کی تسبیحات میں اضافہ کر کرا کے واپس ہو جائیں۔ یہاں گنجائش اسی وسعت قلب، اسی خلق و تلطف کے ساتھ اشقیا و اشرار کی بھی تھی۔ دھوبی کا کام محض اجلے کپڑوں کو استری کر دینا اور دھلے دھلائے کپڑوں کی شکن مٹا دینا نہیں، بڑے سے بڑے گندے اور کثیف کپڑوں کی غلاظتوں اور کثافتوں کو دور کرنا اور ناپاک کو از سر نو پاک بنانا ہے۔

حج سے آئے ہوئے ابھی دو ہی ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ مکان میں اپنے کمرہ سے کچھ چوریاں ہونی شروع ہوئیں۔ کبھی میز سے کچھ پیسے اٹھ گئے، کبھی دونی چونی، گھر کے پروردہ دو چھوٹے لڑکے تھے، شبہ ہر پھر کران ہی پر ہوتا رہا زبانی فہمائشیں اور دھمکیاں دونوں بے سود رہیں، آخر ایک روز صبح سویرے 4 کی رقم اٹھ گئی، غصہ بہت ہی زائد آیا اور کچھ موقع اور مہلت دینے کے بعد ان لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا، کمرہ زنانخانہ کے کوٹھے پر تھا، خیال بھی نہیں گزرا کہ کوئی بیرونی شخص اس میں آ سکتا ہے، لڑکے بے تحاشا پٹنا شروع ہوئے کہ عین اسی حالت میں اصل مجرم مع رقم کے گرفتار ہو کر آ گیا، محلّہ کا ایک لڑکا تھا، ایک زینہ باہر سے بھی تھا بس اسی راستہ سے سب کی آنکھ بچا کر کمرہ میں داخل ہو جاتا تھا، اب سخت ندامت شروع ہوئی کہ گھر کے ان دو بیچارے لڑکوں پر ناحق ہی اتنی مار پڑی، مار تو واپس آ سکتی نہیں، اب بجز توبہ و استغفار کے اور کیا ہو سکتا ہے، ندامت اس لیے اور زیادہ کہ آخر میں وہ دونوں بالکل بے قصور نکلے تھے، سارا کچا چٹھا اسی دن، اسی وقت (یکم ستمبر کو) مولانا کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ اب تلافی و کفارہ کی کیا صورت ہے۔

جواب آیا اور بالکل حکیم الامت کے شایان شان:

"اگر وہ بالغ ہیں تو ان سے معاف کرانا ضرور ہے اور اگر نابالغ ہیں تو کم از کم ان سے اعتراف غلطی اور اظہار ندامت اور ایک مدت معتد بہ تک ان کی دلجوئی اور ان سے فرمائشیں پوچھ پوچھ کر پورا کرنا مناسب ہے اور ان کا قصور وار ہونا اگر اخیر میں ثابت بھی ہو جاتا تب بھی سیاست

(1) مراد روحانی مطب (قاسمی)

کے وقت میں تو یہ فعل بلا دلیل شرعی ہی ہوتا''۔

جواب کا یہ آخری جز خاص مولاناؒ ہی کا حصہ تھا، توبہ واستغفار کی حد تک تو اور بزرگ بھی جاتے، لیکن تدارک کی عملی تدبیریں اور پھران میں یہ باریک بینی اور ژرف نگاہی، مولانا پر ختم ہوگئی! ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اسی عریضہ میں کچھ اور معروضات بھی تھے، ایک یہ کہ مولانا کے استاد مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (1) کے مکتوبات اور مولانا کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے ملفوظات امداد المشتاق پڑھ کر بہت ہی نفع حاصل ہوا، ذکر وشغل وآداب صوفیا سے متعلق بہت شبہات از خود دور ہو گئے، اس کا جواب:

''میرا دل خوش ہوا کہ اپنے بزرگوں کے کلام کا نافع ہونا ایک دانشمند کی شہادت سے ثابت ہوا، اب اس سطر کے ایک جز سے رجوع کرتا ہوں، وہ جز بالکل شروع کا ہے کیونکہ وہ بزرگ ان شاہد کے بھی ہیں''۔

دوسرا معروضہ یہ تھا کہ صبح آنکھ دیر میں کھلنے لگی ہے، معمولات رہ جاتے ہیں، اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہوگی، جواب باصواب:

''حدیث میں ہے لاتفریط فی النوم، سعدی کا ارشاد ہے۔ ع

ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

کیا اس سے اس قدر دلگیر ہونا، زیادت علی المصطفےٰ نہیں''

تیسری گزارش یہ تھی کہ جتنا دل تفسیروں، خصوصاً تفسیری نکتوں میں لگتا ہے، اتنا خود قرآن مجید کی تلاوت میں نہیں لگتا، یہ دل کے اندر کا چھپا ہوا چور ہے، اس پر ارشاد ہوا:

''اگر طاعات میں نفس کو بھی لذت ہو تو یہ خوشی کی بات ہے یا فکر کی، رہا کمی بیشی، تو یہ امر طبعی ہے اس پر کوئی ملامت نہیں''۔

ہر خط، خط کیا ہوتا تھا، ایک مستقل ہدایت نامہ ہوتا تھا، مفید بھی اور لذیذ بھی، ہر خط جب تک

(1) دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس (قاسمی)

نہ آلیتا، برابر اس میں دل لگا رہتا، خطوں میں دلکشی ہوتی ہی اس بلا کی تھی۔

وہ معروضے ابھی اس عریضہ کے باقی رہ گئے ہیں، ایک یہ تھا کہ بھائی صاحب سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں، وہ جناب سے مل کر حسن اخلاق کے گرویدہ ہو کر واپس آئے، سرکاری عہدہ دار کے لیے کسی اہل اللہ سے اتنا تعلق بھی بڑی نعمت ہے اب انشاء اللہ آپ کے مواعظ ورسائل کا بھی مطالعہ کریں گے۔ جواب:

''یہ ان کا حسن ظن ہے کہ ایک ناکارہ سے محبت رکھتے ہیں، میں خود ان کی سادگی اور صفائی کی تعریف کرتا ہوں''۔

آخری اور ایک لحاظ سے بہت اہم گزارش یہ تھی کہ ''اب کی بار تھانہ بھون ذرا طویل حاضری اور لمبے قیام کا قصد ہے، کوئی مہینہ سوا مہینہ کے لیے، میاں بیوی دونوں کا، مکان وغیرہ کا انتظام بھی از راہ مسافر نوازی ہم پردیسیوں کے لیے فرما دیا جائے''۔ اللہ ری سادہ لوحی اور اُف ری کمال بے امتیازی! شیخ وقت کی قدر اچھی کی، ارشاد وہدایت، وعظ وتلقین کے ساتھ ساتھ گھر کی منیجری کے بکھیڑوں کی بھی فرمائش!

جواب آیا:

''اس مضمون سے بہت ہی مسرت ہوئی، دیر جواب میں مکان تجویز کرنے میں ہوئی بعضے مکان میں نے خود دیکھے، میری رائے یہ قرار پائی کہ اس وقت ایک چھوٹا سا مکان جو مدرسہ کا ہے اس میں فروکش ہو جیے پھر دوسرے مکانات ملاحظہ کر لیجیے جو موافق طبیعت کے ہو اس کا انتظام ہو جائے گا، سامان ضروری اپنے گھروں سے فراہم ہو جائے گا، صرف ایک فہرست دے دیجیے''

میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ بڑا ظلم کیا ان دوستوں اور دشمنوں دونوں نے جو مولانا کو ایک خشک آدم بیزار اور تارک الدنیا قسم کا بزرگ اور درویش سمجھے، مولانا بزرگ اور درویش اور زاہد سب کچھ تھے لیکن ان سب سے پہلے اور ان سب سے بڑھ کر انسان تھے، حقیقی انسانیت کا ایک نمونہ بزرگی اور درویشی کے کمالات کا مرقع۔

(14)

اجازت حاضری اور طویل حاضری کی مل گئی۔ اس سے بڑھ کر مسرت کا موقع اور کیا ہوسکتا

تھا، لیکن پھر بھی یہ خیال آیا اور آنا ہی تھا کہ یہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی مدت وہاں کٹے گی کیونکر، عام مریدین، مسترشدین، معتقدین، خانقاہ میں جب حاضر ہوتے ہیں تو بعض تو خانقاہ میں جاروب کشی کرتے ہیں اور باقی یہ نہ سہی، تو ذکر و شغل کرنے، نفی و اثبات کی ضربیں لگانے، اللہ اللہ کرنے، اوراد و وظائف پڑھنے پڑھانے میں رات اور دن کاٹ دیتے ہیں، یہاں ان مشغلوں سے کیا سروکار تھا، اس آنے والے کی دنیا ہی دوسری دنیا تھی، سچ ایک حد تک دینی اخبار سہی بہرحال ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کا نکالنے والا بہرصورت ایڈیٹر اس کا کام ہی اخبار کے لیے لکھنا، اخبار کے لیے پڑھنا، دن رات میں خدا معلوم کتنے اخبارات پڑھ ڈالنا اردو کے بھی، انگریزی کے بھی (اور کبھی کبھی عربی اور فارسی کے بھی) بھلا ایسے ''اخبار چی'' کو ان خانقاہی مشاغل سے واسطہ کیا تھا۔ دل میں بات آئی، ہمت کے پیر ذرا لڑکھڑائے، لیکن بات کو چرا جانے کی، چھپا ڈالنے کی ترکیب جس طرح آج 1948 میں نہیں بن پڑتی 1929 میں بھی نہ بن پڑی، دل کڑا کر کے 14 ستمبر کو خود مولانا ہی کو لکھ بھیجا کہ حضرت وہاں کا نظام اوقات کیا رہے گا؟ اب تک کا تو معمول روزانہ کئی گھنٹے کے لیے اخبار نویسی اور اخبار خوانی کا ہے، اگر یہ وہاں کے مشاغل کے منافی ہو تو اپنے اخبار کے لیے کسی نئے انتظام کی فکر کر کے آؤں، جواب آیا مختصر لیکن بالکل کافی۔

''مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

طبعاً کسی جانب شرح صدر نہیں ہوا، لیکن عقلاً ترجیح ہوئی کہ اخبار کا انتظام نہ بدلا جائے، میں برکت کی دعا بھی کرتا ہوں۔ اشرف علی''

یہ جواب ان کا آیا، جو اپنی سختی اور خشکی کے لیے مشہور تھے اور یقیناً اس بدنامی کے پھیلانے میں معتقدین کا بھی حصہ مخالفین سے کچھ کم نہ تھا، حقیقتاً مولانا کے ہاں بڑا توسع تھا، بحیثیت عالم شریعت کے بھی اور بحیثیت مرشد طریقت کے بھی۔

اکتوبر کی کوئی تاریخ 20 کے بعد کی تھی، جب تھانہ بھون پہنچنا طے پایا تھا، درمیانی وقفہ اچھا خاصا تھا، جی میں آیا کہ اس اثنا میں اپنا تعارف مولانا سے کچھ اور زیادہ کرا لیا جائے اور ہو سکے تو مولانا کے علوم سے کچھ استفادہ اپنی کتابوں کے سلسلہ میں کر لیا جائے۔ مصنف کی اصلاح سے قبل اگر تصانیف ہی کی اصلاح ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اپنی شائع کی ہوئی دو کتابیں ڈاک سے

روانہ کردیں، ایک تو فیہ مافیہ، یعنی مولانائے رومیؒ کے ملفوظات فارسی زبان میں، اپنے اردو دیباچہ ومقدمہ کے ساتھ، دوسرے اپنا رسالہ تصوف اسلام (طبع ثانی) اور ایک عریضہ بھی لکھ دیا کہ دو حقیر ہدیے ڈرتے ڈرتے ارسال خدمت ہیں اور اس کے بعد ہی ایک جوابی کارڈ بھی وسط اکتوبر میں ڈال دیا کہ فلاں تاریخ کو حاضر خدمت ہو جاؤں گا، جواب اسی کارڈ پر، 18 اکتوبر کا لکھا ہوا حسب ذیل موصول ہوا:

"مکرمی سلمہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے دو ہدیے بشکل نافع کتابوں کے اور محبت نامہ کارڈ ہذا پہنچ کر منت بخش ومسرت افزا ہوئے۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے، اگر ہمت وفرصت ہوئی تو اسٹیشن جدید پر ملوں گا، ورنہ آدمی حاضر ہوگا، کارڈ محض اس مصلحت سے بھیج دیا کہ خط پہنچنے کا اطمینان ہو جائے۔

دونوں رسالے وقتاً فوقتاً، بنظر استفادہ متفرق طور پر دیکھتا رہتا ہوں، دل خوش ہوتا ہے، دوسری کتاب (1) میں اتفاقاً دو مقام قابل نظر ثانی پڑے، ایک مقام اول میں، ایک مقام آخر میں صفحہ 6 پر خانقاہ امدادیہ کا ذکر اکابر کے ساتھ فرمایا ہے اگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہوتے تو یہ ذکر برجا تھا، اب تو دو شالہ میں ٹاٹ کا حاشیہ ہے، صفحہ 187 پر حدیث، "من مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة الجاهلیة" کے صحاح میں ہونے کی نفی ہوئی ہے، مشکوٰۃ میں مسلم سے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اصل مسلم میں بھی آسانی سے نکل آئے گی، اگر نظر ثانی فرما کر، اب کی بار اشاعت کے موقع پر ان دونوں مقاموں کی تصحیح ہو جائے تو مفید ہو۔ باقی خیریت ہے، والسلام، اشرف علی از تھانہ بھون بھائی صاحب سے سلام فرما دیجیے"۔

اس مکتوب پر صرف تین حاشیے اور ملاحظہ فرما لیجیے۔

(1) تصوف اسلام صفحہ 6 کی جس عبارت کا ذکر ہے، وہاں دیباچہ میں عرض یہ کیا گیا تھا کہ قدیم محققین صوفیا کے صحیح اسلامی تصوف کا اعلیٰ نمونہ اب بھی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں نظر

---

(1) یعنی تصوف اسلام (طبع ثانی)

آسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ مولانا اس ''ذکر اشرف'' کو کیسے گوارا فرماتے۔

(2) یہ ضروری اصلاح بالکل صحیح ومناسب ارشاد ہوئی۔

(3) بھائی صاحب سہارنپور میں تھے اور مولانا کا مکتوب ان ہی کے پتہ پر موصول ہوا تھا۔

مولانا کی ذات، خود دینی حیثیت سے عجب ذات تھی، کوئی صرف فقیہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا، کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے نا آشنا، یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل بھی، روی عصر بھی اور رازیٔ وقت بھی، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث وتصوف کے علاوہ، کلام قدیم وجدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں، وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ، یہیں سے خوشہ چینی کرکر کے اپنی بات بناتے، اپنی دکان چمکاتے۔

ایک نوجوان عزیز، کالجی تعلیم پائے ہوئے اور انگریزی صحبتیں اٹھائے ہوئے، مدت سے یہ سوال کررہے تھے کہ ''دنیا میں بدی کے وجود کی علت کیا ہے؟'' گویا تخلیق کائنات کا راز اور فعلیت خالق کی مصلحت جاننے کے درپے تھے اور اس کو اکثر نوجوانوں کی طرح ''عین روشن خیالی'' کا مطالبہ سمجھ رہے تھے، ان کے مکتوب کی نقل بجنسہٖ حضرت کی خدمت میں روانہ کردی، اپنے اس عریضہ کے ساتھ کہ:

> ''حضرت جواب تو الٹا سیدھا انھیں دے ہی لوں گا، لیکن حصول تبرک اور خود اپنی ہی مزید تشفی کے لیے خدمت والا میں عرض کررہا ہوں، اگر کچھ مختصر اشارات عنایت ہوجائیں تو تفصیل اپنی عبارت میں انشاء اللہ کرلوں گا''۔

جواب آیا اور حسب معمول واپسی کی پہلی ہی ڈاک سے آیا، کاغذ کے دونوں رخوں پر لکھا ہوا پہلے پہلا صفحہ ملاحظہ ہو:

> ''الجواب، غالباً علت سے مراد حکمت ہے، ورنہ علت جو سب حوادث کی ہے، اس کی بھی ہے، پس اگر واقعی مراد اس سے حکمت ہے تو اس سوال میں ایک دعویٰ ہے، وہ یہ کہ تمام حوادث کی حکمت معلوم ہونا ضروری ہے، کیا اس دعویٰ پر کوئی دلیل ہے، خصوص جاہل غلام اگر عالم آقا کے افعال کی حکمتیں پوچھے، کیا سائل صاحب کو عقلاً

وطبعاً گوارا ہے کہ ان کے تمام افعال کی مصلحتیں ان کا ایک نوکر ان سے پوچھے اور جس فعل کی حکمت اس کو نہ بتلائی جائے اس کی حکمت کا انکار کر دے، کیا آقا کا یہ جواب دینا غیر معقول ہوگا کہ نامعقول تجھ کو ہمارے افعال سے کیا بحث، جو کام تجھ کو بتلا دیا اور وہ تیرے بس کا بھی ہے، تو اسے کیے جا، اور فرق کیا ہے۔ اشرف علیؒ"

اب دوسرا رخ پڑھیے:

"مکرمی، السلام علیکم۔ پشت پر جو درج ہے وہ ضابطہ کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نہ سائل کو حکمت پوچھنے کا حق ہے، نہ ہم پر حکمت بتلانا واجب ہے، اب میں تبرع کے درجہ میں حکمت بتلاتا ہوں، اہل ظاہر نے، حکمت، ابتلا کو بتلایا ہے، جیسے کسی نوکر کی وفاداری آزمانے کے لیے یا اگر خود باعلم ہو تو دوسروں پر بغرض اتمام حجت ظاہر کرنے کے لیے طاقوں میں روپے ڈال دیے جاتے ہیں کہ اس سے بچنا یا نہ بچنا ظاہر یا معلوم ہو جائے اور اہل باطن نے حکمت ظہور اسما الٰہیہ کو بتایا ہے، اگر بدی پیدا نہ کی جاتی اور کوئی اس کا مرتکب نہ ہوتا تو نہ بعض کو سزا ہوتی، جس سے قاہر و منتقم کا ظہور ہوتا اور نہ بعض کو معاف کر دیا جاتا جس سے عفو و غفور و رحیم کا ظہور ہوتا، مگر دونوں جوابوں پر پھر سوال ہوتا ہے کہ تخلیق شر میں تو یہ حکمت ہوگئی، مگر خود اس حکمت یعنی ابتلا و ظہور اسما میں کیا حکمت ہے، پھر اخیر جواب یہی ہوگا کہ حکمت معلوم ہونا ضروری نہیں، تو اس جواب تبرع کے بعد بھی جواب ضابطہ کی ضرورت ہوگی، اسی واسطے عارفین کا فیصلہ ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمّا را

اور فرمایا۔

زبان تازہ کردن بہ اقرار تو ۔۔۔ نینگیختن علت از کار تو

و امثالها من الوصایا والحکم ۔۔۔ اشرف علیؒ"۔

درخواست صرف مختصر اشارات کے لیے کی گئی تھی، جواب میں اشارات نہیں، تصریحات ارشاد ہوئیں اور وہ بھی مختصر نہیں، ضرورت کی حد تک مفصل۔

مدت کے بعد اس متن کی مطول شرح، پچ (مرحوم) کے کئی صفحات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک مستقل مقالہ کی حیثیت سے 'تلاش راز' کے عنوان سے شائع ہوئی، مضمون بحمد اللہ مقبول ہوا، انگریزی خواں حلقوں میں خوب پھیلا، خوب چلا، بہتوں کو نفع حاصل ہوا، داد، مفت میں، پچ نگار کو ملتی رہی، داد دینے والے بھی معذور تھے۔ چمکتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے بلوری برقی قمقمے کو سب دیکھتے ہیں، کسی کو کیا خبر کہ اندر ہی اندر، برقی رو (کرنٹ) کہاں سے آرہا ہے۔

وہ مقالہ بصورت ضمیمہ ابھی ملاحظہ ہو۔

(14)
ضمیمہ
تلاش راز(1)

سائنس اور میڈیکل سائنس دونوں کے گریجویٹ، ایک نوجوان عزیز کا مکتوب ذیل مدت ہوئی موصول ہوا تھا:

''دنیا میں بدی کے وجود کی علت کیا ہے؟ اس کے قطعاً نامحبوب ہونے میں تو کسی کو کلام ہو نہیں سکتا ...... کلام الٰہی میں مسلسل اس سے بچنے کی تاکید ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر شے کا وجود اسی مختار کل کے علم و مرضی سے ہے، جب بدی کا وجود بھی اسی کے علم و مرضی سے ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ ایسی ایمان شکن چیز جب خود ہی پیدا کی تو پھر اس میں مبتلا ہونے پر ہم کیوں مورد الزام ٹھہریں ...... مذہبی نقطہ نظر سے ایسے سوالات کا حل یہی ہوتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے اور عقلاً ذات باری کے اسرار و مصالح سمجھنے پر اکبر مرحوم یہ یاس انگیز سبق دیتے ہیں۔

جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا　　　ذہن میں جو گھر گیا، لاانتہا کیونکر ہوا

ہر چند کہ یہ مضمون پامال ہے لیکن مسکن جواب کے لیے فطرت انسانی ہنوز تشنہ ہے، امید ہے کہ آپ سچ میں اس کا جواب مذہبی نقطہ نظر سے بھی دیں گے اور عقلی دلائل سے بھی ثابت فرمائیں گے''۔

مکتوب کو موصول ہوئے مدتیں گزر گئیں، ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے اور مہینوں سے ہوتے ہوتے برسوں کی نوبت آ گئی، سب سے پہلے عزیز موصوف سے ان کے اس صبر آزما

(1) متعدد سائلوں کے جواب میں سچ کا یہ پرانا مضمون بعد نظر ثانی نقل کیا جاتا ہے (صدق لکھنؤ 15 جولائی 1939)

زحمت انتظار پر معذرت کرنی ہے، امید ہے کہ وہ معاف فرمائیں گے۔

مکتوب کے پہلے فقرہ میں لفظ ''علت'' آیا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ''علت'' سے مراد مصلحت غایت یا حکمت رکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے چل کر مکتوب ہی میں لفظ ''مصلحت'' صراحتاً درج ہے، بدی کی علت فاعلی تو کوئی پوچھنے والی چیز نہیں، ذہن میں سوال یقیناً یہ پیدا ہوا ہوگا کہ قادر مطلق نے بدی آخر پیدا ہی کیوں کی؟ اب ایک شے سے تمام تر روکنا ہی مقصود تھا، تو اسے سرے سے پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ آئندہ جو کچھ گفتگو ہوگی وہ سوال کے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر ہوگی۔

اشکال جو پیش کیا گیا ہے، نیا نہیں ہے، خدا معلوم اب تک کتنوں کو پیش آچکا ہے اور آج سے پیشتر خدا معلوم کتنے قلم اس کے سلجھانے پر اٹھ چکے ہیں، مراسلہ نگار مستحق شکریہ ہیں کہ انگریزی خواں نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کی ترجمانی کر کے انھوں نے مسئلہ کی توضیح کے لیے ایک نیا موقع بہم پہنچادیا، لیکن کسی شبہ کے محض شیوع عام کی بنا پر یہ لازم نہیں آتا کہ اس سوال کی تشنگی فطری بھی ہے، غیر طبعی فضا اگر کسی مرض کو عام وعالمگیر بنادے تو یہ نہ ہوگا کہ مرض کو مرض کے بجائے صحت کہنے لگیں، مرض مرض ہی رہے گا، خواہ مریضوں کی تعداد کتنی ہی زائد ہوجائے۔ بے غوری اکثر ذہن کے سامنے رائی کا پہاڑ بنا کر کھڑا کردیتی ہے اور التفاف تام کے فقدان کے باعث بارہا یہ ہوتا رہتا ہے کہ جو مسئلے گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہوجانے کے ہیں، ان کے سلجھانے کے لیے حسن نیت کے باوجود ہفتوں اور مہینوں کی مدت بھی کافی نہیں ہوتی۔

جواب کا مرحلہ بعد کا ہے، پہلے بقول ایک زندہ عالم وعارف کے، ایک سوال خود سائل پر عائد ہوتا ہے، سوال حکمت ومصلحت سے متعلق کیا گیا ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ خود اس سوال مصلحت کی کیا مصلحت ہے؟ یہ سوال پیش کس غرض سے کیا گیا؟ سوال سے سائل کا مقصود کیا ہے؟ جواب میں کہا جائے گا کہ ''تشفی قلب'' اب غور اس پر کرنا ہے کہ آیا جواب سے یہ مقصود حاصل ہو بھی سکتا ہے؟ بدی کے وجود کی کوئی سی بھی مصلحت عقلی بالفرض بتا بھی دی گئی تو آیا ذہن کی تشفی اس سے ہوجائے گی؟ کیا عقل اس مصلحت عقلی کا نام سن کر خاموش ہوجائے گی؟ اور کیا بعینہ یہی سوال خود اس مصلحت عقلی پر بھی عائد نہ ہوگا؟ کیا اسی تیزی ومستعدی کے ساتھ ذہن یہ سوال نہ کر بیٹھے گا کہ مانا، فلاں حکمت، وجود بدی کی محرک ہوئی، لیکن خود اس حکمت کی کیا حکمت ہے؟ خالق کائنات نے

جو بھی مقصود پیش نظر رکھا، کیوں رکھا؟ جو بھی مصلحت ملحوظ رکھی، کیوں رکھی؟ خوب غور کر کے، دل کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھیے، کہ آیا "کیوں" اور "کس لیے" کا یہ سوال بعینہٖ ہر جواب پر عائد ہو کر نہیں رہتا؟ اور جو طبائع آج بدی کی حکمت کے درپے ہیں، کل کیا وہ ٹھیک اسی طرح اس حکمت کی حکمت اور غایت کی غایت کے کھوج میں نہ لگ جائیں گی؟ اور اگر سوالات کا تسلسل یوں ہی برابر اور یکساں قائم رہا، تو تشفی کیا حاصل ہوئی؟ اور جب تشفی کا امکان نہیں، تو بات وہیں رہی جہاں پہلے تھی۔

لیکن بالفرض کوئی ایسی صورت ہے، جس سے وجود بدی کی مصلحت معلوم ہو جانے پر ذہن کی تشفی ہو جائے اور آئندہ سوالات کا سلسلہ رک جائے، تو اس صورت کو ابھی کیوں نہیں اختیار کر لیا جاتا، ذہن اگر دو ایک قدم آگے چل کر سکوت و سکون اختیار کر سکتا ہے تو اس سے ایک منزل قبل، اس سے پہلے ہی سوال کے وقت یہ کام کیوں نہیں لیا جاتا؟ اور دل کو یہ کہہ کر کیوں نہیں سمجھا لیا جاتا، کہ جہاں روزمرہ کی زندگی میں چھوٹے بڑے صدہا ہزار جزئی واقعات، صانع فطرت کے پیدا کیے ہوئے بھی اور انسانی ہاتھوں کے پیدا کیے ہوئے بھی، ایسے نظر سے گزرتے رہتے ہیں، جن کی علت غائی، حیثیت افادی، مصلحت وجودی، مطلق سمجھ میں نہیں آتی، وہاں اس طویل فہرست میں ایک عنوان کا اضافہ اور سہی۔

غرض مقصود سوال سے متعلق جو پہلو بھی اختیار کیا جائے اور جواب سے تشفی ہونے نہ ہونے کی جو شق بھی قبول کی جائے ہر صورت میں نہ سوال نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے اور نہ جواب عقلی کے لیے فکر و کاوش کا کوئی حاصل نکلتا ہے۔

اب اس طرف آیئے کہ سوال پیش کس کی طرف سے ہو رہا ہے، کسی مذہبی شخص کی طرف سے یا لامذہب کی طرف سے؟ دو حال سے خالی نہیں، پہلے کی طرف سے ہوگا یا دوسرے کی طرف سے۔ اگر لامذہب کی زبان سے ہے، تو وہ ابھی حکیمانہ نظم کائنات ہی کا کب قائل ہے؟ وہ ابھی اسی کا معتقد کہاں ہے کہ عالم اور مانی العالم، بامعنی، بامقصد اور بامفہوم بھی ہے؟ اس کے نزدیک تو عالم نام ہے، منتشر ذرات کے غیر ارادی اجتماع کا اور ضرور نہیں کہ اس اجتماع کے عقب میں کوئی غایت، کوئی مقصد، کوئی مصلحت بھی ہو (اگر سائل غایت و مصلحت کا وجود ضروری قرار دے رہا ہے

تو ظاہر ہے کہ وہ ملحد نہ رہا بلکہ ایک حکیم صناع کے وجود کا قائل ہو گیا) لامذہب و دہریہ کی طرف سے سوال حکمت کا پیش ہونا ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص فن طب کی حقیقت ہی کا سرے سے منکر ہو اور لگے کسی خاص طریق علاج کے منافع ومصالح پر بحث کرنے، جزئیات پر گفتگو جب ہی ہو سکتی ہے جب پہلے اصول تسلیم کر لیے جائیں۔

لیکن سائل اگر مومن ومسلم ہے، تو ایک بار پھر اسے سوچنا چاہیے کہ سوال سے نتیجہ اور فکر جواب سے حاصل کیا؟ مسلم کا کام احکام کی تعمیل ہے، نہ کہ ان کی توجیہ وتعلیل کی ادھیڑ بن، بالفرض مصالح وحکم عقلی حیثیت سے سمجھ میں بھی آ گئے تو اس سے نفع کیا ہوا؟ دین کا یا دنیا کا آخر کون سا نفع اس سوال کے حل ہونے اور راز حکمت کے منکشف ہو جانے پر معلق وموقوف ہے؟ انسانی دماغ کے لحاظ سے بجا ہو یا بیجا، بشری عقل کے معیار سے معقول ہو یا غیر معقول، بہر حال وبہر صورت بدی کا وجود تو ہو ہی چکا، اب نفع کی چیز اور کام کی بات کون سی ہے، بدی سے بچنا یا اس بحث میں الجھنا کہ بدی کا وجود ہوا کیوں؟ مسلم مامور کس چیز پر ہے، مسلم کی ترقی مراتب موقوف کس امر پر ہے، آیا بدی سے بچنے پر یا نیکی وبدی کا فلسفہ سمجھنے پر؟ ڈاکٹر کا کام یہ ہے کہ انسان جس ہیئت کذائی کے ساتھ جن اعضا اور جن قوتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے، ان میں اگر کوئی خرابی یا بے اعتدالی نظر آئے، تو اس کی اصلاح میں لگ جائے نہ یہ کہ ان سوالات میں اپنے کو مشغول کر دے کہ اس کی ترکیب یوں کیوں رکھی گئی ہے، اس کی ہیئت وساخت اس قسم کی کیوں واقع ہوئی ہے، اس کے جسم کی ترکیب میں فلاں اجزا کیوں رکھے گئے ہیں، وقس علی ہذا، کوئی ڈاکٹر اگر ان مسائل پر توجہ نہیں کرتا، یا بعد توجہ ان کے کسی حل پر نہیں پہنچتا تو اس سے اس کی طبی حذاقت یا فنی قابلیت پر کیا حرف آ سکتا ہے؟

غرض سائل جونسا مسلک بھی اختیار کرے، سوال جس طرح اپنی غایت ومقصود کے لحاظ سے بے نتیجہ رہا تھا سائل کے مسلک کے لحاظ سے بھی لاحاصل ہی نظر آتا ہے۔

سوال محض سوال ہی نہیں ہے بعض اہم دعووں کا بھی پردہ پوش ہے، جواب محض دینی اور اعتقادی حیثیت سے نہیں، ''عقلی'' و''استدلالی'' حیثیت سے بھی چاہا گیا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سائل کے خیال میں عقل، ہر مسئلہ کی عقدہ کشائی کے لیے کافی ہے اور عقل بشری، ہر

مصلحت ربانی اور حکمت الٰہی کا بے تکلف احاطہ کرسکتی ہے، لیکن خود یہ مفروضہ کہاں سے ثابت ہے؟ عقل کی اس ہمہ گیری پر کون سی دلیل، عقلی یا نقلی قائم ہے؟

یہ صحیح ہے کہ بدی کے وجود میں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ انھیں سمجھا بھی عقل ہی کی مدد سے جائے، یہ کہاں سے لازم آگیا کہ ہر مسئلہ کی کنہ یہاں تک کہ جو مسائل اعم الاعمات (Ultimete Prolems) کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی بھی کنہ، عقل ہی کی وساطت سے دریافت ہوسکتی ہے؟ انکار عقل کی قوت سے نہیں، انکار عقل کی اس ہمہ گیری سے ہے جو سوال میں فرض کرلی گئی ہے، عقل کی فضیلت مسلم، فضیلت ہی نہیں، افضلیت بھی مسلم، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر گتھی عقل ہی کے ناخن سے کھل سکتی ہے، عقل بھی آخر دوسری انسانی قوتوں کی طرح محض ایک طبعی قوت ہے اور ایک محدود دائرہ کے اندر کارفرما۔ اس محدود دائرہ کے باہر اس سے کام کیونکر لیا جاسکتا ہے؟ آنکھ کا کام دیکھنا ہے اور کان کا سننا، معدہ کا کام ہضم کرنا اور دماغ کا سوچنا، آنکھ سن نہیں سکتی اور کان آنکھ کا کام نہیں دے سکتا، معدہ کیسا ہی تندرست ہو، سوچ نہیں سکتا اور دماغ کتنا ہی توانا ہو، غذا ہضم نہیں کرسکتا، عقل سے بھی کام وہی لینا چاہئیں جو اس کے کرنے کے ہیں، جو اس کی حدود کے اندر ہیں، چھونے اور چلنے، سانس لینے اور کھانا ہضم کرنے کا بار اگر ہاتھ پیر، پھیپھڑا اور معدہ کے بجائے، عقل پر ڈال دیا جائے تو کون عقلمند اسے روا رکھے گا؟

عقل کا کام، فلاسفہ قدیم اور نفسیین بعدید، دونوں کی تحقیق میں محسوس کی ترتیب اور مدرکات کی تنظیم ہے، اب جو علوم محسوسات سے بلند اور جو حقائق مدرکات سے ماورا ہیں انھیں عقل کی گرفت میں کیونکر لایا جاسکتا ہے؟ اور کوئی انھیں زبردستی لانا چاہے بھی تو عقل اپنی حدود سے قدم نکال کر ان کا احاطہ کیونکر کرسکتی ہے؟ حافظ شیراز شاعر نہ تھے صاحب نظر حکیم اور صاحب معرفت صوفی بھی تھے، اسی مقام کی شرح اپنے مشہور شعر

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

میں کرتے ہیں اور جو لوگ سن و سال یا فہم و بصیرت کے لحاظ سے ابھی بچپن کی منزل میں ہیں، انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ عقل و استدلال کی راہ سے راز دہر کی طلسم کشائی کی کوشش عبث

ولا حاصل ہے، ہمیشہ نا کام رہے گی، حافظؒ یہ نہیں کہتے کہ یہ عقدہ سرے سے لاینحل ہے بلکہ ''حکمت'' کی قید لگا کر کہتے ہیں کہ عقل واستدلال کی راہ سے اس معما کا حل ہونا ممکن نہیں۔

قاصر النظر مادی کا قدم عقل کی منزل تک پہنچ کر رک جاتا ہے، عقل اس کا سدرۃ المنتہیٰ ہے، وسیع النظر روحانی اس سے آگے بڑھتا ہے، وہ مانتا بھی ہے اور اپنے تجربہ سے جانتا بھی، کہ عقل سے ماورا کچھ اور باطنی قوتیں بھی انسان کو عطا ہوئی ہیں، اس ناسوتی زندگی کے خاتمہ پر وہ باطنی قوتیں سب کی سب روشن ہو کر رہیں گی، اس وقت نیک وبد، مومن وملحد، سب کے لیے کشف حقائق ہو کر رہے گا، آیۂ کریمہ **فکشفنا عنک غطاء ک فبصرک الیوم حدید**، اسی منزل وجود کی خبر دے رہی ہے (1) یہ قوتیں، بد پرہیزیوں سے بچنے، ریاضتوں میں لگے رہنے، مجاہدات میں مشغول رہنے سے اسی زندگی میں بھی ایک حد تک بیدار ہو جاتی ہیں اور ''کل'' کا مستقبل ایک معتد بہ درجہ میں ''آج'' کے حال میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس وقت بغیر کسی دلیل وبرہان کے، بغیر اصول وقیاس اور قواعد واستقرار کی مدد کے، بغیر زبان سے بولے ہوئے، لفظ اور قلم سے نکلی ہوئی عبارت کے، قلب کی تشفی اور ذہن کی تسلی ہو جاتی ہے اور سوال کا حل ہونا الگ رہا، سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، ان بلند تر قوتوں سے بغیر ان شرائط کے پورا کیے ہوئے جو ان کے بروز وظہور کے لیے لازمی ہیں انکار کر بیٹھنا ایسا ہی ہے کہ کوئی کمسن بچہ ان قوتوں کے وجود سے سرے سے انکار کر دے جو ابھی اس کے اندر مخفی ہیں اور جوان ہونے پر نمایاں، روشن اور ظاہر ہو کر رہیں گی۔

جو کیفیات اور جو قویٰ اپنی نوعیت میں بلند ہیں انھیں پست تر کیفیات اور ادنیٰ قویٰ میں منتقل کرنا اور علویات کی تشریح وتوضیح سفلیات کی اصطلاح میں کرنا، نہ ممکن العمل ہے نہ کسی طرح یہ

---

(1) اکبر مرحوم نے حکمت ومعرفت کے بیسیوں مسائل باتوں باتوں میں حل کر دیے ہیں، ایک جگہ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ہنگامۂ شکر وشکوہ دنیا میں ہے گرم	لیکن مرے ذہن میں یہ بات آتی ہے
کھلتا نہیں راز دہر ''شکوہ'' ہے تو یہ	اور ''شکر'' یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

''راز دہر'' حواس مادی کی مدد سے نہیں کھل سکتا، البتہ موت کے طاری ہوتے ہی، قویٰ میں اتنی پختگی آجاتی ہے کہ کشف حقائق از خود ہو جاتا ہے، ایک دوسری جگہ کہا ہے۔

درجہ متحیر کا بیخود سے فروتر	ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

مطالبہ معقول وصحیح کہا جاسکتا ہے، ایک چھوٹا بچہ، جو ابھی لذت کے معنی صرف مٹھائی کھانے اور راحت ومسرت کے معنی صرف کھلونے کھیلنے کے جانتا ہے وہ اگر اس پر ضد کرے کہ فلسفی کو جو لطف مسائل کے حل کرنے میں آتا ہے، عابد کو جو راحت رات رات بھر نماز پڑھنے میں حاصل ہوتی ہے، ڈاکٹر جو مسرت مریضوں کی خدمت گزاری اور تیمارداری میں آتی ہے یہ سب کیفیتیں اسے مٹھائیوں کی بولی اور کھلونوں کی زبان میں سمجھا دی جائیں تو کون اس پر قادر ہوسکتا ہے؟ اور کون اس کے مطالبہ کو واجبی قرار دے گا؟ یہ ایک بہت موٹی اور کھلی ہوئی بات ہے لیکن آہ کہ اکثر ایسی روشن اور پیش پا افتادہ حقیقتیں بھی بحث وگفتگو کے وقت نظر سے رہ جاتی ہیں، عارف رومؒ عاجز آکر کہتے ہیں کہ ''خام'' کے اندر ''پختہ'' کا حال کوئی کیونکر بھر دے، بس سکوت ہی مناسب ہے۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

سوال اس ذات کی ایک فعلیت سے متعلق کیا گیا ہے جو ذات مطلق ہے، وہ ہستی غیر محدود ہے، غیر محدود کی پیائش کوئی محدود آج تک کرسکا ہے؟ مطلق کو ادراک کی گرفت میں لانا کسی مقید کے لیے ممکن ہے؟ یعنی وہ ذات مطلق ہمہ خیر و ہمہ قدرت ہے لیکن ساتھ ہی ہمہ حکمت بھی ہے، وہ خیر مطلق وقادر مطلق ہونے کے ساتھ ہی حکیم مطلق بھی ہے اور نہ صرف وہ خود بلکہ جو فعل بھی اس سے صادر ہوتا ہے ہمہ حکمت ہوتا ہے، لیکن آج حکمت کوئی اس کے علم کا، اس کی قدرت کا، اس کی رحمت کا، اس کی ربوبیت کا، کسی صفت کا احاطہ کرسکتا ہے؟ پھر تنہا اس کی حکمت ہی کا احاطہ کیوں ممکن سمجھا جائے؟ جزئی حکمتوں کا سوال جزئی قدرتوں اور جزئی رحمتوں کی طرح علاحدہ ہے، یہاں جو مسئلہ زیر نظر ہے وہ حکمت کاملہ کا ہے۔

مطالبہ توجیہ عقلی کا کیا گیا ہے، لیکن پہلے خود توجیہ عقلی کے معنی ومفہوم کو سمجھ لینا چاہیے، انسان کا ذہن ہر نامانوس شے سے بھڑکتا ہے، گھبراتا ہے، دفع وحشت کے لیے وہ صرف مانوس ومالوف اشیا کو چاہتا ہے، توجیہ اس کی اسی طلب کی تسکین کا نام ہے، اس میں اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوتا کہ ایک اجنبی جزئیہ کو ایک مسلم ومتعارف کلیہ کے تحت میں، یا ایک اجنبی کلیہ کو ایک عام تر ووسیع تر ومتعارف کلیہ کے تحت میں لے آیا جاتا ہے، یہی توجیہ ہے اور اسی کا نام انگریزی میں Explanation ہے، اس تعریف سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ہر علم وفن میں ایک نقطہ ایسا آجاتا ہے

جس کے آگے توجیہ چل نہیں سکتی اور وہاں پہنچ کر ہر صاحب فن کو خاموش ہو جانا پڑتا ہے، ایک طبیعی درخت سے پھل کو ٹوٹ کر زمین پر گرتا دیکھ کر اس کی توجیہ قوت کشش کے وسیع کلیہ سے کر دیتا ہے لیکن اگر یہ سوال ہو کہ قوت ہی میں یہ قوت کیسے اور کہاں سے آئی تو طبیعی کے پاس کچھ جواب نہ رہے گا۔ ایک مریض علاج کے لیے طبیب کے پاس جاتا ہے، طبیب اس کی توجیہ میں کہہ سکتا ہے کہ حصول صحت ایک نوع کی راحت ہے اور راحت ہر انسان کو مطلوب، لیکن اگر اس پر یہ سوال پیدا ہو کہ راحت مطلوب ہی کیوں ہے، تو طبیب خاموشی پر مجبور ہو جائے گا، یہ حال ہر علم وفن اور ہر صنف واقعات سے متعلق ہے۔

مذہب کی اصطلاح میں خدا سب سے آخری چیز ہے، اس کے بعد نہ کوئی اور وجود ہے اور نہ اس سے وسیع تر کوئی ہستی، بقول اکبر

اخیر ''کیوں'' کا جواب تو ہے

اس وسیع ترین وجود کو اصول عقل وقوانین منطق کے مطابق، کس موجود کے ماتحت اور اس کے افعال کو جو اعم الاعمات کا مرتبہ رکھتے ہیں کس کلیہ کے تابع رکھا جا سکتا ہے؟ جس پر ہر سوال ختم ہو جاتا ہے، جس کا ارادہ ہر مصلحت اور ہر حکمت کا ملتجیٰ ہے اور جس کی مشیت غایۃ الغایات ہے، اس کی کسی فعلیت کی غایت تلاش کرنا، قواعد عقلی ہی کے لحاظ سے، اسی طرح بے معنی ہے جیسے یہ سوال چھیڑا جائے کہ سب کا پیدا کرنے والا خدا ہے، تو خدا کو کس نے پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ خدا اگر کسی اور سے پیدا ہوا ہے تو اسے خدا کہا ہی کیوں جائے گا؟ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ مصلحت خداوندی اگر کسی اور مصلحت کی تابع اور ارادۂ ایزدی کسی دوسری غرض وغایت کا پابند ہے تو ان پر مصلحت خداوندی اور ارادۂ ایزدی کا اطلاق ہی نہ ہو سکے گا۔ کوئی اگر ذات حق کے متعلق سوال کرے کہ اسے کس نے اور کیوں پیدا کیا تو سب کو ہنسی آجائے، لیکن ہنسی اس وقت کیوں نہیں آجاتی، جب سوال صفات حق وافعال حق سے متعلق کیا جاتا ہے اور ان کی توجیہ وتعلیل کے لیے کوئی اور سہارا ڈھونڈھا جانے لگتا ہے؟

سوال کے عقب میں تخیل یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بدی بھی ایک مستقل ایجابی وجود رکھتی ہے اور جس طرح انسان وحیوان، شجر وحجر، آفتاب وماہتاب، چرند وپرند، مستقل وقائم بالذات اصناف

موجودات یا باصطلاح منطق ''جوہر'' ہیں، اسی طرح ایک مستقل جوہر بدی بھی ہے جو بھوت کی طرح کبھی اسے لپٹ جاتی ہے اور کبھی اس پر مسلط ہو جاتی ہے، مگر کیا حقیقتاً بدی ایسی ہی کسی ماڈی چیز کا نام ہے؟ کیا مذہب نے بدی کی بھی حقیقت بیان کی ہے۔

قرآن وحدیث سے اس تخیل کی تائید نکلنا الگ رہا، جتنی بھی تصریحات ہیں سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدی ''جوہر'' نہیں عرض ہے، کوئی مادی مخلوق نہیں، محض ایک کیفیت، ایک روش، ایک طریق عمل کا نام ہے، کلام مجید کی بکثرت آیات سے یہی ظاہر ہوتا ہے مثلاً

''فھدیناہ النجدین'' (البلد) ''ہم نے انسان کو (نیکی و بدی) دونوں راستے دکھا دیئے''۔

''انا ھدیناہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً'' (دہر، رکوع ۱) ''ہم نے انسان کو راہ عمل بتا دی، پھر کوئی سیدھی راہ پر پڑ لیا اور کوئی ٹیڑھی پر''۔

''فالھمھا فجورھا وتقواھا'' (الشمس) ''اللہ نے انسان کو گمراہی اور ہدایت دونوں کے راستے القا کر دیئے''۔

وقس علیٰ ہٰذا، مفاد سب کا یہ ہے کہ بدی نام ہے انسان کی غلط روی کا، خود لفظ ''گمرہی'' اس معنی کی جانب رہنمائی کر رہا ہے، اس کے بالمقابل نیکی نام ہے راست روی کا، سیدھی راہ پر چلتے رہنے کا، گویا انسان جب تک اپنی قوتوں کو، اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو صحیح طور پر رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کر رہا ہے، اعمال حسنہ میں مشغول ہے اور جس وقت وہ ان کی خداداد قوتوں کو، اپنی فطری صلاحیتوں کو بیجا طور پر استعمال کرنے لگا، بدی، بدکاری، بدعملی کا مرتکب ہو گیا، گویا بدی نام ہے راہ اعتدال وتوسط کو چھوڑ کر افراط وتفریط اختیار کر لینے یا صراط مستقیم سے منحرف ہو جانے کا، دوسرے مذاہب کی بابت تحقیق نہیں لیکن اسلام میں تو بدی کا مفہوم بس یہی اور اسی قدر ہے۔

بدی کے اس صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھنے کے بعد کیا اس پر مراسلہ نگار کا سوال عائد بھی ہو سکتا ہے؟ اب سوال کے یہ معنی ہوئے کہ انسان میں غلط روی کی صلاحیت کیوں رکھی گئی۔ انسان کی خلقت ایسی کیوں رکھی گئی کہ وہ سیدھی راہ چلتے چلتے کبھی ٹیڑھی راہ پر بھی پڑ سکے؟ اوپر یہ تصریحات آ چکی ہیں کہ عقل کی محدود وقوت، آخری مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے ناقابل ہے لیکن بہرحال جتنی بھی قوت عقل سلیم کو حاصل ہے اس کے لحاظ سے غور کیا جائے کہ بجز اس کے اور کیا صورت تکوین

انسانی ممکن تھی؟ کیا یہ ہونا چاہیے تھا کہ انسان سرے سے مسلوب الاختیار اور مشین کی طرح قصد و ارادہ تو اسے دیا جاتا لیکن ایسا ارادہ دیا جاتا جو ہمیشہ نیکی ہی کو اختیار کرتا اور بدی کا امکان ہی باقی نہ رہتا۔ اول تو یہ ارادۂ اختیار کی بالکل انوکھی تعریف ہوتی کہ بجائے دو شقوں میں سے ایک کے انتخاب کے انسان ہمیشہ ایک ہی شق کے قبول کرنے پر مجبور ہوتا اور پھر اس صورت میں یعنی احتمال بدی کے مرتفع ہو جانے کی صورت میں خود نیکی کے بھی کوئی معنی باقی رہ جاتے ہیں؟ کوئی ایسی نیکی ممکن بھی ہے جب تک دوسری طرف سے اشتعال نہ پیدا کرایا جائے؟ صفت ''عدل'' کے ظہور کا موقع جب ہی آسکتا ہے جب ایک طرف ظالم، دوسری طرف مظلوم، ادھر مستغیث، اُدھر مجرم کا وجود ہو، ''صبر'' کس چیز پر کیا جائے گا، اگر مصائب وشدائد کا وجود نہ ہو، صفات عفو وکرم، جود و شجاعت بروئے کار اسی وقت آسکتے ہیں جب بالمقابل خطائیں، لغزشیں، حاجت مندیاں اور خطرات موجود ہوں، ماں کی ممتا اسی وقت جوش میں آتی ہے جب سامنے بچہ، بیکسی اور بے بسی کی تصویر بنا پڑا ہو۔ یہ حال ہر نیکی کا ہے اور جس عقل سلیم سے مدد چاہی گئی تھی اسی کا فیصلہ یہ ہے کہ بغیر بدی کے وجود کے محض نیکی کی تمنا دنیا میں رکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کوئی یہ آرزو کرے کہ زمین پر بلندیاں ہی بلندیاں ہوں کوئی پستی نہ ہو۔ لفظ بلندی کے معنی و مفہوم جب ہی پیدا ہو سکتے ہیں جب مقابل میں کوئی ''پستی'' ہو۔

سوال میں جزم و وثوق کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بدی کا وجود خالق کائنات کے ''علم و مرضی'' سے ہے، ''علم'' سے یقیناً ہے لیکن ''مرضی'' سے قطعاً نہیں، یہ غلط فہمی بہت عام ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے اور ذی فہم اس میں مبتلا ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) پہلے تو خدا آپ ہی بندوں کو برائی میں مبتلا کرتا ہے اور پھر آپ ہی سزا دیتا ہے۔

یہ خیال خدا معلوم کہاں سے گڑھ لیا گیا ہے، قرآن تو قدم قدم پر اس کی مخالفت کرتا ہے۔ ''علم'' اور ''رضا'' دو بالکل مختلف چیزیں ہیں، بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ کسی چیز کو جاننا اور ہے اور اسے پسند کرنا اور، طبیب جانتا ہے اپنے تجربہ وواقفیت کی بنا پر پورا یقین رکھتا ہے کہ مریض کے لیے فلاں فلاں بد پرہیزیاں مہلک ہیں، ان سے مریض کی ہلاکت یقینی ہے، اپنے اس علم کا اظہار وہ مریض کے سامنے بار بار کر بھی دیتا ہے اور اسے صاف اور کھلے لفظوں میں ڈرا دیتا ہے یہاں تک

کہ بعض صورتوں میں تعیین مدت کے ساتھ مریض کی ہلاکت کی پیش گوئی بھی کر دیتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر کیا واقعات کا حکم لگا دیتا ہے، کیا وہ ان واقعات کے وقوع کو پسند بھی کرتا ہے۔ نامی گرامی وکیل مقدمات کے نتائج کا اندازہ قطعیت کے ساتھ لگا لیتے ہیں، کیا ان نتائج سے وہ متفق بھی ہوتے ہیں؟ حیرت، جبر و قدر میں آ کر علم الٰہی و رضائے الٰہی کو خلط مبحث کر کے ایک کر دیتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہر شے میں ایک طبعی خاصیت رکھ دی ہے، آگ جلاتی ہے، گرماتی ہے، پانی ڈبوتا ہے، بھگوتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے، تریاق صحت دیتا ہے، ہوا اڑاتی ہے، آفتاب روشن کرتا ہے، وقس علیٰ ہذا۔

یہ سارا نظام تکوینی جس قانون کے تحت چل رہا ہے اس کا نام مذہب کی زبان میں مشیت الٰہی ہے، اسی قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ انسان کو ارادہ یا اختیار دے دیا گیا ہے، وہ اپنی عقل و تمیز سے مختلف راستوں میں سے ایک راستہ اپنے لیے انتخاب کر سکتا ہے۔ چند شقوں میں سے ایک شق اپنے لیے پسند کر سکتا ہے، چند طریقوں میں سے ایک طریق عمل اپنے لیے متعین کر سکتا ہے اس پر جو کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اسی قدر انتخاب و اختیار کی بنا پر، چنانچہ جن کی یہ قوت مختل ہو جاتی ہے (مثلاً مجنون کی) یا جن کی یہ قوت پختگی کو نہیں پہنچی ہوتی ہے (مثلاً بچوں کی) یا حالات میں یہ قوت معطل ہو جاتی ہے (مثلاً حالات خواب میں) ان پر سے ان حالات میں ذمہ داری بھی ساقط ہو جاتی ہے، ان حدود کے اندر انسان تمام تر آزاد ہے، ہر طریق عمل کے نتائج اسے بتا دیے گئے ہیں، زیست و فلاح، موت و ہلاکت کی ساری راہیں اسے دکھا دی گئی ہیں اور وہ پوری طرح آزاد و خود مختار ہے کہ جونسا عمل چاہے کرے، جونسی راہ چاہے اختیار کرے، اس میں اس پر مطلق کوئی جبر نہیں۔ "**فمن شآء فلیومن ومن شآء فلیکفر**" (کہف) "**قل کل یعمل علٰی شاکلتہ**" (بنی اسرائیل) وغیرہا متعدد آیات کریمہ اسی مضمون پر ناطق ہیں اور یہ سارا نظام تکوینی قانون مشیت کی ماتحتی میں چل رہا ہے۔

اسی قانون کے متوازی ایک دوسرا قانون بھی کارفرما ہے، اس کا تعلق نظام تکوینی Physical plan سے نہیں نظام Moral plan سے ہے، ''کیا ہے'' ۔What is سے نہیں ''کیا ہونا چاہیے'' What to be سے ہے، افعال کی جواب دہی اور اعمال ذمہ داری اسی عالم

سے متعلق ہیں، جزا وسزا کا صدور اسی قانون سے وابستہ ہے، اللہ نے جن طریقوں کو پسندیدہ فرمادیا ہے (اور حقیقتاً وہ سارے طریقے بندوں کے فوز وفلاح کے ہیں) ان پر چلنے سے مرضیات الٰہی حاصل ہوتی ہیں اور انھیں کے آخری اور انتہائی مقام کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے (**یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الٰی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی**) اور اس کے برعکس اللہ کے ناپسند کیے ہوئے طریقوں پر چلنا، اپنی ہلاکت وخسارہ کی راہ اختیار کرنا، اپنے مذہب کی زبان میں اللہ کے سخط وعذاب کی طرف لے جاتا ہے جس کی آخری منزل کا نام جہنم ہے۔

ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ "بیٹا دیکھو، فضول خرچی نہ کرنا، تباہ وبرباد ہو جاؤ گے، بری صحبتوں میں نہ بیٹھنا ہلاک ہو جاؤ گے، مجھے اگر خوش رکھنا ہے تو اس کے فلاں فلاں طریقے ہیں اور اس کے لیے یہ یہ انعام ہیں، اگر کہا نہ سنو گے تو خود ہی اپنے کیے کو بھگتو گے، میرا کام سمجھا دینا ہے، اپنا نفع ونقصان خود ہی دیکھ، سمجھ سکتے ہو" لڑکا ان روشن ہدایتوں کے بعد سعید ثابت ہوا تو خیر، ورنہ اگر نالائق نکلا تو باپ پر اس کی کیا ذمہ داری؟ اور باپ کے متعلق یہ الزام کیونکر کوئی شائبہ معقولیت رکھ سکتا ہے کہ اس نے آپ ہی تو بیٹے کو گمراہ کیا اور آپ ہی سزا دے رہا ہے۔ یہ مغالطہ نہ ہو کہ اس مثال میں باپ تو خود مجبور ہے اور اللہ مجبور نہیں، قادر مطلق ہے، وہ قادر مطلق بیشک ہے لیکن اسی قدرت مطلقہ کا ایک ظہور یہ بھی ہے کہ اس نے قدرت کا ایک جز، یعنی قدرت تمیز اور اعمال میں قدرت انتخاب بندوں کی طرف منتقل کر دیا ہے اور اس لیے وہ اس باب میں آزاد وخود مختار ہیں، اب اس سوال پر کیا باقی رہا؟

یہ ساری گفتگو بدی کے وجود کو مسلم مان کر تھی، لیکن دقت نظر ایک قدم اور آگے بڑھا کر سوال کرتی ہے کہ دنیا جسے نقص، عیب، بدی کہہ اور سمجھ رہی ہے اس کا وجود فی الواقع کہیں ہے بھی، جو اس کی توجیہ وتعلیل پر قیل وقال کی ضرورت پیش آئے؟ یہ مسلم ہے کہ انسان کا علم ناقص ہے اور اس کی نظر محدود، وہی درمیانی آلات ووسائط، جن پر کم نظری وسطح بینی اول اول ٹھوکر کھاتی ہے، وسعت نظر وازدیاد علم کے ساتھ برابر آرام سے لذات میں، ناگواریوں سے خوشگواریوں میں، انقباض سے انبساط میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مدرسہ کی پابندی، کم سمجھ بچہ کو قید وبند سے کم دشوار

نہیں معلوم ہوتی اور ماں باپ ہیں کہ اس کی تعلیمی ترقیاں دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوئے جاتے ہیں، مریض آپریشن کے نام سے گھبرا رہا ہے اور اس کے تصور سے خوف کھا رہا ہے اور شفیق ڈاکٹر ہے کہ خوشی خوشی اپنے اوزار سنبھال رہا ہے کہ ابھی ابھی مریض کی تڑپ، راحت و آسائش سے بدل جائے گی، بچہ اور مریض کی نظریں کوتاہ ہیں، وسائط کو مقاصد سمجھے ہوئے ہیں، گذرگاہ پر منزل مقصود کا دھوکا کھا رہے ہیں، والدین اور ڈاکٹر کی نظریں دوررس ہیں، ان کا علم کامل تر ہے، عاجل اور آجل کا فرق نگاہ میں ہے اور انھیں واسطہ اور مقصود کی شناخت میں دھوکا نہیں۔

اس وسیع اور لق ودق کارخانہ کائنات کا ذرہ ذرہ، ایک دوسرے سے مربوط، متعلق ووابستہ ہے، ہر واقعہ دوسرے سے مرتبط، ہر شے کی ہستی، دوسرے کی زندگی سے دست وگریبان، ہر ہر تار دوسرے سے جکڑا اور گندھا ہوا، بچے اور نادان، قدم قدم الجھتے ہیں، حکیم ودانا، دور دور کی حکمتوں کی خبر لاتے ہیں اور بڑی بڑی گہرائیوں تک اتر جاتے ہیں، یہ فرق مراتب جب معمولی معمولی انسانوں کے درمیان نظر آتا ہے، تو جو ہستی علیم کل ہے، ہمہ علم وخبر ہے، کیسے مانا جائے کہ اس کی نظر میں کوئی بھی شے بدی کے حکم میں داخل ہوگی دنیا میں جن چیزوں کو بدی، مصیبت، نقص سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ خود اپنے قصور نظر کا نتیجہ ہے، اگر حجابات دور ہو جائیں، ہر شے سارے سلسلۂ وجود میں منظم ومرتب، ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوستہ ومربوط، پوری طرح اور اصلی رنگ میں نظر آجائے تو کس کی نگاہ میں یہ ''نقائص'' نقائص باقی رہ جائیں اس وقت ہر شے اپنی اپنی جگہ پر کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل میں سرگرم نظر آئے گی اور جو کوتہ نظری کو بدنمائی کے دھبے معلوم ہو رہے تھے وہی چشم دوربین میں حسن وزیبائی کے خدوخال بن جائیں گے، جو اللہ کے فضل وکرم سے اس منزل پر پہنچ گیا اس کے سامنے یہ سوال باقی ہی نہیں رہتا کہ دنیا میں بدی کا وجود کیوں ہے، وہ حیرت کے ساتھ یہ دریافت کرتا ہے کہ دنیا میں بدی کا وجود کہیں ہے بھی؟ ''وماذالک علی اللہ بعزیز''.

مذہبی تحقیق اور طلب حقیقت کی راہ، خودی وانانیت، ضد اور سخن پروری کی راہ نہیں، شکستگی و فروتنی، غور وفکر، سنجیدگی وتدبر کی راہ ہے، مبارک ہیں وہ جو صدق وطلب کی راہ پر سچے رہروؤں کی طرح چلیں، معروضات بالا کا مطالعہ اگر خلوئے ذہن کے ساتھ کیا گیا تو کریم کی کریمی سے کیا بعید ہے کہ دلوں کو تسکین وتسلی کا سہارا، کسی نہ کسی درجہ میں ہاتھ آجائے اور جو سوال اول نظر میں

بڑے معرکہ کا اور مہتم بالشان نظر آرہا تھا عجب نہیں کہ غور و تامل کے بعد معنی کی تحلیل اور اطراف و جوانب کی دیکھ بھال کے بعد قابل التفات بھی نہ رہ جائے اور اس کی بے حقیقی روشن و عیاں ہو کر رہے، واللہ اعلم و علمہ احکم.

(15)

دن اور تاریخ تو اب کسے یاد، اتنا یاد ہے کہ وسط اکتوبر کے بعد کا زمانہ تھا (اور سنہ تو یاد ہی ہوگا کہ عیسوی 1929 اور ہجری 1348 تھا) کہ یہ نامہ سیاہ ایک دن دوپہر کی گاڑی سے تھانہ بھون پہنچا، حاضری دو بار اس سے قبل ہو چکی تھی، اب کی البتہ کوئی سوا مہینہ، ڈیڑھ مہینہ کا پروگرام تھا، یا حافظہ پر زیادہ زور دوں تو خیال ایسا پڑتا ہے کہ اب کی قصد چالیس دن کے قیام کا تھا۔ 40 کے عدد میں برکت آج سے نہیں، ہزاروں سال قبل سے چلی آتی ہے۔ "وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً". مہمانخانہ کے بجائے ایک مستقل مکان کی انتظام ضروری تھا، قصبہ میں مکان اس وقت بہت ارزاں برائے نام کرایہ پر مل جاتے تھے، اسٹیشن سے حاضری تو سیدھے مولانا ہی کی خدمت میں دی اور دو ایک روز تک حضرت ہی کا کھایا، مکانکی تلاش جاری رہی، حضرت نے خود اس میں بڑی دلچسپی لی، دوسروں سے تلاش کی تاکید کی، مکانات قصبہ میں بڑے بڑے موجود ہیں، اچھی اونچی پختہ حویلیاں کرایہ کے لیے خالی، لیکن تلاش ایسے مکان کی تھی جو خانقاہ سے قریب سے قریب ہو، آخر ایک مکان مل گیا، بڑا تو ایسا نہ تھا، مگر ضرورت بھر کا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ خانقاہ سے کل چند قدم کے فاصلہ پر تھا، مسجد اشرفی کے بالکل سامنے گویا اب

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا تھا!

چند روز میں گھر والوں کو بھی بلا لیا، پکانے والا پہلے سے ساتھ تھا، اب اپنا گھر، اپنا دانہ پانی، پردیس میں دیس، سفر میں وطن کا لطف۔

خانہ داری کا سامان، دو ہی چار آدمیوں کے لیے سہی، بہرحال مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لیے اچھا خاصا چاہیے تھا، پلنگ، چوکی، میز، کرسی، پکانے ریندھنے کے برتن، کھانا کھانے کے برتن وغیرہ، سارے کھڑاگ کا انتظام بڑی حد تک مولانا نے گھروں سے خود ہی کر دیا اور جو خادم بننے کے لیے آیا تھا، اسے ایک حد تک مخدوم بنا دیا۔ یہ تھے "خشک" اور "درشت" مولانا اشرف علی!

خیال یہ تھا کہ مدت قیام کے لیے دستور العمل کوئی ریاضتی قسم کا تجویز ہوگا، معمولات عابدوں، زاہدوں کے سے مقرر کیے جائیں گے، تہجد وشب بیداری کی تاکید ہوگی اور دن رات میں بڑی تعداد ذکر وغیرہ کی بتادی جائے گی، واقعتاً یہ کچھ بھی نہ ہوا، ایک روز ڈرتے ڈرتے گزارش بھی کی کہ کچھ پڑھنے کو بتادیا جائے تو اس کی تعمیل کی جائے، جواب میں ارشاد ہوا کہ "کوئی خاص ضرورت تو اس کی نہیں ہے، اگر کوئی بات خیال میں آگئی تو کہہ دوں گا"۔ اب معمول یہ تھا کہ کوئی سوا نو ساڑھے نو پر، کوئی خادم صاحب آتے اور حضرت کی طرف سے بلاوا ہرگز نہ دیتے، بلکہ صرف اتنا کہہ جاتے کہ "مولانا نے فرمایا ہے کہ میں اس وقت خالی ہوں، اگر آپ کو بھی فرصت ہو اور جی چاہے تو آجایئے" قربان جایئے ان حکیمانہ احتیاطوں کے، خوب جانتے تھے کہ اس شرف حضوری ہی کے لیے تو وطن سے چل کر آیا ہوں، اتنے دنوں کے لیے وطن کی ضرورتوں کو چھوڑ آیا ہوں، ہر طرح نیاز مند ہوں، اس پر یہ کبھی نہ کرتے کہ مخدومانہ، حاکمانہ، افسرانہ لہجہ میں کہلا بھیجتے کہ آجاؤ، بلکہ ہمیشہ لحاظ اس نیاز مند ہی کی فرصت کا اور طبیعت کی آمادگی کا رکھ لیتے کہ بار کسی طرح کا بھی نیاز مند کی طبیعت پر نہ پڑے اور نہ کسی طرح اس کا حرج ہو، اللہ اللہ! اتنی احتیاط اور کون کرے گا؟ چھوٹوں کے لیے نہ سہی، اپنے برابر والوں کے لیے بھی کون جذبات کی اتنی رعایت رکھتا ہے۔ کاش حضرت کے ہزار ہا مریدوں اور بیسیوں خلفا میں سے، سب نے نہ سہی، اکثر نے بھی درسگاہ اشرفی کا یہ ابتدائی سبق حاصل کرلیا ہوتا! اسے کوئی اہم اور قیمتی شے سمجھ کر اس پر توجہ ہی کی ہوتی!

پہلی بار جو خادم صاحب بلانے کو آئے وہ بجائے زبانی پیام کے ذیل کا پرچہ لائے:

"مکرمی- السلام علیکم- میں اس وقت فارغ ہوں، اگر جی چاہے تشریف لایئے، لیکن اگر اس وقت کوئی شغل ایسا ہو جس کا انقطاع تشویش کا سبب ہو، تو تکلیف نہ کیجیے، دوسرا وقت مل جائے گا۔ اشرف علی"۔

ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا شغل، اس کے مقابلہ میں اور کیا ہوسکتا تھا؟ حاضری تھانہ بھون اور عارضی مہاجرت کی غرض ہی اس کے سوا اور کیا تھی، اس پر بھی یہ اہتمام دوسرے کی طبیعت پر بار پڑنے، دوسرے کے مشاغل میں حارج ہونے کے باب میں تھا، یہ احتیاط دوسرے پر تفوق وبالادستی جتلانے کے باب میں تھی کہ اپنے کسی قول وعمل میں امکان بھر اس کا شائبہ بھی نہ آنے

پائے۔ کوئی اور مولانا کے زہد وتقویٰ پر گرویدہ ہوا ہوگا، کوئی ان کے علوم ومعارف سے مسخر ہوگیا ہوگا، اس نامہ سیاہ کے دل کو گھائل کرنے والی تو مولاناؒ کی یہی ادائیں ذرہ نوازی اور بندہ پروری کی تھیں۔ عبد کامل کے سچے جانشینوں میں جھلک ہونی بھی اسی رحمۃ للعالمین کی چاہیے۔

ہاں تو معمول ہوگیا کہ وہی کوئی سوانو، ساڑھے نو پر خانقاہ پہنچ جاتا، گھر سے دو قدم پر تو تھی ہی، حضرت سہ دری میں تشریف فرما ہوتے، ہاتھ میں تسبیح کبھی ہوتی، کبھی نہ ہوتی، بائیں طرف دیوار میں، دھوپ گھڑی کے حساب سے وقت بتانے والی بڑی گھڑی لگی ہوئی، اس کے نیچے بیٹھنے کا ایما فرمایا جاتا، ایک جیبی گھڑی کھلے ہوئے کیس میں حضرت کے سامنے ڈیسک پر رکھی رہتی، دو چار لوگ اور آجاتے، عموماً اہل تخصیص ہی ہوتے، بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا، نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹہ رہتی، باتیں ہر قسم کی ہوتی رہتیں، گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے، لیکن ہم لوگوں کو بھی بے تکلف بولنے چالنے، پوچھنے پاچھنے، سوال وجواب کرنے کی اجازت تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر یا خود ہی مولانا کسی فقہی، کلامی، تفسیری، سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل ومسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرمادیتے، جسے حاضرین بڑے انشراح قلب کے ساتھ سنتے لیکن ایسا بہت کم ہوتا، عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے، یہی رہتی اور بغیر اس کے کہ سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے اور بغیر اس کے کہ وہ اسے محسوس بھی کرنے پائیں کہ انھیں کوئی خاص تعلیم دی جارہی ہے، خدا جانے کتنے مسائل، کتنی کام کی باتیں، باتوں باتوں میں ان کے کان میں پڑ جاتیں۔ معزز اور بزرگ صحابیوں کو بھی، تعلیم کیا اصطلاحی قسم کی، کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ ملا کرتی؟ ثقہ راویوں سے بعد کو سننے میں آیا کہ اس مجلس چاشت کا دستور اس سے قبل نہ تھا اور اس بدعت حسنہ کی بنیاد اسی تباہ کار کی حاضری کے وقت سے پڑی، یہ اگر صحیح ہے تو حضرت نے حد کردی، ذرہ نوازی اور ایک خاکسار کی سرفرازی کی!

کوئی 11 بجے سہارنپور کی طرف سے گاڑی آتی اور بڑی ڈاک اسی سے آتی (1) ریل کی آواز سن (اسٹیشن دوہی فرلانگ پر تو تھا) اور کبھی گھڑی دیکھ، چند منٹ بعد حضرت اٹھنے کا قصد فرماتے اور بڑے ہی ملتجیانہ لہجہ میں (جیسے کوئی چھوٹا، اپنے بڑے کے سامنے درخواست پیش کر رہا

---

(1) دوسری ڈاک دلی کی طرف سے آنے والی سہ پہر کو قبل اذان عصر آتی، وہ نسبتاً ہلکی ہوتی۔

ہے) حاضرین سے کہتے ''ذرا گھر ہو آؤں'' اور کبھی تصریح کے ساتھ لفظ اجازت بڑھا دیتے، ''اجازت ہو تو ذرا گھر ہو آؤں'' یہ کہہ کر حضرت ڈاک دیکھنے، کھانا کھانے اور ذرا کی ذرا استراحت فرمانے کے لیے دو فرلانگ کے فاصلہ پر، گرمی کی کڑی دوپہر اور برسات کی شدید بارش میں، زنانہ مکان تشریف لے جاتے، دو سوا دو گھنٹہ کے بعد ظہر کی اذان ہوتی اور حضرت پھر تشریف لے آتے (کسی پچھلے نمبر کی اس تشریح کو یاد کر لیجیے کہ مسجد اور خانقاہ کی عمارت باہم متصل اور گویا ایک ہی تھی) بعد ظہر اسی سہ دری میں نشست عام ہوتی اور مجمع اچھا خاصا ہو جاتا، ڈاک کثرت سے ہوتی، روزانہ اوسط، 30، 40 خطوط کا تھا، یہ وقت جواب لکھنے کا ہوتا، حضرت خطوط کے جوابات لکھتے جاتے (کبھی کوئی خط اہل تخصیص کو مع اپنے جواب کے سنا بھی دیتے) لوگوں سے گفتگو بھی کرتے جاتے اور جو اہل حاجت تعویذ و نقش کے طالب ہو کر آتے، ان کی حاجت روائی بھی کرتے جاتے۔ حاضر دماغی کی ایسی مثال بھی کمتر دیکھنے میں آئی ہے، عصر کی اذان پر یہ محفل برخاست ہوتی، حضرت نماز عصر پڑھا کر پھر مکان تشریف لے جاتے۔ مغرب کے بعد اگر کسی کو کوئی خاص بات کرنی ہوتی تو اسے وقت دیتے، کسی کو بیعت کرنا ہوتا تو اسی وقت کرتے۔ ذکر صبح کی مجلس کے لیے طلبی، بلکہ اطلاع دہی کا شروع ہوا تھا اور اسی پر یہ روزانہ پروگرام کا قصہ چھڑ گیا، جو ایک بار اجمالاً پہلے بھی آچکا ہے، ایک روز صبح میری حاضری پر ارشاد ہوا کہ ''آپ ہر روز جو میری اطلاع پر آجاتے ہیں اس سے مجھے شبہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں آپ اسے طلبی سمجھ کر اپنا حرج کر کے تو نہیں آجاتے ہیں، ایسا کیجیے کہ کبھی میری اطلاع پر نہ بھی آئیے، کم از کم ایک ہی دفعہ سہی، تو میرے دل کو اطمینان ہو جائے اور میں یہ سمجھوں کہ آپ اسی روز آتے ہیں، جس روز بالکل بلا تکلف آسانی سے آسکتے ہیں، ورنہ مجھے شبہ یہی رہے گا کہ آپ اپنی طبیعت پر بار ڈال کر اپنا حرج کر کے چلے آتے ہیں''۔

جی میں آیا کہ ایک آدھ بار اس ارشاد کی تعمیل میں ناغہ کر ہی دیا جائے لیکن عملاً کبھی ہمت نہ ہوئی، پہلے سے ارادہ بار بار کرتا، لیکن جب وقت آتا تو دل کبھی گوارا نہ کرتا کہ آج کی محرومی پر صبر کر لیا جائے۔

(16)

مدینہ منورہ ہر سال ہزاروں حاجی حاضر ہوتے رہتے ہیں اور اپنے ظرف و بساط کے لائق

وہاں کے انوار و برکات سے مستفید ہو کر آتے ہیں، اپنی کم نصیبی کہ جب اسی سال 1929ء میں، قبل حج حاضری ہوئی تو بجائے کسی ایجابی نفع اور فرحت وانبساط کے ایک سلبی کیفیت محسوس ہوئی، یعنی اپنے ڈھکے چھپے عیوب سب اپنے پر کھلنے لگے، اور دل بے اختیار اپنے کو نفریں وملامت کرنا چاہنے لگا اور اپنی بے عملی بلکہ بد عملی قدم قدم پر محسوس ومشاہد ہونے لگی۔ چھ مہینہ بعد، اسی کیفیت کا اعادہ، تھانہ بھون کے قیام میں ہوا، معتقدین یہاں کے طرح طرح کے فضائل وعجائب بیان کرتے تھے، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ "مجھے یہاں کی ہوا میں خوشبو محسوس ہوتی ہے" ہوتی اور ضرور ہوتی ہوگی، اپنا تجربہ سب سے مختلف، اپنی یافت سب سے الگ رہی، اپنے کو تو نہ انوار نظر آئے نہ اسرار وعجائب کا انکشاف ہوا، ہفتوں کے طویل قیام میں بات ایک ہی ہاتھ آئی، چاہے جتنے مختلف عنوانوں سے اسے بیان کیا جائے اور وہ تھی اپنے نفس کی کدورت، اپنے اندر کی خباثت کہ جسے خود دیکھیے اور آپ اپنے سے شرمایئے۔ "فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ" - غالب نے جو مدت ہوئی کہا تھا۔

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

شاعری نہ تھی، اب جا کر کھلا کہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان آپ اپنی نظر میں چور ٹھہر جائے، اب تک نظر میں جو ہنر تھے معلوم ہوا کہ وہ عیب ہیں اور دوسروں کی جھولی میں جو کوئلے اور پتھر دکھائی دے رہے تھے اب ثابت ہوا کہ وہ عین لعل وگہر ہیں، تکلفات، رسوم، تصنعات کی ایک دنیا کی دنیا، نظر سے رخصت ہوگئی اور اپنی جگہ حقائق کے لیے خالی کر دی۔

خیال یہ تھا کہ یہاں صوفیوں کے سے دعوے ہوتے ہوں گے، مجذوبوں کے ہاں کے سے احکام جاری ہوتے ہوں گے، کشف وکرامات کے چرچے اور تذکرے ہوتے ہوں گے، بڑا زور خوابوں اور کیفیات کا رہتا ہوگا اور سب سے زیادہ اہمیت واہتمام کے ساتھ ذکر وشغل کے حلقے ہوتے ہوں گے۔ مولاناؒ کی تصانیف ومواعظ کے مطالعہ اور قبل کی مختصر صحبتوں اور ملاقاتوں نے ان تخیلات کو ضعیف ضرور کر دیا تھا، پھر بھی اچھی خاصی جان ان میں باقی تھی، اب کی طویل صحبت اور روزمرہ کی گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اتارا کہ اصل شے تو احکام شریعت ہیں، مدار کار تو

اتباع کتاب وسنت ہے، البتہ پورے اخلاص وتزکیۂ قلب کے ساتھ، اللہ کے حقوق بقدر امکان ادا کیجیے، فرائض وواجبات میں حتی الامکان غفلت نہ کیجیے۔ اللہ کے بندوں سے اچھی طرح ملیے جلیے، باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، ماں، بہن، لڑکی استاد، شاگرد، ملازم، آقا، دوست، پڑوسی، سب کے حق پہنچایے اور امکان بھر ادا کیجیے، بلاضرورت دنیا کے غموں اور دوسروں کے قصے، قضیے میں نہ پڑیے، بلاوجہ کسی کی بھی، ادنیٰ سی بھی دل آزاری، دل شکنی نہ کیجیے، احتساب نفس کرتے رہیے، اپنی اصلاح کی فکر میں لگے رہیے، طاعت ارادی کو جانے نہ دیجیے، غفلت غیر ارادی کی پروانہ کیجیے، بس یہی عطر تصوف ہے اور جان طریقت ہے، بیسیوں غیر ضروری مسائل، جو تصوف میں گھس آئے ہیں، سب مجالس اشرفی کی برکت سے صاف ہوئے، ایک آدھ وعظ بھی اسی دوران میں ہوا اور خوب ہوا لیکن جو علوم ومعارف روزمرہ کی بے تکلف مجلسوں میں سننے میں آتے رہے ان کی بات ہی کچھ اور تھی، گہری سے گہری باتیں، دلچسپ رنگ میں ادبی لطیفے، مزاحی چٹکلے، لفظی مناسبتوں کے مظاہرے اس پر مستزاد، بڑا ہی ظالم بلکہ مفتری تھا وہ جس نے ایسے پیارے من موہنے مولانا کو ''خشک'' مشہور کیا۔

ناقص قسم کے مشائخ وصوفیا کی تعلیمات جو دماغ میں بھری ہوئی تھیں، وہ تو تھیں ہی، اس سے بڑھ کر زہریلا مواد، دل میں فقہ وفقہا کے خلاف جمع تھا، اللہ بخشے مولانا شبلی مرحوم کو، وہ اور بہت سی خوبیوں اور اوصاف کے آدمی تھے، ان کے کمالات کی قدر نہ کرنا ناانصافی ہے، لیکن اس خاص آگ کو ان کی تصانیف اور پھر طویل صحبت نے اور بھڑکا دیا تھا اور جی میں یہ بات جم گئی تھی کہ جیسے یہ پوری جماعت کی جماعت احمقوں، کم فہموں، خشک مزاج لکیر کے فقیر کٹھ ملاؤں کا ایک گروہ ہے۔ یہ زنگ بھی مجالس اشرفی سے دور ہوا، مولانا ہی نے بار بار معقول، مدلل، گفتگوئیں کر کر کے کثرت سے مثالیں دے دے کر سمجھایا کہ شریعت کے نظام میں فقہ کا مقام کتنا بلند ہے اور یہ فقہا درحقیقت امت کے عقلا اور ملت کے حکما ہوئے ہیں، نظم ملت انہی کے دم سے وابستہ ہے، انھوں نے اگر کتاب وسنت کی روشنی میں عقلی، منطقی قاعدوں کے ماتحت اور فطرت بشری کے روزانہ تجربوں کی مدد سے اتنی جزئیات ہر شعبۂ زندگی سے متعلق نہ مرتب کر دیے ہوتے تو آج ہم لوگ خدا معلوم کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوتے اور امت منتشر ہو کر کیسی کیسی گمراہیوں میں بٹ چکتی، فقہا وصوفیا

دونوں درحقیقت اسلام کی فوج کے اہم بازو ہیں، رہے ان کے "بدنام کنندۂ نکونامے چند" نمونے، تو ظاہر ہے کہ کس گروہ میں نہیں ہوتے، یا نہیں ہوسکتے، رائے ہر گروہ کے بہترین ہی نمائندوں سے قائم کرنا چاہیے، نہ کہ ان کے بدترین نمائندوں کو دیکھ کر۔

بڑے گاؤں (ضلع بارہ بنکی) کے ایک چھوٹے سے رئیس تھے شیخ حسن الرحمٰن قدوائی (گھریلو نام محسن میاں) متقی محتاط، عالم وطبیب بھی تھے، مولاناؒ کے شاگرد بھی زمانۂ قیام کانپور میں رہ چکے تھے، ایک زمانہ میں لکھنؤ کے شیخ الوقت، مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ سے بیعت بھی ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد سے بڑی تمنا رکھتے تھے کہ اب تجدید بیعت مولانا کے ہاتھ پر کریں، گھر سے نکلتے اور اتنا بڑا سفر کرتے ہچکچا رہے تھے، میں نے ہمت دلائی کہ میرے زمانۂ قیام میں آیئے اور میرے ہی یہاں اتریئے۔ آئے، دوپہر کا وقت تھا، اسی شام کو بعد مغرب دیکھا کہ مولاناؒ، اپنے ہاتھ پر ہنسی خوشی بیعت کر رہے ہیں، نہ کوئی جرح نہ سوال وجواب۔ مولاناؒ نے اب بیعت لینا بہت کم کر دی تھی، جس کسی کو مرید کرتے بھی تو بڑی قیل وقال اور بہت سی شرطوں کے پورا کرنے کے بعد، ان کے لیے یہ کوئی بھی صورت پیش نہ آئی، آئے اور کھٹ سے مرید ہو گئے، اس لیے کہ صلاحیت پوری طرح موجود تھی، شیخ نے اوّل نظر میں بھانپ لیا اور کسی مزید جرح کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسروں کے مذاق فاسد کی بنا پر، ضرورت ردوقدح کی ہوتی ہے۔ مولاناؒ قواعد وضوابط کے محکوم نہ تھے، قاعدے اور ضابطے سب ضرورتاً اور سہولت کے لیے بنا لیے تھے، یہ نہ تھا کہ اپنے اور دوسروں کے ہاتھ باندھ دینے کے لیے خواہ مخواہ کچھ ضابطے عائد کر لیے ہوں، یہ واقعہ خاص اسی غرض سے درج کیا جاتا ہے، مولاناؒ کو ایک گروہ ضابطہ پرستی میں بدنام کر چکا ہے، بدنامی تمام تر بیجا۔ ایسے لوگوں نے قریب سے حضرت کو دیکھا ہی نہیں۔

یاد ہوگا کہ جولائی 1928 میں میری بیعت ضابطہ سے حضرت ہی کے حسب مشورہ وایما، مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ کے ہاتھ پر ہوئی تھی، تفصیل سب اوپر گزر چکی ہے، تھانہ بھون کے قیام کو اب کی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ مولانا کا مکتوب ذیل، دیوبند سے موصول ہوا:

"محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ محررہ 16 اکتوبر باعث سرفرازی ہوا تھا، اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہوں گے،

خداوند کریم وہاں کی حاضری باعث برکات لاتعناہیہ کرے، آمین

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی　　　　بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھ کو قوی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرمائیں گے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرض محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر محمل پر حمل نہ فرمائیں، میں نے حسب الارشاد حضرت مولانا دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے اصرار پر اس وقت بیعت کر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی، روسیاہی، ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے انس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے، "وللہ الحمد، اللھم زد فزد"، اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بیعت بھی کر لیں، مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے، میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا یہی عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں اور درخواست کریں تو جناب ان کو ضرور بیعت کر لیں، قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے، اسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے۔

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرما لیا کریں، نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعا کی التجا کر دیا کریں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ، دیوبند، 20 جمادی الاول 1348

مکتوب آپ نے (کاتب کی اجازت کے بغیر) پڑھ لیا تو دو لفظ، مکتوب الیہ کی زبان سے، کاتب سے متعلق بھی سنتے چلیے اور اس کے لیے ذرا صبر و انتظار سے کام لیجیے کہ اس ارشاد کی تعمیل ہوئی یا نہیں اور حکیم الامت نے اس سے کیا اثر لیا۔

مولانائے دیوبندی کے سیاسی خیالات جو کچھ بھی ہوں اور اجتہادی غلطیاں تو صحابہ کرامؓ تک سے ہوئیں اور بار بار ہوئیں، بلکہ مذہب اہل سنت کا دارومدار ہی کہنا چاہیے کہ غیر نبی کے غیر معصوم ہونے کے عقیدہ پر ہے، لیکن جہاں تک تواضع، ضبط نفس، ایثار و انکسار اور جذبہ خدمت خلق کا تعلق ہے مولانا حسین احمد صاحب کی ذات، اپنی جگہ بے نظیر ہے، ہاں خود ان کے استاد شیخ الہند

کی نظیر ہو تو ہو، یا پھر ان ہی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی مہاجر مدنیؒ تھے۔قوم عجیب افراط وتفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے، کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے، خفا ہوئے تو گالیاں دینے اور لعنت برسانے لگے، گویا ان کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو اور اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے ادھر کوئی درجہ نہیں، توازن واعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص ورجال کو، ان کے صحیح مقام پر رکھنا، ہم لوگ بھول ہی گئے، ہیں شیعیت اور خارجیت دونوں بے اعتدالی کی پیداوار ہیں اور اہل سنت کا مذہب جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا، افسوس ہے کہ وہ خود اب اسی بدبختی کا شکار ہوا جا رہا ہے!

(17)

مشورہ یا ارشاد بزرگانہ، مخلصانہ، مشفقانہ، سب کچھ سہی، بہر حال ناقابل عمل تھا، اکتوبر 1929 میں بھی اسی طرح ناقابل عمل، جس طرح جولائی 1928 میں تھا، وہ گرامی نامہ بجنسہٖ حکیم الامت کی خدمت میں پیش کر دیا گیا، ارشاد ہوا کہ ''اس کا جواب میں لکھ دوں گا، آپ کو لکھنے میں شاید دقت ہو'' اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے یہی مقصود بھی تھا۔اصل مکتوب پڑھ لینے کے بعد اب اس جواب سے مشرف ہو لیں:

''مخدومی ومکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مولوی عبدالماجد صاحب کے نام جو گرامی نامہ آیا اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا، گو اس وجہ سے کہ میں اس کا مخاطب نہیں، مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں، لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاددہانی بھی ہے اس لیے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مجملاً تو وہی عذر ہے جو زبانی عرض کیا تھا اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے اس لیے امید ہے کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے، وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت وسوءِ خلق تو مشہور ہے، مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت ودل جوئی جو صمیم قلب سے ہے وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے، کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیے

جائیں، دوسرے گوان کو مجھ سے موانست کافی ہے، لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے، اس کو میں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا، جس کا میں شکر گزار ہوں اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا، لیکن جو اوّل بار میں بقول خود میری خاطر منظور تھی، سو اب بھی میری خاطر منظور فرمائی جائے اور جس طرح سے کام چل رہا ہے چلنے دیا جائے کہ آپ ان کے مخدوم رہیے اور مجھ کو خادم رہنے دیجیے اس جدید تبدل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے، جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا جو ان کی قدرت سے خارج ہے تکلیف مالا یطاق ہے جو ہر پہلو سے منفی ہے۔ والسلام

ناکارہ ننگ انام اشرف برائے نام۔ از تھانہ بھون،

جمادی الاول 1348

انگریزی تاریخ 26 اکتوبر 1929 تھی، اس سے ضمناً یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ کم از کم اس تاریخ تک دونوں حضرات کے تعلقات شدید سیاسی و اجتہادی اختلافات کے باوجود آپس میں کتنے شگفتہ اور مخلصانہ تھے اور مضمون جواب کی جامعیت نا قابل دید ہے، ہر گوشہ کو گھیرے ہوئے اور ہر پہلو کو سمیٹے ہوئے۔ یہ جواب ایک لفافہ میں رکھا ہوا میرے پاس آیا اور اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ میرے نام بھی:

"مکرمی سلمہٗ، السلام علیکم، میں نے ایک مضمون مولانا کے جواب میں لکھ دیا ہے، ہر چند بوجہ اپنے مخاطب نہ ہونے کے مجھ کو استحقاق خطاب کرنے کا نہ تھا، مگر چونکہ آپ آزادی سے شاید ان کی خدمت میں عرض نہ کر سکتے میں نے بطور اعانت کے یہ خطاب کیا ہے، اب میری استدعا یہ ہے کہ آپ آزادی سے اس پر نظر فرما دیں، اگر کسی ترمیم کی حاجت نہ ہو تو اس کو مع اپنے تائیدی مضمون کے روانہ فرما دیں اور اگر ترمیم مصلحت ہو تو اس کو بعینہٖ روانہ فرمائیں اور ترمیم کا لحاظ اپنی تحریر میں فرمالیں۔ مگر میرے آئندہ معروضات کے لیے مجھ کو ترمیم کی اطلاع فرما دیں تاکہ آئندہ اسی لحاظ سے عرض معروض کیا کروں۔

والسلام۔ اشرف علیؒ"

ترمیم کی ظاہر ہے کہ بھلا کیا گنجائش تھی، بڑے شکریہ کے ساتھ بجنسہ اس خط کو، اپنے عریضہ کے ساتھ روانہ کردیا۔ ''بزرگی'' کا جو عام تخیل دلوں میں بیٹھ گیا ہے کہ ''بزرگ'' اور اہل اللہ وہ ہے جو بجز تسبیح پڑھتے رہنے کے اور کچھ نہ جانتا ہو، نہ اس کا کوئی مشغلہ ہو، نہ وہ کسی معاملہ میں کوئی مشورہ یا رائے دے سکے، محض بھولے بھالے قسم کا زاہد خشک ہو، مولانا کی بزرگی، اس سے کتنی مختلف تھی اور ان ہی پہلوؤں کی تھوڑی بہت نقش کشی، ان ''نقوش وتاثرات'' کی علت غائی ہے۔

دن گزرتے گئے اور ہفتوں پر ہفتے بیت گئے، سفرحج کو مستثنیٰ کرکے، وطن سے باہر اتنے روز رہنے کا یہ اتفاق مدتوں کے بعد ہوا تھا، اپنی کیفیت عاشقانہ نہ تھی، نہ یہ تھا کہ وطن یاد نہ آتا ہو، وہاں کی ضرورتوں اور کاموں کی طرف خیال نہ جاتا ہو، یاد برابر ایک ایک چیز آرہی تھی، ہر ہر ضرورت کا احساس تازہ تھا، لیکن طبعاً نہیں عقلاً یہاں کے قیام کو سب پر ترجیح تھی، فطرت بشری عجب متضاد عنصروں کا مجموعہ ہے، انسان ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں سے کشاکش میں رہتا ہے، عمر ہی اس کشمکش میں تمام ہو جاتی ہے، مبارک اور خوش نصیب ہے وہ جو کسی درجہ میں عقل کو حاکم اور طبیعت کو مغلوب رکھے، اکبر کے حکیمانہ مصرع

غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

میں یہ ''اِدھر'' اور ''اُدھر'' سے اشارہ اسی طبیعت اور عقل کی کشمکش کی جانب ہے۔ اور پھر تھانہ بھون کی سی پرسکون فضا اور کہاں نصیب ہو سکتی تھی، راحت قلب اور تسکین خاطر کا ہر سامان موجود، پانچوں وقت مولانا کی اقتدائیں نماز، یہ نعمت خود کچھ تھوڑی تھی، آہ وہ جہری نمازوں کی نعمت، فن تجوید میں کمال کا حال تو فن والے جانیں، لیکن آواز کی دلکشی اور تاثیر کو تو ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے، غضب کی دلکشی تھی فجر کی قرات خاصی طویل ہوتی، مگر جی یہی کہتا کہ بس

وہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی!

عتاب کے منظر بھی اس مدت میں بارہا دیکھے، مولاناؒ کے ہاں کوئی چیز رازکی یا پوشیدہ نہ تھی، یہ منظر اکثر وہی بعد دوپہر والی مجلس عام میں پیش آتے، مولانا بڑے ہی لطیف الحس اور ذکی الحس تھے، کسی بے ڈھنگی اور بے قاعدہ بات کی برداشت نہ تھی، لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے کہ مورد عتاب ہو جاتے، تکلف اور مصنوعی ادب وتعظیم تو گویا حضرت کی چڑھ تھی، لوگ عموماً

اسی کے عادی، خیر جس پر جو گزرنا ہوتی گزر جاتی لیکن اتنا فائدہ بہر حال ہوتا کہ خود اس کو بھی آئندہ کے لیے سبق مل جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت وبصیرت ہو جاتی، مجذوب کے اس مصرع میں کہ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

شاعری نہیں واقعہ بیانی ہے، مجلس میں سب سے زیادہ ڈھیٹ اور بے لحاظ یہی نامہ سیاہ تھا، بارہا عین عتاب کے وقت مجرم کی طرف سے کچھ عرض ومعروض کی جرات کر گزرتا، حضرتؒ کا کمال علم تھا کہ تبسم کے ساتھ نرم لہجہ میں کچھ جواب ارشاد فرما دیتے۔ برکتوں کے دن، فیض کی راتیں گزرتی گئیں، آغاز انجام کو پہنچا، مدت قیام ختم ہو گئی اور نومبر کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ یہ مسافر اس آستانہ سے رخصت ہو گیا، نوازشوں اور عنایتوں سے مالا مال، پھر بھی حسرتوں سے گرانبار ؎

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہت کچھ پوچھ ڈالا بہت کچھ بے پوچھے پاچھے سن لیا، لیکن جو پوچھنا اور سننا اور سیکھنا باقی رہ گیا اس کی میزان اس سے بھی کہیں زائد!

گھر پہنچا تو اپنے نامور ہمنام اور مخلص کرم فرما، مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کا دعوت نامہ حضرت مولاناؒ کے نام جلسۂ مخالف شاردا ایکٹ میں شرکت کے لیے اپنی ڈاک میں پایا، بات اب معمولی معلوم ہوتی ہو، اس وقت معمولی نہ تھی، یہ شاردا ایکٹ کیا؟ اس کی مخالفت میں جلسہ کیا اور کہاں؟ اور مولانا کی شرکت کی اس میں کیا اہمیت؟ ہر سوال ایک مستقل جواب چاہتا ہے۔ ماضی کی فنا شدہ موجوں کو حال کی فضا میں کوئی کیسے لوٹا لائے!

مرکزی اسمبلی میں ایک ہندو ممبر آنریبل مسٹر ہربلاس شاردا نے مسودۂ قانون یہ پیش کیا کہ ہندوؤں میں کم سنی کی شادی بہت نقصان پہنچا رہی ہے اس کی قانونی ممانعت ہونی چاہیے اور لڑکی اور لڑکے کی شادی، فلاں سن سے قبل، جرم قرار دینی چاہیے، ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق تمام تر ہندوؤں سے تھا، بعض نافہم مسلمان ممبروں نے خواہ مخواہ اس کا دائرہ مسلمانوں کے لیے بھی وسیع کرا دیا۔ اب مسلمان چونکے اور اس صحیح احساس کے ساتھ کہ یہ عمر ازدواج کی قید تو شریعت کی آزادی میں صریح دست اندازی ہے، لگے اس کی مخالفت میں جلسے کرنے اور ریزولیشن پاس کرنے، خوش قسمتی سے تحریک کی رہنمائی کی باگ مولانا محمد علیؒ کے ہاتھ میں آگئی، جو مذہب

وسیاست کے صحیح امتزاج کا ایک مکمل نمونہ تھے اور مولانا شاہ عبدالماجد بدایونی مرحوم بھی وقت کی دوسری مفید اور ملی تحریکوں کی طرح اس میں بھی پیش پیش تھے، 22 دسمبر کو کانپور میں مولانا محمد علیؒ کے زیر صدارت ایک عظیم الشان مرکزی جلسہ اسی مقصد کے لیے قرار پایا اور مولانا بدایونی کی طرف سے علاوہ عام مطبوعہ دعوت نامہ کے ذیل کا ذاتی اور خصوصی دعوت نامہ حضرت مولانا کے نام، اس حقیر کے توسط سے موصول ہوا:

اللہ ولاسواہ

ذوالمجد والکرم عظیم القدر جناب مولانا شاہ اشرف علی صاحب

السلام علیکم، فقیر عبدالماجد القادری البدایونی عارض مدعا ہے۔

ضروریات مذہب وحالات اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ میں جناب سے گزراش کروں کہ 22 دسمبر کو کانپور تشریف لاکر قانون خلاف شریعت کے انسداد وامحاء کی مجلس میں اپنے مذہبی اور عالی خیالات سے ہماری امداد فرمایئے۔

میں سنتا ہوں کہ جناب سفر کے کم عادی ہیں اور موسم بھی تلخ ہے اور شاید مسافت بھی زائد اور جناب کے حالات واوقات بھی مشغول اور گھرے ہوئے ہیں، مگر باوجود اس کے جو امر داعی باعث زحمت دہی بنا رہا ہے وہ ایک اور فقط ایک ہے، یعنی خدمت تحفظ شریعت اور اس کے لیے ہر طبقہ کے مسلمانوں کا ایک مرکز نقل وشرف پر مجتمع ہو جانا۔

یقین ہے کہ اس امر کی اہمیت کا ممتاز لحاظ فرما کر اور فقیر کی تحریک کو درجۂ اختصاص وقبول دے کر محض دین ومذہب کے لیے باوجود مشاغل کثیرہ یا اعذار واقعیہ تکلیف سفر گوارا فرمائی جائے گی اور نوید تشریف آوری سے اطلاع بخشی جائے گی۔

میرا مسلک وعمل، اس مقصد وجہد کے لیے ہر محافظ وخادم شریعت اور مخالف قانون زیر نظر (شاردا ایکٹ) کو وسعت قلب کے ساتھ شریک کار ورفیق عمل ومشیر تدابیر بنانا ہے، اس کی اہمیت آپ کے ذہن وفکر میں بھی مجھ سے کم نہ ہوگی۔

اور یقین ہے کہ اس بار آپ غیر معمولی ہمت سے کام لے کر، اپنے عزم صمیم اور شرکت کے وعدہ سے مطلع فرمائیں گے۔

مطبوعہ دعوت نامہ بھی حاضر کیا جائے گا مگر یہ عریضہ فقیر کے خصوصی جذبات کا ترجمان ہے

فقیر عبدالماجد القادری البدایونی

(از کانپور، بانس منڈی، دفتر جماعت استقبالی

معرفت مولانا عبدالکافی صاحب)

بدایونی مرحوم جس طرح ایک بڑے جوش بیان مقرر اور نامور خطیب تھے، اسی طرح بڑے خوش مزاج اور مخلص نواز تھے اور میرے تو خصوصی کرم فرما تھے، لیکن حضرت مولاناؒ سے بالکل صفائی نہ تھی، اول تو عقائد میں دیوبندی و بریلوی اختلاف مدتوں سے، پشتوں سے، سدراہ بنا ہوا تھا، نوبت تکفیر تک کی آچکی تھی، پھر ذاتی طور پر سیاسی اختلافات بھی شدید قسم کے حائل رہ چکے تھے، اس موقع پر مولاناؒ کو مدعو کرنا ہمت دعالی ظرفی کا کام تھا، مولانائے بدایونی کر گزرے، ادھر حضرت مولاناؒ بھی، خیر نیم سیاسی مجلسوں میں تو کیا جا کر شریک ہوتے، یوں بھی وعظ و تلقین یا اور کسی غرض سے سفر کرنا اب کئی سال سے ترک کر چکے تھے اور آنت اتر آنے کے عذر سے اب وطن سے کہیں باہر نہیں نکلتے تھے، بلکہ ایک مطبوعہ معذرت اس باب میں شائع و تقسیم بھی فرما چکے تھے۔ مولانائے بدایونی نے مجھ سے محض پوسٹ مین ہی کی خدمت نہیں لینا چاہی، بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اس دعوت نامہ کو اپنی سفارش کے ساتھ حضرت تک پہنچا دو۔

(18)

جواب آیا اور حضرتؒ کی عام عادت کے مطابق فوراً آیا، آپ بھی فوراً ملاحظہ میں لائیں:

"از ناکارہ و آوارہ اشرف علی غفرلہٗ

بگرامی خدمت عالی درجت، مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالیٰ افاداتہم وافاضاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

باوجود میرے ناقابل خطاب ہونے کے مجھ کو خطاب سے سرفراز فرمانا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا اور کس طرح شکریہ ادا کروں، بجز اس کے کہ

از دست گدائے بینوا ناید ہیچ ۔۔۔ جز آنکہ بصدق دل دعائے بکند

جس خدمت کے لیے مجھ کو ارشاد ہوا ہے، اول تو اس کا دینی خدمت ہونا، پھر مزید برآں

جناب کا حکم ہونا، فی نفسہ کسی عذر کا متحمل نہیں، لیکن اگر کوئی عذر حد عذر سے متجاوز ہوکر، حد عجز تک پہنچ گیا ہو غالباً اس کا پیش کر دینا نقص امر نہ ہوگا۔

اسی غرض سے چھپا ہوا عذر نامہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں اور بجائے شرکت جسمانی کے شرکت روحانی پر جس کا ظہور بصورت دعا ہو رہا ہے، اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اور علاوہ دعا کے اور خدمات محتملہ کے متعلق شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو، اپنے کچھ چھپے کا کاشف اور شفیع بناتا ہوں۔

آن را کہ عقل وہمت وتدبیر ورائے نیست
خوش گفت پردہ دار کسے در سرائے نیست

والسلام، از تھانہ بھون، 4 رجب 1348

یہ ہے ''خشک مزاج ودرشت مزاج'' مولانا تھانوی کا جواب، اپنے سے ایک کہیں کم عمر اور اعتقادی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ایک مخالف کیمپ کے مولوی صاحب کے نام! ''خشک ودرشت مزاج''

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا!

وطن پہنچ کر سفر پر تبصرہ اور میزبان کا شکریہ ناگزیر تھے پہنچتے ہی جو عریضہ لکھا، وقت کے تازہ تاثرات کا ترجمان ہے، لیکن دل ہچکچا رہا ہے کہ جو باتیں صرف سرگوشیوں میں کہنے کی ہیں انھیں نغمۂ محفل کیسے بنا دیا جائے؟ دوسری طرف مولانا کے افادات کے منافع ومصالح ہیں انھیں چھپا بھی کس طرح ڈالا جائے؟

اچھا تو فیصلہ یوں سہی کہ مولانا کے ارشادات تو جوں کے توں، نقل کر دیے جائیں، رہے اپنے معروضات تو وہ کہیں نقل اور کہیں ان کی محض تلخیص۔ ایک کے لیے روایت باللفظ کا اہتمام، دوسرے کے لیے روایت بالمعنی کی گنجائش۔ معروضات ماجدی کے لئے ''م'' اور ارشادات اشرفی کے لیے ''ا'' کی علامت ذہن میں رکھ لیجیے اور آگے چلیے:

م۔ سیدی ومطاعی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ا۔ مشفقی محترمی دام کمارضی اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

م۔ وطن پہنچا

ا۔ الحمدللہ

م۔ لکھنؤ میں خواجہ صاحب(1) سے دو ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں بہت پر لطف۔

ا۔ ماشاءاللہ۔ زادکم اللہ لطفکم علیٰ لطف

م۔ اب کی طویل حاضری میں آنکھوں نے اور دل کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، کاش اسے دوسروں کو بھی دکھا سکتا۔

ا۔ کوئی چیز ہی نہیں ہے جس کو کوئی واقعی دیکھے، یہ تمنا درحقیقت اہل نظر کے، اہل وہم ہونے کی تمنا ہے مگر جو محبین اس وہم میں مبتلا ہیں، میرے لیے تو وہ وہم حسن ظن ہے جو میرے لیے ہر حال میں مبارک ہے۔

م۔ کتنے اعزہ واحباب غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے ہیں ان کے لیے دل بے اختیار کڑھتا ہے۔

ا۔ یہ غلبہ ہے محبت کا ادراک پر اور چونکہ میرا ادراک غالب ہے محبت پر، میں ان سے مسرور ہوں کہ ان کے خلاف واقعہ اعتقاد سے میں محفوظ رہا۔

م۔ مجھے جو نعمتیں حاصل ہوئیں، ان کا اظہار الفاظ میں کیونکر کروں۔

ا۔ یہ عدم اظہار، اظہار سے ابلغ ہے۔

م۔ بڑی نعمت وہی حاصل ہوئی، جو مدینہ منورہ کی حاضری میں حاصل ہوئی تھی، یعنی قدم قدم پر اپنی پستی، اپنی نالائقی کا احساس اور بجائے وہاں کی برکات وانوار سے مستفید ہونے کے، الٹا یہ دھڑکا کہ کہیں یہ وجود نجس یہاں کی فضائے پاک کو گندہ نہ کردے۔

ا۔ حقیقت میں بڑی نعمت ہے جس پر مبارکباد دیتا ہوں، یہ نیستی ہی تو ہستی ہے۔

م۔ بس اسی قسم کا سبق تھانہ بھون کی حاضری میں ملا۔

ا۔ مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں بواسطہ محل کے ملا، یہاں بلا واسطہ محل کے، گو آپ کو محل کا گمان ہوا ہو، جو باوجود خلاف واقعہ ہونے کے مضر نہیں۔

---

(1) یعنی خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؒ

م۔ جتنی دیر حاضر خدمت رہتا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب کے سامنے ایک ٹمٹماتا ساچراغ ہے، دل بار بار ندامت وخجالت سے گڑا جاتا تھا۔

ا۔ ماشاءاللہ یہی تو بڑی دولت ہے کہ چھوٹوں سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھا جائے۔

م۔ تفسیر، حدیث، فقہ سے متعلق بھی بہت سے امور میں آنکھیں کھلیں، لیکن تصوف واخلاق سے متعلق جو بیش بہادرس ملے، زبان ان کے بیان سے عاجز ہے۔

ا۔ وہی بات پھر کہنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ سب غیر محل سے ملا۔

م۔ ان فیوض معنوی کے علاوہ، مادی حیثیت سے بھی بڑی راحت ملی، گویا اپنے گھر میں تھا، اپنے اوقات ومشاغل میں پوری طرح آزاد۔

ا۔ اس جز میں تو میں بھی، بلاکسی تفصیل وتاویل کے موافق ہوں بلکہ اس کو خود بھی بار بار بطور تحدث بالنعمۃ کے کہا کرتا ہوں کہ یہاں کسی پر کوئی گرانی نہیں ڈالی جاتی، نہ خیالی نہ واقعی۔

م۔ کاش ہمارے مولانا...... بھی اسی طرح اپنے خادموں کو آزاد چھوڑ دیتے۔

ا۔ تو لطیف مجاہدہ جواب ہے کیسے ہوتا۔

م۔ وہاں چند گھنٹوں کی حاضری میں بار بار کھانے اور چائے پر مجبور ہونا پڑا۔

ا۔ یہی مجبوری تو روح ہے فنا کی۔

م۔ ایک خواب، تھانہ بھون کے زمانۂ قیام ہی میں دیکھا تھا، آج عرض کرتا ہوں، دیکھا کہ ایک بڑا سا مکان ہے، جیسے کسی طبیب کا مطب، جناب وہاں کھڑے ہیں اور پاس ہی ڈولی کے اندر چھوٹی محل صاحبہ تشریف فرما ہیں، اتنے میں وہ باہر نکل آئیں اور تخت پر تشریف فرما ہو کر میری طرف پشت کیے کچھ خانگی معاملات کا ذکر فرمانے لگیں، میں مسرور بھی کہ مجھ پر اتنا اعتماد فرمالیا گیا، ساتھ ہی دنگ ومتحیر بھی کہ جناب جیسے مجسمۂ شریعت کے ہاں نامحرم سے مخاطبت کی اجازت کیسی؟

ا۔ بی بی چونکہ طبعاً محبوب ہوتی ہے، میری نسبت محبوبیت اس شکل میں ظاہر ہوئی اور نسبت محبوبیت سے یہ مراد نہیں کہ میں محبوب ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ میرے قلب میں طالبین کی جو محبوبیت ہے، غرض صفت اس شکل میں ظاہر ہوئی اور اس صفت کا آپ کی طرف متوجہ ہونا

اشارہ ہے کہ خاص نفع حاصل ہونے کی طرف انشاء اللہ۔

م۔ وہاں کے دوسرے حضرات میں مولوی شبیر علی صاحب سب سے بہتر نظر آئے اللہ انھیں برکات دارین عطا فرمائے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمالیں۔

م۔ میرے ہمنام مولانا بدایونی ایک عریضہ خدمت والا میں، خدا معلوم میرے توسط سے کیوں ارسال کر رہے ہیں، ملفوف ہے۔

ا۔ غالباً توسط کو موثر سمجھا، میں بھی اسی مصلحت سے اسی توسط کو اختیار کرتا ہوں کہ میرا عذر موثر ہو"۔

ذکر یہ تو ذہن میں ہے نہ، کہ دسمبر 1929 کا چل رہا ہے، صدق کا نقش اوّل سچ (ہفتہ وار) اس وقت اللہ کے فضل سے زور وشور سے نکل رہا تھا۔ دو بزرگ ایسے بھی تھے جن کی خدمت میں انتہائی تعلق کے باوجود پرچہ نہیں بھیجا جاتا تھا، ایک اپنے سب سے بڑے محبوب مولانا محمد علیؒ۔ دوسرے اپنے سب سے بڑے مقتدا مولانا تھانویؒ، دونوں کا رعب، ادب اور لحاظ اتنا غالب تھا کہ پرچہ نذر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، خدا معلوم کس وقت، کس مضمون پر کیا اعتراض کر بیٹھیں، اس وقت کچھ کرتے دھرتے نہ بنے گی، نہ اپنے ضمیر وبصیرت کے خلاف چلنے پر عقل آمادہ ہوگی اور نہ ان حضرات کے ارشادات کی عدم تعمیل کو دل قبول کرے گا، لیکن اب سچ کے سلسلہ میں ایسی صورت آئی کہ حکیم الامت سے رجوع کرنا ناگزیر ہوگیا، صورت یہ ہوئی کہ سچ میں ایک مسلسل مضمون، ظہور مسیح ودجال اور خروج یاجوج وماجوج پر، یورپ اور اسلام اور دوسرے عنوانات سے کوئی ڈیڑھ سال سے نکل رہا تھا، لکھنے والے حیدرآباد دکن کے ایک صاحب علم صوفی اور خانقاہ جیلانیہ مستعد پورہ کے شیخ مولوی محمد شاہ صاحب قادری تھے، جنھوں نے کسی مصلحت سے اپنا اخباری نام "عبداللہ شاہ قادری" رکھا تھا، احادیث متعلقہ کی ایک نئے انداز پر تفسیر کرکے، موصوف دکھا یہ رہے تھے کہ پیش گوئی ہمیشہ تمثیل ومجاز کے پردہ میں ہوتی ہے، چنانچہ حدیث نبویؐ میں دجال اور یاجوج وماجوج سے مراد اقوام فرنگ ہیں، عام علما کو اس تعبیر سے شدید اختلاف تھا۔ مضمون کے شروع میں، ایڈیٹوریل تمہید میں اگرچہ یہ لکھ دیا گیا تھا کہ مدیر کو نہ اس کے مطالب سے لفظ بلفظ

اتفاق ہے نہ یہ انداز تحریر ہی زیادہ پسند ہے۔ اس پر بھی جب مضمون کے بیسیوں نمبر نکل چکے، تو اپنی ذمہ داری کا احساس ذرا زیادہ ہوا اور اگست 1928 سے دسمبر 1929 تک پورے ڈیڑھ سال کے کل پرچے، مولانا کی خدمت میں تنقید کے لیے ارسال کیے۔ خط تنہا اس پبلک معاملہ کے لیے کیوں جاتا، دو تین باتیں ذاتی بھی اس میں عرض کر دیں۔

جوابی ارشادات (علامت ''ا'') مع میرے ملخص معروضات (علامت ''م'') کے ملاحظہ ہوں:

''م۔ سچ میں مدت سے ایک مضمون احادیث دجال پر نکل رہا ہے، کل پرچے یکجا کر کے ارسال خدمت ہیں۔ اگر حسب فرصت ان پر ایک نظر کر لی جائے تو مجھے استفادہ کا بہت موقع مل جائے۔

ا۔ مشکل سے آج کچھ وقت ملا۔ خیال تھا کہ آج ہی روانہ کر دوں، مگر ایک صاحب بیچ میں آ گئے اس لیے کامیاب نہ ہو سکا، ان کے جانے کے بعد ڈاکخانہ کا وقت نہ رہا۔

(یہ واقعی حماقت تھی کہ اتنا بڑا پلندہ، مولانا کی نہایت درجہ مشغولی کا خیال کیے بغیر روانہ کر دیا تھا۔ مولانا آج کا کام کل پر رکھنا جانتے ہی نہ تھے، فرط اخلاق سے ضروری کاموں کا حرج کر کے، ادھر متوجہ ہو گئے، یہ جملہ معترضہ تھا، اب آگے اصل ارشادات پھر نقل ہو رہے ہیں۔)

''ا۔ مفصل دیکھنا تو مشکل تھا، لیکن مجمل مطالعہ بھی غالباً مفصل مطالعہ کی طرح کافی ہوگا۔ میں نے مختصر اصولی جواب لکھ دیا ہے، اب ضرورت اس کی ہے کہ کوئی صاحب علم اصل مضمون کا مطالعہ کریں اور میری مختصر عرضداشت ذہن میں رکھیں تو امید ہے کہ کوئی جز بلا جواب نہ رہا ہوگا۔

اس کا ضرور قلق ہے کہ اخبار سچ کے عموماً لوگ معتقدین اس میں شائع ہونے سے مضمون کو سچ ہی سمجھتے ہوں گے اور باطل میں مبتلا ہو گئے ہوں گے، اس لیے میں نے پہلی یا دوسری ملاقات میں زبانی یا تحریراً عرض کیا تھا کہ کوئی مضمون دینی، بدوں ملاحظہ مولانا حسین احمد صاحبؒ کے شائع نہ کیا جائے، معلوم نہیں کب تک اس سے قلق رہے گا، اصل سبب اس توسع کا مذموم نہیں، یعنی حسن ظن، لیکن ہر شے کی حدود ہوتی ہیں حسن ظن کی بھی ایک حد ہے، اس سے تجاوز ایسا ہے جیسے غذائے

لطیف ومقوی کی مقدار معقول سے متجاوز کر کے تخمہ کا سبب بن جاتی ہے چنانچہ شیخ شیرازی نے جہاں گلستاں میں حسن ظن کی تعلیم فرمائی ہے۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی　　　　پارسا دان ونیک مردانگار

وہاں بوستاں میں اس کی حد بتلانے کو یہ بھی فرمایا ہے۔

نگہدارد آن شوخ در کیسہ در　　　　کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بر

یعنی قبل تجربہ وامتحان سب کے ساتھ معاملہ احتیاط کا کرے، اسی طرح ہر صالح صورت عالم نام کا ادب وعظمت تو ضروری ہے، مگر اس کی تحریر وتقریر کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرنا جس کا اثر اپنے نفس پر یا دوسروں کے نفس پر ایسے رنگ میں ہو جو بڑی خطرناک ہے، یہ حد سے تجاوز ہے الا ان یشهد بصحة من كان موقفا اے بہ دلیل صحیح۔

میرا یہ معروضہ اگر موجب ثقل ہو، معافی کے بعد مطلع فرمادیا جائے تاکہ آئندہ صرف دوستی کا علاقہ رکھوں اور حد مشورہ میں قدم نہ رکھوں، والسلام۔ اشرف علی۔ 01/ رکا ٹکٹ لگا کر پرچے خدمت میں مرسل ہیں"۔

مولانا کی اصل تنقید تو آگے چل کر آئے گی، سردست داد، مکتوب کی جامعیت وبلاغت کی دے لینے دیجیے، تبلیغ کی تبلیغ اور پھر اتنی نرم وشیریں زبان میں۔ حق، کون کہتا ہے کہ، ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے؟ تنقید، مضمون نگار کے اصل مضمون پر جو ہوئی وہ تو ہوئی، باقی خود ایڈیٹر کی تنبیہ بھی بہت برمحل رہی، اسے بتایا گیا کہ ایڈیٹر کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے، ہر رطب ویابس کو چھاپ دینا اس کا کام نہیں۔ مضامین اگر گمراہ کن ہیں تو اشاعت باطل کی ذمہ داری سے وہ بچ نہیں سکتا اور دلالت علی الخیر پر جب اجر وصلہ موجود ہے تو "دلالت علی الشر" پر کیوں نہ وعید موجود ہو؟ مولانا کو اپنے اس نیازمند کی خاطر بہت عزیز تھی اور یقیناً وہ اس کے معاملات میں بڑی رعایت اور مروت کو دخل دیتے تھے، اس سے بہت ہی رواداری برتتے تھے، تاہم اصلاحی شان سب پر غالب تھی اور اپنے مخلصوں، نیازمندوں، خادموں کو وہ ضرورت کے موقع پر اور ضرر دینی سے بچانے کے لیے نہ ٹوکنا، تدین وآئین صداقت کے خلاف اور بجا طور پر خلاف سمجھتے تھے۔ طبیب کی دوستی اور خیر اندیشی یہی ہے کہ وہ مریض کی مرضی پر نہیں، مریض کے مرض پر نظر رکھے۔

خط میں دو باتیں اور بھی عرض کی گئی تھیں اور وہ تمامتر ذاتی تھیں۔ایک سوال یہ تھا کہ جہری نماز پڑھانے میں بڑا تکلف ہوتا ہے، سہو کثرت سے ہونے لگتا ہے، خصوصاً جب یہ علم ہو کہ نمازیوں میں کوئی حافظ یا نیم حافظ موجود ہے۔اس کا کیا علاج ہے؟ جواب آیا:

''ضعف قلب وضعف دماغ اس کا سبب ہے، اس کے دو علاج ہیں ایک قرأت طویل نہ پڑھنا، دوسرا علاج حق تعالیٰ کی طرف یا خانۂ کعبہ کی طرف توجہ رکھنا''۔

پہلے علاج، یعنی اختصار قرأت پر عمل تو پہلے ہی سے تھا، دوسرے علاج میں جوشق ثانی ارشاد ہوئی یعنی خانۂ کعبہ کی طرف مرکزیت توجہ، یہ حکیم الامت کے مخصوصات میں سے ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہم ایسے عامیوں کے حق میں یہی مشورہ بہترین ہے، خاص کر ان لوگوں کے لیے جو زیارت بیت اللہ سے مشرف بھی ہو چکے ہیں۔ایک مادی صورت یعنی صورت خانۂ کعبہ کا تصور جمالینا کہیں زیادہ آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ ایک غیر مادی اور منزہ اور وراء الوراہستی کو تصور کی گرفت میں لایا جائے۔

صحبت بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیوں، اپنے عیوب، اپنے گناہ، مشاہدہ میں آجاتے تھے اور بغیر اس کے کہ مولانا خطاب خاص سے مخاطب فرمائیں یا صراحتاً کسی کو اس کے کسی عیب پر توجہ دلائیں، معلوم ایسا ہوتا کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے ازخود ہٹتے جاتے ہیں اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی تھیں۔40 روز قیام نے ایک خیال یہ دلا دیا کہ اپنے گھر میں ملا جلا کارخانہ چل رہا ہے، زمینداری وغیرہ تو بحمداللہ تقسیم شدہ ہے لیکن گھر کا اثاثہ تو بھائیوں میں مشترک ہے ایک کے اٹھ جانے کے بعد ترکہ کی تقسیم شرعی کی کیا صورت ہوگی، یہی کیونکر متعین ہوگا کہ اٹھ جانے والے کی جائداد تھی کتنی؟ خط میں تیسرا سوال یہی تھا، اس کا جواب حسب ذیل ملا:

''جائداد سے مراد غالباً اثاث البیت ہے، اگر یہی مراد ہے تو جواب یہ ہے کہ دونوں کو مساوی شریک سمجھا جائے گا۔بس نصف اثاث کا اس کو مالک قرار دے کر میراث جاری کی جائے گی''

مشائخ اور بزرگوں کی صحبت کا ماحصل لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کچھ وظیفے سیکھ لیے یا بہت سے

بہت یہ کہ کچھ ذکر و شغل کی مشقیں کر لیں، خانقاہ اشرفی سے متعلق دوسروں کا تجربہ جو کچھ بھی ہو، اپنا تجربہ تو یہ ہوا کہ مریض کو مرض کا احساس برابر ہو جاتا اور جہل خواہ باقی رہ جائے، لیکن جہل مرکب سے نجات بہر حال مل جاتی۔ مریض کو اپنے تندرست ہونے کا زعم و پندار باقی نہ رہ جاتا اور جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے دین اور دینداری کا ہر شعبہ بیدار ہو جاتا۔ ''ملکہ یادداشت'' صوفیا کی اصطلاح میں جو معنی بھی رکھتا ہو، اس کی اصلی اور صحیح تعبیر یہیں ملتی تھی اور دین سے مراد دین ہی ہے، شریعت کا بتلایا ہوا اور صاحب شریعت کا لایا ہوا دین، کوئی بعد کا اختراعی نظام یا آئین مراد نہیں۔

لیجیے باتوں میں شاخیں نکلتی آئیں اور اصل موضوع یعنی مقالات دجال پر حضرت مولانا کی تنقید ٹلتی چلی گئی اب وقت آ گیا کہ اسے بجنسہٖ مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ کیا جائے۔

(20)
از حکیم الامتؒ

(خوب خیال کر کے پڑھیے کہ حکیم الامتؒ کی یہ بیسویں قسط بقلم عبدالماجد نہیں، بقلم حکیم الامت ہے)۔

1۔ نصوص کا اپنے ظواہر پر محمول کیا جانا، اجماعی منقولی مسئلہ ہے اور معقولی بھی، ورنہ تمام نصوص اور تمام قوانین سے امن مرتفع ہو جاتا ہے، البتہ اگر کوئی عقلی یا نقلی صارف ہو تو بضرورت غیر ظاہر پر محمول کر لیا جائے گا، مگر صارف کا محض خیالی یا ذاتی ہونا کافی نہیں، ورنہ ہر فرقہ قرآن و حدیث کا تحریف کرنے والا ایسے خیال یا ذوق کا مدعی ہو سکتا ہے اور صوفیا کی تاویل اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ ان معانی کے مدلول نص ہونے کے مدعی نہیں بلکہ اصل مدلولات کو قبول کر کے ان مدلولات کے مشابہ کو بطور اعتبار کے ظاہر کرتے ہیں۔

2۔ احادیث متضمنۂ خروج دجال و یاجوج و ماجوج کو جو صحیحین میں بھی مذکور ہیں جو شخص خلوئے ذہن کے ساتھ پڑھے گا اس کے ذہن میں بے تکلف جو معانی آئیں گے وہی ان احادیث کے مشہور اور صحیح محمل ہیں۔

3۔ ان معانی کا امتناع نہ کسی دلیل عقلی سے ثابت ہے اور نہ کسی دلیل نقلی سے، مثلاً کسی

دوسری ایسی ہی صحیح حدیث میں اس کے خلاف آیا ہو یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خروج کا کوئی زمانہ متعین فرمایا ہو اور وہ زمانہ گزر گیا ہو، مگر ایسا بھی نہیں ہوا، بلکہ ایک حدیث صحیح میں تصریح ہے کہ آپ کو دجال کے متعلق یہ بھی احتمال تھا کہ شاید میرے ہی زمانہ میں ظاہر ہو جائے، تو ایسی صورت میں حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا کیسے صحیح ہوگا۔

4۔ پھر وہ مجاز بھی بعض قلیل عبارات میں جاری کیا گیا ہے اور جو عبارات اس مجاز سے بھی خالی چھوڑ دی گئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں، چنانچہ مضمون مذکور کی تاویلات کو احادیث پر منطبق کرنے سے واضح ہو سکتا ہے چنانچہ نمونہ کے طور پر ایک عبارت بالمعنی پیش کرتا ہوں کہ ان دونوں واقعات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف رکھتے ہوں گے جن میں ایک واقعہ ختم ہوگا اور دوسرا شروع بھی اور ختم بھی ہوگا اور حدیثوں میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ لفظ نبی اللہ بھی آیا ہے، اس لیے اس میں کوئی صحیح تاویل بھی نہیں ہو سکتی، اگر کسی کا دل چاہے مشکوٰۃ کے یہ ابواب، ان مدعی صاحب کے سامنے لے کر بیٹھ جائے معلوم ہو جائے گا کہ کتنی جگہ گاڑی اٹکے گی۔

5۔ اسی لیے علمائے امت میں سے خصوص سلف خیر القرون میں سے کسی کو ایسے معانی کا احتمال بھی نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وقوع سے پہلے حقیقت سمجھ میں نہیں آتی، اول تو یہ بات غلط ہے، جب حقیقت واضح ہے، سمجھ میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں، پھر اس میں کلام ہے کہ جس کو وقوع کہا گیا ہے، یہ وقوع ہے یا نہیں، ممکن ہے وقوع اسی طور پر ہو جیسا مدلول متبادر ہے۔

6۔ پھر اگر علما یا صحابہؓ نہ سمجھے ہوں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں تو یہ احتمال نہیں، پھر جب بعض صحابہؓ کا متبادر معنی پر محمول کرنا آپ کو معلوم ہوا تھا، آپ نے اس کی نفی کیوں نہ فرمادی۔ اس معنی کی تقریر کیوں نہ فرمائی، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو ابن صیاد پر دجال ہونے کا شبہ ہوا تو حضورؐ سے اس کے قتل کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا، اگر یہ وہی ہے تو تم اس پر مسلط نہیں ہو سکتے، اگر وہ نہیں ہے تو اس کا قتل کرنا اچھی بات نہیں، آپ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ یہ دجال ہو سکتا ہی نہیں، کیونکہ دجال ''شخص واحد کا نام نہیں'' خاص قوم کا نام ہے، اس لیے یہ دجال نہیں ہو سکتا، خصوص جب کہ وہ اس قوم میں بھی نہ تھا۔

7۔ پھر اگر ایسی ہی تاویلات کا باب مفتوح ہو تو اس کی کیا دلیل ہے کہ جو اس وقت سمجھا گیا

وہی مراد ہے، ممکن ہے دوسری قوم اور دوسرے واقعات مراد ہوں، جو واقع ہو چکے ہوں، یا آئندہ واقع ہوں اور اس حالت میں مرزا کی تاویل پر بھی حتیٰ کہ دعویٰ نبوت میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا حالانکہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے، اس تحریر میں اس نے بھی ایسی ہی تطبیق کی کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں تطبیقوں میں تعداد احادیث کی کمی وبیشی کا تفاوت ہو۔

8۔ کسی مدعا کے اثبات میں زیادہ کوشش کرنا کوئی حقانیت کی دلیل نہیں ہے، اہل باطل نے اپنی آرا واہوا کے اثبات میں اس سے زیادہ کوشش کی ہے، مگر ان کے باب میں ارشاد ہوا ہے۔ "اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا"، اور ارشاد ہوا ہے، لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالاً۔

9۔ اسی طرح دعا کے بعد رائے نہ بدلنا کوئی شرعی دلیل نہیں، مرزا نے بھی ایسے دعوے کیے ہیں، شرعی ادلہ متعین ہیں، یہ ان میں سے نہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ بعض دعا شرائط سے خالی ہوتی ہے، اس لیے قبول نہیں ہوتی۔

10۔ پھر غضب پر غضب یہ ہے کہ بلا دلیل اپنے دعویٰ پر اتنا جمود ہے کہ مخالف پر جس کے پاس شرعی دلیل بھی ہے طعن واستہزا واستخفاف، بلکہ سب وشتم بھی کیا گیا ہے یہ مجاز ایسا قوی وراجح ہو گیا کہ حقیقت کا قائل تمسخر وابطال کے قابل ہو گیا۔

11۔ مدیر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ قبل تحقیق اس کو شائع کر دیا، خدا جانے کتنی امت محمدیہ غلطی میں مبتلا ہوگئی ہوگی اور جو عذر اشاعت کا لکھا گیا ہے، محقق علما سے استفتا کر لیا جائے کہ وہ عنداللہ عذر ہوسکتا ہے یا نہیں تاوقتیکہ اس مضمون کے بطلان کی اور اشاعت کے خطا ہونے کی تصریح شائع نہ کی جائے۔

ضمیمہ نمبر (20)

اپنا ذاتی خیال اس وقت بھی تھا اور اب تو اور زیادہ جزم ووثوق کے ساتھ ہے کہ جس طرح حقیقی دجال کا اطلاق آخر زمانہ کے کسی ایک متعین شخصیت پر ہوگا اسی طرح مجازی وصفاتی دجال خدا معلوم کس کثرت سے پیدا ہوچکیں گے، افراد بھی اور اقوام بھی، چنانچہ اسی خیال کی وضاحت کے لیے ذیل کا نوٹ بھی مولانا کے مضمون کے نیچے شائع ہوا:

سچ۔حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ اس وقت علمائے امت کے ان گنے چنے افراد میں سے ہیں، جن کی رائے ہر مسئلہ دین میں پوری طرح سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بہرحال پورے عزت واحترام، توجہ والتفات کی مستحق ہوتی ہے، مضمون ''یورپ اور اسلام'' اور اسی سلسلہ کے دوسرے مضامین کے بہت سے نمبر، پچھلے ماہ دسمبر میں، مولانا موصوف کی خدمت میں بغرض اظہار رائے گرامی بھیج دیے گئے تھے، مولانا نے بکمال عنایت وقت نکال کر انھیں ملاحظہ کیا اور ان کے تدوین وتحقیق نے اس پر جو کچھ ارشاد فرمایا بجنسہٖ اوپر درج کر دیا گیا، امید ہے کہ ہمارے مکرم جناب مولوی عبداللہ شاہ صاحب قادری حیدرآبادی اس انتقاد کی روشنی میں اپنے نقاط بحث کو آئندہ اور زیادہ مضبوط اور مدلل بنانے کی کوشش کریں گے، انتقاد اگر تحقیق وحسن نیت کے ساتھ کیا گیا ہے تو بہرصورت مفید ہی ہوتا ہے۔

جہاں تک سچ یا مدیر سچ کے ذاتی عقیدہ کا تعلق ہے، جیسا کہ ان صفحات میں بارہا، اس سے پیشتر بھی عرض کیا جا چکا ہے، دجال کے ظہور ذاتی اور ظہور صفاتی میں اسے کوئی تناقض نہیں نظر آتا، بلکہ اس کی فہم ناقص میں یہ دونوں عقیدے ایک دوسرے کے ممد اور ایک دوسرے کے مکمل ومتمم ہیں اور سچے رسول کی پیش گوئیوں کی پوری عظمت میں درحقیقت یوں ہی ظاہر ہوتی ہے کہ مجازی اور حقیقی ولفظی اور معنوی، ذاتی اور صفاتی، ہر رنگ سے پوری ہو کر رہیں، اگر آج ان صفحات میں موجودہ فرنگی تمدن کو شیطانی تمدن سے یا موجودہ فرنگی حکومتوں کو فرعونی حکومتوں سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ابلیس کے کسی شخصی وجود یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کی تاریخی شخصیت سے انکار ہے، ٹھیک اسی طرح موجودہ تمدن یا فرنگی قوموں کو دجال قرار دینا اس کا مستلزم نہیں کہ آئندہ کسی شخصی دجال کے ظہور سے انکار ہے، آج صفاتی حیثیت سے بے شمار دجال اور بے شمار مہدی موجود ہیں، آئندہ کیا عجب ہے کہ کسی شخصیت کے اندر دجال کامل اور کسی ایک شخصیت کے اندر مہدی کامل کا ظہور ہو جائے، غرض سچ تو اپنے نزدیک علمائے سنت کے عام ومسلم عقیدہ اور مولوی عبداللہ صاحب کے عقیدہ کے درمیان مطلقاً کوئی تناقض اور تعارض نہیں پایا جاتا، فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں فریق ایک ایک پہلو پر زیادہ زور دے رہے ہیں''۔

(21)

مولانا کا یہ افادۂ قلم سچ جلد 5 نمبر 11 مورخہ 11 مارچ 1930 میں مع میرے معروضات کے نکلا (وہی معروضات جو ابھی بطور ضمیمہ گزر چکے) لیکن اس کے طبع واشاعت کا پس منظر بھی کچھ کم سبق آموز دلچسپ نہیں۔ اشاعت سے قبل مولانا کی اجازت ضروری معلوم ہوئی، لیکن ادارتی تجربہ نے یہ اندیشہ بھی سامنے لا کھڑا کیا، کہ ایسا نہ ہو جواب میں لوگ مولانا پر شخصی طنز وذاتی تعریض شروع کردیں، اول اس کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا، اس لیے رائے یہ ٹھہری کہ تحریر بغیر مولانا کے نام کی تصریح کے دی جائے اور بجائے نام کے صرف ''ایک نامور متدین عالم کے قلم سے'' لکھ دیا جائے۔ اجازت طلبی کا خط 19 دسمبر 1929 کو لکھا اور یہ بھی عرض کردیا کہ ارشادات گرامی سے شرح صدر پوری طرح تو نہ ہوسکا، تاہم ان کی اشاعت، صاحب مضمون کی شخصیت کے اخفا کے ساتھ کردینا چاہتا ہوں۔

جواب آیا، اور حسب معمول اصولی تعلیم لیے ہوئے جواب آیا:

''یہ آپ کی سلامتی صدر اور صفائے طبیعت ہے لیکن میں اصولاً بدوں شرح صدر کے اشاعت کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بدوں شرح صدر کے بھی، اشاعت مضمون کی جائز ہے، حالانکہ یہی تو بنا ہے میرے قلق کی، پھر اس میں اس میں فرق ہی کیا ہوگا، چونکہ مجھ کو شرح صدر ہے اس لیے میں النور (1) وغیرہ میں شائع کرادوں گا، میرے پاس نقل موجود ہے اور اشاعت میں اپنا نام ظاہر کردوں گا اور بے تمیزی (2) پر میں آمادہ وراضی ہوں، البتہ آپ کی فراخدلی پر نظر کرکے (چنانچہ اس محبت نامہ میں بھی مجھ کو مشورہ عرض کرنے کی اجازت دی ہے) یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ شرح صدر کی کوشش تو ضروری ہے، عقائد کا معاملہ ہے یا اگر باوجود صحیح کوشش کے کامیابی نہ ہو تو اہل اختلاف میں اجمالاً جس کی حقانیت مظنون ہو اس کی تقلید ضروری ہے، اب صرف اس کا تصفیہ رہا کہ شرح صدر کا طریق کیا ہوگا اس میں آپ کا کیا خیال ہے؟''۔

---

(1) مولانا ہی کی سرپرستی میں یہ ماہنامہ 'تھانہ بھون' سے نکلتا تھا۔ (2) میرا ہی لفظ تھا، جسے مولانا نے دہرادیا ہے۔

شرح صدر کی یہ ضرورت بجائے خود شرح صدر کی محتاج تھی، جو بدنصیبی سے نہ اس وقت حاصل ہوا، نہ اب ہے، مقصود یہاں اپنے کسی عقیدہ کی تبلیغ و رعایت نہیں، مقصود صرف حکیم الامتؒ کی تعلیم وطریق کار کی شرح و ترجمانی ہے اور فی الجملہ اس پر ان سطور سے روشنی پڑ گئی۔ عقائد و مسائل کی جزئیات میں شرح صدر ہو یا نہ ہو، اس کا کوئی اثر جذبۂ محبت و تعلق عقیدت پر نہیں پڑ سکتا تھا۔ پچھلے گرامی نامہ میں جہاں سچ کی روش پر گرفت تھی وہاں یاد کر لیجیے کہ آخر میں یہ فقرہ بھی تو تھا کہ:

''میرا یہ معروضہ اگر موجب ثقل ہو تو معافی کے بعد بے تکلف فرما دیا جائے تا کہ آئندہ صرف دوستی کا علاقہ رکھوں اور حد مشورہ میں قدم نہ رکھوں''۔

اس فقرہ کے جواب میں اسی 19 دسمبر والے معروضہ میں کیا گیا:

''والا نامہ کے آخر میں یہ عبارت کہ میرا معروضہ اگر الخ پڑھ کر حیران رہ گیا اور اس کے جواب میں بادب تمام عرض کرتا ہوں کہ والا نامہ تو موجب ثقل مطلق نہ تھا، البتہ اس کے آخر کا یہی ٹکڑا ایک حد تک موجب ثقل ہوا، ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کے ارشادات اپنے لیے کسی درجہ میں موجب گرانی سمجھتا تو اپنی طرف سے ایسی درخواست ہی کیوں پیش کرتا''۔

اس جز کے جواب میں ارشاد ہوا:

''میں اس عنایت و محبت کا ممنون ہوں، احتمال تو مجھ کو معتد بہ نہ تھا، لیکن میں وہمی طبع واقع ہوا ہوں، احتیاطاً لکھ دیا تھا، اس کا یہ نفع ہوا کہ صراحتاً مجھ کو اجازت حاصل ہو گئی، اس اجازت صریحہ کی بنا پر مکرر عرض ہے کہ ایسے مضامین مولانا حسین احمد صاحب کے ملاحظہ میں ضرور گزار دینا چاہیے''۔

گرامی نامہ ختم ہونے پر ہے، دو تین باتیں ضرور نوٹ کر لیجیے۔

(1) مولانا کو اپنے چھوٹوں تک کی رعایت کس درجہ مد نظر رہتی ہے، کیسے کیسے شفقت آمیز انداز خطاب کے اختیار کرتے رہتے ہیں۔

(2) لیکن حق کی رعایت اس پر بھی مقدم رہتی ہے، جس مسئلہ کو خود سمجھ رہے ہیں اس کے بیان کرنے سے مخاطب کی مروت میں خاموش نہیں ہو جاتے، دیکھتے ہیں کہ مخاطب بے توجہی کے کان سے سن رہا ہے، اس پر بھی اپنا فرض تبلیغ برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حق گوئی اور نرم خوئی کی

جامعیت کے لحاظ سے مثنوی مولانائے رومؒ کے مصرع

زرم گو لیکن مگو غیر از صواب

کی زندہ تفسیر ہے۔

(3) سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد صاحب سے اس وقت بھی تھے، اس پر بھی اس وقت تک ان کا پورا لحاظ واحترام قائم تھا۔

دجال اور مسیح موعود اور یاجوج وماجوج ومسائل متعلقہ سے صحیح عقائد، بیشک وہی ہیں جن کی جانب مولانا کے تنقیدی مضمون میں اشارہ موجود ہے، اکابر اہل سنت کا ان ہی پر اتفاق ہے لیکن گنجائش کسی نہ کسی حد تک ان تعبیروں کی بھی نکل سکتی ہے جو حیدرآبادی مولوی صاحب، سچ کے مضمون نگار نے اختیار فرمائی تھیں اور اس لیے بطور ایک کمزور مذہب کے اس کی اشاعت میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن ان تعبیرات کی کمزوری کی تصریح افسوس ہے کہ اس وقت نہ کردی گئی اور کی کیسے جاتی جب خود ہی اس وقت ان کی اس حد تک کمزوری کا احساس نہ تھا اور ادارتی خاموشی سے سچ خواں طبقہ قدرتاً اور بالکل صحیح طور پر سمجھتا رہا کہ اس نہایت درجہ طویل مضمون کو ادارتی تائید بھی حاصل ہے۔ اس طرح کی کوتاہیاں اور لغزشیں فرائض ادارت میں خدا معلوم کتنی اور بھی ہو چکی ہیں۔

خطوط میں علمی، دینی، سلوکی مسائل کے ساتھ کچھ خانگی باتیں بھی برابر رہا کرتی تھیں، چنانچہ اس خط میں بھی جو 19 دسمبر کا، یعنی آدھے جاڑے گزر جانے پر لکھا ہوا تھا، یہ عبارت بھی درج تھی کہ "بھائی صاحب بیچارے ہر سال موسم سرما میں ضیق النفس کے دردوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور شدید اذیتیں اٹھاتے ہیں، اب کی سال اب تک اللہ نے اپنے فضل سے محفوظ رکھا ہے، میں تو اسے جناب والا کی توجہ اور اہل خانقاہ کی دعاؤں کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ:

"نہایت مسرت ہوئی، مبارک باد عرض کرتا ہوں اور ان آثار کو دیکھ کر تجدید دعا کی ہمت بڑھتی ہے اس لیے مکرر دعائے صحت وحفاظت کرتا ہوں"۔

مولانا عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی، لیکن سب سے پہلے انسان تھے اور جس نے ان کے اس جوہر کو نہ پہچانا اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا۔

ایک بار عجب اتفاق ہوا، ایک ہی شب میں ہم میاں بیوی دونوں نے مولانا کو خواب میں دیکھا حالانکہ دونوں مکان کے الگ الگ حصوں میں سو رہے تھے، یہ جنوری 1930 کا زمانہ تھا، اپنا خواب بڑا طویل تھا، خلاصہ یہ کہ آبادی اور خانہ آبادی چھوڑ، عبادت و ریاضت کے لیے جنگل میں نکل جانا چاہتا ہوں، اعزہ سخت پریشان ہو کر مولانا کو چپکے سے اطلاع کر دیتے ہیں اور حضرت دفعتاً بلا اطلاع آ جاتے ہیں اور جہاں میری جانماز بچھی رہتی ہے وہیں بیٹھ جاتے ہیں اور مجھے افہام وتفہیم کر میرا ارادہ بدل دیتے ہیں۔ میں بے انتہا خوش ہو رہا ہوں کہ کہاں غریب خانہ اور کہاں مولانا کا ورود اور سفر تو حضرت اب کرتے ہی نہیں، میرے لیے اپنا مستقل قانون تک توڑ دیا، یک بیک حضرت واپس بھی تشریف لے گئے اور میرے دل کی دل ہی میں رہ گئی کہ چند اسٹیشن ساتھ جاؤں گا اور نذرانہ مصارف پیش کر دوں گا۔ دل اس کے بعد بھی مسرت سے ایسا لبریز رہا کہ جیسے واقعتاً حضرت تشریف لے آئے ہوں، خیر صبح 9 جنوری کو یہ خواب لکھ بھیجا، بزرگوں کو لوگ خواب لکھ ہی بھیجتے ہیں بلکہ بعض مشائخ تو کھود کھود کر خوابوں کو پوچھا کرتے ہیں، مولانا کے ہاں خوابوں کو یہ درجہ حاصل نہ تھا، بہر حال میرے اس عریضہ پر یہ لکھ کر آیا کہ:

> ''تعبیر میں تو مجھ کو اصلاً مہارت نہیں، لیکن اجمالاً اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ نہایت مبارک خواب ہے، آپ کے لیے بھی اور میرے لیے بھی کیونکہ متحابین فی اللہ کا اجتماع دونوں کے لیے مبارک اجتماع ہے، نیز آپ کے لیے اشارہ ہو سکتا ہے کہ علوم واعمال میں اپنی رائے پر وثوق نہ فرمائیں بلکہ کسی دوسرے کو بھی شریک مشورہ کر لیا کریں''۔

بیوی کا خواب تو رہا ہی جاتا ہے، انھوں نے یہ دیکھا کہ انھیں اپنی عملی مذہبی زندگی میں کچھ بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں اور وہ حضرت کو لکھ رہی ہیں کہ آپ تو فرمایا کرتے ہیں کہ ''دین میں کوئی خاص مشقت نہیں پھر یہ میرے لیے کیا ہے'' اتنے میں حضرت خود ہی موجود ہو گئے اور انھیں زبانی تسلی دے رہے ہیں کہ فی الحقیقت دین کی راہ میں کوئی ایسی دشواری ہی نہیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ:

> ''یہ تو واقعہ ہے، ان کی ہمت بڑھائی گئی ہے کہ دشواری کو پیش کرنے کے بعد معلوم

ہوگا کہ کچھ دشوار نہیں، ان کو بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنی اصلاح میں رجوع کیا کریں"۔

خیر یہ خواب اور تعبیر خواب وغیرہ تو کبھی کبھار کی چیزیں ہیں وقتاً فوقتاً یہ تذکرے بھی آتے رہیں گے، دوسرے مشائخ کی طرح یہاں یہ نہ تھا کہ یہ گفتگوئیں مولانا کی عظمت کے اہم (یا غیر اہم بھی) اجزا ہوں، مولانا کے مذاق کی اصل چیزیں تو مسائل وعلوم تھے، فقہ، تفسیر، کلام، سلوک، غرض دین کے ہر شعبہ سے متعلق اور یہی تذکرے آپ کو ان اوراق میں کثرت سے ملیں گے۔

(22)

خیر اور چیزیں تو بعد کو آتی رہیں گی، ابھی تو مسئلہ وہی سچ میں مضمون دجال ویاجوج وماجوج کے اندراج کا چل رہا ہے، 30 دسمبر 1929 کو معروضۂ ذیل پیش کیا گیا، (نقل کسی قدر تلخیص کے ساتھ ہے):

"والا نامہ کے جواب میں بہ ادب گزارش ہے کہ سچ تو مولانا کی نظر سے برابر گزرتا ہی رہتا ہے اور میں اپنی جگہ سمجھتا رہتا ہوں کہ کوئی مضمون اگر خاص طور پر قابل گرفت ہوا تو مولانا ضرور تنبیہ فرمادیں گے (1) چنانچہ ایک موقع پر جب مولانا کا ذکر زیادہ مداحی کے ساتھ آگیا تھا تو مجھے فہمائش ہوئی بھی تھی (2) پھر یہ مضمون تو اور بھی ایسے متعدد حضرات کی نظر سے گزرتا رہا جو آپ ہی حضرات کے صحبت یافتہ اور آپ ہی جیسے بزرگوں کے حلقۂ درس کے تربیت یافتہ ہیں، ان میں سے کسی نے بھی مضمون کو گمراہ کن یا ناقابل اشاعت نہیں فرمایا، اگرچہ اس کے مطالب سے پورا اتفاق بھی نہیں کیا (3)۔

میں خود بھی اس کا قائل نہیں کہ مضمون تمام تر حق ہی ہے، البتہ یہ سمجھتا رہا کہ اس میں بہت سی باتیں آگئی ہیں جو لگتی ہوئی اور بظاہر چسپاں ہیں (4) اور جہاں کہیں اس میں غلو اور تجاوز عن الحدود ہو گیا ہو، ان مقامات کی کوئی صاحب تصحیح کردیں (5) چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا انتخاب ہی اس غرض سے کر چکا ہوں (6) موصوف کے نزدیک مضمون میں جابجا بہت زائد غلو ہے، اگرچہ مضمون کو سرے سے بے محل انھوں نے بھی نہیں قرار دیا (7)۔ اسی لیے گزارش کی تھی کہ جناب والا اپنے اس مختصر مضمون کی اشاعت کی اجازت سچ میں دیدیں تا کہ جن کے پاس زہر پہنچ

چکا ہے، تریاق بھی پہنچ جائے (8) النور یا کسی اور پرچہ میں طبع ہونے سے یہ مقصود حاصل نہ ہوگا، درخواست اجازت آج مکرر پیش ہے (9)۔

اپنے ذاتی شرح صدر کی صورت سوا اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ جناب کی تحریروں کو پڑھتا اور اپنی بساط کے موافق ان پر غور کرتا رہوں یا اس کے علاوہ اور جو صورت ارشاد ہو (10)؟

یہ عریضہ بہت ڈر ڈر کر لکھ رہا ہوں، کوئی امر نامناسب اگر اس میں قلم سے نکل گیا ہو تو اس کا بھی ایما فرما دیا جائے، (11) ان مضمون نگار کے مضمون کی تازہ قسط مرسل خدمت ہے (12)۔

جواب ایک ایک فقرہ کا حسب دستور نمبروار پڑھیے:

(1) ''بعض اوقات نظر فرمانے کا اتفاق نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے مگر کچھ فرمانے سے کوئی امر مانع ہوجاتا ہے خواہ مانع ضعیف ہو یا قوی چنانچہ مجھ سے بھی اگر پوچھا نہ جاتا تو غالباً کچھ عرض نہ کرتا، اسی لیے محض نظر فرمانے پر اکتفا مناسب نہیں، میرے نزدیک ضرورت اس کی ہے کہ قبل اشاعت ملاحظہ میں لایا جائے اور ملاحظہ کرانے کی غرض ظاہر فرمادی جائے کہ تحقیق رائے مقصود ہے۔

(2) اس پر قیاس نہ فرمایا جائے اپنی مدح کو روکنا تو ایسے متواضع بزرگوں کے لیے مثل امر طبعی کے ہے دوسرے مضامین کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور بہت سہل ہے اب دکھا کر پوچھ لیا جائے۔

(3) اس میں اکثر کا معمول یہی ہے (خواہ مناسب ہو یا نامناسب) کہ بدوں پوچھے کچھ نہیں فرماتے، اس لیے سکوت حجت نہیں، اگر دل چاہے اس سکوت کے معنی ان سے پوچھ لیے جائیں، فیصلہ ہوجائے گا۔

(4) دلچسپی حجت نہیں، البتہ اگر دونوں جانب دلیل صحیح ہو، اس میں دلچسپی ایک جانب کی مرجح ہوسکتی ہے اور جہاں صحیح اور فاسد کا مقابلہ ہو وہاں دلچسپی مرجح نہیں۔

(5) اور اگر تمام جہان ہی اغلاط سے پر ہو تو وہاں کیا کیا جائے گا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(6) اس انتخاب سے کام لینے کا وقت قبل اشاعت تھا کہ مولوی صاحب کو وہ مضمون دکھلایا جاتا۔

(7) سوخلوط تو مضر ہی ہوا۔

(8) اہل علم کے لیے تو کافی ہے، مگر ان کو چنداں حاجت نہیں اور جن کو حاجت نہیں ان کے لیے یہ مختصر تحریر کافی نہیں۔

(9) میرا پہلا عذر تو ہلکا ہو گیا، مگر اب ایک دوسرا عذر اور ہے، خواہ اخبار سچ کی شان اس سے گھٹتی ہے کہ 50 صفحہ کا یہ جواب(1) البتہ اگر کسی کو شرح صدر ہو جائے، پھر وہ عبارت میں مبسوط کر کے لکھے تو مفید ہو سکتا ہے۔

(10) ایک بار اصل حدیثیں جو بقدر ضرورت مشکوٰۃ میں ملیں گی ایک کو بھی ان بزرگ کے مضمون کو اس پر منطبق کیا جائے تو بقدر ضرورت کشف حقیقت ہو جائے گا۔

(11) توبہ توبہ نیاز مندوں سے ڈر کیسا، آپ کو حق ہے کہ ناز کے ساتھ خوب لکھیے۔

(12) دیکھ لیا، پہلے بھی دیکھا تھا، اس کا جواب میرے اسی پرچہ میں موجود ہے، خلاصہ یہ کہ ظاہر معنی سے جب تک کوئی صارف نہ ہو، خلاف ظاہر پر عمل ناجائز ہے، خواہ اس کا تاویل نام رکھا جائے"۔

گفتگو اس نقطہ پر پہنچنے کے بعد بھی ختم کہاں ہوئی، اپنے لیے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ حضرت مولانا کی زیادہ سے زیادہ عظمت واحترام کے باوجود بھی طبیعت تقلید محض پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی اور جب تک دل میں کچھ بھی خلش باقی رہے، جی یہی چاہتا ہے کہ طالب علمانہ سوالات کھود کھود کر کیے ہی جائیے چنانچہ یہ والا نامہ پاکر 8 جنوری 1930 کے عریضہ میں جو کچھ عرض کیا اسے کچھ بجنسہٖ اور کچھ خلاصتاً آج آپ بھی ملاحظہ میں لے آئیے:

"جناب والا کا یہ ارشاد بالکل بجا کہ اصل احادیث کے سامنے رکھنے کے بعد صاحب مضمون کی تاویلات ان پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتیں، چنانچہ اب نہیں، آج سے کئی مہینے قبل ہی صاحب مضمون کو لکھ بھی چکا ہوں کہ آپ پوری احادیث کے بجائے ان کے صرف درمیان درمیان کے ٹکڑے لے لیتے ہیں تو ارشاد گرامی تو بجائے خود بالکل صحیح ہے، البتہ شرح صدر اسی باب میں نہیں پاتا کہ جو مضمون صرف اس درجہ میں ناقص ہے وہ ناقابل اشاعت بھی ہے(1)۔

---

(1) یعنی اصل مضمون کی ضخامت تو 50 صفحہ تک پہنچ چکی اور اس پر تنقید اتنی مختصر!

دجال وغیرہ کی بابت جو کچھ حضور انورؐ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا ہے وہ یقیناً لفظاً وحقیقتاً بھی پورا ہو کر رہے گا اور مجازاً اور استعارتاً بھی، ہر اعتبار و ہر پہلو سے، چنانچہ جس طرح ایک اصلی وحقیقی فرعون کے علاوہ آج ہزار ہا مجازی فرعون موجود ہیں، اسی طرح سمجھتا ہوں کہ ایک متعین وشخصی دجال کے ظہور کے علاوہ اور اس سے قبل بہت سے اشخاص واقوام پر صفاتی دجال کا اطلاق ہوگا، اپنے اس خیال کا جناب ہی کے متعدد صحبت یافتہ بزرگوں کے سامنے اظہار کیا، کسی صاحب نے انکار نہیں فرمایا، بلکہ گویا تائید ہی کی(2)، سچ میں بھی اسے تفصیل سے لکھ چکا ہوں، بلکہ اس پر ایک قادیانی پرچہ نے سوال بھی کیا تھا کہ جب دجال کا ظاہر ہو چکنا مان لیا ہے تو اب ہمارے مرزا صاحب کے ماننے میں کیا تامل ہے۔ اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ جو دجال ظاہر ہو چکے ہیں وہ تو محض صفاتی اعتبار سے ہیں، نہ کہ وہ متعین فرد جو بالکل آخر زمانہ میں آئے گا اور اس مجازی وصفاتی معنی میں تو مہدی بھی میں ہر بڑے عالم شریعت کو مانتا ہوں(3)، خواہش یہ تھی کہ پہلے جناب کا وہ مختصر مضمون نکل جائے، اس میں صاحب مضمون کی لغزشوں کا اجمالاً ذکر آ گیا ہے، پھر مولانا مناظر احسن گیلانی یا مولانا محمد شفیع دیوبندی یا مولانا زکریا صاحب (شیخ الحدیث) یا اسی درجہ کے کوئی اور صاحب ان پہلوؤں کی وضاحت کر دیں جو صاحب مضمون کی نظر سے غائب ہو گئے ہیں اور اسی طرح ناظرین سچ کے سامنے مسئلہ کے سارے پہلوؤں کی تحقیق آ جائے گی(4)، اس لیے اگر اجازت مرحمت ہو تو سچ کے اگلے ہی نمبر میں گنجائش نکال کر جناب کی تحریر دے دوں(5)، مولانا (حسین احمد صاحب) کی خدمت میں بھی آج ہی کل میں عریضہ روانہ کر رہا ہوں، اس میں بصراحت عرض کر دوں گا کہ ہر نمبر میں جو شے بھی قابل اصلاح معلوم ہو، اس سے مجھے ایما فرما دیا جایا کرے اور جناب کے ارشاد کا حوالہ بھی دے دوں گا(6)، البتہ قبل اشاعت ہر مضمون کا مسودہ مولانا کی خدمت میں بھیجتے رہنے سے تو ان کے اوقات عزیز پر بڑا بار پڑ جائے گا(7)، وہ ہفتہ وار پرچہ کے خیال سے یہی چاہیں گے کہ اپنے اور کام کاج چھوڑ کر ہمارے پلندہ کو بروقت واپس کر دیا کریں اور اپنا شدید حرج کریں گے، پھر اگر مضامین وقت پر نہ پہنچے، تو مجھے صدہا ناظرین سے معذرت کرتی رہنی پڑے گی'۔

عریضہ (اور پورا عریضہ بھی کہاں، یوں کہیے کہ اس کا ملخص) ابھی ختم نہیں ہوا، بعض بعض

عریضے تو گویا پورے پورے مقالے یا مضمونچے ہوتے تھے، ان کے جوابات فوراً دیتے رہنا، حضرت مولانا کی کرامت اگر نہیں تو نظم وضبط اعلیٰ کا ثمرہ اور حیرت انگیز عزم وہمت کا کرشمہ تو ضرور تھا اور بعض عریضے تو پوری کشکول ہوتے تھے، خانگی، فقہی، کلامی، سلوکی، ہر قسم کے موضوع ان میں چھڑے ہوئے، چنانچہ یہ عریضہ بھی اسی قسم کا تھا، بیشتر حصہ تو نقل ہو چکا، تھوڑا سا اور رہ گیا، وہ بھی پڑھ لیجیے اور نیاز نامہ کی رنگارنگی اور بوقلمونی پر جی چاہے تو مسکراتے بھی جائیے:

''ایک بڑی خوشخبری یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے چار عزیز مختلف شدید بیماریوں میں مبتلا تھے، ذاکرین خانقاہ سے سب کے حق میں دعا کرائی گئی، بحمد اللہ چاروں کو شفا حاصل ہو گئی اور علاج کوئی نیا نہیں کیا گیا وہی پرانے اور اس وقت تک غیر نافع علاج دعاؤں کی برکت سے نافع بن گئے(8)۔

دو فقہی سوال بھی دریافت کرنے ہیں۔

(1) کسی صاحب کی ایک کتاب جو میری ملک نہیں، کئی سال سے میرے پاس موجود ہے اور یاد نہیں پڑتا کہ کس کی ملک ہے اور مجھ تک کیسے پہنچی، اب اس کے لیے کیا کیا جائے(9)۔

(2) وارث اگر فاتر العقل ہے تو اس کی بابت ترکہ کے احکام کیا ہیں(10)۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا خط بھی جناب کے ملاحظہ کے لیے ملفوف ہے، پنسل سے جس حصہ پر میں نے خط کھینچ دیا ہے وہ جناب کے لیے قابل ملاحظہ ہے،(11) یاد تازہ کرنے کے لیے جناب کی وہ یادداشتیں بھی ملفوف ہیں''۔

جواب کے لیے اس قسط میں کہاں گنجائش، اس کے لیے تو ذرا انتظار ناگزیر ہے، البتہ ان آخری ٹکڑوں کو سمجھنے کے لیے دو باتیں اپنے حافظہ میں از سر نو لے آئیے:

ایک یہ کہ خانقاہ اشرفی (جس کا نام حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہؒ کے نام پر خانقاہ امدادیہ تھا) میں مقیم ذاکرین وشاغلین بعد نماز عصر ختم خواجگان کے لیے اکٹھے ہوتے تھے اور اس کے خاتمہ پر اہل حاجت کے لیے دعائیں بآواز بلند کرتے تھے، اس طرح کہ ایک صاحب الفاظ دعا کو پکارتے جاتے اور دوسرے حضرات آمین کہتے جاتے۔

دوسری بات یہ کہ مولانا گیلانی کا ایک مفصل مقالہ ہندوستان میں جواز فئے کے حق میں نکلا

تھا (اور یہاں کے غیر مسلموں سے سودی منافع اسی فئے کے حکم میں تھے) حضرت مولانا کو اس تحقیق سے سخت اختلاف تھا۔

(23)

جوابات نمبر وار پڑھیے اور اب تو آپ اس طریقہ پر پڑھنے کے خوب عادی ہو چکے ہیں:

(1) ''اس کے متعلق آگے معروض ہے۔

(2) بس عرفی اخلاق کی یہی تو مضرت ہے کہ حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

(3) اس کا کسی کو انکار نہیں کہ مجازی دجال و یاجوج بہت سے ہیں جیسے مجازی فرعون بہت سے ہیں لیکن کیا اس کی بنا پر کسی کو یہ جائز ہے کہ قرآن مجید میں جو فرعون کا قصہ وارد ہے، اس کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ مراد اس سے مجازی فرعون ہے، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون نہیں، البتہ صوفیا کی طرح یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جس فرعون کا ذکر ہے وہ تو وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا مگر دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہیے جو موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ کیا تھا تو کیا حیدر آبادی صاحب نے یہ مضمون اسی طرح لکھا ہے؟ کیا اس مضمون سے کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے، یا حقیقی دجال کی نفی سمجھے گا، جب اس کا یہ مدلول ہے تو مضمون غلط ہوا یا نہیں، جب غلط ہوا تو دیکھنے والے غلطی میں پڑیں گے یا نہیں، اب غور فرمایا جائے کہ وہ اس حد تک ناقص ہوا یا نہیں، کہ سرے سے ناقابل اشاعت ہے۔

(4) کیا اتنا لکھنا کافی ہوگا، یا مضمون مطبوع کے غلط ہونے کی بھی تصریح ضروری ہوگی، میرے نزدیک تو یہ بھی ضروری ہے ورنہ وہ غلط فہمی دور نہ ہوگی۔

(5) مجھ کو اب بھی گوارا نہیں کہ سچ کی وقعت، قلوب میں کم ہو کہ اس کے نامہ نگار ایسے ہیں کہ پچاس صفحے کے جواب میں دو صفحے لکھے ہیں، اگر ضرورت ہی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ مضمون النور بابت شعبان میں نکلے گا، اگر دل چاہے اس کے حوالہ سے نقل فرما دیجیے تا کہ کاتب کو سچ کا نامہ نگار نہ سمجھا جائے۔

(6) اس خط کا مضمون بھی مولانا کی خدمت میں پیش کرنا ضروری ہے۔

(7) اختصار کے ساتھ ہو تو فوراً جواب آسکتا ہے کہ اس قسم کا مضمون ہے، آیا وہ صحیح ہے یا غلط،

اس سے بعض مضامین قابل اشاعت ثابت نہ ہوں گے، دوسرے بیچ میں سب مضامین تو قابل مشورہ نہیں ہوتے، پھر مشورہ تو مجمل نظر سے بھی ہوسکتا ہے،اس میں دیر ہی کیا لگتی۔

(8) مبارک ہو آپ کو بھی اور ان مریضوں کو بھی اللہ تعالیٰ شفا کی تکمیل فرمادیں، بے تکلف عرض ہے کہ اس قسم کا تذکرہ بطور دعویٰ برکت کے نہ فرمایا جائے، اتفاقیات کو تحقیقات میں داخل کرنا گراں معلوم ہوتا ہے۔

(9) جہاں جہاں گمان ہو، دریافت کیا جائے، خواہ بیچ میں بھی چھاپ دیا جائے، جب پاس ہوجائے یا تو کتاب ہی کسی مسکین کو دے دی جائے یا اگر اپنی ضرورت کی ہو، خود رکھ کر قیمت مساکین کو دے دی جائے۔

(10) وارث تو وہی ہوگا، اس کا حصہ مثل، اس کے دوسرے اموال کے کسی امین شخص کے حوالہ کیا جائے کہ اس کی حفاظت کرے اور اس کی ضروریات میں استعمال کرے۔

(11) کچھ مختصر مختصر عرض کردیا ہے، میرے خیال میں اب کسی ثالث کے فیصلہ کی ضرورت ہے، میں احباب کو مکدر کرنا نہیں چاہتا''۔

مکتوب کا یہ آخری فقرہ دوبارہ پڑھ لیجیے گا۔ یہ وہی مولانا ئے تھانوی ہیں جو بدنام اپنی خشک مزاجی اور خشونت کے لیے تھے!

خط ہمیشہ بڑی چیزوں یا دینی، علمی مسئلوں ہی کے متعلق نہیں ہوتے تھے، بیچ کی چیزوں اور بڑی چھوٹی ہر قسم کی خانگی باتوں پر بھی ہوا کرتے تھے، ادھر گھر میں کوئی علیل ہوا اور درخواست دعا لیے ہوئے جوابی کارڈ مولانا کی خدمت اقدس میں پہنچا، بارہا کا تجربہ یہ کہ ادھر خط گیا اور ادھر افاقہ بھی شروع ہوگیا۔ بات عجب سی ضرور نظر آتی ہے، لیکن اپنے تجربوں کو کوئی جھٹلائے کیسے اور مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر میری بیوی اس معاملہ میں خوش عقیدہ تھیں۔

اسی جنوری میں ایک بچی ذرا زیادہ بیمار ہوئی، خط حسب معمول گیا، جواب شفقت سے لبریز حسب ذیل موصول ہوا:

''مکری السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بچی کی حالت دریافت کرکے قلب پر خاص اثر ہے، دل سے دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ

صحت بخشے، گھر میں بھی بعد سلام فرما دیجیے کہ میں نے کئی بار دعا کی اور کرتا رہوں گا۔

اشرف علیؒ"۔

اکثر عریضے ملے جلے ہوتے تھے، ذاتی اور خانگی باتوں کے علاوہ سب کے کام آنے والے سوالات بھی ان میں خوب خوب لگے لپٹے رہتے تھے، چنانچہ اس کے معاً بعد کا عریضہ مورخہ 20 جنوری 1930 اسی قسم کا ہے۔

''سیدی ومطاعی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دعا کے لیے اُدھر خدمت والا میں کارڈ روانہ کیا اور ادھر شافیٔ برحق کے فضل وکرم سے افاقہ شروع ہوگیا، چنانچہ جس وقت کارڈ جناب تحریر فرما رہے ہوں گے بحمداللہ طبیعت بالکل صاف ہوگئی(1)۔

دوسوالات

1۔ ایک شخص نے کوئی بیس سال گزرے، اپنے والد مرحوم کی ایک رقم بغیر ان کے علم واطلاع کے اڑا لی تھی، ان بیچارہ کو شبہ دوسروں پر رہا کیا، اب یہ شخص نادم منفعل، تلافی کس طرح کرے؟ توبہ واستغفار اور مرحوم کے حق میں دعائے خیر وایصال ثواب تو ظاہر ہی ہیں(2)۔

2۔ ایک شخص نے ایک نکاحی عورت سے بدکاری کی، شوہر اور وہ عورت دونوں وفات پا چکے ہیں، اب یہ شخص علاوہ توبہ واستغفار کے کفارہ کس طرح کرے؟(3)۔

جواب کے لیے پڑھنے والے بیقرار ہوں گے۔ بلا انتظار ملاحظہ ہو!

(1) مبارک، مجھ کو اس وقت تین خوشیاں ہیں، بچی کی صحت کی، آپ کی طمانیت کی، گھر میں کی جمعیت کی اور اخیر کی خوشی سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ ضعیف القلب ہیں، پریشانی کی متحمل نہ ہوسکتیں۔

(2) یہ بہت ہی ضروری ہے اور وہ روپیہ شرعاً مرحوم کے ورثہ کا حق ہوگیا، سب کو ہر ایک کا حصہ کسی بہانے سے پہنچا دیا جائے، جو لینے والے کا بھی اس میں حصہ ہے وہ حصہ منہا ہوجائے گا۔

(3) توبہ واستغفار کافی ہے"۔

ان جوابات میں جواب نمبر 2 جیسا کہ ظاہر ہے، حکیم الامت ہی کا حصہ تھا، اوّل تو استحقاق ورثہ ہی کی جانب کسی کا ذہن کم منتقل ہوتا اور پھر "کسی بہانے سے" کی حکیمانہ قید کوئی دوسرا کہاں

سے سوچ سکتا تھا۔

ماہ مبارک رمضان اس سال فروری میں پڑا، عریضہ جو لکھا حسب معمول کشکول نما اور اس میں ایک آدھ چیز اپنے متعلق ایسی تھی جسے آج چھپاتے اور منظر عام پر لاتے طبیعت کچھ ہچکچا سی رہی ہے، باقی خود مولانا سے کیا پردہ تھا، کچا چٹھا تو ان کے آگے پیش ہی کرتے رہنا تھا اور ان سے تعلق جو قائم کیا تھا وہ اس کے سوا اور تھا کاہے کے لیے؟ اور ہاں یہ تو وہی ہوگا کہ بیچ میں مضامین تاویل احادیث دجال سے متعلق، حال ہی میں مولانا سے بڑی مفصل خط وکتابت ہو چکی ہے اب اصل عریضہ (حسب معمول تلخیص کے ساتھ) ملاحظہ ہو:

''معلوم نہیں ماہ مبارک میں حضرت کا نظام اوقات کیا رہتا ہے(1)، خدا کرے میرا یہ عریضہ ان معمولات میں کسی طرح مخل نہ ہو(2)، مولانا (حسین احمد صاحب) دیوبند سے سلہٹ تشریف لے جاتے وقت اسی طرف سے گزرے، لکھنؤ سے دریاباد تک معیت رہی، جناب کا ارشاد مضامین سچ کے سلسلہ میں پہلے ہی عریضہ میں لکھ چکا تھا، اب زبانی بھی عرض کر دیا(3)، النور میں اس مضمون، متعلق مضامین تاویل احادیث دجال کا منتظر ہوں، اس میں چھپ لے تو سچ میں نقل کر دوں(4)۔

یہ عریضہ خاص اس ضرورت سے ہے کہ پورے عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی ہمت تو کبھی بھی نہیں ہوئی، البتہ بالکل آخر کے 4، 5 دن مسجد میں بیٹھ جانے کا معمول ہے، لیکن کیا عرض کروں، ہر دفعہ ختم اعتکاف پر بجائے مسرت واطمینان کے دل کی ملامت ہی ہاتھ رہتی ہے اور اسباب ایک نہیں متعدد، اول تو یہ کہ اپنے کو پاک وصاف اور ہر وقت باوضو رکھنے کے جو آداب مسجد میں وہ بن نہیں پڑتے، برابر ان کے خلاف ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک آدھ بار سوتے میں ناپاک ہونے کی بھی نوبت آگئی(5)، دوسرے یہ کہ جسم مسجد میں ہوتا ہے لیکن دل گھر میں اور روزمرہ کے معمولات میں اٹکا رہتا ہے(6)، تیسری اور سب سے بڑی بدبختی یہ کہ مزاج پر قابو اس حالت میں بھی نہیں رہتا، کھانا لانے، پانی لانے، روشنی لانے والے ملازم سے کوئی غلطی ہوگئی (اور ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہے) تو بس وہیں برس پڑتا ہوں اور لحاظ اعتکاف کا تو کجا، معمولی ادب مسجد بھی ملحوظ نہیں رہتا(7)، پھر اپنی اس جھنجھلاہٹ پر عین اسی حالت میں اور زیادہ جھنجھلاہٹ ہوتی رہتی ہے(8)، ایک بار ایک کم سن ملازم لڑکے پر تو ہاتھ تک چلا بیٹھا تھا(9)، انھیں سب چیزوں کو یاد کر کے سوچتا

ہوں کہ اب اعتکاف موجب قرب ہوا یا اور زیادہ بعد کا باعث بن گیا(10)، اور اب کی سال کے تذبذب وتردد کی حالت میں ارشاد وہدایت والا کا منتظر ومستدعی ہوں(11)۔

النور میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شوق کے ساتھ تربیت السالک کے صفحات پڑھتا ہوں، اپنے کام کی باتیں سب سے زیادہ اسی حصہ میں ملتی ہیں، کہیں میں عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہہ ڈالتا کہ امام غزالی دنیا میں دوبارتشریف لے آئے ہیں(12)"۔

جواب باصواب حسب معمول آیا اور مفصل، مکمل ومدلل آیا، کیا حرج ہے اگر آپ کے مطالعہ میں فوراً کے بجائے کچھ ٹھہر کر آئے، انتظار کا مجاہدہ بھی آخر مجاہدہ ہی کا اجر رکھتا ہے، کاغذ کی جس سلپ پر یہ مسودہ تحریر ہورہا ہے وہ یہیں ختم ہورہا ہے اور اسی پر اس قسط کو بھی ختم ہوجانے دیجیے!

(24)

(1) کچھ بھی نہیں، جو پہلے سے ہوتا ہے وہی رہتا ہے۔ ایک آدھ سپارہ کی تلاوت اکثر بڑھ جاتی ہے، لیکن مجلس عام اور ڈاک کا انتظام بالکل بحال رہتا ہے۔

(2) مخل کیوں ہوتا اور اجر کا مکثر ہوگیا۔

(3) خدا کرے مولانا متوجہ ہوجائیں۔

(4) کتابت ہوگئی ہے، طباعت کے لیے گیا ہے، یہ پرچہ شعبان کا ہے۔

(5) اس میں معتکف کا کیا دخل، اس سے ذرہ بھر اعتکاف کے کمال میں خلل نہیں آتا۔

(6) رہنے کا تو کچھ ڈر نہیں، البتہ رکھنا نہ چاہیے، وہ بھی جب کہ بلا ضرورت ہو اور ضرورت ہے تو نظم اوقات رکھنے کا حکم ہے، یعنی انتظام حقوق واجبہ یا مستحبہ کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معراج میں کہ اعلیٰ مقام ہے قرب کا اپنا دل امت میں رکھا تھا اور اس کے مصالح کا اہتمام فرمایا تھا۔

(7) اور اگر اسی حالت کے ذریعہ سے مربی حقیقی کو تربیت پسند ہو کہ ایسی لغزشیں ہوں جن سے اپنے اعتکاف پر نظر ہی نہ ہو بلکہ بجائے ناز کے ان پر استغفار وندامت ہو تو پھر یہ بھی عین رحمت ہے۔

(8) یہی تو چیز ہے جس سے انسان انسان ہے، یہی تجربے ہیں جن سے تکمیل میں مدد ملتی

ہے، اگر ان سے کام لیا جائے۔

(9) اگر اس کے بعد دوسری طرح بھی ہاتھ چلا دیا جائے کہ اس کو کچھ دے کر خوش کر دیا جائے تو اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کی فضیلت ہاتھ آ گئی، خلاصہ یہ کہ کوتاہی کا مضائقہ نہیں، البتہ اس کا تدارک ضروری ہے۔

(10) کوتاہی کے تدارک کے بعد، بعد کا احتمال ہی نہیں، حاصل یہ کہ نَفْعَلُ وَنَسْتَغْفِرُ کو ترجیح ہے، نَفْعَلُ وَنَفْتَخِرُ پر بھی اور نَفْعَلُ وَنَسْتَبْشِرُ پر بھی۔

(11) ضرور کیجیے اور کوتاہیوں سے بچنے کا اہتمام بھی کیجیے، پھر بھی کچھ ہو جائے تدارک کیجیے

بہر کیکے تو گلیمے رامسوز

(12) مگر الحمدللہ، اس عقیدہ کے جب قائل نہیں تو اب تو اس کہنے کا وقوع نہ ہوگا، اس لیے جواب کی بھی ضرورت نہ رہی۔

اب میں ان مضامین کی حدود کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ برکات طالبین کے ہیں، ماں دودھ سے خالی ہوتی ہے، بچہ کی برکت سے دودھ اتر آتا ہے اور اگر وہ پلانا چھوڑ دے تو سوکھ جاتا ہے، پس ان کی چھاتی ایک سڑک ہے کہ عالم فیض سے دودھ چل کر اس سڑک سے گزرتا ہوا بچہ کے معدہ پر منتہی ہوتا ہے، اسی طرح میں صرف ایک سڑک ہوں ان علوم کے واہب حضرت حق، موہوب لۂ طالبین ہیں، ان کے طفیل میں مجھ سے بھی وہ علوم مس کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ کوئی حقیقت ہے تو میرا کیا نقصان ہے مگر میری جہاں تک رسائی ہے اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے''۔

یقین ہے کہ مکتوب بالا کے بعض بعض فقرے ناظرین نے مکرر ضرور پڑھے ہوں گے اور بعض کو عجب نہیں کہ دوبار سے بھی زائد، اللہ نے کیا دل اور کیا دماغ اور پھر ساتھ ہی کیا قلم دیا تھا، پورے پورے علوم چھوٹے چھوٹے فقروں کے اندر سمائے ہوئے ہوتے تھے اور تسکین قلب کا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہ رہا ہے، بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجیے اور جواب میں تسکین و تسلی ہی حاصل کیجیے، مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے۔ اس کے بعد کا جو کارڈ ہے وہ اگرچہ محض دعائے صحت وخیریت کا ہے، ایک سرسری نظر اس پر بھی کرتے چلیے، حضرت کی

شفقت بیکراں کا تو اس سے کچھ اندازہ ہو ہی جائے گا، ڈاک خانہ کی مہر اس پر 20 مارچ کی ہے:
''مشفقی مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
گھر میں کی علالت سے قلق ہوا، دل سے دعائے صحت کرتا ہوں، اگر بعد صحت بھی مطلع فرمائیں تو رفع تشویش ہو، باقی خیریت ہے، والسلام دعا گو و دعا جو اشرف علی''۔

حضرت کی حیثیت ہم لوگوں کے لیے محض ایک بزرگ کی نہ تھی، بزرگِ خاندان کی سی ہو گئی تھی اور معاملہ یہیں تک رہتا جب بھی مضائقہ نہ تھا، میں نے تو اپنی ڈھٹائی سے اس قسم کے کام حضرت سے لینے شروع کر دیے تھے کہ جیسے وہ میرے ایجنٹ یا مختار ہیں، مکان ٹھہرا دیجیے، اس کے سامان کا بندوبست کر دیجیے وغیرہا اور حضرت نے کمال حلم یا غایت شفقت سے اپنے کو بنا بھی کچھ ایسا ہی لیا تھا۔ آگے بڑھتے جائیے اور ان لطائف کو سمجھتے جائیے۔

اپریل میں خیال آیا کہ حاضری کو کئی مہینے گزر گئے، اب پھر بیوی بچوں کو ساتھ لے ذرا طویل قیام کے ارادہ سے چلنا چاہیے۔ مکان تھانہ بھون میں پرانے بنے ہوئے اور مکینوں سے خالی، اچھے خاصے موجود تھے اور برائے نام کرایہ پر مل جاتے تھے، نظر میں اب کی ایک خاص مکان تھا، پختہ اور نیا، خوشنما اور صاف ستھرا، آرام دہ اور بشری ضروریات کی ساری رعایتوں سے لیس، ایک تہ خانہ بھی موجود اور کمروں کے اندر پانی نکلنے کی نالی سے متصل سلیقہ مندی سے ایک کشتی بنی ہوئی۔ یہ مادّی اور طبعی ترغیبات خود ہی کیا کم تھیں کہ یہ معلوم ہوا کہ مکان خود حضرت کا تعمیر کرایا ہوا اور حضرت کا ذاتی مسکن ابھی چند روز قبل تک تھا۔ تفسیر بیان القرآن وغیرہ کی تصنیف اسی مکان میں ہوئی تھی، مادّی و طبعی کشش پر عقلی و روحانی اشتیاق کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اب اس مکان میں حضرت کے ایک شاگرد و خلیفہ جلیل احمد خاں صاحب شیروانی علی گڑھی مقیم تھے جو اس وقت سفر حج پر گئے ہوئے تھے اور مکان سر دست خالی تھا۔ سفر تھانہ بھون کے ساتھ ساتھ طبیعت میں تقاضا اسی مکان میں قیام کا بھی پیدا ہوا اور نتیجہ 27 اپریل کے عریضہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اب کی خط کے ساتھ ساتھ جواب خط بھی دیکھتے چلیے، ''م'' سے مراد یہ خاکسار اور ''ا'' سے حضرت مولانا ہیں:

م۔ بحمد اللہ بخیریت ہوں۔
ا۔ الحمد للہ۔

م۔ اور مزاج والا کا عافیت خواہ۔

ا۔ بحمداللہ تعالیٰ میں بھی خیریت سے ہوں۔

م۔ انشاءاللہ یہاں سے 11 ذی الحجہ کو روانہ ہوکر سہارنپور ایک روز اترتا ہوا 13، 14 ذی الحجہ تک حاضر خدمت ہوجاؤں گا۔

ا۔ خداتعالیٰ خیریت سے ملادیں۔

م۔ مکان وہ جو جناب والا کا ہے، وہی بہت پسند آیا تھا، امید ہے کہ اب کی وہی عنایت ہوگا۔

ا۔ حاضر ہے، انشاءاللہ تعالیٰ عنقریب صفائی کرادی جائے گی۔

م۔ اگر اتفاق سے میرے زمانہ قیام میں جلیل احمد صاحب واپس آگئے تو اطلاع پاتے ہی خالی کردوں گا۔

ا۔ اگر وہ آئے، ان سے کہہ دیا جائے گا، پھر جو باہمی مشورہ قرار پائے۔

م۔ یہ بھی گزارش ہے کہ اس مکان کے لیے کوئی رقم کرایہ کی تجویز کردی جائے، جو مدرسہ یا اور کسی مد میں دے دی جائے۔

ا۔ ہر چند کہ مکان وقف ہے مگر میں اس کا متولی ہوں اور اس میں شرط ہے کہ واقف اپنی حیات تک اس سے منتفع ہوسکتا ہے اور دوسروں کو بلاعوض انتفاع کی اجازت دے سکتا ہے، اس لیے کرایہ کی ضرورت نہیں۔

م۔ اس مکان کے اندر سامان بھی ضرورت اور بڑے سلیقہ کا دکھائی دیا، تخت، پلنگ وغیرہ یہ سب تو جلیل احمد صاحب کا ہوگا۔

ا۔ کچھ ان کا ہے اور کچھ میرا اور ان کی طرف سے بھی استعمال کی اجازت ہے۔

م۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ تو ملنے سے رہا، باقی اگر اسی قسم کا سامان کرایہ پر مل سکے تو بڑی سہولت ہوجائے۔

ا۔ اگر موجودہ سامان کے ہوتے ہوئے بھی ضرورت ہوئی انتظام ہوجائے گا"۔

سفر میں ابھی چند روز کی دیر تھی، حضرت کی تصانیف، ملفوظات، مواعظ کے مطالعہ کا سلسلہ برابر تیزی، سرگرمی و مستعدی سے جاری تھا، خوب خوب نکتے ملتے تھے، بڑی بڑی بصیرتیں حاصل

ہوتی تھیں، برسوں کے جمے ہوئے عقائد وخیالات پر بار بار نظر ثانی کرنی پڑتی تھی، بعض بعض مسائل پر طبیعت پھڑک اٹھتی تھی، زبان سے بے اختیار داد اور دعا دونوں نکلتیں، دل کبھی انھیں غزالیؒ وقت ٹھہراتا اور کبھی چپکے چپکے اللہ سے ان کی عمر اور صحت میں برکت طلب کرنے لگتا، غرض عقیدت وعظمت کی ہر منزل گویا دل میں گھر کیے ہوئے تھی، اس پر بھی طبیعت کی کجی کہیے یا فہم کی کمی، یا شاعر کی زبان میں

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

سیاسیات تو پھر خیر دور کی چیز تھی، فقہیات تک میں انقیاد کامل اور سو فیصدی انقیاد کا درجہ کسی طرح حاصل نہ ہوا، سیاسیات میں تو یہ ''غیر مقلدی، خوب نمایاں تھی فقہیات میں بھی کچھ ایسی شاذ نہ تھی۔ 4 مئی کو حساب لگایا کہ ابھی حاضری کے تو کئی دن باقی ہیں اور اتنا وقت ہے کہ خط کا جواب بآسانی آسکتا ہے، تو پیدا شبہات ابھی کیوں نہ لکھ بھیجیں اور دو ہفتہ تک کے لیے دل پر بار ہی کیوں لیے رکھیے، یہ سوچ ذیل کا عریضہ ڈاک میں ڈال دیا،

''والا نامہ نے ممتاز فرمایا، مکان کے ساتھ ہی سامان مکان کے استعمال کی بھی جو اجازت مرحمت ہوئی، یہ میری توقع سے بھی زائد ہے، شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے (1)، البتہ استعمال کی حالت میں سامان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے (2)۔

آج کل ملفوظات ''حسن العزیز'' زیر مطالعہ ہے، ایک جگہ پر ارشاد درج ہے کہ ''اگر کسی کی یہ رائے ہو کہ گاؤ کشی چھوڑ دیں تو چونکہ مبنیٰ اس رائے کی ملت کفریہ کی رعایت ہے، یہ اس سے بھی اشد ہوگا'' (جلد 2 ص 236 و 237) تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مبنیٰ ہونے ہی میں کلام ہے یعنی ملت کفریہ کی رعایت، میرے علم ویقین میں تو ترک ذبح گاؤ کا مشورہ دیتے وقت پیش نظر صرف مصلحت امت تھی یعنی ایک فعل مباح کے ترک کر دینے سے متعدد ومہمات امور میں کامیابی کی توقع اور شریعت کے اہم ترین احکام کا تحفظ تو اس صورت میں ان کی یہ رائے ملت کفریہ کی رعایت پر مبنی کیسے کہی جائے گی (3)۔

اسی طرح ایک جگہ (جلد 2 ص 239) پر یہ عبارت نظر آئی کہ ایک شخص تھے اصحاب فقہ سے، انھوں نے اپنا پیام اصحاب حدیث میں کسی کے یہاں دیا، انھوں نے قید لگائی کہ تم کو رفع

یدین وغیرہ کرنا ہوگا، انھوں نے منظور کرلیا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہوجائے محض مردار دنیا کے لیے ایسی چیز کو بلاتحقیق ترک کردیا جس کو دین سمجھتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ رفع یدین اس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا، بس غیر افضل تھا، تو اگر ایک مقصد مباح کے لیے اس نے ایک سنت کے بجائے دوسری سنت پر عمل شروع کردیا تو اس میں سلب ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات پیدا ہوگئی(4)۔

ملفوظات کے صدہا صفحات میں صدہا جواہر پارے مجھے ملے، ایسی ایسی نادر وبیش بہا تعلیمات ملیں جو اور کہیں نہیں ملی تھیں(5)۔ لیکن فقہی مسائل میں کہیں کہیں شبہات پیدا ہوئے جن کا نمونہ اوپر کے دو سوالوں میں گزرا(6)۔

(25)

خط ختم ہوگیا، سوال دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم تھے، پہلا سوال تو اس وقت کی ملکی فضا کے لحاظ سے اور اس وقت ہی کی قید کیوں، آج کی اور ہمیشہ کی ملکی فضا کے اعتبار سے بھی اور دوسرا فقہی سوال بھی اہم، ایک تو اصولی اعتبار سے اور پھر ذاتی اعتبار سے بھی اس لیے کہ ان دنوں اپنا مشغلہ کچھ فقہ ہی کی کتابوں کی الٹ پلٹ کرتے رہنے کا ہوگیا تھا، چاہے جتنا اور جیسا جو کچھ بھی سمجھ میں آئے کبھی ہدایہ اور کبھی فتح القدیر، کبھی درمختار اور کبھی اس کی فاضلانہ ومحققانہ شرح رد المحتار اور کبھی بدائع الصنائع اور کبھی السیر الکبیر، کبھی ان کے اصل متن اور کبھی ان کے اردو ترجمے(1) عربی شرحیں اور یہ فیض بھی تمام تر اسی بارگاہ کا تھا ورنہ فقہ اور فقہا دونوں کے خلاف تو تعصب کا رنگ برسوں سے جما ہوا تھا اور ہر فقیہ اپنے خیال میں نرا کٹھ ملا تھا، یہ علم مولانا ہی کی مجلس میں بیٹھ بیٹھ کر اور ان کی زبان سے مختلف فقہی مسائل کی توضیح وتشریح بار بار سن کر حاصل ہوا تھا کہ فقہا کی جماعت، حمقا کی نہیں، درحقیقت حکما کی جماعت ہوئی ہے اور فقہ اٹکل پچو باتوں کا نام نہیں، قرآن وسنت ہی کی حکیمانہ تشریح واستنباط کا نام ہے۔ مجلس اشرفی کے بیشمار فیضوں میں سے ایک فیض یہ تھا کہ مشائخ صوفیا کے ساتھ محبت اور علما وفقہا کے متعلق عظمت اہل مجلس کے دلوں میں پیدا ہی ہوجاتی تھی۔

---

(1) یعنی ان میں سے جن کے ترجمے اردو میں ہوچکے ہیں۔

بہر حال دونوں سوالوں کا جواب آیا اور اب کی والا نامہ کیا آیا، ایک مستقل ہدایت نامہ اور دستور العمل بن کر آیا، انتظار کہاں تک کیجیے گا، اب معاً پڑھنا شروع کردیجیے۔

(1) یہ آپ کی محبت ہے، ورنہ یہ تو منجملہ حقوق ہے۔

(2) چونکہ مالک موجود نہیں جن سے اس کا فیصلہ کرا سکوں، لہٰذا میں اس سے زیادہ اور عرض نہیں کر سکتا کہ جس استعمال میں اس کا اندیشہ ہو احتیاط فرمائی جائے۔

(3) یہ اپنا اپنا تجربہ ہے، آپ کی نظر میں اور اشخاص کے خیالات ہیں، میری نظر میں اور اشخاص کے خیالات، اس لیے اس کا فیصلہ مشکل ہے، دونوں سوالوں کے متعلق یہی معروض ہے، اس لیے میں نے مدت ہوئی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جن احباب سے محض دوستی ہے ان سے عقائد واحکام میں گفتگو نہ کروں گا یا تو خیریت کی اطلاع واستطلاع کا تعلق رکھوں گا یا دعا کا اور یا معالجہ نفسیات کی تحقیق کا اور ایسے احباب کی فہرست میں جناب کا اور مولانا عبدالباری صاحب (ندویؒ) اور جناب سید سلیمان صاحب (ندویؒ) کا نام ذہن میں تجویز کیا ہے، ان دونوں صاحبوں کو بھی اس کی اطلاع دے چکا ہوں، ایسی تحقیقات کے لیے مولانا حسین احمد صاحب ومولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اسی میں مصلحت ہے۔

ترمیم:- بعد تحریر خط ہٰذا خیال ہوا کہ چونکہ اس تجویز کی کافی اطلاع اس کے قبل نہیں کی گئی، اس بار تو اس قاعدہ سے اور مستثنیٰ کردیا جائے، لہٰذا اس وقت جواب عرض کیے دیتا ہوں اور آئندہ کے لیے وہی عذر اگر اس جواب میں شبہ رہے، اس کی تحقیق مذکورۂ بالا بزرگوں سے کرلی جائے اور وہاں سے اس کے خلاف فیصلہ ہو، آپ اس کے ماننے میں معذور ہوں گے۔

جواب سوال اوّل۔ میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کے اس مشورہ کی بنا ہنود کے جذبات ہیں اور ان جذبات کی بنا ان کی ملت کفریہ اور بنا کی بنا بنا ہوتی ہے، پس اس مشورہ کی بنا ملت کفریہ ہونا ثابت ہوگیا، باقی جو مصلحت سوال میں مذکور ہے اگر وہ بھی بنا ہو تو غایت مافی الباب، دو بنائیں ہوئیں، ایک محمود ایک مذموم اور محمود مذموم کا مجموعہ مذموم ہوتا ہے اور بنا محمود بھی اس وقت ہے جب یہ بنا واقعی ہو، ہنوز اسی میں کلام ہے۔

گاؤ کشی جاری رکھنے میں مہمات دینیہ محفوظ نہ رہیں گی، یہ محض خیالی بنا ہے لیکن اگر اس کو قطعی

بھی مان لیا جائے تو اس کا جواب اوپر گزر چکا ہے، یہ تو تحقیقی جواب ہے اور الزامی جواب یہ ہے کہ بہت سے امور دینیہ اذان سے بھی زیادہ اہم ہیں، اگر ترک اذان سے ان امور کا تحفظ ہوتا ہو تو کیا اذان بھی ترک کر دی جائے گی اور اگر شعائر وغیر شعائر ہونے کا فرق بتلایا جائے تو جو محض ذبح بقر کو بھی شعائر میں سے کہتا ہو، گو بعارض ہی، جیسے مجدد صاحب ہندستان میں اس کو شعائر میں سے بتلاتے ہیں اور ہنود کا اس کو اسلام کی علامت سمجھنا اس کی عقلی کافی دلیل ہے، اس پر یہ فرق حجت نہ ہوگا، رہا سوال تحفظ کا، اگر تحفظ بھی نہ رہا، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں، کیونکہ ہمارے اجتہاد کو اس میں دخل نہیں اور اگر بلا اکراہ ترک کر دیا تو اس حکم شرعی کے عدم تحفظ میں ہمارے اجتہاد کو دخل ہوا، اس لیے ہم اس کے ذمہ دار ٹھہرے، فافترقا۔

(4) جواب سوال ثانی، یہ قصہ ردالمختار، شرح درمختار باب التعزیر قبیل باب السرقہ میں مذکور ہے اور یہ بزرگ ابوبکر جوز جانی ہیں جن کے قول کو خلاف تحقیق کہنے میں مبادرت نہیں ہوسکتی اور وہ تحقیق انما الاعمال بالنیات سے ظاہر ہے، کیونکہ بنا اس ترک سنت کی، دوسری سنت کا من حیث السنت اختیار کرنا نہ تھا بلکہ محض جیفۂ دنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا، جس کی حقیقت استخفاف دین اور استعظام دنیا ہے اور اس کا وہی اثر ظاہر ہے جو ان بزرگ نے فرمایا ورنہ سوال کے سب مقدمات نماز بقصد ریا میں بدرجۂ اولیٰ جاری ہیں، کیا ریا بھی مباح ہو جائے گی۔

(5) آپ کی قدر دانی اور حسن ظن ہے ورنہ بزرگوں کے کلام میں جو کچھ ذخیرہ ہے اس کے سامنے یہ محض حزف پارہ سے زائد حیثیت نہیں رکھتے۔

(6) اس کے متعلق اوپر عرض کیا ہے اور سادگی اور خلوص سے عرض کیا ہے، یہ مباحث بہت گنجائش رکھتے ہیں، ان میں کلام کہیں ختم نہیں ہوتا، دوستوں میں ایسا کلام جو کبھی ختم نہ ہو، کشاکش کی صورت پیدا کرتا ہے، اس لیے ایسے بزرگ سے تحقیق مناسب ہے، جس سے زیادہ کلام نہ کیا جاسکے، ان کا پتہ اوپر عرض کیا ہے"۔

سفر تھانہ بھون میں اب بھی دو چار دن کی گنجائش باقی تھی اور 1930 میں "غلام" ہندستان کی ڈاک کا نظام، 48-1947 کے "آزاد" ہندستان کی سی ڈاک کا نہ تھا، دریاباد کے خط کا جواب، تھانہ بھون سے چوتھے دن تو یقینی اور اکثر تیسرے ہی دن آجاتا تھا، جواب اس سرفرازنامہ کا بھی

معاً لکھ دیا۔ کسی بزرگ کو بزرگ و معظم ماننے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری ہی باتیں دل میں اتر جائیں اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہو جائے، کم از کم اپنا عقیدہ تو یہی ہے اور اطاعت مطلق وغیر مشروط صرف رسول معصوم ہی کا حق خصوصی معلوم ہوتا ہے اور عقیدہ وخیال کو بھی چھوڑ یے، طبعی طور پر بھی اپنے کو انقیاد و اطاعت کی یہ دولت کبھی ملی ہی نہیں کہ ادھر سے جو کچھ اور جس مسئلہ میں بھی ارشاد ہو وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بہر حال اسے بے چوں و چرا مان ہی لیا جائے، وقت کے بیسیوں مسئلے اور پھر ان کی جزئیات تو سیکڑوں ایسی تھی جن میں اس نادان کو اس دانائے عصر کے ساتھ موافقت نہ ہوئی اور عقیدت و عظمت میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا۔ حضرت کی خدمت میں گستاخ اور ڈھیٹ اتنا تھا کہ جواب الٹا سیدھا جو کچھ بھی سمجھ میں آتا، بے تکلف عرض کر گزرتا، چنانچہ اب کی بھی یہ لکھ ڈالا:

"گرامی نامہ نے دونوں سوالوں کے جواب سے مشرف کیا، پہلے سوال (متعلق ترک ذبیحہ گاؤ) سے متعلق تو خاصی بڑی حد تک شرح صدر ہو گیا اور دوسرے سوال (متعلق انتقال از حنفیت بعمل بالحدیث) کے جواب سے بھی کسی درجہ میں تسکین ضرور حاصل ہوئی (1)، اس کا علم شاید جناب کو بھی نہ ہو کہ میں ہر تحریر گرامی کا کتنا مشتاق بلکہ حریص رہتا ہوں (2)، اور جن مسائل میں پوری طرح شرح صدر نہیں ہو پاتا ان میں بھی ارشادات گرامی سے نفع مبین تو بہر حال حاصل ہوتا ہے (3)، کم از کم کسی نئی حکمت، نئی بصیرت، نئی دلیل کا انکشاف تو ہر بار ہوتا ہی رہتا ہے، چنانچہ اب کی بھی خود اسی جواب سے کہ آئندہ فلاں فلاں قسم کے سوالات کا جواب نہ ملے گا، خدا گواہ ہے کہ قلب نے ایک کیف و لطف ہی محسوس کیا (4)۔

اور پھر یہ حال تو فقہ و سیاسیات کے اختلافی مسائل کے باب میں ہے، باقی جہاں تک سلوک و اصلاح نفس کے مسائل کا تعلق ہے، اس میں تو عارف رومیؒ میرے ہی دل کی ترجمانی صدیوں پیشتر کر گئے ہیں۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں اتنی برکت تو ضرور عطا فرمائے کہ جب تک ہم طالبین، مسترشدین کا جی چاہے ہمارے درمیان ارشاد و افادہ کے لیے سلامت با کرامت رہنے دے (5)۔

جواب حسب توقع بلا توقف آیا اور آپ کے سامنے بھی بلا توقف پیش ہے:

(1) یہ اختلاف ذوق کا ہے، مجھ کو ذوقاً اپنے دوسرے جواب میں زیادہ سکون ہے بنسبت پہلے جواب کے۔

(2) مجھ کو علم ہے اور اس علم سے آپ کا ممنون بھی ہوں، مگر ساتھ ہی اس کا بھی علم ہے کہ میری تحریرات اس قدر کے قابل نہیں اور اس علم سے گونہ خجل ہی ہوں کہ باوجود میری تحریر کے غیر قابل ہونے کے اہل علم اس کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں۔

(3) اس کا منشا محض حسن ظن ہے، نہ کہ میرا محقق ہونا۔

(4) آپ کے اس لطف سے مجھ کو لطف ہوا اور اس لطف میں یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس لطف کو باقی رکھے اور اس بقا کی شرائط میں سے عدم سوال بھی ہے، اس میں علاوہ لطف کے تعب کی بھی کمی ہے، متکلم کو بھی، مخاطب کو بھی۔

اب بے تکلفی کے سبب اپنی اس تجویز کا راز بتلاتا ہوں، وہ یہ کہ ہر فن میں اس شخص سے پوچھنا چاہیے جس میں اس شخص کے ماہر ہونے پر اعتماد ہو، سکون میں اس کو بڑا دخل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو فقہیات میں ماہر نہیں سمجھا جاتا۔

(5) یہ حد تو مخدوش ہے، شاید جلد ہی رائے بدل جائے، مناسب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے علم میں خیر ہو'۔

تحقیق مسائل وغیرہ کے پہلوؤں کو چھوڑیے مولانا کی لطیف و متین ظرافت کا بھی پورا نمونہ اس مکتوب کے اندر موجود ہے اور ہلکی شوخ طبعی و ظرافت نہ علم و فضل کے کمالات کے منافی ہے نہ درویشی و روحانیت کی کرامات کے۔ خط و کتابت کی میراب کافی سے زائد ہو چکی، یہ اور بات ہے کہ طبیعت اس سیر سے بھی سیر نہ ہوئی ہو، اب ایک جھلک پھر حاضری تھانہ بھون کی دیکھیے۔

(26)

مئی کے تیسرے ہفتہ کی کوئی گرما گرم رات تھی، غالباً 18، 19 کی درمیانی شب کہ یہ فقیر ایک بار پھر حاضر ہو گیا، لمبا قیام مہینہ سوا مہینہ کے لیے جب ہوتا تو عموماً زنانہ بھی ہمراہ ہوتا، کبھی اول ہی سے اور کبھی چند روز بعد سہارنپور سے بلا لیا جاتا۔ ایک مستقل مکان اپنے لیے برائے نام

کرایہ پر لے لیا جاتا اور کھانے پینے کے سارے انتظامات اپنے ہی ہوتے، ایک آدھ ملازم ضرور ہمراہ ہوتے، لیکن پردیس میں یہ آبادکاری کوئی آسان چیز نہ تھی، پھر تھانہ بھون میں، جو کوئی شہر نہیں، محض ایک معمولی قصبہ تھا اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جو عادی تمام تر تن آسانیوں کا تھا، حضرت ہی کی شفقتیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچا دیتیں اور جس حد تک بن پڑتا سفر کو حضر اور پردیس کو دیس بنا دیتیں۔ مسافر نوازی کے پورے لوازم، مہمان کے مذاق طبیعت اور حیثیت عرفی کی رعایت کے ساتھ انجام دیتے رہنا، اگر کسی صاحب کے خیال میں درویشی و مرتبہ مشیخت کے منافی ہے تو وہ صاحب خوب سن لیں کہ مولانا ان کے معیار کے مطابق ہرگز نہ درویش تھے نہ شیخ! بزرگی کی حکایت کسی بزرگ سے پوچھیے اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجیے۔ یہ عامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بہترین دوست، بہترین میزبان، بہترین مخدوم، بہترین عزیز، بہترین ہمسایہ، غرض انسانی کمالات واوصاف کے لحاظ سے ایک بہترین انسان ہوئے ہیں۔

آمد سے قبل مکان و قیام سے متعلق اب کی جو خط و کتابت رہی تھی وہ ابھی چند ہی صفحات اوپر نقل ہو چکی ہے اور اس لیے یقین ہے کہ ذہن میں تازہ ہو گی، قیام اب کی اسی مکان میں ہوا، رقبہ کم اور مکانیت بظاہر مختصر، لیکن اچھے اچھے وسیع مکانوں سے زیادہ آرام دہ اور قابل پسند بالاخانہ سے لے کر تہ خانہ تک، کمرہ سے لے کر صحن تک، دالان سے لے کر باورچی خانہ تک، ہر شے ضرورت کی، آرام کی، اپنی اپنی جگہ پر سلیقہ سے موجود تکلفات نہیں، نہ سہی، آسائش تو بہرحال، ہر آرائش پر اور راحت تو بہرصورت ہر نمائش پر مقدم ہے۔ کیسا انجینئر تھا یہ جس نے حقائق کو رسوم پر، ضروریات کو نمائش پر غالب رکھا۔ قدرت کو جس سے دلوں کی تعمیر اور اخلاق و روحانیت کے استحکام کا کام لینا تھا وہ اینٹ اور چونے کے کام میں بھی استاد نکلا! "تعمیری پروگرام" کا لفظ گاندھی جی کی تحریکات کے سلسلہ میں بار ہا سنا تھا، مولانا کی ذات، معلوم ہوا کہ اس کی بہترین جامع، لفظ کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں تھی!

آج اس گزرے ہوئے زمانہ کو کوئی 18 سال ہو چکے، لکھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی کل کی بات ہے، ماضی کی تو تلخیوں اور ناخوشگواریوں میں بھی خاطر کائنات نے ایک لذت رکھ

دی ہے، چہ جائیکہ خوشگواریوں اور گزری ہوئی مسرتوں، لذتوں اور راحتوں کی یاد میں! کاش دنیا میں اور کوئی ایجاد نہ ہوئی ہوتی۔ صرف یہ خوشگوار اور لذیذ ماضی کو پکڑ رکھنے اور جکڑ دینے کی کوئی تدبیر ایجاد ہوگئی ہوتی:

رات آدھی گزر چکی تھی، جب گاڑی تھانہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پر رُکی، سلیقہ شعار ملازم کو ایک ٹرین پہلے سے بھیج رکھا تھا، دہلی سے آئی ہوئی ڈاک اسٹیٹ مین اور کئی پرچوں کو منتظر پایا، گھر پہنچتے ہی موم بتی کی روشنی میں جلدی جلدی اسے پڑھنا شروع کیا، تھانہ بھون کا زائر، بہرحال سچ کا ایڈیٹر بھی تو تھا! اخبارات پر فوراً گر پڑنے کی لت جو وقت نا وقت کسی حال میں پیچھا نہیں چھوڑتی، اسے کہاں رکھ آتا! مئی کی رات کی بساط ہی کیا، وہ بھی جب آدھی سے زائد جاگتے ہی گزر چکی، خیال یہی تھا کہ صبح آنکھ دیر میں کھلے گی، لیکن شیخ خانقاہ کا فیض وتصرف یا دل کا دھڑکا، بہرحال آنکھ اپنے وقت پر بغیر کسی تکان کے محسوس کیے کھل گئی۔ اور آہ حضرت کی مسجد کے موذن کی اذان فجر! کمتر یہ حلاوت اور دل آویزی اور تاثیر کسی اذان میں ملے گی، بے نمازوں کے کان میں یہ آواز پڑ جائے تو عجب نہیں کہ نمازی بن جائیں، ظہر، عشا وغیرہ کے اوقات میں تو حضرت کے ہاں اذان ذرا ٹھہر کر ہوتی تھی، لیکن فجر میں اول ہی وقت ہوتی تھی کہ لوگوں کو وضو، غسل اور، اور ضرورتوں کے پورا کرنے کا وقت باطمینان مل جائے، موذن حافظ اعجاز اس وقت انشاء اللہ زندہ وسلامت ہوں گے (اللہ ان کی عمر میں برکت دے) عجب نہیں جو نسبت بلالی رکھتے ہوں۔

معمول یہ تھا کہ طالبین وسالکین کا تانتا ہر زمانہ میں بندھا رہتا تھا، یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کر کے خانقاہ میں ٹھہر جاتے، ان میں اچھے اچھے ذاکر وشاغل ہوتے اور ان میں سے بعض بعض تو اپنے زہد وریاضت کی بنا پر خود قابل زیارت ہوتے لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کے ڈھب کے زیادہ نہ ہوتے، دن تو دن رات کے بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے اور کام سے مراد محض نوافل واوراد ہی نہیں، ہاتھ پیر سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوگا، سادگی، اخلاص، بے طمعی، بے نفسی کے بیسیوں سبق ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر سیکھے جاسکتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک تعداد حضرت کے مخصوص خلفا کی بھی تھی، یہ عموماً اہل علم واہل وجاہت ہوتے، کوئی نہ کوئی ان میں سے بھی تھانہ بھون حاضر ہی

ہوتا رہتا، خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؒ (انسپکٹر آف اسکولس) مولانا محمد طیب صاحبؒ ناظم(1) دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، طبیب حاذق مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھیؒ، اس وقت یہی نام خیال میں آرہے ہیں، اس قسم کے حضرات سے بھی تھانہ بھون کے طویل قیام کے دوران ضرور ملاقات ہوجاتی۔ ایک تیسرا طبقہ مولانا کے ذاتی مہمانوں کا ہوا کرتا اور ان میں سے اکثر علم و دین کے مشاہیر ہی ہوتے، آج شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دہلی سے آمد ہے، کل مدرسہ مظاہر علوم کے مفتی عبداللطیف صاحبؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سہارنپور سے آرہے ہیں اور پرسوں رائے پور کے مشہور بزرگ شیخ عبدالقادر صاحبؒ جنھیں پہنچانے کو مولانا خود اسٹیشن تک گئے اور ان کے پیچھے ان کا ذکر خیر بار بار کرتے رہے۔ اس قسم کے نفع طویل قیام تھانہ بھون میں ضمناً لیکن عموماً ہی ہاتھ آجایا کرتے تھے۔

یہ منظر تو روزمرہ کے تھے، ایک روز بعد ظہر والی مجلس میں گیا اور ذرا دیر کرکے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تعلیم یافتہ ہندو صاحب مولانا کے قریب ہی داہنی طرف امتیازی جگہ پر بیٹھے ہوئے اور مولانا ان سے بلطف و اخلاق گفتگو میں مشغول ہیں، معلوم ہوا کہ یہ صاحب میرٹھ کالج میں (غالباً تاریخ کے) پروفیسر ہیں، وہ صوفیائے ہند کے حالات و تعلیمات دریافت کررہے تھے اور مولانا ایک ایک سوال کا جواب بشاشت قلب سے دے رہے تھے۔ مولانا کا تشدد یا ظاہری تشدد جو کچھ بھی تھا، وہ اصلاح کی غرض سے اور ان ہی لوگوں کے لیے تھا جو خود طالب اصلاح ہوکر آتے تھے، یہ نہ تھا کہ کوئی شخص محض ملاقات یا کسی مخصوص علمی تحقیق کے لیے آئے اور اس پر بے تحاشا دارو گیر، زجر و ملامت ہونے لگے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے مسلسل قیام میں مولانا کے معمولات کو بغور دیکھنے اور مزاج کے پہچاننے کا موقع خوب قریب سے ملا اور مدت قیام جتنی بڑھتی جاتی، عقیدت و عظمت چاہے نہ بڑھتی لیکن محبت و جاذبیت میں بہرحال ترقی ہوتی رہتی۔

1930 کی دوسری سہ ماہی، ہندستان کے طول و عرض میں ایک خاص ہیجان کی گھڑی تھی، گاندھی جی نے برطانیہ کے خلاف، مسلمانوں کو ساتھ لیے بغیر، قانون شکنی شروع کردی تھی اور اب کی اس کے لیے انتخاب نمک سازی کا کیا تھا، اس نمک سازی پر مسلمانوں کے بعض مہربانوں کی نمک پاشی مستزاد! 1919 تا 1922 کی تحریک خلافت و ترک موالات ہندو مسلم اتحاد کا ایک یادگار

(1) مہتمم (قاسمی)

عہد تھا، مسلمان اگر ''مہاتما گاندھی کی جے'' میں شریک تھے تو ہندوؤں کے گلے بھی گلی گلی اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے اور گاندھی جی، علی برادران کے ساتھ گویا شیر وشکر تھے۔ 1930 کا رنگ اس سے بالکل الگ تھا۔ الگ اس لیے کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا اور محبوب لیڈر محمد علیؒ بڑے بڑے تلخ تجربوں اور بڑی بڑی مایوسیاں اٹھانے کے بعد اب کانگریسی تحریک سے الگ تھا، جمعیۃ علمائے دہلی، بعض قیود وشرائط کے ساتھ کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی لیکن خود اس کا بھی ایک بازو اس سے الگ ہو کر ایک دوسری جمعیۃ العلما بنا رہا بلکہ بنا چکا تھا۔ میں خود اس وقت تک ایک گومگو اور حیص بیص کے عالم میں۔ ع

نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے!

یہ فضا تھی کہ تھانہ بھون آنا ہوا، آتے ہی نظر مظفر نگر کے مطبوعہ ایک پوسٹر پر پڑی، عنوان ''فرمان علمائے تھانہ بھون'' نیچے حضرت کی تحریروں کے اقتباس کچھ اس طرح دیے ہوئے کہ گویا حضرت نے خاص اس تحریک کی مخالفت میں کوئی فتویٰ دیا ہے، خاکسار نے دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ جواب نفی میں ارشاد ہوا۔ سچ کے ایڈیٹر کے لیے اتنا سہارا بہت تھا، پورا ایک مضمون ہاتھ آ گیا، حضرت ہی کے ایما سے ایک استفتا مرتب کر، (1) اس پر حضرت کا جواب اور اپنی تمہید بڑھا، سچ اور الجمعیۃ دونوں میں شائع کر دیا۔ سچ کی وہ تحریر اپنی شارح وترجمان آپ، اس پر اب نہ کسی تبصرہ کی ضرورت نہ اضافہ کی گنجائش، آگے بجنسہٖ اسی کو پڑھیے۔

(27)

جمعیۃ العلما کے اجلاس امروہہ نے کانگریس کی موجودہ تحریک قانون شکنی کی تائید اگرچہ بہت بچ بچ کر اور شرائط وقیود کے ساتھ مشروط ومقید کر کے کی، لیکن بہر حال کی۔ ادھر اس تجویز کا بعض مستند ومتدین علمائے کرام کے نام سے شائع ہونا تھا کہ دوسری طرف سے ایک ''فرمان'' شائع ہوا، جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اس تجویز کے قطعی مخالف ہیں اور دہلی کے ایک اخبار نے تصریح کے ساتھ لکھ دیا کہ ابھی جمعیۃ العلما کی تجویز

---

(1) مسودۂ استفتا جس پر مولانا کے دست مبارک کی اصلاحیں اور اضافے ہیں، آج تک اپنے پاس محفوظ ہے۔

(2) منقول از سچ جلد 6 نمبر 20، 21 (30 مئی و 6 جون 1930)

شائع ہوئے کچھ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے خلاف مسلمانوں کے جلسے ہندستان میں شروع ہو گئے ہیں اور اکثر مقامات سے خود علما اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، یہاں تک کہ علمائے تھانہ بھون، بالخصوص حضرت مولانا اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند کا فرمان اس کے خلاف شائع ہو چکا ہے''۔ اور سخت افسوس ہے کہ خلافت کمیٹی جیسی ذمہ دار مجلس کے ترجمان، روزنامہ خلافت نے بلا تامل اس قسم کی تحریروں کو اپنے ہاں نقل کرنا شروع کر دیا۔ اس پروپیگنڈہ میں حقیقت وواقعیت کا جز کس حد تک شامل ہے، اس کا جواب مراسلت ذیل کے پڑھنے کے بعد خود حضرت مولانا کی زبان سے مل جائے گا۔

''بخدمت گرامی حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، حال میں ایک تحریر ''فرمان علمائے تھانہ بھون'' کے عنوان سے اتحاد پریس مظفرنگر سے منجانب محمد نبی بصورت اشتہار نیز بعض اخبارات میں اس حیثیت سے شائع ہو رہی ہے کہ گویا موجودہ تحریک کے متعلق جناب والا نے اسی زمانہ میں مستقل طور پر بغرض اعلان تحریر فرمایا ہے، تحریر مذکور مسلک عریضہ ہذا ہے، اس کے متعلق بہ ادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا تحریر مذکور جناب نے شائع کرائی ہے یا جناب کی اجازت وایما سے شائع کی گئی ہے؟ والسلام

خادم عبدالماجد''

الجواب:۔''مکرمی دام لطفکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جواباً اجزائے ذیل عرض کرتا ہوں۔

(1) یہ مضمون نہ میں نے شائع کرایا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے اجازت لی ہے اور نہ قبل اشاعت اطلاع کی ہے۔

(2) مجھ کو یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ مضمون میرا ہے بھی یا نہیں، گو بعض اجزا کی نسبت احتمال ہوتا ہے کہ میرا ہوگا، مگر تحریک موجودہ سے قبل کا۔

(3) اور اگر میرا ہے تو معلوم نہیں کہ پوری اور مسلسل عبارت ہے یا ناتمام اور متفرق، کیونکہ دونوں صورتوں میں بعض اوقات مدلول اور مقصود بدل جاتا ہے۔

(4) پھر جتنی عبارت لکھی ہے اس کا موجودہ تحریک سے کوئی تعلق بھی نہیں، اس کا حاصل تو

صرف ان لوگوں کی شکایت ہے جو بانی تحریک کے اس درجہ معتقد ہیں کہ اس کی ہر تحریک کی قرآن وحدیث سے تائید کرنے لگتے ہیں اور یہ شکایت اب بھی ہے۔

(5) میں نے جب اول اشتہار دیکھا، مالک پریس کو خط لکھا کہ شائع کنندہ سے دریافت کریں کہ مضمون میری کس تحریر سے لیا ہے اس کا حوالہ بتلادیں اور کس زمانہ کا ہے اور بدوں اپنی کسی تمہید کے مستقل طور پر میری طرف منسوب کر کے کیوں شائع کیا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ گویا میں نے مستقل اشاعت ہی کی غرض سے لکھا ہے۔ مگر کافی سے زیادہ مدت گزر گئی۔ جواب نہیں آیا، قبل استفسار مالک پریس نے اس قدر اطلاع دی تھی کہ یہ شائع کرنے والے مدرسہ مخزن العلوم سہارنپور کے کوئی ملازم ہیں اور اگر کسی کو مزید تحقیق کی ضرورت ہو، وہ پریس مذکور یا مشتہر مذکور سے تحقیق فرمالیں۔

نوٹ: اس جواب سے مقصود صرف واقعہ اشتہار کی حقیقت بتلانا ہے نہ کہ اس تحریک کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنا کہ اس کا اس جواب سے کوئی تعلق نہیں۔

اشرف علی عفی عنہ 25 ذی الحجہ 1328"

مولانا کے مکتوب میں جو عبارتیں زیر خط اور جلی کردی گئی ہیں وہ خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں، مولانا بتصریح ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ مضمون نہ انھوں نے شائع کرایا، نہ کسی کو شائع کرنے کی اجازت دی، نہ قبل اشاعت انھیں اس کا علم ہوا اور نہ وہ مضمون ہرگز انھوں نے موجودہ تحریک کے متعلق تحریر فرمایا بلکہ مولانا کو تو اس میں شبہ ہے کہ آیا وہ مضمون ان کا ہے بھی اور اگر ہے تو آیا صحیح وبلاتحریف نقل بھی ہوا ہے! بانی تحریک گاندھی جی کے ساتھ بعض مسلمانوں کو محبت وعقیدت میں جو غلو ہے، اس کی اصلاح اور اس کا تدارک یقیناً ضروری ہے، اس مقصد میں علمائے جمعیۃ العلما کا قدم حضرت مولانا سے ہرگز پیچھے نہیں، مگر ظاہر ہے کہ اس کو تحریک موجودہ کی موافقت ومخالفت سے کیا تعلق؟ کاش ہمارے اہل صحافت، خلق وخالق کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے!

(28)

عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور وقوت، جوش وولولہ سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی، کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی، لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت

بھی ہے، یہ محبت اسی جوش وقوت کے ساتھ محمد علیؒ سے تھی، گویا ایک مقتدا تھے تو دوسرے محبوب اور ان دونوں کے درمیان آپس میں شدید سیاسی اختلافات کی گہری خلیج حائل ملاقات کیا معنی، موالات ہر قسم کی ترک! غلط فہمیوں اور ان کے طبعی نتیجہ کے طور پر بدگمانیوں کے انبار دونوں طرف لگے ہوئے۔

اس حلقہ میں ''وہ'' ایک بدعقیدہ نیچری اور ہندو پرست، اس پارٹی میں ''یہ'' ایک ملا محض اور گورنمنٹ کے حمایتی! فرق صرف اتنا تھا کہ حکیم الامت بہرحال حکیم الامت تھے، گفتگو میں ہر طرح زبان پر قابو اور مخاطب کی دل شکنی کا لحاظ رکھتے، ادھر محمد علیؒ کے ہاں زبان ضبط کے لفظ سے نا آشنا!

اس نیازمند غریب وناتواں کی جان عجب کشمکش میں۔ ع

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کیا دو معاصر مخلصین ومومنین کے درمیان اتنا شدید ومدید اختلاف اور تنازع ممکن بھی ہے؟ ممکن ہی نہیں کثیر الوقوع بھی اور یہیں پہنچ کر مذہب اہل سنت کی قدر ہوتی ہے، امیر المومنین علی مرتضیٰؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے اور دوسرے دوسرے اکابر صحابہؓ کے مابین اختلافات کی حکایت کس کے کانوں میں نہیں پہنچی ہے؟ دوسرے اختلافات اس سے کم درجہ کے مشاہیر میں سہی، پھر بھی مسلم مقبولین اور اہل اخلاص کے درمیان کیا نادر الوقوع رہے ہیں؟ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ، قطب الاقطابؒ اور محدث جلیل ابن جوزیؒ میں سے آپ کس کا شمار اہل باطل میں کریں گے؟ نظام الاولیا شیخ نظام الدین دہلویؒ اور قاضی شہر شیخ ضیاء الدین سنامیؒ کے درمیان آپ کس کے برسر ناحق ہونے کا حکم لگائیں گے؟ غرض عہد صحابہؓ سے لے کر متاخرین تک کون سا دور، اکابر ہی کی باہم تفسیق بلکہ تکفیر ومجادلہ سے خالی رہا ہے؟ نفس کے لیے اور شیطان کی راہ میں نہیں، بلکہ حق کے لیے اور اللہ کی راہ میں اس عالم ناسوت میں، محدود فہم وبصیرت رکھنے والے بندوں میں، حالات تکوینی کے محکوم ومسخر بندوں میں، جدال وخصومت کب اور کس دور میں نہیں رہی ہے؟ اور یہ بھی اسی راہ کی امتحان ہی کی ایک لطیف وصبر آزمای صورت ہے۔

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے مرے یار ہوتی آئی ہے

اور ذرا اور آگے بڑھیے تو دو معصوموں تک کے درمیان دینی حرارت سے وقتی آویزش اور ہنگامی عتاب فی اللہ کی حکایت تو خود قرآن مجید نے سنائی ہے۔ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَأْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ (اعراف، آیت 15) قَالَ يَابْنَؤُمَّ لَاتَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ (طٰہٰ۔ آیت 49) اور پھر وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ (حجر۔ آیت 47) کی بشارت اہل جنت کو اگر ان ہی موقعوں کے لیے نہیں تو اور کس محل کے لیے ہے؟

بہرحال دل مضطرب رہتا تھا کہ وقت کے ان دو بڑے مخلص بندوں اور دین وملت کے ان دو زبردست خدمت گزاروں کے درمیان کوئی صورت مصالحت ومفاہمت کی نکالیے یا کم سے کم اتنا تو ہو ہی جائے کہ آپس میں اتنی بیگانگی اور اجنبیت باقی نہ رہے اور اس کے لیے پہلا عملی قدم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ملاقات تو ہو جائے۔ اب تک دونوں بزرگوں میں باوجود ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں سرسری روشناسی ہوئی تھی اور اس کو بھی اب کئی برس گزر چکے تھے۔ آخر ایک روز موقع پا اور ہمت کر، خدمت مبارک میں عرض ہی کر دیا کہ ''حضرتؒ ایک مرتبہ ملاقات تو حضرت کے اور مولانا محمد علیؒ کے ہو ہی جانا چاہیے، حضرت تو سفر کرنے سے رہے، اجازت ہو تو ان ہی کو کبھی اپنے ہمراہ یہاں لے آؤں، جیسا آپ کی خدمت میں گستاخ ہوں ویسے ہی انھوں نے بھی منہ لگا رکھا ہے، امید کیا بلکہ یقین ہے کہ عرض رائگاں نہ جائے گی، انشاء اللہ کچھ تو غلط فہمیاں دونوں طرف کی ملاقات ہی سے دور ہو جائیں گی''۔ ذکر، پھر یاد کر لیجیے، آخر مئی یا شروع جون 1930 کا ہو رہا ہے، قدرت نے خود ہی کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ مولانا محمد علی بھی متواتر تلخ تجربوں کے بعد اب کانگریس سے ہٹ چکے تھے اور جو مسلک ونقطۂ نظر حکیم الامت کا تھا اس سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، دل نے اس تائید تکوینی کو اشارۂ غیبی سمجھا اور اس سے تقویت حاصل کی۔

تواضع وانکسار تو حکیم الامت کا حصہ تھا، میرے معروضہ کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ''ارے نہیں، وہ بڑے آدمی ہیں، یہاں کہاں آئیں گے، یہاں آنے کی انھیں دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں، انھیں بڑی زحمت ہوگی'' میں اس جواب کے لیے تیار تھا اور اس پر کب خاموش رہنے والا

تھا، عرض کی کہ ''اس سے حضرت کو کیا بحث، لانے والا اور بلانے والا تو میں ہوں، ان کے آنے کی ساری ذمہ داری میرے سر، میں صرف آپ کی اجازت چاہتا تھا۔ رہی ان کی زحمت و تکلیف تو اس سے کہیں بڑھ بڑھ کر تکلیف دہ مقامات اور ٹھیٹھ دیہات میں جانے اور ٹھہرنے کے عادی ہیں، ان کی زحمت کا تو خیال بھی نہ فرمائیے''۔ ذرا تامل کے بعد فرمایا کہ ''عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اس قسم کی تحریک کی تھی، پہلے تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بلانا مناسب نہیں، لیکن ان صاحب کے اصرار پر میں نے جو کہا تھا، وہی آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں، میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہر حال دیں کہ درمیان میں، ایک رات یہاں گزار سکیں، پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا، عزت سے اپنے قریب ہی بیٹھاؤں گا، لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وہ اس روز خود گفتگو نہ فرمائیں۔ بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلا قصد جواب سن لیں، آدمی ذہین ہیں، اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے، بس اس وقت صبر و خاموشی سے سن لیں، شب میں آرام کریں اور طبیعت کو خلوئے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقع دیں، پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر تک چاہیں ارشاد فرمائیں، میں بھی اسی خاموشی کے ساتھ سننے کو تیار رہوں گا''۔

واہ رے حکیم الامت! یہ جواب جس میں اتنی مصلحتوں کی رعایت ہو ان کے سوا کوئی اور دے سکتا تھا؟ ان ہی تحریروں سے تو بار بار کہنا پڑتا ہے کہ عالم و فاضل، ذاکر و شاغل، عابد و زاہد، بزرگ و درویش ہونا اور چیز ہے اور حکیم و مصلح ہونا کچھ اور!

هم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

اب آگے یہ نہ پوچھیے کہ ''تدبیر'' کا یہ اقدام ''تقدیر'' کی قوت کے آگے کس طرح ناکام رہا، دلّی جا، خوش خوش یہ پیام میں نے اپنی طرف سے مولانا محمد علیؒ کو پہنچایا اور عرض کیا کہ تھانہ بھون کا پروگرام میرے وہاں قیام کے زمانہ میں بنائیں۔ اس پر مولانا خوشی سے آمادہ تو خیر کیا ہوتے، کچھ نیم راضی سے ہو چلے تھے اور ادھر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آئندہ ملاقات میں انھیں اور زیادہ آمادہ

کر سکوں گا کہ عین اسی زمانہ میں ان کی علالت بہت زیادہ بڑھ گئی، یہاں تک کہ دہلی سے شملہ جانا پڑا، میں نے وہاں بھی ان کی خدمت میں حکیم الامت کی غیر سیاسی کتابیں، یاد آخرت وحقائق تصوف سے متعلق (شوق وطن وقصد السبیل وغیرہ) ارسال کیں کہ اسپتال میں لیٹے لیٹے ان کا مطالعہ جاری رہے، لیکن قبل اس کے کہ زمین اتنی بھی تیار ہو سکے یا مجھے اپنے حسب توقع ان کی خدمت میں ایک بار پھر حاضری وگفتگو کا موقع ملے، ان کا وقت موعود انھیں کشاں کشاں شملہ سے بھوپال اور بمبئی اور پھر لندن لے گیا اور بجائے یاد آخرت کے کتابی مطالعہ واستحضار کے وہ خود ہی اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے، او من احب لقاء الله احب الله لقاء ہ کی خلعت سے سرفراز ہو گئے۔ آہ کہ تاریخ امت کے کتنے صفحات ایسی ہی حسرتوں سے رنگین ہیں!

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

(29)

شروع جون کی کوئی تاریخ تھی، مولانا محمد علیؒ کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی گلنار بی سلمہا کا عقد مشہور قومی کارکن شعیب قریشی صاحب (1) کے ساتھ قرار پایا اور مولانا کے ہاں سے میرے پاس دعوت نامہ آیا، حضرت تھانویؒ سے مولاناؒ کے تعلقات اب بھی کچھ شگفتہ نہ تھے، اس لیے جانے کی اجازت میں نے ڈرتے اور ہچکچاتے ہی طلب کی، حضرت کے ہاں ان چیزوں میں تنگی کہاں؟ اجازت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ مرحمت ہوئی بلکہ تشویق وہمت افزائی کے لہجہ میں، محمد علیؒ کو اب کی کئی مہینے کے بعد دیکھا، بیچارہ ضعف وبیماریوں کی ایک پوٹ، 52 سال کی ادھیڑ عمر میں، ستر بہتر سال کے بوڑھوں سے بدتر! خیر یہ تو داستان ہی دوسری چھڑی جاتی ہے۔ یہیں مولوی احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلما سے ملاقات ہوئی، محفل عقد میں نہیں، آپس کے تعلقات آمد ورفت بھی اب ختم ہو چلے تھے، محفل سے باہر سڑک کے کنارہ، شب کے اندھیرے میں چوروں کی سی ملاقات ہوئی۔ ''فرمان کی حقیقت'' سے، بہت خوش ہوئے، مبارکباد دی اور الجمعیۃ کے لیے اس کی نقل لے گئے، بہرحال دو چار دن بعد دہلی سے سہارنپور ٹھہرتا ہوا پھر تھانہ بھون پہنچ گیا اور مدت

---

(1) یہ وہی شعیب قریشی ہیں جو مدتوں ریاست بھوپال میں وزیر رہ کر اس وقت 1950 میں پاکستان کی طرف سے روس میں سفیر تھے۔ (قاسمی)

قیام پوری کر آخر جون میں سہارنپور، دیوبند ٹھہرتے ہوئے وطن واپسی ہوئی۔ عبادت گزاروں اور اہل تقویٰ کی تو مولاناؒ کے حلقہ میں کمی کبھی بھی نہ رہتی، اب کی طویل قیام چونکہ اس زمانہ میں رہا جب انگریزی اسکولوں میں گرمیوں کی بڑی چھٹی ہوتی ہے، اس لیے خانقاہ میں دو ایک ایسے ماسٹر صاحبان سے بھی ملاقات ہوئی جو ماشاء اللہ اہل فہم بھی تھے اور یہ فہم کی نعمت بڑی نعمت ہے!

اب کی گھر پہنچ کر تین دن بعد جو عریضہ لکھا وہ اس قابل ہے کہ مع جواب تقریباً پورا ہی نقل ہو (معروضات ماجدی کے لیے ''م'' کی اور ارشادات اشرفی کے لیے ''ا'' کی علامت یاد رہے)

''م۔ تین دن ہوئے بحمد اللہ مع الخیر دریاباد واپس پہنچا ہوں۔

ا۔ اول خجالت کے ساتھ غالباً تین روز کے توقف جواب کی معافی چاہتا ہوں، میں اس کا منتظر رہا کہ فراغ کا وقت ملے تو خط لکھوں، مگر اضیاف کا ہجوم فوق العادت رہا، اس لیے فراغ میسر نہ ہوا، اب بھی قیلولہ کے عوض یہ خط لکھ رہا ہوں، ورنہ ظہر کے بعد پھر مجمع ہو جائے گا، مع الخیر پہنچنے سے اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

م۔ تھانہ بھون کی یاد برابر آئے جاتی ہے، یاد تو پہلے بھی آتی ہی رہتی تھی، اب کی بار اور زائد ہے

ا۔ یہاں بھی علیٰ ہذا کوئی دن آپ کے ذکر وفکر سے خالی نہیں جاتا۔

م۔ شب پنجشنبہ (2 جولائی) پچھلے وقت زلزلہ محسوس ہوا، آنکھ کھل گئی، اس وقت اندازہ یہ ہوا کہ کوئی دو منٹ تک قائم رہا ہوگا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ معاصی کو معاف فرمائے۔

م۔ کلام مجید کی آیات اس اثنا میں برابر زبان پر رہیں۔

ا۔ ایسے وقت میں ذکر اللہ کا استحضار علامت حب الٰہی کی ہے، مبارک ہو۔

م۔ تجربہ ہے کہ جب زلزلہ آتا ہے، کسی اہل اللہ کا وصال ہوتا ہے، کوئی تین سال ہوئے یہاں جوار کے ایک متقی بزرگ (مولانا عابد حسین صاحب فتح پوری) کا انتقال ہوا، عین تدفین کے وقت زلزلہ آیا۔

ا۔ تجربہ لزوم کے متعلق ہوتا ہے، یہ اقتران اتفاقی ہے جس کا تخلف اقتران پر غالب ہے نیز حدیث میں ہے۔ ان الشمس والقمر لاینخسفان لموت احد ولاحیاتہ۔ اس پر

زلزلہ کو قیاس کرلیا جائے۔

م۔ اب جو یہ زلزلہ محسوس ہوا، خیال اس وقت معاً جناب والا کی طرف گیا، چنانچہ اسی وقت آپ کی خیریت کی بھی دعائیں کیں اور بعد کو نمازوں میں بھی کیں۔

ا۔ خیر اس خیال سے میرا تو بھلا ہو گیا، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ مزید اتفاق یہ ہے کہ عین اس وقت خواب میں جناب ہی کی زیارت ہو رہی تھی، اس کے بعد دن میں دو بار خواب میں ہوئی، پھر کل جمعہ کو دن میں چوتھی بار ہوئی، چاروں مرتبہ بہت اچھی حالتوں میں دیکھا، تفصیلات تو اب یاد نہیں، اتنا خوب خیال ہے کہ جناب والا خوب بشاش، مطمئن تھے اور میری جانب بھی پوری شفقت کے ساتھ ملتفت، ان واقعات کو محض اتفاق پر محمول کروں یا ان کے کچھ معنی بھی سمجھوں؟

ا۔ مجھ کو تو ایسے اسرار سے بالکل دلچسپی نہیں، میں تو اتفاق پر محمول کرتا ہوں، البتہ علامت محبت کی ضرور ہے۔

م۔ اب کی سفر میں جب دیوبند ٹھہرا تو گھر میں مولانا سے بیعت ہو گئیں۔

ا۔ دونوں صاحبوں کو مبارک ہو۔

م۔ اور مولانا ہی نے تجدید عقد بھی کرادی(1)۔

ا۔ اس پر بھی دونوں صاحبوں کو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔

م۔ والا نامہ جو ''فرمان'' کی حقیقت سے متعلق میرے عریضہ کے جواب میں عنایت ہوا تھا اسے اپنی تمہید کے ساتھ میں نے سچ اور الجمعیۃ میں شائع کرادیا تھا، الحمدللہ کہ آپ کے مخلصوں کی ایک بڑی تعداد مثلاً...... وغیرہم اس سے بہت مسرور و مطمئن ہوئے اور مجھے تو بڑی خوشی اس کی ہے کہ مولانا نے بھی اسے بہت پسند فرمایا۔

ا۔ اہل اصلاح کی مسرت کو اپنے لیے فال نیک سمجھتا ہوں، مگر واقعات بتلا رہے ہیں کہ باستثنا جناب مولانا کے کہ وہاں علم و عمل کے اثر سے تنگی نہیں اور مسرت اصلی ہے اور بے غرض، باقی سب حضرات یا اکثر حضرات بہت جلد اس مسرت عارضی و عرضی کو ختم کردیں گے، چونکہ

(1) راقم آثم پر ایک دور الحاد کا طاری رہ چکا ہے، فقہا نے لکھا ہے کہ ایسی حالت میں عقد نکاح کی تجدید کرالینا چاہیے۔

اب تک کسی نے اصول کے موافق، ان تحریکات کے متعلق باقاعدہ سوال نہیں کیا تھا، اس لیے اپنی رائے کچھ ظاہر نہیں کرسکا، اب ایک صاحب نے باقاعدہ سوال کیا ہے، اس لیے باقاعدہ جواب لکھا، جو کہ واقع میں تو اس جواب کے معارض نہیں، جو آپ نے لکھوایا تھا، لیکن سطحی نظر والوں کی نظر میں باہم تعارض موہوم ہوگا، اس لیے وہ مسرت ختم ہوجائے گی اور بدگمانی پیدا ہوجانا عجب نہیں، مگر میں اس کی سب کو اجازت دیتا ہوں، مجھ کو جیسا چاہیں سمجھیں اور جو چاہیں کہہ لیں، انشاء اللہ دلگیر نہ ہوں گا۔

بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ اگر ان جوابوں کے ملاحظہ کے بعد کچھ ثقل ہوجائے مانع خطاب ہوتو موقت یا موبد طور پر اس مانع پر عمل رکھیے، میں ہر حال میں دعا کرتا رہوں گا۔

م۔ مولانا محمد علی صاحب اس وقت بہت زائد علیل ہیں، قدیم امراض ذیابیطس وغیرہ پر جدید امراض ریاحی، دورۂ قلب وغیرہ کا اضافہ ہوگیا ہے، تنفس سا ہر وقت رہنے لگا ہے، شملہ میں ایک اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں، خواب آور دوا کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ سونا ممکن ہے نہ لیٹنا، دعائے صحت کے لیے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے۔

ا۔ خود میرا دل دکھا، دل سے دعائے خیر کرتا ہوں۔

اطلاع بغرض استدعاء دعا۔ مولوی عبدالباری صاحب کے چھوٹے بھائی میاں شعیب کل یہاں پہنچ گئے، دعا کیجیے جو غرض ان کو یہاں پہنچنے کی ہے، یعنی اصلاح، اللہ تعالیٰ اس کو پوری فرمادیں۔

(30)

حضرت اپنی ذات سے اپنے سیاسی بلکہ مذہبی مخالفین کے بھی حق میں جتنے نرم، مہذب و متین تھے اور اپنی تحریروں میں اس کا پورا لحاظ رکھ لیتے تھے، اس کے تجربے ایک دو بار نہیں، بار بار ہوچکے تھے، لیکن اس پر بھی برابر حیرت رہا کی کہ حضرت کے اس مذاق طبیعت کے باوجود مقربین اور مخصوص حاشیہ نشینوں میں بعض صاحبان، زبان اور قلم دونوں بے لگام رکھتے تھے اور ان سب کے سرخیل ایک خاص مولوی صاحب تو بس اپنی نظیر آپ تھے، مدت سے ان کی بدزبانی اور اس کے ساتھ مولانا کے ہاں ان کا تقرب دل کو کھٹک رہا تھا، آخر ایک بار خط میں اس کو عرض ہی کردیا اور

کچھ خانگی باتیں ہر عریضہ کا جز ہوتی ہی تھیں، خط پر تاریخ 12 جولائی کی ہے:

''تین چار دن سے اپنے عریضہ کے جواب کا برابر انتظار رہتا(1)، بحمداللہ مفصل جواب سے سرفرازی ہوئی، جس سیاسی تحریر کا حوالہ اس والا نامہ میں ہے، وہ ہنوز نظر سے نہیں گزری(2)، لیکن گزرنے پر بھی انشاءاللہ قلب پر کوئی مخالف اثر مترتب نہ ہوگا(3)، البتہ ایک دوسرے امر میں قلب کو اکثر خلجان رہا کیا ہے، آج اس بارہ میں اپنی تشفی چاہتا ہوں، یعنی جناب والا کے قلم سے بعض اور صاحبوں مثلاً مولوی ...... کی تحریروں کی تائید وتصویب(4)، ابھی اسی ہفتے ان کی حل القرآن جلد اول کو پڑھا اور کیا عرض کروں کہ جا بجا اسے پڑھ کر کیسی تکلیف ہوئی، تتمہ (ص 140 تا 147) میں محض ایک اجتہادی مسئلہ میں اختلاف کے جرم میں نہ صرف تنہا ''مسٹر محمد علی بلکہ ساری جمعیۃ العلما کو صاف صاف ''مکذب القرآن'' افترا علی القرآن'' جہالت'' اور'' دعاوی کفریہ'' کا فر تک بنایا ہے کہ یہ لوگ مشرکین مکہ سے بدترین ہیں، ایسی تحریروں پر جب جناب کے قلم سے صادر پاتا ہوں(5)، تو فرط ادب سے کچھ کہتے نہیں بنتا، اجازت ہو تو حالی مرحوم کا ایک شعر عرض کردوں۔

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا (6)

آخر خود جناب کے بیان القرآن میں بھی تو موقع بموقع باطل فرقوں کی تردید ہے، اس طرز اور اس طرز میں کیا مناسبت ہے؟ کہاں وہ متانت وشان عالمانہ اور کہاں یہ دل آزار طرز عامیانہ(7)، مجھ سے عرصہ ہوا، آپ کے ایک بڑے مخلص نے (جو خود بھی ماشاءاللہ ایک ممتاز عالم دین ہیں) کہا تھا کہ حضرت تھانویؒ کو سب سے زیادہ بدنام ان کے بعض مقرب تلامذہ ہی نے کیا ہے(8)، اس قول کا میں محض ناقل ہوں، باقی خود اپنے قلب پر جو گزرتی رہتی ہے وہ اوپر عرض کر چکا۔

پچھلا عریضہ روانہ کرنے کے بعد بھی دوبارہ خواب میں زیارت ہوئی(9)۔

میاں شعیب کو خدا کرے پورے استفادہ کی توفیق نصیب ہو (10)۔

گھر میں آثار حمل معلوم ہو رہے ہیں، والدہ ماجدہ مدظلہا اس کو جناب کی دعا وتوجہ کا ثمرہ فرماتی ہیں (11)۔ تحفظ کے لیے کوئی دعا یا نقش اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو مرحمت ہو(12)''

جواب حسب معمول فوراً ہی آیا:

"(1) یہ تعلق سے ناشی ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

(2) ابھی چھپی نہیں ہے، سائل چھپوانے کو کہتے ہیں، اگر مجھ کو بھی چند نسخے دیے تو میں کسی خط کے ساتھ بھیج دوں گا۔

(3) یہ آپ کی بلند نظری ہے، جہاں تک میری نظر نہ گئی تھی اب آپ کے لے جانے سے گئی، بارک اللہ فیکم۔

(4) مجھ کو یاد نہیں کہ کسی ایسی تیز تحریر کی میں نے تصویب تحریر کی ہو، جبکہ میں خود اس کے خلاف ان کو مشورہ دیتا رہتا ہوں، ہاں اگر کسی مضمون کو فی نفسہٖ صحیح سمجھتا ہوں، گو عنوان تیز ہو، زبانی تصویب کر دیتا ہوں۔

(5) مجھ کو واقعی یاد نہیں پڑتا، لیکن اگر میری یاد کے خلاف کہیں ایسا پایا جائے، ان کی نیت پر موافقت کر دی ہوگی، جیسے فقہ کی کتابوں میں تکفیر کے فتووں کی سب علما موافقت کرتے ہیں، حالانکہ بہت سے فتووں میں ان اقوال کا کفر ہونا مشکل ہے، مگر محض موافقت کی بنا اہل فتویٰ کی یہ نیت ہے کہ عوام الناس ایسے اقوال سے سختی کے ساتھ بچیں۔

(6) شعر یاد آنا بالکل برمحل ہے، میں جیسا ہنسنے میں شریک ہوں، ایسا ہی رونے میں بھی، کیونکہ رونے والوں کو بھی خوش نیت سمجھتا ہوں اور ہنسنے والوں کو بھی اور سچ تو یہ ہے کہ برکات اسلام سے فائض ہونے میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہے، رونا رعد ہے ہنسنا برق، دونوں کے جمع ہونے سے بارش ہوتی ہے۔

(7) فطری تفاوت کو کون مٹا سکتا ہے، ابن تیمیہؒ استاد ہیں، ابن القیمؒ شاگرد، استاد گرم، شاگرد نرم، اب کس کو کیا کہا جائے، وہاں ابن تیمیہؒ کا رنگ ہے، فطرتاً بھی اور کچھ ان کے مطالعۂ کتب سے بھی۔

(8) وہ تو میرے تلمیذ بھی نہیں اور نہ مقرب، وہ عنایت کرتے ہیں اور میں رعایت، آپ کو شاید اس کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ میری تحریرات پر بھی ایسی ہی آزادی سے کلام کرتے ہیں جس میں اگر مضمون صحیح ہوا قبول کر کے اپنے قول کو واپس لے لیتا ہوں ورنہ قبول نہیں کرتا، لیکن برا نہیں مانتا

صرف نیت پر نظر کر کے باقی بدنامی کا تو مجھ پر بحمداللہ دانہ خردل کے برابر بھی اثر نہیں ہوتا، البتہ آپ کے دل دکھنے سے دل دکھتا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ آپ ان تحریرات کو نہ دیکھا کیجیے۔

(9) یہ سب آثار ہیں محبت کے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

(10) ہاں دعا کرتے رہیے، ان کو بھی انس تو معلوم ہوتا ہے اور ان سے مجھ کو بھی وہی ہادی حقیقی ہیں۔

(11) ان کی محبت ہے، میں کیا چیز ہوں۔

(12) میں عامل تو ہوں نہیں، مگر توکلاً علی اللہ ایک تعویذ دے دیا کرتا ہوں اب بھی حاضر ہے گلے میں ایسے طور پر رہے کہ زیر ناف پڑا رہے''۔

خط و کتابت بعض اوقات بڑی تیزی سے ہوتی، ابھی اُدھر سے جواب آیا نہیں کہ اِدھر سے دوسرا نیاز نامہ پھر تیار، چنانچہ اس 12 والے عریضہ کے بعد دوسرے عریضہ کی تاریخ 19 جولائی ہے۔ حضرت کی صحبت کی اصلی برکت یہ تھی کہ ذہن خود اپنی کوتاہیوں کی جانب منتقل ہو جاتا، نماز کے ارکان ٹھیک ادا ہو پاتے ہیں یا نہیں؟ وضو بھی ٹھیک ٹھیک کر آتا ہے یا نہیں، قرآن مجید کے الفاظ ضروری حد تک صحیح ادا ہو پاتے ہیں یا نہیں؟ پڑوسیوں کے ساتھ، اپنے نوکروں چاکروں کے ساتھ جو طرز عمل ہے، وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ بھائی بہنوں کے، عزیزوں کے، بیوی بچوں کے جو حقوق شریعت نے واجب کیے ہیں، وہ بھی ادا ہو رہے ہیں یا نہیں؟ تقسیم جائداد شریعت کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں؟ آمدنی کا کوئی جز ناجائز اور اکل بالباطل کے تحت میں تو نہیں؟ وغیرہا، بیسیوں سوال اپنے ہی متعلق ذہن کے سامنے آنے لگے، ذیل کا مکتوب تمام تر ایک استفتا فقہی ہے اور نسبتاً مختصر ہے، اس لیے سوال جواب ساتھ ہی ساتھ پڑھتے چلیے۔

م۔ آج کے عریضہ میں دو فقہی سوالات عرض کرنے ہیں، ایک اپنی ذات سے متعلق دوسرا ایک ہم وطن سے متعلق۔

ا۔ چونکہ ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں، اس لیے اس کو اپنے کلیہ سابقہ سے مستثنیٰ کر کے جواب عرض کرتا ہوں۔

م۔ ہم لوگ دو بھائی اور ایک بہن ہیں اور ہم دونوں کی ماشاء اللہ کئی اولادیں، لیکن ہم لوگوں کا

کہنا چاہیے ہر مال مشترک ہی ہے، زمینداری، مکان، سامان مکان وخانہ داری، ہر شے مشترک اور آمدنی کے لحاظ سے بھی خلط ملط، کچھ نہیں معلوم کہ کون سی شے کس کی ملک ہے، ہر چیز سب کے کام میں یکساں رہی ہے اور یہ بات ایک پشت قبل سے چلی آرہی ہے، والد مرحوم اور چچا صاحب مرحوم میں بھی ایسی ہی یک جہتی تھی، ان کی بھی جائدادیں ملی جلی ہوئی تھیں، اب آپ کے فیض صحبت سے عموماً اور وعظ احکام المال کے مطالعہ سے خصوصاً ذہن کی رہنمائی اس جانب ہوئی کہ ہر ایک کی ملک متعین ہونا ضروری ہے کہ بغیر اس کے وارثوں کے درمیان تقسیم شرعی کیونکر ہو سکے گی، سو اب اشکال کا حل ہمارے ہاں کے لیے فرمایئے، ہمارے ہاں تو ملک ہی متعین نہیں، کئی دن سے اس فکر میں ہوں، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اب آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ا۔ ایسی صورت میں ضرورت اس کی ہے کہ سب مصالح پر نظر کر کے ایک صورت صلح کی تجویز کر لی جائے، مناقشہ نہ کیا جائے کہ ہر شخص اپنا پورا حق وصول کرنا چاہے بلکہ ہر شخص تسامح سے کام لے، البتہ ان میں اگر کوئی نابالغ ہو، اس کا حصہ اتنا لگایا جائے کہ کسی کمی کا احتمال نہ رہے، اگر میری یہ تقریر کافی نہ ہو تو عدم کفایت کی وجہ ظاہر فرما کر مع اس پرچہ کے دوبارہ استفسار فرمایا جائے۔

م۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں ایک رئیس کے ہاں ایک ملازم کی بیوی پر گھر کی مالکہ خفا ہوئیں اور طنز سے بولیں کہ جا اپنے بیٹے کو یہ پیسہ دے آ، شوہر نے یہ سنا تو اس نے بھی مزاح وطنز کے لہجہ میں بیوی سے کہا ''اماں، لاؤ سودے کے پیسے لاؤ'' اس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اماں کہنے سے طلاق واقع ہو گئی۔

ا۔ اگر مزاح نہ بھی ہوتا تب بھی یہ قول محض بے اثر تھا، طلاق وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوئی''۔

اگست کے مہینہ کی مراسلت اتفاق سے دو کارڈوں تک محدود رہی اور وہ کارڈ بھی محض ذاتی وخانگی معاملات میں طلب دعا کے لیے۔ پہلا کارڈ جس پر یکم اگست کی مہر ہے:

''وبا کی خبر سے قلب کو تعلق ہے، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمادیں، اگر دل چاہے متعلقین کو بتلا دیجیے کہ ہر خوردنی نوشیدنی چیز پر 3 بار سورۂ انا انزلنا دم کر کے کھائیں پئیں اور

ستغفار کی کثرت رکھیں''۔(1)

دوسرا کارڈ جس پر مہر 20 اگست کی ہے:

''اللہ تعالیٰ آپ کو اور برخورداری کو صحت بخشے، بعد افاقہ بھی اطلاع دیجیے، اللہ تعالیٰ سب بلا سے ہر قسم کی وبا، ہیضہ و طاعون کو دفع فرمادے، میں بھی امیدوار دعا ہوں''۔

مولانا کا وقت عزیز بلا ضرورت لینا یوں بھی طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا تھا اور کوئی خاص ضرورت اتفاق سے پیش آئی نہیں اس لیے مراسلت ان چند ہفتوں کچھ رکی رکی سی رہی۔ اتفاق مزید یہ کہ 1930 کی اس تیسری ماہی میں نمک سازی اور قانون شکنی کے سلسلہ میں ہندوستان کا سیاسی بحران تیز سے تیز تر ہوا اور مسلمان خصوصاً ایک عام ابتلا میں گرفتار، بھائی بھائی میں تفرقہ پڑ گیا، بیٹے باپ سے جدا ہونے لگے اور مرید مرشد سے چھٹنے لگے اور عین اسی زمانہ میں حضرت مولانا کے قلم سے رسالہ معاملۃ المسلمین شائع ہوا (پورا نام معاملۃ المسلمین فی مجادلۃ غیر المسلمین) اور اب وہ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ کے مجموعہ کا ایک جز بن کر دارالاشاعت دیوبند، ضلع سہارنپور سے شایع ہورہا ہے۔ جس کی زد تمامتر آکر مولانا حسین احمد صاحبؒ کے سیاسی مسلک پر پڑتی ہے۔ تکوینی اتفاقات اور ترتیب حالات کے سامنے جب حضرات صحابہؓ تک بے بس ہو ہو گئے تو ہم غریبوں، نادانوں کا کیا ذکر، میرا ذہن اپنی سادہ دلی سے اس جانب بالکل نہ منتقل ہوا کہ اس زمانہ میں اور اس ماحول میں میری ذرا طویل خاموشی یا نیم خاموشی کے معنی ارادی اعراض یا عمداً کنارہ کشی کے بھی لیے جاسکتے ہیں، بات اب اتنے عرصہ کے بعد بالکل لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس وقت ذہن اس طرف گیا ہی نہیں۔ حافظ کے مشہور غزل کے مصرع

گر زہندوے شا برما جفائے رفت رفت

اور

درمیان جان وجانان ماجرائے رفت رفت

نظر سے بارہا گزرے تھے، انھیں پڑھا تھا، گنگنایا تھا، تحریروں میں دہرایا تھا، لیکن اس شاعری کو ہمیشہ شاعری ہی سمجھتا رہا تھا۔

(31)

وسط ستمبر کے بعد کی کوئی تاریخ تھی کہ ایک عزیز مع دو رفیقوں کے اپنے اپنے مقام سے تھانہ بھون کے لیے پہلی بار روانہ ہوئے اور اپنے حسن ظن سے پہلے دریاباد کو سرفراز کرتے گئے، ان کی خدمت میں مناسب مشورے عرض کردیے گئے اور خیال یہ ہوا کہ وہ واپس آلیں جب پھر حضرت کی خدمت میں خط لکھا جایے 29 ستمبر کو وہ سیدھے دریاباد واپس آئے، حضرتؒ کی خیر وعافیت تو انھوں نے بحمد اللہ سنائی اور خود بھی بہت خوش خوش آئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خبر بد بھی لائے کہ حضرت کو میرے اس طویل سکون سے ایک گونہ گمان ارادی اعراض کا ہے!

این گل دیگر شگفت!

سن کر سناٹے میں آگیا، طبیعت خبر کے راویوں پر جھنجھلا کر رہ گئی۔

ہمراہ عدو آئے وہ یاں ہائے قیامت

اک اور بھی ساتھ اپنے لگا لائے قیامت

صبح اٹھتے ہی ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں چلتا کیا۔ عریضہ تنہا پہلے پڑھ لیجیے، جواب بعد کو پڑھیے گا، جواب اگر ساتھ ساتھ پڑھتے گئے، تو عریضہ تو بالکل بیکار اور بے جان نظر آئے گا، عریضہ کی عبارت میں حسب معمول اختصار و تلخیص سے کام لیا جائے گا، جواب لفظ بلفظ درج ہوگا، نیاز نامہ اب ملاحظہ ہو:

'سیدی ومطاعی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت سے عریضہ نگاری کا ارادہ کر رہا تھا، آج کل پر ٹلتا رہا، ادھر چند روز ہوئے میرے ایک عزیز (جو باندہ میں وکیل ہیں) مع اپنے دو رفیقوں کے خدمت والا میں حاضر ہوئے تھے، خیال یہ کر رہا تھا کہ واپسی پر ان سے خیریت معلوم ہو جائے، جب عریضہ لکھوں، اب وہ کل سہ پہر کو یہاں پہنچے، بحمد اللہ خیریت تو ان سے معلوم ہوگئی، وہ تینوں صاحب میری حسب توقع مسرور ومطمئن بھی ہر طرح آئے(1)۔

البتہ اس سے قلب کو تکلیف پہنچی(2) کہ رسالہ معاملۃ المسلمین کی اشاعت کی بنا پر میری جانب سے ترک مراسلت کا گمان (وہ گمان درجۂ احتمال ہی میں سہی) جناب کو کیسے پیدا ہوا(3)، کیا

میری نیازمندی اور قلبی عقیدت ایسی ایسی ہلکی چیزوں سے بدل جانے والی ہے(4)؟ مسائل مختلف فیہ میں اختلاف ونزاع تو آج سے نہیں سلف سے چلا آیا ہے(5)، پھر جب مالکؒ وشافعیؒ سے بدعقیدگی کسی حنفی کے لیے جائز نہیں(6)، تو اس وقت ان مسائل کی بنا پر دور حاضر کے حکیم الامت(7) سے کیونکر جائز ہوسکتی ہے؟ یہ تو خیر ایک سیاسی مسئلہ ہے، میں تو متعدد فقہی مسائل میں بھی جناب والا کے ارشادات کو اپنی فہم سے بالاتر پاتا ہوں(8) بایں ہمہ جو نیازمندی قائم ہو چکی، وہ غیر متزلزل ہے، غزالیؒ کی فقہ کو اپنے لیے حجت نہیں سمجھتا، لیکن سلوک وفن اصلاح نفس میں انھیں امام الائمہ سمجھتا ہوں اور وہ زندہ ہوتے تو ان کی کفش برداری اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔ بلا شائبۂ تصنع وتملق عرض ہے کہ ایسا ہی معاملہ جناب والا کے ساتھ ہے(9)۔

خدمت والا سے واپس ہوئے اب کوئی تین مہینے ہوئے، اب پھر حاضری کا بہت دل چاہنے لگا ہے۔ زیارت خواب میں متعدد بار ہوئی، کبھی نماز پڑھتے پایا، کبھی نماز کے لیے تیار ہوتے، تسکین ہر مرتبہ حاصل رہی، ایک مہینہ کے اندر ہی انشاءاللہ حاضری کا پھر قصد ہے(10)۔

پچھلے دنوں یہاں ہیضہ کا زور رہا، ہم لوگ بحمداللہ محفوظ رہے، اب آب وہوا صاف ہے(11)۔

والسلام محتاج دعا

عبدالماجد"

جواب پڑھیے اور انتظار کے بغیر پڑھیے، سہولت کے لیے نمبر ہر فقرہ پر ڈال دیے ہیں:

"مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(1) یہ سب برکت آپ کی توقع کی ہے۔

(2) بیشک تکلیف پہنچی جس کی میں معافی چاہتا ہوں، لیکن اس پر نظر فرمائی جائے کہ اس احتمال کے ظاہر نہ کرنے میں آپ رفع بھی نہ فرماتے اور براہ بشریت مجھ کو وہ احتمال بڑھ جاتا اور اس وقت آپ کو اطلاع ہوتی تو زیادہ تکلیف ہوتی، اگر اس پر نظر فرمائی جائے تو پھر میرے اظہار سے جو تکلیف ہوئی وہ نہ ہوتی، بلکہ اخفا کو موجب تکلیف قرار دیتے، لیکن پھر بھی معافی چاہتا ہوں۔

(3) حقیقت کے نہ جاننے سے۔

(4) اسی میں تو شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب کے نزدیک ہلکی ہیں یا نہیں۔

(5) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے کہ سب کے نزدیک مختلف فیہ ہیں یا نہیں۔

(6) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے یہ اختلاف سب کے نزدیک مثل اختلاف حنفی شافعی کے ہے یا نہیں۔

(7) یہ لقب تو مجھ کو خود مسلم نہیں۔

(8) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ مثل فقہی مسائل کے ہے یا نہیں۔

(9) اب تو کوئی شبہ ہی نہ رہا مگر بدوں حقیقت پر مطلع ہوئے تو شبہ ہو سکتا تھا اور ہوا اور منشا اس کا احتیاط تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا تعلق کسی کے لیے تکلیف کا سبب نہ بنے۔

(10) اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ عطا فرمائے، میرے پاس بجز دعا کے کوئی چیز نہیں۔

راز:۔ جس میں میری کوئی مصلحت نہیں، صرف آپ کی مصلحت ہے اور وہ بھی دینی، متواتر اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کانگریس کی شرکت کو فرض فرماتے ہیں، اس صورت میں معلوم نہیں اپنے خاص متعلقین کے لیے تارکین فرض سے خاص تعلقات رکھنے کو عقلاً یا شرعاً یا طبعاً پسند فرماتے ہیں یا نہیں، اس لیے خاص عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ مولانا سے ایسے طریقہ سے کہ مولانا اپنا اصلی خیال ظاہر فرما دیں ضرور تحقیق کر لیں کہ مجھ جیسے تارک فرض سے ان صاحبوں کا ملنا ان کے قلب لطیف پر گراں تو نہ ہوگا، کیونکہ گرانی کی صورت میں باطنی فیوض منقطع ہو جاتے ہیں جو ضرر عظیم ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آیا وہ روایت گو ظاہراً متواتر ہے صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہو اور ملنا گراں تو چند روز کے لیے مجھ سے ملنا بند کر دینے سے کچھ ضرر نہیں، پھر جب موقع ہوگا عود ہو جائے گا اور میں زمانہ بے تعلقی میں بھی دعا گو رہوں گا۔

(11) مبارک ہو۔

اشرف علیؒ

اسی 15۔16 برس کے عرصہ میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی! اور اب تو خیر حضرت کے وصال کو

پانچواں برس ہو رہا ہے، زندگی ہی میں دنیا کتنی بدل چکی تھی! مزاجوں کے رخ بدل گئے، دلوں کی دھڑکنیں بدل گئیں، فضا کی ہر سانس بدلی ہوئی، یوں کہیے کہ زمین آسمان بدل گئے۔ ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں!

العالم متغیر جس نے کہا بالکل سچ کہا، دیکھنے میں ایک بہت موٹی سی بات، لیکن حقیقت میں بہت گہری اور باریک بات تھی۔ کاش 1930 متحجر ہو گیا ہوتا! زمانہ کی گھڑی کی سوئی اسی ہندسہ پر پہنچ کر رک گئی ہوتی۔ کاش یہ آپ بیتی، سرگذشت صرف شیرینیوں اور حلاوتوں ہی کی ہوتی، لیکن زندگی ساری کی ساری خواب شیریں ہی کا نام نہیں، کیسے کیسے تلخ تجربے، کتنے بھیانک اور ڈراؤنے خواب اسی زندگی میں دیکھنے پڑتے ہیں! طبیعت اس سے ہچکچاتی ہے کہ ساری ہی روئداد دہرائی جائے، لیکن پھر دل یہی فیصلہ کرتا ہے کہ دوسروں کو پورا نفع جب ہی ہو سکتا ہے جب سب ہی کچھ اگل کر رکھ دیا جائے اور لکھنے والے پر جو کچھ بھی گزر جائے، پڑھنے والے اس کی موت کے بعد بھی ان نقوش کاغذی سے بہر حال کچھ سبق ہی حاصل کرتے رہیں، پھر یہ نظارہ کہ ایک طرف ایک سپاٹ دل و دماغ اور سطحی نظر رکھنے والا 38 سال کی عمر کا ہے اور دوسری طرف ایک حکیمانہ نظر رکھنے والا محقق واستاد، صاحب فن ستر بہتر سال کی عمر کا جہاندیدہ، وہ کس کس طرح اسے گھوم گھما کر گرفت میں لا کر، راہ راست پر لا رہا ہے اور کس کس طرح نکات فن کا افادہ کرتا جا رہا ہے، یہ سب چیزیں اگر منظر عام پر نہ لائی جائیں تو یہ کتنا بڑا بخل ہوگا، گو بعض دوسری مصلحتوں کا اس سے خون ہی ہو رہا ہو، لیکن پھر دنیا میں کون سی بڑی مصلحت ہے جس کے لیے چھوٹی چھوٹی مصلحتوں کی قربانی کرنی نہیں ہوتی؟

(32)

نقوش و تاثرات کی یہ قسط جو حضرت کی وفات سے پورے تین سال بعد وسط جولائی 1946 میں سپرد قلم ہو رہی ہے (اور مجموعہ کی اشاعت کی نوبت تو دیکھیے کب آئے) پوری طرح سمجھ میں نہ آئے گی، بلکہ ذہن میں اور الجھن پیدا کر دے گی، جب تک سلسلہ کے ابتدائی نمبر خصوصاً 5 و 6 پیش نظر نہ ہوں جو حضرت کی وفات سے چند ہی ہفتے بعد 1943 کی آخری سہ ماہی میں لکھے گئے تھے، جن حضرات کے ذہن میں ان نمبروں کے مضامین نہیں، وہ لاکھ ذہین ہوں، مگر اس گتھی کو حل

ہی نہ کرسکیں گے کہ آخر ایک باضابطہ مرشد کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے بزرگ سے رابطہ وتعلق قائم رکھنے پر اتنا اصرار کیوں ہے۔ وہاں ایک ایک تفصیل اسی لیے درج ہو چکی تھی کہ آگے چل کر ذہن کو جھٹکا نہ لگے اور پڑھنے والا آسانی سے سمجھتا رہے کہ لکھنے والے کا اصلی مرکز عقیدت کون تھا، رائے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ پڑھنے والے لکھنے والے کی موافقت ہی میں قائم کریں، لیکن یہ تو بہر حال ضروری ہے کہ روئداد واقعات وہ من وعن اسی کی زبان سے سنیں۔

مرکز عقیدت وعظمت والے بزرگ کے حق میں یہ عقیدہ بھی اصلاً ہرگز ضروری نہیں کہ وہی عنداللہ بھی سب سے زیادہ مقبول ہیں، اس کا فیصلہ کوئی بندہ کیونکر کرسکتا ہے، چہ جائیکہ ایسا شخص جو خود ان بزرگوں سے کہیں فروتر ہو، طالب کے دیکھنے کی بات تو صرف یہ ہوتی ہے کہ میرے حق میں نافع تر کون ہے، میری تعلیم واصلاح کون بہتر طریقہ سے کرسکتا ہے؟ وہی ایک گستاخ شاعر کی زبان میں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

لکھنؤ میں ابھی 20۔21 سال اُدھر تک ایک مشہور بزرگ تھے، اپنے علم وفضل، زہد وتقویٰ کے لیے عوام ہی میں نہیں، حلقۂ خواص میں بھی مقبول ونامور، ان کی خدمت میں ایک سے زائد بار حاضری کا اتفاق ہوا، ان کی بزرگی اور برگزیدگی میں ذرا شک نہیں، یقیناً عنداللہ بڑے مقبول ہوں گے، لیکن دل کو یہ نظر آیا کہ اپنے کام کے زیادہ نہیں، اول تو چند منٹ سے زائد بیٹھے نہیں اور پھر وہ چند منٹ بھی ادب کے ساتھ سر جھکائے خاموش رہے اور جو کچھ دل میں تھا سے دل ہی میں رکھے بس دعا کرا کے اور برکت کا لطیف ونازک سا عطیہ لیے چلے آئے۔ تو حاصل گزارش یہ کہ بزرگی اور نافعیت لازم وملزوم ہرگز نہیں۔

اوپر 30 ستمبر 1930 کا عریضہ اور حضرت کا جواب دونوں درج ہو چکے اور اس وقت کی روئداد ان سے معلوم ہو چکی، آگے کی کارروائی کے لیے میرا دوسرا عریضہ مورخہ 16 اکتوبر (کسی قدر ملخص) اور حضرت کا جواب پورا ملاحظہ ہو:

''سیدی ومطاعی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ نے سرفراز اور حسب معمول ہر طرح مطمئن بھی فرمایا، ہر گرامی نامہ گویا تشفی

وتسکین خاطر کا مخزن ہوتا ہے اور اسی لیے تو میں سرفراز ناموں کے وصول ہونے پر اتنا حریص رہتا ہوں(1)۔

مولانا مدظلہٗ سے ابھی دو ہفتے ہوئے لکھنؤ میں نیاز حاصل رہا تھا، ارشادات زیادہ تر مسائل حاضرہ ہی سے متعلق رہے، شرکت کانگریس کے لیے فرضیت کی تصریح تو میں نے نہیں سنی(2)۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ ممدوح کا میلان اس جانب بہت زائد ہے اور دل سے چاہتے یہ ہیں کہ مسلمان اس تحریک میں بڑی کثرت سے شریک ہوں(1)، خود تو اپنے لیے طے ہی فرما چکے ہیں، باقی ازراہ ذرہ نوازی اپنے ایک خرد سے بھی اس بارہ میں مشورہ فرماتے رہے، خیر، یہ مسئلہ تو الگ ہے، باقی جناب والا نے جس امر کی بابت خیال ظاہر فرمایا، اپنے حق میں اس کا احتمال ہی نہ گزرا اور نہ اب ہے (3)، میں تو جناب کو بھی ایسے احتمالات سے ارفع ومنزہ سمجھتا ہوں(4) اور مولانا مدظلہٗ کو بھی(5)، بلکہ میرا تو ذہن ہی اس صورت کے فرض کرنے سے ابا کرتا ہے کہ کسی حال میں مولانا اپنے خدام کی جناب کی خدمت میں حاضری سے گرانی محسوس کریں گے (6)، یا اس کے برعکس جناب والا اپنے خدام کی مولانا کی خدمت میں حاضری سے (7)۔

ایسی اولاد کی بدبختی میں کیا شک ہے، جو باپ اور چچا کے درمیان کسی معمولی سے اختلاف کی بنا پر ایک کی جانب داری میں دوسرے سے بے ادبی، گستاخی اور ترک تعلقات پر اتر آئے(8)۔

رہا میرے لیے مولانا کی طرف سے باب فیض کی مسدودی کا احتمال، تو میرے لیے تو خوش قسمتی سے دو دو دروازے موجود ہیں اور یکساں شفقت وکرم والتفات کو دیکھ کر میرے لیے یہ فیصلہ ہی دشوار ہے کہ دونوں آستانوں میں سے میرے لیے شفیق تر کون ہے، بقول کسی کے، صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم(9)۔

اس مسئلہ پر یہ گزارش اپنی فہم کے بساط کے لائق کی ہے، اگر کسی اصولی غلطی میں مبتلا ہوں تو برائے خدا ضرور تصحیح فرما دی جائے(10)۔

شب کو خواب میں جناب والا کی پھر زیارت ہوئی اور اب کی اپنے والد ماجد مرحوم کو بھی میں نے اسی مجلس میں شریک پایا(11) (والد مرحوم بڑے نیک اور دیندار تھے، 1330 میں حج سے

---

(1) وہی 1930 کی تحریک نمک سازی وقانون شکنی مراد ہے جس سے علی برادران علانیہ اپنی علاحدگی ظاہر کر چکے تھے۔

فارغ ہوکر معاً 12 ذی الحجہ کو صبح تڑکے منیٰ میں ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور 14 ذی الحجہ کو اذان فجر کے وقت مکہ معظمہ میں انتقال کیا) اس سے قبل والد مرحوم کو مولانا مد ظلہٗ کے ساتھ بھی ایک مجمع میں دیکھا تھا (12)۔

ایک اپنے ضروری خانگی مسئلہ کے متعلق بھی عرض کرنے والا تھا، مگر یہ عریضہ یونہی بہت طویل ہوگیا، اس لیے اسے آئندہ ہفتہ تک ملتوی کرتا ہوں (13)، والسلام"

جواب وہی ہر فقرہ کا نمبر وار ملاحظہ ہو اور اس کے قبل والے مکتوب کے مفہوم کا استحضار تو بہر حال ضروری ہے۔

''اگر کارڈ نہ آیا ہوتا (1) تو میرا خیال مبسوط عرض کرنے کا تھا، مگر پریشانی میں زیادہ وقت لینا بے رحمی معلوم ہوئی، اس لیے بہت مختصر عرض ہے۔

(1) اس محبت کا صلہ بجز دعا کے کیا پیش کروں۔

(2) مجھ کو اس روایت کی صحت پر اصرار نہیں، لیکن نہ سننے سے استدلال نفی محتاج نظر ثانی ہے، بعض اوقات سنانے کے لیے محرک کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ محرک کسی مخالف خیال کا کان میں پڑنا ہوتا ہے، ممکن ہے وہاں یہ محرک واقع نہ ہوا ہو اور جس نے بلکہ جنھوں نے میرے سامنے روایت کی ان کے سامنے یہ محرک واقع ہوا ہو۔

(3) آپ کے شایانِ شان یہی ہے لیکن اگر مجھ کو یہ احتمال کسی راوی یا رواۃ کے ثقہ ہونے کی بنا پر ہوگیا تب بھی مستنکر نہیں، کیونکہ جو بنا آپ کو احتمال نہ ہونے کی ہے، یعنی مولانا کا تدین، وہی بنا مجھ کو احتمال ہونے کی ہے، کیونکہ جس امر کا دین ہونا ثابت ہو تو خلاف دین کے متعلق ایسا اثر ہونا لازم ہے۔

(4) اپنا عدم تنزہ ابھی عرض کرچکا ہوں۔

(5) اوپر عرض کرچکا ہوں کہ ایسا اثر ہونا تنزہ کے خلاف نہیں، عین تنزہ و تدین ہے۔

(6) اگر گرانی طبعی ہو اور دین اس کا منشا ہو تو ذہن کو اس کے لیے آمادہ کرنا چاہیے۔

---

(1) گھر میں اختلاجی دورے، غشی اور تشنج کے ساتھ سخت قسم کے پڑنے لگتے تھے، کارڈ میں اس کی اطلاع ودرخواست دعا تھی۔

(7) واقعی اس کا موقع پیش نہ آنے سے اس کا اندازہ نہیں، لیکن مجھ کو اپنے اوپر بھروسہ نہیں۔

(8) بیشک آپ کا خیال عین حق ہے، لیکن چندروزہ جسمانی بُعد خدانہ کرے ترک تعلق نہیں، اصل تعلق قلب سے ہے اور جسم قلب پر حاکم نہیں کہ جسم کے قید سے قلب کو قید ہو جائے، مجھ کو اپنے قلب کی حالت مشاہد ہے، ان چیزوں سے وہ مطلقاً متاثر نہیں ہوتا، میرے قلب کا اس باب میں یہ مذہب ہے ۔

نہ دوری دلیل صبوری بود　　　　که بسیار دوری ضروری بود

یعنی بضرورت بود وضروری بمعنی واجب نیست۔

(9) اگر یہ عرض کرنا گستاخی نہ ہو تو مجھ کو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ جس فن کا یہ مسئلہ ہے آپ کا جواب اس کے متعلق نہیں اور میری تجویز اس سے متعلق ہے اور آپ نے ابھی اس پر نظر نہیں فرمائی، گو نظر فرمانے کے بعد آپ کی تحقیق مجھ سے بھی بلند و محیط ہو سکتی ہے، مگر ابھی ایسا نہیں ہوا، اس لیے ابھی مجھ کو اس دعویٰ پر اصرار ہے کہ ایسے امور گو ابہام ہی کے درجہ میں ہوں، فیض میں سدراہ ہو سکتے ہیں اور ہو جاتے ہیں۔

(10) اصول کی شان تو بہت بلند ہے، اس کو میں اصول میں سے نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض فروع میں اثر اصول جیسا ہوتا ہے، وہٰذہ منہا۔

(11) آپ نے مجھ کو صلحا کی شرکت مجلس کی خبر سنائی، اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

(12) بیساختہ یہ نکتہ ذہن میں آیا کہ مولانا کے اجتماع کو مقدم اور میرے اجتماع کو موخر دیکھنا شاید اشارہ اس طرف ہو کہ مولانا کا حق مقدم ہے اور یہی میں بھی لکھ رہا ہوں۔

(13) بہت بہتر۔

تجدید مشورۂ مفید: میں نے مضمون صفحۂ اول کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے اس پر عمل ہونے نہ ہونے میں میرا کوئی نفع ہے نہ ضرر، دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے وہ آپ ہی سے متعلق ہے اور اس بنا پر مجھ کو اس پر اصرار کا حق نہیں، لیکن فرط خیر خواہی پھر تجدید پر مجبور کرتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے جس کا ایک درجہ تو بہت سہل اور اسلم ہے، یعنی بُعد موقت اور ایک درجہ

جو سہل اور اسلم تو نہیں لیکن آپ کے مذاق کے موافق، وہ مولانا سے پوچھ لینا ہے مگر ایسے عنوان پر کہ اصلی رائے ظاہر ہو جانے کی تدبیر ہو۔

تائید مشورۂ مفید: سیر میں حضرت علیؓ کا ابوجہل کی بیٹی سے جو کہ شرعاً حلال تھی، نکاح کا قصد اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ایک خاص خطبہ پڑھنا کیا اس کو نہیں بتلاتا کہ انبیا علیہم السلام تک کا طبعاً تاثر ممکن ہے، چہ جائے علما خوب غور فرمالیں۔

ضمیمہ
متعلق نمبر 32

(ابھی دو ہی چار صفحہ اوپر اسی نمبر 32 میں حضرت کے نام خط میں ذکر ایک ''ضروری خانگی معاملہ'' کا آچکا ہے، معاملہ یہ تھا کہ میں نے اپنے ایک مرحوم دوست کی صاحب اولاد بیوہ سے اکتوبر 1930 میں اپنی عمر کے 38ویں سال میں عقد کرلیا تھا، پہلی بیوی سے پوری طرح گفتگو و مشورہ کے بعد، لیکن عقد کے بعد نباہ آسان نہ معلوم ہوا، اور اندازہ و توقع کے خلاف طرح طرح کی سخت پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں، آخر میں حضرت سے رجوع کیا، جو خود بھی صاحب تجربہ تھے آگے حضرت کا جواب ملاحظہ ہو۔)

از اشرف علی غفرلہٗ بمکرمی محترمی دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

داستان غم سنی۔ طبعاً دل دُکھا، دو وجہ سے، ایک آپ کی کلفت سے مگر وہ چونکہ اختیاری تھی، اس لیے کم دل دکھا۔ دوسرے اہل خانہ کی کلفت سے اور وہ چونکہ غیر اختیاری تھی اس سے زیادہ دل دکھا، یہ تو اظہار تھا اس اثر کا جو میرے قلب پر ہوا، جو کہ آپ کا اس خط سے مقصود بھی نہیں، اب میں اس جز کی طرف رجوع کرتا ہوں جو خط سے آپ کا مقصود ہے، یعنی اس معاملہ کے متعلق اجزا مشورہ طلب میں رائے ظاہر کرنا، میری رائے میں اس خط میں جتنے اجزا لکھے ہیں سب مناسب ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو نافع فرمائے، اگر اس پر مزید مطلوب ہو مولانا(1) کا خط کافی اور جامع ہے اور جو اس سے بھی زیادہ توضیح مقصود ہو، گو حاجت نہیں لیکن اس بنا پر کہ شاید مجھ کو اس معاملہ کا زیادہ

(1) مراد مولانا حسین احمد صاحب ہیں، جن کا خط تمام تر مبارکباد ہی کا آیا تھا۔

تجربہ ہے، مجھ سے اس کی درخواست کرنا زیادہ بے محل بھی نہیں اور اس کا درجہ مولانا کی تحریر کے سامنے ایسا ہوگا جیسے دواؤں کی خاصیت تو طبیب زیادہ جانتا ہے جس سے پنساری کے علم کو کوئی نسبت نہیں لیکن خود دواؤں کو پنساری زیادہ پہچانتا ہے، جو کہ پنساری کے لیے نہ کمال ہے نہ طبیب کے لیے کچھ نقص ہے، اس کے متعلق جو میں عرض کروں گا اس کا یہی درجہ ہوگا، اس معروض کے چند اجزا ہیں:

(1) قدیمہ سے کہیے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے تمھارے مشورہ سے کیا ہے، اگر تم روک دیتیں ممکن ہے میں ایسا نہ کرتا۔

(2) اب ہو چکنے کے بعد آخر کیا چاہتی ہو، کیا اس کو چھوڑ دوں، مگر اس کے ساتھ ہی دو باتوں پر نظر کر لی جائے، ایک یہ کہ کیا بلا وجہ ایسا کرنا عند اللہ مبغوض نہ ہوگا اور کیا عرفاً ایسا کرنا بدنامی کا سبب نہ ہوگا، کیونکہ خاندانی لوگوں کے لیے ایسا کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے پھر ہمیشہ کے لیے خاندان کے سب لوگوں کے لیے وقت کا سامنا نہ ہوگا، سب کا اعتبار جاتا رہے گا، جہاں بھی پیام بھیجا جائے گا یہ جواب ملے گا کہ جس خاندان کے بڑوں نے ایسا کیا، چھوٹوں کا کیا اعتبار، تو ان کے رشتے ناطے مشکل ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے اس کے چھوڑ دینے کے بعد اگر خواہش نفس کا تقاضا ہوا جو کہ بس سے باہر ہے اور تمھارے معاملہ میں احتیاط کو ضروری کہا گیا ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟ تو پھر یہی صورت ہوگی جس سے فرار ہوا، یا خدا نہ کرے کسی معصیت میں ابتلا ہوگا جس کو کوئی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس سوال کا ان سے نرمی کے ساتھ جواب لینا چاہیے، امید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ چھوڑنے کو گوارہ نہ کریں گی اور آپ کی آمادگی دیکھ کر ان کا غم ہلکا ہو جائے گا۔

(3) قدیمہ کی دلجوئی پہلے سے زیادہ رکھیے اور مناسب موقع پر بطور خوش طبعی کے یہ جتلا دیجیے کہ دیکھو دوسرے عقد سے تمھارا یہ فائدہ ہوا کہ تمھاری خاطر زیادہ ہونے لگی اور پہلے جو کبھی کبھار غصہ کر لیتا تھا اب وہ بھی نہ رہا تو تمھارا نفع ہوا یا نقصان۔

(4) جدیدہ سے خفیہ اجازت لے کر ضرورت اور مصلحت سمجھا کر انتظام خانہ داری قدیمہ کے ہاتھ میں رکھیے لیکن جدیدہ سے یہ کہنا بھی ضروری ہوگا کہ جدا خرچ لینا تمھارا حق ہے۔ جب اس حق کو حاصل کرنا چاہو بے تکلف کہہ دو۔ اس کے بعد اگر کبھی انھوں نے اپنے حق کا مطالبہ کیا تو

دینا پڑے گا، لیکن اگر ایسا ہوا مدتوں بعد ہوگا اور اس انتظام کے اطالت عمر میں اس سے زیادہ اعانت ہوگی کہ جدیدہ کا کچھ نفقہ ماہوار مقرر کر دیجیے کہ پھر آپ اس کا ان سے حساب نہ لیں۔

(5) کوئی وقت گو تھوڑا ہی سا ہو ایسا معین کر لیجیے جن میں دونوں کو بیٹھ کر اولیا کے تذکرے کسی کتاب سے سنایا کیجیے اس سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے اور درمیان درمیان میں دونوں سے کچھ مزاح ولطف کی ایسی باتیں کرتے رہا کیجیے جس سے وہ دونوں بھی باہم بے تکلف ہو جائیں اس کو قلق کی کمی میں خاص دخل ہے، دوسری غرض آپ نے یہ لکھی ہے کہ کوئی تعویذ وغیرہ دیا جائے، ملفوف ہے، گلے میں ایسے طور پر ڈالا جائے کہ قلب پر پڑا رہے، اللہ تعالی نافع فرمائے اور اگر پانچوں نمازوں کے بعد یا باسط سو بار پڑھ کر قلب پر دم کر لیا کریں مزید نفع کی توقع ہے، ملامت خلق کی حکایت جو تحریر فرمائی ہے، یہ اسی جہاد میں داخل ہے جس کا مولانا نے تذکرہ کیا ہے، جس مسئلہ کے متعلق رائے تحریر کی ہے، اس کا فیصلہ اگر نہ ہو چکتا تو ضرورت تھی ہم لوگوں کی نظر وفکر کی، مگر جو حضرات کتاب وسنت کو ہم سے زیادہ سمجھتے تھے وہ اس کو طے کر چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ صرف دو چیزوں میں عدل واجب ہے خواہ ان چیزوں کا کوئی درجہ مستحب ہی ہو، لیکن اگر ایک کے ساتھ اس مستحب کا برتاؤ کیا جائے تو دوسری جگہ بھی واجب ہے، ایک شب باشی اس میں اختیار ہے کہ مضاجعت ہو یا نہ ہو، مباضعت ہو یا نہ ہو، دوسری چیز انفاق، ایک کو جو چیز دی جائے خواہ نقد، خواہ کھانا، خواہ کپڑا، خواہ واجب کے اندر ہو یا واجب سے گزر کر مستحب کے درجہ میں ہو اس میں بھی عدل واجب ہے، باقی دوسرے امور میں جیسے وہ معاملات جن کا برتاؤ حضرت عائشہؓ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس میں مساوات واجب نہیں، ان پر شب باشی وانفاق کو قیاس نہیں کیا جاسکتا پھر عقلاً بھی مناسب حال کا کوئی ایسا معیار نہیں جو صاحب معاملہ پر حجت ہو، بس تو اس کو دل شکنی ضرور ہوگی۔(1)

---

(1) میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ حکم قرآنی "عدل" کی جو تفسیر مساوات سے کی گئی ہے یہ نظر ثانی کی محتاج ہے، دل کو لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ عدل کی تفسیر ہر بیوی کے ساتھ اس کے مناسب حاصل برتاؤ سے کی جائے یعنی ایسا برتاؤ جو اس کے سن، سیرت وعادات وغیرہ کے لحاظ سے مناسب ہو، مکتوب گرامی کی آخری سطروں میں میرے اسی معروضہ کا جواب ہے۔

(33)

ایک ہی موضوع پر اتنی لمبی گفتگو سے حاضرین بزم اکتا چلے ہوں، تو کچھ عجب نہیں، بلکہ سرے سے موضوع سخن ہی اگر ذہن سے گم ہو گیا ہو، تو بھی کوئی بعید نہیں، لیکن بات ہے ہی اتنی اہم اور عجیب سی کہ اسے اس تفصیل سے اگر نہ بیان کیا جائے تو ذہن میں اترے بھی نہیں اور نہ صاحب سوانح کی زندگی اور تعلیم کا یہ پہلو ہی روشنی میں آسکے۔ غالب نے بہت سے، بہت کہا تھا تو یہ کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یہاں ماجرا اس سے بھی عجیب تر اور لطیف تر تھا، شیخ وقت اپنے ایک طالب علم سے بیزار ہرگز کسی درجہ میں بھی نہیں، بلکہ غایت شفقت ہی کی بنا پر اسے اپنے ہاں حاضری دینے سے روک رہے ہیں اور اس کے اشتیاق و تمنا کو اسی کی مصلحت کے خلاف بتا رہے ہیں، ادھر سے بار بار یہ اصرار کہ تھانہ بھون حاضری کی اجازت دی جائے اور ادھر سے ہر بار یہی جواب کہ یہ قصد و آرزو ممکن ہے کہ جو صاحب ضابطہ سے مرشد ہیں ان کے لیے باعث گرانی ہو، اس لیے مناسب و قرین مصلحت نہیں، ارشاد و اصلاح کی ساری تاریخ میں بھی ایسی مثالیں بس ڈھونڈے ہی سے ملیں گی۔

حاضری پر جہاں دو چار مہینے بھی گزر جاتے، دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگتا، آخری لمبی حاضری جون میں ہوئی تھی، اب چار پانچ مہینے گزر چکے تھے ادھر سے لطیف گو پرزور پیرایوں میں ممانعت ہوتی رہی ادھر یہ تہیہ اس کے باوجود ہو گیا کہ شروع دسمبر میں بہرحال اپنے کو اس در تک پہنچا ہی دیا جائے چنانچہ 14 نومبر کے عریضہ میں مذبذب اور مشروط طریقہ پر نہیں بلکہ گویا قطعیت کے ساتھ عرض کر دیا:

''حضرت مولانا حسین احمد صاحب ادھر ایک روز کے لیے دریاباد بھی تشریف لائے تھے میں نے اپنی حاضری تھانہ بھون سے متعلق حضرت کا عندیہ لے لیا، جواب بحمد اللہ وہی ملا جس کا میں متوقع تھا اب انشاء اللہ دو ہفتہ بعد بھائی صاحب کے پاس سہارنپور آنے کا ارادہ ہے اور وہاں سے تھانہ بھون کا، طویل قیام کے لیے اور دیوبند کا مختصر قیام کے لیے''۔

خیال کیا معنی یقین تھا کہ بس اس آخری مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب اجازت نامہ مسرت و خوش دلی کے ساتھ آہی رہا ہو گا۔ جواب آیا لیکن توقع کے بالکل برعکس انکار میں ارشاد ہوا:

''ہنوز میں متفق نہیں، یہ غور فرمائیے کہ آپ نے کس عنوان سے مولانا کا عندیہ لیا، غالباً آپ کا ذہن بوجہ میری محبت کے اس عنوان کافی تک پہنچا نہ ہوگا، اب میں وہ عنوان بتلاتا ہوں اس عنوان سے پوچھیے تو اصل خیال ظاہر ہوجائے گا۔

وہ عنوان یہ ہے کہ یہ لکھیے کہ اشرف کا ایک فتویٰ ممانعت شرکت کانگریس میں نظر سے گزرا جس سے انگریزوں کو قوت پہنچنے کا احتمال ہے، اس لیے ملنے کو دل نہیں چاہتا لیکن چونکہ پہلے سے ملتا تھا اس لیے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید نہ ملنا مضر دین ہو، اس صورت میں اولیٰ کیا ہے، ملنا یا نہ ملنا، ملنا مضر ہوگا یا نہ ملنا''۔

داغ صاحب کا ایک مشہور شعر ہے، غزل کے عاشقانہ رنگ میں ۔

وعدہ پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

تھوڑی سی ترمیم کے بعد وہی منظر آج یہاں پیش تھا، اِدھر سے اصرار ''آج'' پر اُدھر سے گفتگو ''کل'' کے لیے ''قیامت کی تکرار'' بہر حال پیش نظر! یہ جدید حکم نامہ آکر سر چکرایا، زمین پیر کے نیچے سے سرکتی معلوم ہوئی، ہمت کر کے ایک آخری اور انقطاعی خط یہ لکھ ڈالا:

دریاباد۔22 نومبر 1930

''سیدی ومطاعی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تعمیل ارشاد میں مجال عذر ہی کیا، لیکن گزارش یہ ہے کہ جناب کی جس عبارت پر میں نے سرخ نشان بنادیا ہے (یعنی یہ کہ ''اب ملنے کو دل نہیں چاہتا'' (اسے اپنے قلم سے کیونکر لکھوں (1) میرا دل تو اس فتویٰ اور اس قسم کی ساری دوسری تحریروں کے باوجود بھی حاضری کو بے اختیار چاہے جارہا ہے پھر واقعہ کے بالکل برعکس یہ کیسے لکھ دوں کہ ملنے کو دل نہیں چاہتا (2)۔

گستاخی نہ سمجھی جائے تو صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ اپنے قلب میں تو اس باب میں کوئی تشویش سرے سے پاتا ہی نہیں، اس لیے کسی مزید تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا اور اب اگر کچھ کروں گا بھی تو محض تعمیل ارشاد میں نہ کہ اپنے قلب وضمیر کی کسی الجھن کی بنا پر (3)۔

والسلام

محتاج دعا۔ عبدالماجد''

محبت کی دنیا میں سنا ہے کہ ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں نافرمانی ہی عین اطاعت اور انکار ہی عین اتباع بن جاتا ہے۔ امیر المومنین علی مرتضیٰؓ سے بڑھ کر عاشق صادق اور مطیع کامل اور کون ہوا ہے، پھر کیا یاد نہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر اسم مبارک کے آگے لقب ''رسول اللہ'' کے مٹانے کے حکم سے انکار کس نے کر دیا تھا؟ بڑوں کی مثالیں چھوٹوں کے لیے، کوہ کی نظیر کاہ کے لیے، قوت والوں کے نمونے ناتوانوں کے لیے کتنا بڑا اسہارا بن جاتے اور کیسے ہمت اور ڈھارس کے سبب ثابت ہوتے ہیں۔

بچے ضدی اور نادان سہی، شفیق بزرگ اور باپ اور استاد کبھی کبھی ان کی بھی بات رکھ ہی لیتے ہیں۔ جواب حسب معمول پہلی ڈاک سے آیا، پندنامہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا، اب کی پندنامہ سے بڑھ کر شفقت نامہ:-

مشفقی و مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

(1) بمصلحت مضائقہ نہ تھا، لیکن آپ کی طبیعت جو محبت کا محل ہے فتویٰ عقلی پر جو مصلحت کا منشا ہے غالب آگئی جس میں آپ بھی معذور ہیں، یہ ظالم محبت اکثر مصلحت پر ظلم کر کے غالب آجاتی ہے۔

(2) اس پر مجھ کو بے ساختہ شعر یاد آگیا۔

عشق را نازم کہ یوسف را بہ بازار آورد
ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد!

مگر اب میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا لقب بجائے فلسفی کے عاشق ہونا چاہیے، اس لیے کہ فلسفی ہمیشہ عقل کو غالب رکھتا ہے اور عاشق طبیعت کو۔

(3) میں نے جو کچھ مشورہ دیا تھا اپنی کسی مصلحت سے نہیں بلکہ محض آپ کی مصلحت سے دیا تھا کہ خدانخواستہ مولانا سے آپ کو بعد نہ ہو جائے، میرا تو بلکہ ایک نقصان ہی تھا کہ ایک دوست کم ہوتے تھے مگر میں (گو مدعی ایثار نہیں لیکن) الحمدللہ کہ دوسروں کی مصلحت کو خصوص دوستوں کی مصلحت کو اپنے مصالح پر مقدم رکھنے کو پسند کرتا ہوں اور کبھی عمل بھی نصیب ہو جاتا ہے، میں مشورہ کا حق ادا کر چکا اب اگر خدانخواستہ مولانا کی کوئی گرانی ہو تو میں سبکدوش ہوں، آپ سر آنکھوں پر آئیں۔

اشرف علی''

کیسے ظالم یا نابینا ہیں وہ دانا دشمن یا نادان دوست جنھوں نے حکیم الامت کو ''خشک'' یا ''چوب خشک'' خود سمجھا یا دوسروں کو سمجھایا! ظاہر ہے کہ اس وقت حکیم الامت کو مولانائے مدنی سے شدید سیاسی اختلاف تھا (اور جو دونوں کے خیال کے مطابق مذہبی اختلاف کی طرف منجر تھا) اس شدید اختلاف کے وقت وہ یہ نہیں کرتے کہ مولانا کے ایک متوسل کا میلان اپنی طرف دیکھ کر اسے اور اپنانے کی کوشش کریں، بلکہ جب وہ اس طرف بڑھتا ہے تو اور الٹا اسے روکنے اور با اصرار بار بار روکتے ہیں کہ ادھر قدم اٹھانے سے ''شیخ'' کے قلب پر غبار آ جانے کا اندیشہ ہے۔

(34)

اجازت مل جانے کے بعد اب انتظار کا ہے کا ہوتا، شروع دسمبر میں عرض کر دیا کہ سہارنپور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، 6 دسمبر کو حاضر خدمت ہو جاؤں گا، جواب 5 دسمبر کو سہارنپور میں ملا کہ:

''محبت نامہ نے اشتیاق میں اضافہ کیا، انشاء اللہ سب انتظام دلخواہ ہو جائے گا، اتوار کی صبح کو تو کھانا کھایئے گا، جواب کی ضرورت نہیں، نہ گنجائش، بھائی صاحب کے لیے برابر دعا کرتا ہوں، والدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے کہ کوئی شکایت لاحق نہ ہو''۔

قیام کی گنجائش اب کی دو ہی تین دن کے لیے نکل سکی، لیکن مدت کی قلت کی تلافی لطف وعنایت کی شدت نے کر دی، التفات کی فراوانی ہمیشہ ہی رہتی تھی، اب کی فزوں تر رہی، 10 دسمبر کو سہارنپور واپس آ گیا اور یہاں سے عریضہ ارسال کیا، جواب بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ ہو:

م۔ بحمد اللہ رخصت ہو کر یہاں بخیریت پہنچ گیا۔

ا۔ الحمد للہ

م۔ دیوبند بھی حاضری دے آیا۔

ا۔ بارک اللہ تعالیٰ۔

م۔ میرے حال پر جناب کی عنایت وشفقت یوں تو شروع ہی سے ہے اور ہر مرتبہ اس میں ترقی ہی محسوس ہوئی، مگر اب کی بار کا لطف وکرم تو سب سے بڑھ کر رہا۔

ا۔ مجھ کو بھی محسوس ہوتا تھا مگر اس سے زیادہ مسرت ہوئی کہ آپ کو بھی محسوس ہوا، مگر اس کا سبب شاید معلوم نہ ہو، عرض کرتا ہوں کہ باوجود میری بے مروتی وبے تہذیبی کی تحریروں کے آپ

کی عنایت وتوجہ میں کمی نہ ہوئی اور تشریف آوری کی تکلیف برداشت فرمائی، اس سے قلب پر یہ اثر ہوا کہ یہ یقین ہوگیا کہ بیشک آپ کو بہت محبت ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ کو بھی محبت بڑھ گئی اور امید ہے کہ بڑھتی جائے گی''۔

اس مکتوب کا کتاب میں درج کرنا واجبات وضروریات میں سے تھا، کسی کو کسی چیز پر فخر ہو، اس تہی مایہ وتہی دامن کے فخر ومباہات کے لیے ان چند الفاظ کے اندر ایک دفتر کا دفتر موجود ہے۔

اے اللہ گواہ رہیو کہ تیرا ایک مقبول وبرگزیدہ بندہ اس بے عمل وبدعمل کو یوں پروانۂ محبت عطا کر رہا ہے کیا حشر میں یہ 'صداقت نامہ' بے وزن نکلے گا اور اثر سے خالی ہو جائے گا؟

1931 کو اپنے لیے اگر عام الحزن کہوں، تو کچھ بیجا نہ ہوگا، سال شروع ہی ہوا تھا کہ تنہا اسی نیازمند پر نہیں، کہنا چاہیے کہ ملک کی ساری ملت اسلامی پر قیامت ٹوٹ پڑی، یعنی مسلمانوں کا محبوب ترین ومخلص ترین سردار ملی، محمد علیؒ 'سلطان جائر' کے سامنے ''کلمۂ حق'' کہہ کر افضل الجہاد کرتا ہوا اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا۔ آہ بے بس انسان اور اس کی آرزوؤں کے خواب اور دل میں کیا کیا امیدیں تھیں کہ اس محبوب سردار ملت کو وقت کے شیخ اعظم سے ملایا جائے گا، آپ کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ''وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ'' کا نمونہ جنت سے قبل اسی دنیا میں نظر آنے لگے گا۔

آں قدح بہ شکست وآں ساقی نماند!

5 جنوری کو میں حیدرآباد دکن سے دہلی وسہارنپور کے راستہ سے واپس ہو رہا تھا کہ صبح سویرے دہلی کے اسٹیشن پر یہ خبر صاعقہ اثر سننے میں آئی! خیر اس وقت جو گزری گزری، گھر پہنچتے ہی غالباً 8 جنوری کو حضرتؒ کی خدمت میں بڑے دکھے ہوئے دل سے ایک اطلاعی وتعزیتی کارڈ لکھا، جواب فوراً موصول ہوا، آپ بھی پڑھیں:

''مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کرسکتا، خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، صرف ایک صفت، مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے، باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں

نے کبھی دیکھا نہیں، اس لیے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔

اشرف علیؒ

حضرتؒ کی عالی ظرفی وشرافت نفس کا اعتقاد تو پہلے ہی سے تھا، اب اس حقیقی تعزیت نامہ سے علم الیقین کو عین الیقین میں تبدیل کر دیا۔

مربی حقیقی بھی بندہ کو کس کس منزل سے گزارتے ہیں اور کن کن حالات تکوینی میں اسے ڈال کر کیسے کیسے تجربے اسے کراتے ہیں اور پھر کبھی اسی ذیل میں بعض حقائق شرعی کا علم بھی اسے کبھی روایتاً اور کتابی اور کبھی عیاناً اور عینی بھی اسے عطا کر دیتے ہیں۔ اکتوبر 1931 میں ایک مرحوم دوست کی بیوہ سے عقد کرنے کو تو کر لیا تھا، لیکن وہ صاحبہ جب سے آئیں، موافقت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اسباب و وجوہ کی تفصیل کی نہ یہاں گنجائش اور نہ اس سلسلہ میں کوئی ضرورت ہی، مختصر یہ کہ افسوسناک تجربے ہوتے رہے، 19 جنوری 1931 کے مکتوب میں مولانا سے تفصیلی ہدایات چاہیں، مضمون عریضہ تقریباً یہ تھا:

''یہ تو قرآن مجید کی تصریح ہے کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی بیوی کرو، دوسری نہ کرو، لیکن اگر کر چکنے کے بعد یہ تجربہ ہو کہ عدل پر قدرت نہیں، تو اب کیا حکم ہے۔ یہی کہ طلاق دے دی جائے یا کچھ اور (1)۔ یہ تو عمومی اور اصولی استفتا تھا، اب اپنی آپ بیتی مختصراً عرض ہے کہ یہ جدیدہ جب سے آئی ہیں، میرے لیے مطبوع کبھی نہیں رہی ہیں اور جب سے تنہا ان ہی کا ساتھ ہے (قدیمہ اپنے مایکہ گئی ہوئی ہیں) اس وقت سے بے رغبتی ان کی جانب بجائے گھٹنے کے اور بڑھ ہی گئی ہے، رات کا پورا اور دن کا بھی خاصا وقت انھیں دیتا ہوں، پھر بھی گفتگو کی نوبت بھی بہت ہی کم آتی ہے، پھر اگر دل پر جبر کر کے ان کی طرف توجہ والتفات بڑھاؤں بھی تو ان بیچاری قدیمہ کے مرض اختلاج وغیرہ کے بڑھ جانے ہی کا نہیں بلکہ خطرناک صورت اختیار کر لینے کا اندیشہ ہے، اس صورت حال پر مستزاد یہ کہ میری والدہ ماجدہ اور دوسرے اہل خاندان کوئی بھی ان جدیدہ کے آنے سے خوش نہیں، تو علاوہ مسئلہ کے شرعی پہلو کے جناب والا جیسے صاحب تجربہ وفطرت شناس بزرگ کے مشورہ وہدایت سے بھی مستفید ہونا چاہتا ہوں (2)۔

ایک اور شبہ بھی اسی سلسلہ میں عرض کردوں، آپ کی زبان سے سنا تھا اور فقہ کی کتابوں میں بھی دیکھا تھا کہ نفقہ کی حد تک دونوں بیویوں کو بالکل برابر رکھنا، لیکن بحرالرائق (شرح کنز) اور رد المختار (شرح درالمختار) دونوں میں یہ عبارت بھی نظر سے گزری کہ **والحق انه علىٰ قول من اعتبر حال الرجل وحده في النفقة واما على القول المفتىٰ به من اعتبار حالهما فلا فان احدهما قد تكون غنية والاخرىٰ فقيرة فلا يلزم التسوية بينهما مطلقا في النفقة.** اس کا مفہوم میں تو یہ سمجھا کہ قول مفتیٰ بہ یہ ہے کہ دونوں بیویوں کی حالت پر نفقہ کے بارہ میں نظر کی جائے گی اور مطلق مساوات ضروری نہ رہے گی، اگر میں مطلب غلط سمجھا ہوں تو اس کی اصلاح فرمادی جائے (3)۔

جواب فقیہانہ، حکیمانہ دونوں پہلوؤں کو لیے ہوئے آیا، فقیہانہ بہت مفصل:-

(1) ''اس میں تفصیل ہے کہ جس کا حق ادا نہ کرسکے اس سے برفق ولطف پوچھ لے کہ میں تمھارا حق ادا نہیں کرسکتا، اب آگے دو راہ ہیں، غور کرکے ایک راہ کو ترجیح دے لو، ایک راہ یہ ہے کہ اپنے سب حقوق سے دست بردار ہو جاؤ اور معاف کردو اور نکاح میں رہو (اس میں بھی دو طریق ہیں، ایک یہ کہ نفقہ جاری رہے، دوسرے حقوق معاف کرالے) اور اگر اس حالت میں نکاح میں نہیں رہنا چاہتی ہو تو مہر کے ادا یا ابرا کے بعد تم کو طلاق دے دوں اور اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کی بھی اطلاع کردی جائے کہ اگر تم معافی حقوق کی شق اختیار کرو تو آئندہ اس سے رجوع کرلینے کا بھی تم کو حق ہے، مگر جب رجوع کرو مجھ کو اطلاع کردو، پھر اس وقت بھی میں تم کو ان ہی دونوں شقوں کا اختیار دوں گا۔

(2) ان سب حالات وجزئیات کو پڑھ کر تفصیل مذکور سے زائد کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی انشاءاللہ تعالیٰ کافی ووافی ہے، آگے مسئلہ کی تحقیق مذکور ہے۔

(3) الجواب، میں نے یہ روایت آج ہی دیکھی، مگر دیکھنے کے بعد رائے سابق نہیں بدلی، وجہ خدشہ یہ ہے کہ اول تو یہ مسئلہ اپنی اصل سے باب القسم یعنی العدل کا نہیں، باب النفقہ کا ہے جس میں زوجہ کے یسار واعسار کی بحث بمقابلہ زوج کے ہے جس پر نفقہ کی مؤنت ہے، زوجہ کا حق اور زوج کی مؤنت دونوں پر نظر کرکے یہ بحث پیدا ہوگئی، آگے اس پر باب القسم کے جزئیہ کو قیاس

کرلیا گیا اور قیاس کرنے والے بھی نہ مجتہدین ہیں نہ مرجحین ۔ تو خود اصل مسئلہ قیاسی کہ ظنی ہے پھر اس قیاسی پر قیاس کرنے سے جو حاصل ہوگا وہ اصل سے بھی ضعیف ہوکر اضعف ہو جائے گا، خصوص جب قائس بھی ضعیف ہو، پھر خود صحت قیاس کی ایک فارق کی وجہ سے متکلم فیہ بھی ہے اور فارق یہ ہے کہ اصل میں مقابلہ ہے من علیہ الحق اور من لہ الحق کا اور ان دونوں کی بناؤں میں تساوی نہیں، اس لیے وجہ تعدیل میں اختلاف ہوسکتا ہے، اگر قائل نے دونوں بناؤں کی رعایت کے طریق تجویز کرنے میں مختلف رائے قائم کی جس میں کسی کی ترجیح کسی پر لازم نہیں آتی اور یہاں مقابلہ ہے کہ ایک من لہ الحق کا دوسرے من لہ الحق سے جو بناء استحقاق میں متساوی ہیں، پھر باوجود تساوی فی بناء استحقاق محض ایک وصف خارج یعنی بیمار کی وجہ سے جس کا بناء استحقاق پر کوئی اثر نہیں، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ابطال ہے بناء استحقاق کا ایک وصف خارج کے سبب جو ترجیح بلامرجح ہے، غرض قیاس کی صحت بھی ضعیف پھر قائس بھی ضعیف اور قیاس در قیاس کی وجہ سے بھی ضعف، مسئلہ میں اتنے ضعف، پھر نصوص وجوب عدل سے تعارض کیونکہ وہ نصوص اپنے اطلاق سے اس صورت کو بھی شامل کہ ایک موسرہ ہو ایک فقیرہ اور تخصیص وتقیید کی کوئی دلیل نہیں، اس لیے یہ حکم سخت مخدوش ہے، پھر دوسرے قواعد اس کو مقتضی ہیں کہ اگر اس حکم پر عمل بھی کیا جائے تو زوج کی رائے پر اس کا مدار نہ رکھا جائے گا بلکہ قضا قاضی کی حاجت ہوگی، کیونکہ اس صورت میں جو فقیرہ کی طرف ہے نزاع ہوگا کہ وہ دوسرے قول کو لینا چاہے گی اس کا قاطع صرف قضا قاضی ہوسکتا ہے اور عجب نہیں کہ اسی احتمال نزاع کی بنا پر اصل مسئلہ میں بھی قضا قاضی شرط ہو، گو میں نے منقول نہیں دیکھا، شاید تلاش سے مل جائے لیکن اگر کسی مفتی کو اس قول میں شرح صدر ہو جائے اور عامی کو بھی اس کے فتوئی میں شرح صدر ہو جائے تو افتا اور اخذ جائز ہے"۔

اس عامی کا اپنا خیال یہ تھا اور اب بھی ہے کہ شرط عدل کے سمجھنے میں بعض فقہا کو تسامح ہوا ہے، عدل کے معنی اس سیاق میں، یکسانیت یا مساوات مطلق کے نہیں، بلکہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب حال برتاؤ کرنے کے ہیں، ایک بیوی سن رسیدہ ہے، دوسری بالکل نوعمر، ایک بیوی کشمیر کی ہے جو ہندوستان کی گرمی نہیں برداشت کرسکتی، دوسری بیوی افریقہ کی ہے جس سے ہندوستان کی سردی نہیں برداشت ہوتی، ایک ٹھیٹھ دیہاتن ہے دوسری خالص شہری، اس قسم کی تمام

صورتوں میں ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ ایک بیوی کی ضرورتیں اور دلچسپیاں دوسری سے بالکل الگ ہوں گی اور دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانا، مثال عدل کی نہیں، ظلم کی پیش کرے گا، ایسی حالت میں عدل یہی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اسی کے حال و مذاق کی رعایت سے برتاؤ کیا جائے اور نفقہ بھی ایک حد تک اسی کلیہ کے تحت میں آجاتا ہے، بڑی خوشی اس کی ہوئی کہ اس خیال کی تائید بحر الرائق اور رد المختار سے مل گئی، مولانا اس کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے اور مسئلہ پر جو فقیہانہ موشگافیاں کیں وہ ابھی اوپر گزر چکیں۔ مولانا فقہیات میں نرے مقلد جامد اور محض جزئیات کے حافظ و ناقل نہ تھے خود بھی فقیہ تھے، حق رکھتے تھے کہ اگلے فقیہوں سے الگ ہو کر اپنی راہ نکالیں اور بڑی بات یہ کہ کبھی کبھی اس حق کو فرض سمجھ کر ادا بھی کر ڈالتے تھے۔

(35)

مولانا تو جیسے گھر بھر کے پیر تھے، بوڑھا، بچہ، کوئی بھی بیمار ہو اور دعا مولانا کریں، تعویذ مولانا دیں، گھر میں پیدائش ہو، موت ہو، خبر مولانا کو کی جائے، اس طرح کے خطوط کے نمونے اوپر گزر چکے، اب ٹھیٹھ خانگی خط اس قسم کے سب کہاں تک نقل کیے جائیں، اس لیے 28 جنوری کے نیاز نامہ کو تو دوسرے سے جانے ہی دیجیے اس کے بعد کا عریضہ میرے ذخیرہ میں محفوظ 3 مارچ 1931 (11 شوال 1349ھ) کا ہے، جو خانگی اور پبلک حیثیتوں کا جامع ہے، اس لیے اس کی نقل میں مضائقہ نہیں، جواب و سوال ساتھ ہی ساتھ ملیں گے۔

''م۔ کل سہ پہر کو گھر میں لڑکی کی ولادت ہوئی۔

ا۔ مبارک ہو۔

م۔ معمولاً جتنی شدید تکلیف ہوتی تھی اب کی نسبتاً اس سے بہت کم رہی، کیا عجب ہے کہ جناب کے تعویذ اور دعاؤں کی برکت ہو۔

ا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گمان کی برکت ہو۔

م۔ البتہ تعویذ جو مولود کے واسطے عطا ہوا تھا اسے احتیاط سے رکھ لیا تھا لیکن تلاش سے نہ ملا، اگر مکرر عنایت ہو جاتا تو زہے کرم۔

ا۔ ملفوف ہے۔

م۔ لڑکی کا نام بھی آپ ہی تجویز فرمادیں۔اس کی ماں نے تھانہ بھون ہی میں اس کا عہد کرلیا تھا، مجھے ذاتی طور پر زہرا، پسند ہے،اس کی ایک بہن کا نام حمیرا ہے۔

ا۔ مجھ کو بھی پسند ہے،صرف اتنی ترمیم کرتا ہوں،اگر سب کو پسند ہو کہ زہیرا صیغہ تصغیر سے کردیا جائے،حمیرا کا وزن بھی ہوجائے گا۔

م۔ اس طرف جناب کے رسالہ اصلاح الخیال کے مطالعہ کا اتفاق ہوا،سبحان اللہ وجزاک اللہ۔

ا۔ اس سے مسرت ہوئی کہ آپ کو پسند آیا۔

م۔ اس کے آخر میں جو نصیحت نامہ ہے اس کے کاتب تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ معلوم ہوتے ہیں اور مکتوب الیہ سرسید احمد خاں، کیا یہ گمان صحیح ہے؟

ا۔ جز ثانی صحیح ہے جز اول کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے مجھ کو حکم دیا تھا اس خط کے لکھنے کا،سو اس کی عبارت میری ہے۔

م۔ اگر صحیح ہے تو اب تو اس تصریح کے بھی شائع کردینے میں کوئی امر غالباً مانع نہیں۔

ا۔ کوئی مانع نہیں اور اس وقت بھی کوئی مانع نہ تھا،مگر خواہ مخواہ بعض حضرات نے اس وقت خط بھیجنے سے بھی روک دیا،حضرت نے اپنے اخلاق سے اس کو قبول کرلیا،مگر کئی بار نہ جانے سے افسوس ظاہر فرمایا۔

م۔ اجازت ہو تو اب اپنے پرچہ سچ میں اسے شائع کردوں۔

ا۔ کیا مضائقہ شاید کسی کو نافع ہو"۔

حضرت کے ہزارہا مریدوں میں سب ہی طرح کے لوگ تھے،بعض پر حیرت ہوتی تھی کہ دل آزاری اور دل شکنی سے بچنے اور احتیاط رکھنے کا جو سبق حضرت کے ہاں کا سب سے پہلا اور مقدم، درس تھا، یہ لوگ اسی کی طرف سے غافل بلکہ الٹا اور اسے پامال کرنے کو تیار رہتے ہیں، ہر شخص پر عیب چینی اور خردہ گیری کی نگاہ، اپنے اذکار ونوافل پر غرہ، حضرت مولاناؒ کو بدنام کرنے والے حقیقتاً سب سے بڑھ کر حضرت کے مرید اسی قبیل اور قماش کے ہوئے ہیں، ایک ایسے ہی بزرگ سے، جو لکھنؤ اور کانپور میں کتب فروشی کرتے تھے اور عجب نہیں کہ اب بھی زندہ سلامت ہوں، اپنا بھی سابقہ پڑ گیا اور کچھ دنوں تو خیر صبر وتحمل سے کام چلتا رہا،لیکن ادھر بھی آخر اتنی بے نفسی

کہاں تھی؟ عاجز آ کر ایک طویل عرضی مولانا کی خدمت میں پیش کر دی اور جواب جو مرحمت ہوا وہ شان حاکمانہ سے زیادہ مصلحانہ، مصالحانہ اور حکیمانہ پہلوؤں کو لیے ہوئے پہلے مضمون استغاثہ ملخصاً ملاحظہ ہو۔

مورخہ 21 مارچ 1931

''اس وقت ایک ذرا تکلیف دہ موضوع کی طرف توجہ سامی مبذول کرانا ہے اور اس کے لیے قبل ہی سے دست بستہ معافی مانگے لیتا ہوں(1)۔

جناب کے مریدوں میں مرزا...... صاحب لکھنوی میرے لیے عجب عذاب جان ثابت ہو رہے ہیں(2)، مجھ سے کبھی کی شناسائی نہ تھی(3)، کوئی دو سال ہوئے ہوں گے کہ تھانہ بھون ہی میں خود بڑھ کر مجھ سے ملے، پھر لکھنؤ میں خواجہ صاحب کے ہمراہ دو ایک بار گھر پر کرم کیا، شاید سچ کے خریدار بھی ہوں (جس کا تعلق تمام تر دفتر سے ہے مجھے خبر بھی نہیں ہوتی) اب اس کے بعد سے معمول یہ ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینہ میرے نام ایک دل آزار مکتوب روانہ کرتے رہتے ہیں، پچھلے سال میرے قدیم اور عزیز دوست ظفر الملک سیاسی تحریک کے سلسلہ میں جیل خانہ گئے مرزا صاحب کا طنزیہ خط موجود، مولانا محمد علیؒ کا انتقال ہوا، دشمنوں تک نے ماتم کیا، خود جناب والا کا تعزیت نامہ میرے نام آیا، یہ مرزا صاحب ہی ایسے ہیں جنھوں نے اس موقع پر بھی زخم پر نمک پاشی کی، لکھا کہ محمد علی (نام بس اسی طرح درج تھا، نہ مرحوم، نہ مولانا، نہ کچھ اور) کی وفات پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب دنیوی تزک و حشم ہے، عاقبت بخیر گزرے جب خوشی ہونا چاہیے(4)، اب تازہ خط جو کل ہی صادر ہوا ہے اور جس میں سچ پر اس تلخ انداز میں نکتہ چینی کی ہے، بجنسہٖ خدمت والا میں روانہ کر رہا ہوں، مضمون لغو و بیہودہ سہی، لیکن آخر ان حضرات کو اتنے کرخت لہجہ میں مجھے مخاطب کرنے کی کیا ضرورت لاحق رہا کرتی ہے(5) میں نے تو انھیں نہ کسی رشتہ سے اپنا بزرگ تسلیم کیا تھا نہ مصلح نہ ناصح، میرا نفس بھی کچھ مردہ تو ہے نہیں، بری بھلی اچھی خاصی سخت تحریروں پر بھی قادر ہوں، لیکن بحمد اللہ اپنی طرف سے ابتدا نہیں کرتا اور حتی الامکان پہلے اتمام حجت کر لیتا ہوں(6)۔

جناب والا کی صحبت میں رہ کر تو پہلا ہی سبق دوسروں کی رعایت جذبات کا حاصل ہوتا ہے بلکہ میں تو اس باب میں جناب کی احتیاط و ضبط کو دوسروں کے سامنے سنداً پیش کرتا رہتا ہوں(7)

مگر یہ حضرت خدا معلوم کس قسم کے مرید ہیں کہ روش شیخ کے بالکل برعکس اختیار کیے ہوئے ہیں(8)، سچ انھیں ناپسند ہے تو ظاہر ہے کہ فوراً بند کر سکتے اور دوسروں سے بند کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں(9)، لیکن آخر اس دل آزار روش سے کیا نفع سوچے ہوئے ہیں، بجز اس کے کہ میرے نفس میں بھی انتقال کے لیے حرکت پیدا ہو(10)''۔

مولانا ایسے مسائل کے حل کرنے کے بادشاہ تھے، اصل معروضات کا مفصل نمبر وار جواب تو حسب معمول آیا ہی اور ایک اور مستقل مقالچہ اس کے علاوہ! پہلے نمبر وار جوابات ملاحظہ ہوں:

(1) جس تکلیف دہی کا اثر تخفیف دہی ہو وہ تکلیف دہی ہی نہیں، میں تو آپ کے تعلق کو ایسا قوی سمجھتا ہوں کہ شاید معافی مانگنے سے معافی مانگنے کی ضرورت ہو۔

(2) مگر ثواب ایمان بھی ساتھ ساتھ ہوں گے کیونکہ سبب ہیں اجر صبر کے، جیسا جداگانہ پرچہ میں لکھا ہے۔

(3) اچھا ہوا ورنہ زیادہ کلفت ہوتی، جیسا نگار مدت سے مجھ پر سخت حملہ کرتا ہے، مگر اس ناشناسائی کی برکت ہے کہ مجھ کو پروا بھی نہیں ہوتی، اس کے خاص خطی خطاب کرنے پر میں نے منہ نہیں لگایا اور راحت میں ہوں، رنج کی حقیقت ہی خلاف توقع، توقع ہی چھوڑ دی۔

(4) رنج کی باتیں ہیں، مگر رنج کے مصالح سے اس رنج کا علاج کرنا جس کے تین طریقے جداگانہ پرچہ میں لکھے ہیں، یہ ہے اپنا فعل اختیاری، اس میں مشغول ہونا چاہیے، دوسرے کے فعل کو جو کہ اپنے اختیار میں نہیں کیونکر روکا جائے۔

(5) بیشک سچ ہے، مگر یہ تو خود ان کو سمجھنا چاہیے اب ایک شخص نہیں سمجھتا، تو آگے تین ہی راستے ہیں، ایک صبر، دوسرا انتقام، تیسرا انتظام، سب کی تفصیل جداگانہ پرچہ میں لکھی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

(6) یہ تو عین طریق ہے اہل طریق کا۔

(7) یہ آپ کی محبت و حسن ظن ہے، میں کیا چیز ہوں، لیکن آپ کو جب خود احساس ہو گیا، تو مجھ کو زائد احساس کرا دینا بھی جائز ہوگا اور زائد یہ ہے کہ میں اپنے مخالفین اور موذیوں کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں،

احمد رضا خان کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی، کافر، خبیث، ملعون سب کچھ سنتا رہا۔

(8) اسی رعایت جذبات کے تحت میں یہ احتمال ہے کہ وہ اصل دین اسی طریق کو سمجھتے ہوں اور میرے طرز کو محتاج تاویل سمجھتے ہوں۔

(9) میں تو خود فروخت کو بند کر دیتا۔

(10) حد شرعی کے اندر اجازت تو ہے"۔

اب وہ مستقل ہدایت نامہ یا دستور العمل جس کا حوالہ بار بار اوپر آچکا ہے، ملاحظہ طلب ہے:

"مکرمی، دام لطفکم، السلام علیکم

عنایت نامہ نے ممنون کیا، آپ نے جو حکایت اس میں لکھی ہے اس نے محزون کیا، آپ کو تو زیادہ حزن ہونا چاہیے کہ آپ اس کے مخاطب کیے گئے ہیں، ایسے موقع پر میں جس تدبیر سے اپنے حزن کا ازالہ کرتا ہوں، اسی تدبیر کے آپ کے ازالہ حزن کے لیے استعمال کرنے کی کیا آپ اجازت دیں گے۔ استفہام کا جواب چونکہ آپ کی خصوصیت سے اثبات ہی میں متوقع ہے اس لیے بلا انتظار جواب اس تدبیر سے کام لیتا ہوں۔

وھو ہذا۔ مجھ کو اس سے زیادہ سخت مواقع پیش آتے ہیں، دو حیثیت سے، ایک الفاظ اس سے زیادہ سخت ہوتے ہیں، ابھی ابھی ایک عنایت فرما کر خط آیا تھا اس میں مجھ کو گدہا تک لکھا تھا دوسرے ایسے اشخاص کی طرف سے جو اول مدعی اعتقاد کے تھے، مگر میں ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔

(1) اپنی زبان یا قلم یا قلب کو ملوث کیا، میرا کیا بگڑا، رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں، محض خیال کے تابع ہے۔

(2) ممکن ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو، مثلاً امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس لیے وہ معذور ہو، گو ہم بھی اس لیے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہماری رائے میں اس سے سہل اور اسلم ہو۔

(3) اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا تو اپنی عاقبت خراب کی، ہم کو صبر کا ثواب ملا۔

(4) نیز ایسے واقعات سے بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی

ہے، اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا، یا ہو سکتا تھا اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے۔

(5) نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں، اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔

اور بہت سے اسرار و فوائد ہیں، نمونہ کے لیے یہ کافی ہے، یہ تو حقیقی تدبیر ہے زوال حزن کی اور ایک طبعی تدبیر یہی ہے کہ انتقام لے لیا جائے یا جو شخص روک سکے اس کو رکوا دیا جائے، سو اگر مجھ کو اطلاع دینے سے یہ مقصد ہے تو صریح اجازت کا انتظار ہے اور ایک تحریر آپ کی اپنی تحریر کے ساتھ ان کے پاس بھیجنے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی بنا پر خطاب کر سکوں۔

یہ کل تین تدبیریں ہیں اور اگر کوئی چوتھی بات میرے کرنے کی ذہن میں ہو تو ظاہر فرمایئے میں حد قدرت و حد اذن شرعی کے اندر اس کے لیے حاضر ہوں۔

بقیہ اجزا کا جواب اصل خط کے حواشی میں ہے"۔

(36)

اس کے بعد کا نیاز نامہ مورخہ 31 مارچ گویا اسی کا تکملہ اور تتمہ ہے، مع بعض زائد و کارآمد مضامین کے۔ مثنوی مولانائے رومؒ سے شوق و شغف تو اس وقت سے کوئی 11، 12 سال قبل ہی پیدا ہو گیا تھا اور اس کے کانپوری ایڈیشن میں اس پر جو لا جواب حاشیے درج ہیں (خصوصاً افادات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) ان کی مدد سے الٹا سیدھا ساری کتاب کو جلدی جلدی پڑھ گیا تھا، اب ذرا کچھ تو فرصت و یکسوئی حاصل ہوئی اور بڑی بات خود مولانا کا فیض صحبت، جی میں آیا کہ مثنوی کو مولانا کی لکھی اور لکھوائی ہوئی شرح کی مدد سے از سر نو پڑھ ڈالیے کلید مثنوی، مولانا کی اس شرح کا نام ہے، اس کے بعض حصے (دفتر ششم) تو خود مولانا کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض حصوں کو مولانا کے بعض شاگردوں نے ان سے پڑھ کر بطور خود لکھ دیا ہے، شرح شبیری، اسی کلید مثنوی کا ایک جز، بعض اور دفتروں کی طرح، مولانا کے عزیز برادرزادے مولوی شبیر علی صاحب تھانوی کی تیار کی ہوئی شرح کا نام ہے، یہ خاص طور پر سلیس و عام فہم معلوم ہوئی، خط میں یہ ذکر بھی خاصا آ گیا ہے اس کے سمجھنے کے لیے یہ تمہید ضروری تھی، اب آگے خط و جواب دونوں کے ساتھ ساتھ پڑھیے۔

م۔ والا نامہ ایک ہفتہ ہوا وصول ہوگیا تھا، جو کچھ ارشاد ہوا بالکل حق ہے، اب اس وقت تو میں ان صاحب کے باب میں بالکل خاموش ہوگیا ہوں، نہ اپنے پرچہ میں کچھ لکھا، نہ خط سے انھیں جواب دیا، جناب والا سے بھی کچھ عرض نہیں کرتا، جیسا مناسب خیال فرمایا جائے ان سے معاملہ فرمایا جائے۔

ا۔ مناسب تو یقیناً یہی ہے کہ ان پر احتساب کروں، مگر ساتھ ہی ضرورت ہے کہ ذریعہ اطلاع کا بھی ظاہر کروں، تو اس میں آپ کی تحریر کا حوالہ بلکہ ساتھ بھیجنا ضروری ہے، اور یہ بدوں آپ کی اجازت کے ممکن نہیں اور اجازت کی درخواست میں احتمال ہے آپ کے خلاف مذاق ہونے کا جو میرے اصول رعایت جذبات کے خلاف ہے، البتہ اگر آپ ان کی مصلحت اصلاح کے لیے بدوں میری استدعا کے از خود کوئی ایسی تحریر دے دیں پھر میں اچھی طرح ان کے کان کھول سکتا ہوں۔

م۔ البتہ یہ بھی عرض کردوں کہ طبیعت میں سکون صرف اس وقت ہے، ممکن ہے کہ اگر حسب عادت پھر چندروز کے بعد ان کا کوئی جدید مکتوب اسی قسم کا آگیا، تو طبیعت اس وقت ضبط پر قادر نہ ہو۔

ا۔ تو ضبط پر مجبور ہونے کی ضرورت بھی تو نہیں بشرطیکہ حد شرعی کے اندر ہو۔

م۔ ایک عشرہ سے کلید مثنوی (دفتر ششم) زیر مطالعہ ہے، کوشش کرتا ہوں کہ روز تھوڑی تھوڑی سی سمجھ کر پڑھوں، شرح مطالب کی خوبیوں کا کیا کہنا، لیکن بعض مقامات پر شرح کی عبارت زیادہ بلند ہوگئی ہے اور بجائے خود شرح طلب ہے۔

ا۔ بیشک، مگر یہ میری قدرت سے خارج ہے، خواہ علوئے مضمون کے سبب اس کو سہل کرنا دشوار ہے خواہ اپنے محاورات کو بدلنا بوجہ خلاف عادت ہونے کے مشکل ہو۔

م۔ ہم جیسے عامیوں اور مبتدیوں کے لیے تو بعض دفتروں کی شرح شبیری، بہت کارآمد ہے۔

ا۔ جو کارآمد ہو، کام اس سے شروع کیا جائے، ممکن ہے کہ مناسبت بڑھ جانے سے پھر دشواری مبدل بسہولت ہوجائے۔

م۔ رات خواب میں دیکھا کہ کسی صاحب کی مجلس میں حاضر ہوں اور بہت سے لوگ ہیں،

صاحب مجلس ہر شخص سے بڑے اخلاق والتفات سے پیش آ رہے ہیں اور اشعار مثنوی کے مطالب بالکل صاف وسادہ الفاظ میں، لیکن بڑے دل نشین و موثر انداز میں بیان فرما رہے ہیں، ہم سب لوگ محو ہیں اتنے میں کسی نے کہا کہ یہ صاحب حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہیں، بڑی حیرت ہوئی کہ ان کی وضع وصورت سے تو درویشی ذرا نہیں معلوم ہوتی، بالکل دنیا داروں کے سے ہیں، خدا معلوم ہمارے مولانا تھانوی ان سے بیعت کیونکر ہو گئے، لیکن ہاں باتیں واقعی بڑے پتہ کی کہہ رہے ہیں اور اخلاق و گفتگو ضرور عارفوں اور درویشوں کے سے ہیں، بس آنکھ کھل گئی۔

ا۔ مبارک، زیارت بھی، استفادہ بھی، حیرت بھی، معرفت بھی''

بیعت کا تعلق ضابطہ سے، جیسا کہ ان ''نقوش'' کے بعض ابتدائی نمبروں میں خوب صراحت کے ساتھ گزر چکا ہے، ایک دوسرے بزرگ سے تھا، لیکن عملاً مرشد وہادی حضرت مولانا تھانویؒ ہی تھے، علمی واخلاقی واصلاحی سے لے کر ذاتی وخانگی چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں نگاہ اسی دربار کی طرف اٹھتی تھی اور زندگی کی ہر مشکل کا حل یہیں سے ملتا تھا۔

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

مشورے اور ہدایتیں یہیں سے برابر ہر چیز کے لیے ملتی رہتیں، عقد ثانی کے ناخوشگوار عواقب ونتائج کا سلسلہ چل رہا تھا اور آپ بیتی کے تجربوں کے بعد ان دریدہ دہن اور کم عقل آریہ اور مسیحی مناظرین پر غصہ آرہا تھا، جنھوں نے حضور انورؐ کے تعدد ازدواج پر اس حیثیت سے اعتراضات کی بوچھار کی کہ گویا دنیا میں کئی کئی بیویاں رکھنا انتہائی خوش عیشی کے مرادف ہے! ذاتی تجربہ نے چند ہی مہینوں میں بتا دیا کہ دو بیویاں رکھنا اور پھر ان کے درمیان بلند اور معیاری نہیں بلکہ اوسط درجہ کا بھی توازن قائم رکھنا عیش پرستی نہیں، بلکہ ایک سخت مجاہدہ ہے، جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں، خیال آخری علاج، طلاق کی طرف گیا، اور 14 اپریل کے عریضہ میں حضرت کو ساری روئداد وغم لکھ کر مشورہ وہدایت کا طالب ہوا، خط خاصا مفصل تھا، یہاں اس کی بہت مختصر تلخیص درج ہو رہی ہے اور حضرت کے وہ تکلیف دہ لکھنوی مرید تو یاد ہی ہوں گے، ان کا تذکرہ ابھی پچھلے ہی نمبر میں تو آچکا ہے:

''م۔ مرزا...... صاحب کے خط کی نقل میں اپنے عریضہ کے دوسرے کاغذ پر حاضر خدمت

کررہاہوں۔

ا۔ میں نے ان کو آج ہی لکھ دیا، امید ہے کہ اب وہ خطاب نہ کریں گے اور اگر پھر بھی جوش ہوگا تو اس جوش کا جو سبب ہے، سچ کا دیکھنا وہ اس کو ترک کردیں گے، اور جب دیکھنا ترک کردیں گے تو دیکھنے کا جو سبب ہے یعنی خریدنا وہ اس کو بھی ترک کردیں گے اور اس میں سلامتی ہے اور اگر وہ پھر ایسا کریں تو آپ مجھ کو اسی طریق سے اطلاع دیجیے۔

م۔ عقد ثانی کو اب چھ ماہ سے زائد ہوچکے، اس مدت میں خوب تجربے ہوئے، ان کے ساتھ مجھے موانست ہی پیدا ہوسکی نہ مناسبت اور یہی حال ادھر سے بھی ہوگا، جزئیات لکھ لکھ کر کہاں تک آپ کا وقت خراب کروں، خلاصہ یہ کہ جب یہاں ہوتی ہیں تو دن دن بھر گزر جاتا ہے اور معمولی بات چیت کی بھی نوبت نہیں آتی اور اب جب کہ اپنے مایکہ میں ہیں، خط و کتابت سے بھی بجائے مسرت وانشراح کے انقباض ہی بڑھتا رہتا ہے، والدہ ماجدہ اور دوسرے عزیزوں کو ان کی ذات سے جو ناگواری ہے وہ اس کے علاوہ، صورت، سیرت، فہم، سلیقہ، نسب، ہر شے میری توقع سے فروتر ہی نکلی، بہت غور کے بعد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان سے علاحدگی اختیار کر کے حتی الامکان انھیں کوئی دوسرا شوہر تلاش کردوں، انھیں کوئی سزا دینا یا ان کا دل دکھانا ہرگز نہیں چاہتا، صرف اپنے لیے سبکدوشی حاصل کرنا مقصود ہے، جانتا ہوں کہ بلاضرورت طلاق کوئی پسندیدہ امر نہیں، مباحات میں ابغض ہے، لیکن آخر متعدد اجل صحابہؓ اور خود حضور انورؐ کے عمل سے طلاق کی مثالیں ملتی ہی ہیں، اپنی تجویز پر عمل کرنے سے قبل جناب کے ارشاد و مشورہ سے استفادہ ضروری سمجھتا ہوں۔

ا۔ ہاں ایک پہلو تو یہ ہے، مگر اس میں ایک گہری خطرناک خرابی بھی ہے کہ اگر دوسری جگہ باہم توافق نہ ہوا، خواہ کسی جانب سے کوتاہی ہو تو آپ پر الزام آئے گا اور رحم دلی کے سبب عمر بھر اسی ضیق میں ابتلا رہے گا کہ میں ایک یا دو مسلمان کی کلفت کا سبب بنا اور یہ ایسا ضیق ہوگا کہ اس سے نکلنا آپ کے قابو سے باہر ہوگا، کیونکہ آپ منکوحۂ غیر کو طلاق بھی نہیں دے سکتے، اس میں نظر ثانی کرلیجیے اور ساتھ ہی دوسرے پہلو کو پیش نظر رکھیے اور پھر ایک کو ترجیح دیجیے وہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ طلاق کے ساتھ یہ وعدہ کرلیجیے کہ اگر تم نکاح کرنا نہ چاہو تو تم کو مثلاً ہمیشہ دیا کروں گا اور اگر نکاح کرنا چاہو تو نکاح کرنے تک ماہوار ایک سال تک دوں گا۔

م۔ بچی کے لیے تعویذ پچھلے والا نامہ کے ساتھ وصول ہوگیا تھا، بارہا کا تجربہ ہے کہ ادھر کسی مرض کے لیے لکھا گیا ادھر قبل اس کے کہ تعویذ آئے مرض میں افاقہ شروع ہوگیا چنانچہ اب کی بھی بحمد اللہ یہی ہوا۔

ا۔ یہ آپ کے حسن ظن کی برکت ہے ورنہ دوسری جگہوں میں تو خاص تعویذ کا بھی اثر بعض اوقات نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ آپ کے اس حسن ظن کی برکت سے میری آخرت درست کردے۔

اپنے کو جن بزرگ سے بیعت کا تعلق ضابطہ سے تھا، ان سے عقیدت اگرچہ اپنی جگہ پر قائم تھی اور باوجود بار بار سخت دھکے پہنچنے کے بھی، بڑی حد تک قائم تھی، ذہن ہر مرتبہ ان کے لیے کوئی نہ کوئی تاویل کرلیتا تھا، تاہم حضرت تھانویؒ کی بھی عظمت وعقیدت دل میں کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض حیثیتوں سے تو کچھ بڑھی ہی تھی اور بعض خاص موقعوں پر تو اور زیادہ بڑھ جاتی تھی، اس پر بھی ذہن میں یہ کانٹا کھٹکتا رہتا تھا کہ کہیں یہ حال اہل طریق کے ناپسندیدہ وغیر مرضی تو نہیں، بلکہ خود یہ خلش بھی کہنا چاہیے کہ حضرت ہی کی بعض تحریروں کی بنا پر پیدا ہوتی رہتی۔ پچھلے عریضہ کو بھیجے ہوئے ابھی دو ہی چار دن ہوئے تھے کہ ایک نئی تقریب اس مسئلہ میں استفتا اور استفسار کی پیدا ہوگئی۔ مولاناؒ کے اوقات کی ماموری پوری طرح ذہن میں رہتی تھی، مشغولی کا بخوبی علم رہتا تھا اس پر بھی طبیعت مراسلت ومکاتبت کے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی، اپریل کی 25 تھی کہ تازہ عریضہ میں اس باب میں سوالات کرڈالے، عجب زمانہ تھا، خواب میں بھی حضرتؒ کی زیارت کثرت سے ہوا کرتی اور استفادہ بھی، اس کا بھی ذکر کردیا اور ایک آدھ خانگی بات بھی کہہ ڈالی، اکثر خط اسی طرح کے کشکول نما تو ہوا ہی کرتے تھے۔

(37)

''النور کے تازہ پرچہ کی وساطت سے الغطائف کے نام سے ایک تحفہ بے مثل وصول ہوا، سبحان اللہ وجزاک اللہ دل سے بے اختیار دعائیں نکلتی رہیں (1)۔

دو عبارتوں پر سوالات پیدا ہوئے ہیں، انھیں عرض کرکے مزید تشفی حاصل کرنا چاہتا ہوں:

صفحہ 23 آخری سطر میں ہی کہ ان تینوں علائم کا تحقق دال علی الولایۃ نہیں، الخ اس پر دل چاہتا ہے کہ علامات ولایت ومقبولیت بھی جناب کی زبان سے سن لوں (2)۔

صفحہ 18 وسط صفحہ میں ہے کہ ظاہر ہے کہ ایک معتقد و مرید کے لیے اس کا شیخ سب سے احب ہوتا ہے اس پر عرض ہے کہ کسی کو کسی دوسرے زندہ بزرگ کے ساتھ اپنے شیخ ہی کی سی محبت ہو تو اس کے لیے کیا ارشاد ہوگا؟

یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو بلا شائبۂ تصنع عرض ہے کہ آپ کی محبت وعقیدت کو اپنے شیخ سے کم درجہ میں نہیں پاتا، بلکہ اگر کسی جہت سے انھیں ترجیح دیتا ہوں تو دوسری جہت سے جناب والا کو(3)۔

جہاں تک خواب (بلکہ بیداری میں بھی تصور) کا تعلق ہے آپ کی زیارت سے بکثرت مشرف ہوتا رہتا ہوں، کبھی کبھی تو بحمد اللہ ہفتہ میں چار چار بار یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

ابھی پرسوں شب میں دیکھا کہ تھانہ بھون کی مسجد میں حاضر ہوں، البتہ مسجد خوب عالیشان ہوگئی ہے مثل جامع مسجد دہلی کے، وقت رات کا ہے اور غالباً نماز عشا کی تیاری ہو رہی ہے، اپنے کو دیکھا کہ جہاں آپ سنتیں پڑھتے ہیں، اس مصلیٰ پر کھڑا ہوا، وہیں نماز پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، مسجد میں روشنی کم ہے، اندھیرا سا ہے، دل میں کہتا جا رہا ہوں کہ یہ مصلیٰ تو تاریک رہ نہیں سکتا، شیخ وقت کی جائے نماز ہے، ضرور از خود روشن ہو جائے گا، چنانچہ واقعتاً وہ مصلیٰ جگمگاتا نظر آنے لگا، اتنے میں نظر جناب پر پڑی کہ کچھ فاصلہ پر بیٹھے وضو فرما رہے ہیں، دل نے کہا کہ کہیں ادھر دیکھ لیا تو فرمائیں گے یہ بڑا بے ادب وگستاخ ہے، ساری جگہ چھوڑ خاص میرے مصلیٰ پر نماز پڑھنے لگا، بس آنکھ کھل گئی، مضائقہ نہ ہو تو اس کی تعبیر سے بھی ایما فرما دیا جائے(4)۔

گھر میں اللہ کے فضل سے افاقہ تو ہے(5)، لیکن دورے پڑنا ابھی موقوف نہیں ہوئے ہیں جس وقت اختلاج کا زور ہوتا ہے، غضب کی بات ہے کہ آپ حضرات کو بھی جو کچھ منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہیں، گو وہ معذور ہوں لیکن سننے سے بہر حال تکلیف تو ہوتی ہے(6)۔

جواب کے ملاحظہ میں توقف کی حاجت نہیں:

(1) ''اللہ تعالیٰ آپ کی دعاؤں سے مجھ گدائے بےنوا کا بیڑا پار فرما دے۔

(2) بزرگوں کے کلام سے جو مستفاد ہوتا ہے اس کا حاصل اپنے الفاظ میں عرض ہے۔

نمبر 1۔ عقائد صحیحہ

نمبر2۔اعمال صالحہ

نمبر3۔اس کی صحبت کا طبعاً موجب رغبت آخرت ونفرت عن الدنیا ہونا۔

نمبر4۔ اس کی طرف خواص یعنی علما وصلحا کا رجحان ومیلان بنسبت عوام وامرا کے زیادہ ہونا۔

نمبر5۔خود اس کا اتقیا وسالکین کے ساتھ نیازمندی اور محبت کے ساتھ پیش آنا اور شیخ ہونے کی علامات اور ہیں۔

(3) جو مضمون اس مقام میں ہے وہ اس شخص کے لیے بھی محفوظ ہے، بدلا نہیں، یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ احب ہونا چاہیے بلکہ یہ کہا گیا کہ احب ہوتا ہے یعنی عادتاً، سو اگر اس کے خلاف بھی ہو تب بھی کچھ حرج نہیں، اس مقام پر تصور کے نافع ہونے کا ذکر ہے، یہ نفع ان دوسرے بزرگ کے تصور سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور جس مسئلہ کے متعلق آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوا ہے وہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اس کی مختصر تحقیق یہ ہے کہ شیخ کا احب ہونا ضروری نہیں بلکہ خاص تربیت میں اس کی انفعیت کا اعتقاد ضروری ہے، اگر دوسرے کے ساتھ اعتقاد ہے تو پھر تربیت میں اسی سے رجوع کرنا چاہیے، البتہ اگر شیخ کے مکدر ہونے کا احتمال نہ ہو تو اس سے اذن لے لینا اسلم ہے۔

(4) مجھ کو تعبیر سے مناسبت نہیں، اس لیے تفصیلاً تعبیر سے معذور ہوں، اجمالاً اچھا خواب ہے چنانچہ ظاہر ہے۔

(5) الحمدللہ۔

(6) غلبہ میں تو بعض اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو کہہ بیٹھتے ہیں، مگر سامعین کو بجائے تکلیف کے ان کہنے والوں سے عقیدت ہو گئی، سو آپ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟''

اس کے بعد کے دونوں خط بھی فقہ وسلوک ہی کی بعض جزئیات، لیکن اہم جزئیات پر شامل تھے، گو بظاہر خانگی مسائل سے متعلق۔ اہل خانہ مولوی جمیل سے مراد حضرت مولانا کی ربیبہ (دوسرے شوہر سے صاحبزادی) مراد ہیں پہلا خط مورخہ 29 مئی:

م۔عزیزوں میں ایک نوجوان کی شادی ابھی چند روز ہوئے ہوئی تھی، اب بیوی شوہر کے ناکارہ ہونے کی بنا پر خلع کا مطالبہ کر رہی ہے، شوہر کو اس دعویٰ سے قطعی انکار ہے، اب اگر دونوں

اپنا بیان مؤکد بہ حلف ایک دوسرے کے خلاف دیں تو مخاصمہ کے حل کی شرعی صورت کیا ہوگی؟

ا۔ جداگانہ کاغذ پر مرقوم ہے، مگر یہ فیصلہ اس وقت نافذ ہوگا جب زوجین بتراضی کسی کو حکم بنالیں، یعنی شرعی فیصلہ کے نافذ کرنے کا اختیار دے دیں، وہ حکم بجائے قاضی کے ہوجائے گا۔

م۔ عزیزہ اہل خانہ مولوی جمیل احمد کا اب کیا حال ہے؟ خدا کرے بالکل صحت ہوگئی ہو۔

ا۔ بعد معالجہ میرٹھ کے پانچ ماہ تک بالکل تندرست رہیں، بےفکری ہوگئی، مگر اس کے بعد کے دو دورے نہایت شدید پڑے، جس سے وہی پہلی سی حالت ہوگئی، لیکن آج کل زیادہ اثر نہیں ہے، آئندہ کا علم حق تعالیٰ کو ہے، دعا فرمائیے صحت کاملہ عاجلہ نصیب ہو"۔

دوسرا مکتوب، اسی سے ملحق 30 جون کا:

م۔ مسئلہ کا جواب جداگانہ پرچہ پر تھا، وہ شاید لفافہ میں رکھنے سے رہ گیا، دوبارہ زحمت دے رہا ہوں۔

ا۔ واقعی ڈاک کی کثرت سے ذہول ہوگیا، اب مرسل ہے، سہو معاف کیجیے، خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔

م۔ محض تلاوت قرآن مجید میں جی نہیں لگتا۔

ا۔ اس سے نقص اجر نہیں ہوتا اور اجر ہی مقصود ہے، بلکہ جی نہ لگنا مجاہدہ ہے جس سے اجر بڑھ جاتا ہے۔

م۔ صرف ان تفسیروں اور دوسری کتابوں میں جی لگتا ہے جن میں نکات قرآنی کا بیان ہوتا ہے، مثلاً آپ کی مسائل السلوک من کلام ملک الملوک وغیرہا۔

ا۔ چونکہ مضامین جدیدہ سمجھ میں آتے ہیں۔

م۔ اور جہاں کسی آیت سے متعلق کوئی سوال ذہن میں آیا، بس حل کے شوق و جوش میں معا تفسیروں کی ورق گردانی شروع کر دی جس میں وضو بے وضو کی بھی قید نہیں۔

ا۔ اس میں کراہت ہے اور قرآن کو بے وضو مس کرنے میں حرمت ہے۔

م۔ یہ اگر مرض ہے۔

ا۔ یہ یعنی حل اشکال کے لیے بیتابی۔

م۔تو اس کا علاج ارشاد ہو۔

ا۔مرض منحصر ہے معصیت میں اور یہ معصیت نہیں، ایک طبعی تقاضا ہے''۔

ابھی اوپر کے ایک فقرہ میں ضمناً مولانا کی ''ڈاک کی کثرت'' کا ذکر آ گیا ہے، تو اس متن کی شرح مجمل بھی ذرا سنتے چلیے، ڈاک لانے والی اصلی گاڑی سہارنپور کی طرف سے، دوپہر یا ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پر پہنچتی اور کچھ دیر بعد ڈاک کی تھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ جاتی، کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے اور اس کے بعد مولانا کی ڈاک ٹین کے چتکلے میں بحفاظت روانہ ہو جاتی۔ ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (یہ تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقررہ پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے اور پوسٹ مین (ڈاکیہ) کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کیے بغیر اسے لے کر چستی و مستعدی کے ساتھ حاضر خدمت ہو جاتے، حضرت کبھی تو اس وقت تک سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے ہوتے، ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصاً پوسٹ کارڈ اُن کو اسی وقت پڑھ ڈالتے اور ڈاک کا جواب اسی کے دو گھنٹہ کے بعد، بعد ظہر کی مجلس کے لیے اٹھ رہتا، خطوط کی تعداد روزانہ 30، 35 سے کیا کم ہوتی، بعض دن اور زائد پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں، بڑے لمبے چوڑے اور فقہ، سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق، اب حضرت میں اور خطوط کا یہ پشتارہ، ارد گرد حاضرین بزم حلقہ کیے ہوئے، خواص بھی عوام بھی، مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے، حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں، حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی خط کا جواب اسی کے حاشیہ پر یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں، جواب کی جامعیت سبحان اللہ، جوابات جس طرز و انداز کے ہوتے ہیں، اس کی مثالیں تو اوپر کے صفحات میں دو چار نہیں، بکثرت گزر چکیں، اللہ اللہ، دماغ کتنا حاضر پایا تھا، عموماً یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھ دیے جاتے اور اتنے جامع و محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور و فکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے، خال خال خط ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو جواب کے لیے مولانا دوسروں کے حوالہ کر دیتے، یہ وہی خط ہوتے جن میں کتابوں کے حوالہ کی ضرورت ہوتی۔

بار ہا ایسا بھی ہوتا کہ ابھی یہ انبار نپٹنے نہ پاتا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی

آجاتی اور دو چار خط اس میں بھی ہوتے، جواب کے لیے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دوسرے ہی دن نکل جائیں اور یہ منظر بھی ان آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ دن ختم ہو گیا اور حجم وضخامت والی ڈاک ختم نہ ہو پائی، اب مولانا اس سن وسال میں، بعد نماز مغرب وا وراد مغرب لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے، بیٹھ گئے ہیں اور رات گئے تک کام کر کے، ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی کر کے اٹھے ہیں، اس مختصری تفصیل سے یہ تو بہرحال معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ حضرت اس رنگ کے صوفی صافی بالکل ہی نہ تھے، جس میں درویشی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ انسان خلق سے بالکل کنارہ کر کے تنہا کسی جنگل میں رہنا شروع کر دے اور انسانوں سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

ضمیمہ
متعلق نمبر 37

زوج کے عنین ہونے کی صورت میں اگر عورت تفریق چاہے تو اس کا طریقہ شرعا یہ ہے کہ عورت قاضی کے اجلاس میں درخواست دے کہ اس کے عنین ہونے کے سبب میں اس سے علاحدگی چاہتی ہوں (قاضی سے مراد حاکم مسلم ہے گو منجانب سلطنت غیر مسلم کے مقرر ہو کذا فی در المختار ورد المختار) قاضی مرد سے دریافت کرے کہ اس کا دعویٰ عنین ہونے کا صحیح ہے یا نہیں، اگر وہ صحیح بتلا دے تو قاضی اس کو علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی اور اگر وہ تغلیط کرے اور کہے کہ میں اس سے ہم بستر ہوا ہوں تو اگر وہ نکاح کے وقت باکرہ تھی یعنی باکرہ ہونے کی حالت میں اس کا نکاح ہوا تھا تو اب ایک یا دو معتبر ماہر عورتوں کو دکھلایا جائے گا کہ اب وہ باکرہ ہے یا ثیبہ، اگر وہ باکرہ بتلا دیں تو عورت کو راست گو سمجھ کر مرد کو علاج کے لیے اس صورت میں بھی مہلت دی جائے گی اور اگر وہ ثیبہ بتلا دیں یا کہ نکاح ہی ثیبہ سے ہوا تھا تو اس صورت میں مرد سے حلف لیا جائے گا کہ میں اس سے ہم بستر ہوا ہوں، اگر وہ اس پر حلف کرے تو عورت کا دعویٰ خارج ہو جائے گا اور اگر اس حلف سے انکار کرے تو پھر عورت کا دعویٰ صحیح قرار دے کر مرد کو علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے گی اور جن صورتوں میں ایک سال کی مہلت ملی ہے اس ایک سال گزرنے کے بعد اگر سکوت کرے تو حاکم دست اندازی نہ کرے گا اور اگر عورت پھر درخواست دے کہ یہ اب تک بھی ہم بستر نہیں ہوا تو قاضی پھر مرد سے دریافت کرے گا، اگر وہ اس دعویٰ کو صحیح مانے تو عورت

کو کہا جائے گا کہ اب تم کو اختیار دیا جاتا ہے خواہ اس کے ساتھ اسی حالت میں رہو یا تفریق کو اسی مجلس میں یعنی اجلاس برخاست ہونے سے پہلے اختیار کرو۔ اگر وہ تفریق کو اختیار کرے تو اس وقت قاضی مرد سے کہے کہ اس کو طلاق دیدو، اگر وہ طلاق نہ دے تو قاضی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں میں تفریق کردی بس اس سے بھی طلاق بائن واقع ہوگی اور اس میں پورا مہر اور عدت سب لازم ہے۔ لصحة خلوة مع العنة اور اگر مجلس میں اس نے تفریق کو اختیار نہ کیا تو پھر اختیار عورت کا باطل ہو جائے گا اور اگر اس دریافت کرنے پر وہ مرد اس عورت کی تکذیب کرے یعنی دعویٰ ہم بستری کا کرے تو پھر اس میں وہی تفصیل مذکور ہے کہ اگر وہ نکاح کے وقت باکرہ تھی تو اب ایک یا دو معتبر عورتوں کو دکھلایا جائے گا، اگر وہ اب بھی باکرہ بتلادیں تو اس عورت کا قول صحیح قرار دے کر مثل بالا اس کو اختیار تفریق کا دیا جائے گا اور مہر وعدت لازم ہوگی اور بصورت اس کے تفریق کو اختیار کرنے کے قاضی تفریق کردے گا اور اگر وہ ثیبہ بتلادیں یا کہ وہ نکاح کے وقت ہی ثیبہ تھی تو مرد اگر اپنے قول پر حلف کرلے تو عورت کا دعویٰ خارج ہو جائے گا اور اگر حلف سے انکار کرے تو پھر دعویٰ عورت کا صحیح قرار دے کر اس کو تفریق کا اختیار دیا جائے گا مع لزوم مہر وعدت اور یہ تمام تفصیل درمختار وردالمختار میں ہے۔

(38)

بعض ذاتی حالات کا ابتلا بھی عجب سبب رحمت بن گیا اور اسی کے ضمن میں حضرت سے مسائل کی خوب خوب تحقیق ہوگئی اور بعض کیا معنی، حکمت الٰہی تو بلا استثنا ہر ابتلا کے عقب میں ہوتی ہی ہے، یوں کہیے کہ بعض حالات ابتلا کے ضمن میں یہ حکمت الٰہی اپنے مشاہدہ میں بھی آگئی اور شاعر کی بات پوری ہو کر رہی کہ ؂

اسی تقریب اس گلی میں رہے ۔۔۔ منتیں ہیں شکستہ پائی کی!

ذیل کے دو خطوں کے فقہی مسائل اسی صورت حال کا نتیجہ ہے اور دوسرے مسائل کی اہمیت بجائے خود ظاہر و روشن ہے، پہلا عریضہ 21 جون 1930 کا ہے:

م۔ زوجہ مطلقہ سے متعلق یہ تصریح تو قرآن مجید ہی میں موجود ہے کہ زمانہ عدت میں انھیں

(نوٹ) ایک مسلمان جنٹ کے اجلاس میں اس کا ایک مقدمہ تھا ان کے پوچھنے پر یہ جواب لکھا تھا، اس لیے اس کی عبارت بہت صاف ہے۔

گھر سے نہ نکالو، نہ خود نکلیں، لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ بیوی اپنے مایکہ ہی میں تھی جب اسے طلاق ملی تو کیا اس صورت میں بھی شوہر اسے زمانہ عدت کے لیے بلا کر اپنے گھر میں رکھے؟

ا۔ اصلی قانون یہی ہے، لیکن ضرورت کے وقت اس میں تبدل بھی ممکن ہے اب وہ ضرورت دیکھنے کے قابل ہے، دلیل الاوّل مافی الہدایۃ۔ **لوزارت اھلھا وطلقھا زوجھا کان علیھا ان تعود الٰی منزلھا فتعتد فیه،** ودلیل الثانی مافی الغایۃ، **الا اذا اضطرت نحوان خافت سقوطه اویعارفیه علٰی نفسھا او مالھا او اخرجھا اھل المنزل بان کانت تسکن بکراء او کان زوجھا غائبا او لایقدر علی الاجرة.**

م۔ درآنحالیکہ عورت کو زیادہ آسائش اپنے مایکہ ہی میں ہے اور شوہر کے گھر آکر اپنے میں مزید مفاسد کا اندیشہ ہے۔

ا۔ مفاسد کا اندیشہ اگر وہ مفاسد معتد بہا ہوں عذر ہے۔

م۔ اگر شوہر ہی کے ہاں عدت گزارنا ہر صورت میں لازم ہو تو آیا یہ درست ہوگا، کہ مفاسد سے بچنے کے لیے شوہر بجائے اپنے ذاتی گھر کے اپنے کسی عزیز (مثلاً بھائی) کے مکان میں رکھ دے اور نفقہ بہرصورت خود ہی دیتا رہے۔

ا۔ یہ گھر شوہر کا گھر نہ ہوا۔ جب شوہر کے گھر میں رہنے سے اندیشہ ہے تو بھائی کا گھر اور عورت کا مایکہ برابر ہے۔

م۔ زحمت جناب کو اس لیے دے رہا ہوں کہ میری نظر سے یہ جزئیات فقہ کی کسی کتاب میں گزرے نہیں۔

ا۔ بلکہ رحمت دے رہے ہیں کہ بیان حکم کا اجر ملا۔

دوسرے عریضہ پر تاریخ 21 جولائی کی درج ہے:

م۔ گمراہ فرقوں کے بعض افراد کے متعلق ایک سوال دل کو بے چین کیے ہوئے ہے، بعض شیعہ حضرات ایسے دیکھنے میں آئے جو دیکھنے میں ہر طرح عبادت گزار بلکہ متقی وخاشع ہیں، اسی طرح ایک قادیانی کو جانتا ہوں جو اونچے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود نماز وتلاوت قرآن کے گویا عاشق ہیں اور گھنٹوں قال اللہ وقال الرسول کے مذاکرہ میں رہا کرتے ہیں، جب میں حج کو

روانہ ہونے لگا تو مجھ سے بڑے الحاح سے کہا کہ وہاں میرے حق میں دعا ضرور کیجیے گا، اگر میں گمراہی میں مبتلا ہوں تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نجات دے، سوال یہ ہے کہ ایسے اشخاص کا شرح صدر عقائد حقہ صحیحہ کے لیے کیوں نہیں ہو جاتا؟ اور کیا ان کا حشر بھی اہل عناد و اہل استکبار ہی کا سا ہوگا؟

ا۔ سوال کا حاصل یہ ہے کہ باوجود کوشش طلب حق کے حق کیوں نہیں واضح ہوتا اور اگر اس حالت میں بھی حق واضح نہ ہو تو ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، سو یہ سوال گو نازک ہے مگر جواب اس کا بھی ہے، لیکن جواب کا موقع اس وقت ہے جب یہ واقعہ اول ثابت ہو جائے کہ طلب حق کی کوشش کی گئی ہے، اگر کوئی بیمار ہو تو اس کے علاج کی کوشش صرف یہ نہیں ہے کہ تمنا اور دعا پر اکتفاء کرے، کوشش یہ ہے کہ اطبا سے ملے، روپیہ خرچ کرے، اس کا اندازہ کرے کہ کون طبیب حاذق ہے، اسی طرح یہاں ایسے شخص کو علما فریقین سے ملنا چاہیے، دونوں سے تحقیقات کر کے پھر اندازہ کرنا چاہئے کہ کون سی بات جی کو لگتی ہے اور ہر وقت اسی دھن میں رہنا چاہیے، اگر مل نہ سکے تو مکاتبت رکھے، ایک کی تقریر کا جواب دوسرے سے لینا چاہیے اور دعا بھی چاہیے، خصوص اگر اس شخص نے اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا ہو تو اس سے یہ بھی سوال ہوگا کہ جب تم کو اس جدید مذہب میں شرح صدر نہ تھا تو اس کو اختیار کیوں کیا، اس سابق ہی پر قائم رہ کر بطریق مذکور جستجو حق کی کرنا چاہیے جب یہ مرحلہ طے کرے تب اس سوال کا حق ہے۔

م۔ زوجہ مطلقہ اگر غصہ میں آ کر مہر بلکہ نفقہ عدت کی بھی رقم لینے سے انکار کر دے اور اس طرح کے الفاظ کہے کہ "مہر نہ معاف کروں گی نہ اس کا روپیہ لوں گی، یہ روپیہ آپ ہی کو مبارک رہے" تو ایسی صورت میں شوہر کیا کرے؟

ا۔ مہر اور نفقہ کی رقم خود یا کسی ثقہ عورت یا مرد کے واسطہ سے مطلقہ کے روبرو رکھ کر کہہ دے کہ فلاں شخص نے یہ رقم مہر اور نفقہ کی دی ہے اور دے کر فوراً وہاں سے علاحدہ ہو جائے، بس جب وہ قبضہ پر قادر ہو گئی اور دینے والے نے سب موانع مرتفع کر دیے، شرعاً ادا ہو گئی، خواہ وہ قبضہ کرے یا نہ کرے۔

م۔ ابھی خواجہ صاحب کی مناجات فریاد مجذوب موصول ہوئی، ماشاء اللہ بہت خوب ہے،

خاص کر آخر کے بعض اشعار حمد، لیکن سوچ یہ رہا ہوں کہ داد کس کو دوں، آیا بجلی کے جگمگاتے ہوئے قمقمہ کو، یا اس مخفی خزانہ کو جس نے ایک معمولی تار کو اتنا منور کر رکھا ہے۔

ا۔ مثل سوال سابق کے یہاں بھی اول یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جس کو خزانہ سمجھا ہے وہ خزانہ ہے بھی، اس وقت اس سوال کا موقع ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو خزانہ کنزاً مخفیا کو سمجھ کر اور مظہر اس تار و قمقمہ کو سمجھ کر حسب تفاوت مراتب داد دینا چاہیے۔

یہ ''خواجہ صاحب'' کی تلمیح تو سمجھ میں آ ہی گئی ہوگی، مراد خواجہ عزیز الحسن غوری، بی، اے (علیگ) سے ہے، مجذوب تخلص مولانا ہی کا عطا کیا ہوا تھا، واقعتاً بھی کچھ نیم مجذوب سے تھے مولانا کے خلیفۂ مجاز تو تھے ہی، مولانا کے عاشقوں کے بھی سرگروہ تھے، چہرہ بڑا نورانی، قلب نورانیت میں شاید اس سے بھی بڑھ کر، مدتوں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز رہے، آخر میں اس سے بھی بڑے عہدہ ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز پر فائز رہے، عرض یہ کیا گیا تھا کہ عارفانہ مضامین نظم کی داد انھیں دی جائے یا ان کے شیخ طریق، سر چشمۂ مضامین و معارف کو، جواب شاعرانہ انکسار اور عارفانہ حقیقت آموزی کے ساتھ یہ ملا کہ میرا سر چشمۂ معرفت ہونا ہی کہاں سے ثابت ہے، کنزاً مخفیا سے اشارہ صوفیوں کی مشہور حدیث قدسی کنت کنزا مخفیا الخ کی جانب ہے اور ارشاد یہ ہوا کہ بجلی کا ''خزانہ مخفی'': اسی حقیقی کنز مخفی کو سمجھو!

بعضا بعضا خط بالکل اپنا کچا چٹھا ہوتا تھا، آج انھیں نقل کرتے وقت حیرت سی ہوتی ہے کہ اس وقت حضرت کی خدمت میں سب کچھ کہہ ڈالنے کی جرأت اللہ نے کہاں سے دے دی تھی، ذیل کا معروضہ اور اس کا جواب دونوں اس اعتبار سے بڑے سبق آموز ہیں، خط تو حسب معمول ملخصاً نقل ہوگا اور جواب پورے کا پورا، خط پر تاریخ 6 اگست کی ہے:

''کبر کی مذمت اور اس کا علاج تو جناب کی تصانیف اور مواعظ میں جابجا کثرت سے ملا لیکن کبر کی حقیقت کبھی نظر سے گزرنا یاد نہیں پڑتی (1)۔

ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میری ہی طرح بیشمار اور بندگان خدا بھی اس میں مبتلا ہیں، وہ یہ کہ غلطی کو غلطی سمجھ لینے کے باوجود بھی طبیعت اس کے پورے تدارک پر آمادہ نہیں ہوتی، حقوق العباد میں تو اس کا تجربہ ہر روز ہوتا رہتا ہے، ملازم پر بیجا سختی بارہا کر گزرا ہوں، کچھ دیر

بعد نادم ہوا، سمجھا کہ برا کیا، اپنے او پر نفریں کی، آئندہ کے لیے احتیاط کا بھی دل میں عہد کیا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ اسے خوش کرنے کے لیے کچھ دے دلا دیا۔ اللہ کے سامنے توبہ واستغفار بھی کر لیا، لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ خود اس ملازم سے اپنے قصور کی معافی مانگ لیتا اور ایک ملازم ہی غریب پر کیا موقوف ہے، عزیزوں دوستوں سے بھی معافی مانگتے طبیعت رک جاتی ہے، حد یہ ہے کہ خود والدہ ماجدہ سے صراحت کے ساتھ معافی مانگنے کی توفیق نہ ہوئی، حالانکہ خدا جانے کتنے قصور ان کے کر چکا ہوں اور آج تک کرتا آرہا ہوں۔

عقلاً بھی کوئی امر اس میں مانع نہیں پاتا، بس ایک نفس ہی اس پر آمادہ نہیں ہوتا، دوسروں کو اس کے منافع وفضائل بتادوں، دوسروں کو ترغیب دے کر اس پر آمادہ کر دوں، بس اپنے ہی کو عمل کی توفیق نہیں ہوتی، یہ آخر کیا ہے، ؟نفس کا کبر ہے یا کچھ اور، والدہ ماجدہ کے مقابلہ میں تو ظاہر ہے کہ ادنیٰ تخیل بھی اپنی بڑائی کا نہیں رکھتا، ان کی فرمانبرداری اپنے لیے انتہائی سعادت سمجھتا ہوں، اس پر بھی یہ کیا شامت ہے کہ عملاً ان کے آگے نہیں جھکا جاتا، اپنی لڑکیوں پر تاکید رکھتا ہوں کہ برابر ان کی خدمت کرتی رہیں، لیکن جب خود ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں تو یہ نہیں ہوتا کہ ان کے پیر دابنے لگوں یا پنکھا جھلنے لگوں، الٹے وہ خود ہی میرے پنکھا جھلنا شروع کر دیتی ہیں، دل میں خفیف ہو کر انھیں روکتا ہوں، جب بھی وہ نہیں مانتیں، اکثر یہی الجھن رہتی ہے کہ آخر میرا انجام کیا ہونا ہے، اللہ کے ہاں محض جاننا یا دوسروں کو بتادینا کیا کام آئے گا، خود ان سطور کی تحریر کے وقت استحضار آخرت سے آنسو بہ رہے ہیں، لیکن عمل کا معاملہ جوں کا توں(2)۔

امراض نفس پر متفرق طور پر تو جناب نے بہت کچھ تحریر فرمادیا ہے، جی چاہتا ہے کہ احیاء علوم الدین کے جز ومہلکات کی طرح آپ کے قلم سے اس مبحث پر کوئی مستقل کتاب ہوتی(3)۔

گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں، کہتی ہیں کہ تھانہ بھون کے قیام کے بعد سے حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا تصور اکثر غالب رہتا ہے، خواب میں بھی دو ایک بار زیارت ہو چکی ہے(4)''

یہ حافظ صاحبؒ مولانا کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے رفیق اور پیر بھائی تھے، ہنگامہ 1857 میں بندوق کی گولی سے شہید ہوئے، تھانہ بھون ہی میں مدفون ہیں، مولانا کے مواعظ میں ان کا ذکر کثرت سے ملے گا، روزانہ مجلسوں میں بھی اکثر ان کا ذکر خیر رہتا۔

(39)

جواب حسب معمول نمبروار ملاحظہ ہو:

(1) ''ممکن ہے نہ لکھی ہو، اگر یہ صحیح ہے تو وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حقیقت اس کی ظاہر ہے کہ اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھنا ہے، آگے اس میں دو درجے ہیں، ایک بلا اختیار خیال بڑائی کا آنا، اور ایک باختیار ایسا خیال کرنا، پھر اول میں دو درجے ہیں، اس خیال کے مقتضا پر عمل نہ کرنا پس یہ تو بالکل مذموم نہیں، دوسرا عمل کرنا یہ مذموم ومعصیت ہے، اسی طرح قصداً بڑا سمجھنا بھی علی الاطلاق مذموم ہے گو اس کے مقتضا پر عمل بھی نہ ہو۔

(2) آپ نے جس غلطی میں ابتلا عام لکھا ہے، صحیح ہے، مگر اس میں قدرے تفصیل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ سے معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہوکر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شرمندہ ہوگا اور یہ اس وقت تک عذر ہے جب تک اس سے تعلق رکھنا چاہیں، ان صورتوں میں تو صرف اس کا خوش کردینا امید ہے کہ قائم مقام معافی کے ہوجائے گا اور بعض اوقات اس سے تعلق ہی رکھنا نہیں جیسے ملازم کو موقوف کردیا یا وہ خود چھوڑ کر جانے لگا، اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہوجانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے کیونکہ یہاں دونوں عذر نہیں۔ اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور کبر ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضا پر عمل تو ہوا، تو غایت سے غایت کبر اعتقادی نہ ہوگا مگر کبر عملی ضرور ہی ہے، اور اگر کوئی کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، تو اگر کبر کا گناہ نہ ہوا ظلم کا تو ہوا، میرے خیال میں خط کے سب شقوں کا جواب اس میں فیصلہ آچکا، اگر انطباق میں کچھ تردد رہے، پھر تحریر فرمائیں۔

(3) حضرت اب نہ دل ہے نہ دماغ، ہر چیز میں طبیعت اختصار کو ڈھونڈتی ہے، خصوص جب کہ حضرت امام غزالیؒ کبر پر کافی بحث کرچکے ہیں، مجھ کو پہلے سے یہ خیال آتا تو میں اسی کا حوالہ دے دیتا، اتنا بھی نہ لکھتا۔

(4) مجھ کو اس باب میں بہت تنگی ہے، میں مشکل سے کسی تصور یا کسی خواب کو کسی باطنی سبب سے مسبب سمجھتا ہوں، یہ تصرفات اکثر متخیلہ کے ہوتے ہیں، لیکن احتمالاً اگر یہ کسی باطنی سبب سے

مسبب ہے تو وہ سب روحانی مناسبت ہے جس کی کنہ معلوم ہونا ضروری نہیں، البتہ نتیجہ اس کا خاص فیوض و برکات کا حاصل ہوتا ہے، اللھم ارزقھا.

حضرت کے ہاں خواب، کشف وغیرہ کی ایسی ہی بے وقعتی تھی، حالانکہ دوسرے آستانے ان ہی چیزوں کو گویا اصل مقصود بنائے ہوئے ہیں۔

یہ مکتوب گرامی محض میرے عریضہ کا جواب ہی نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل تھا۔ بالکل خانگی معاملے اب پھر شروع ہوتے ہیں۔ جن صاحبہ کو میں نے آخری علاج کے طور پر (نہ کہ بطور سزا یا انتقام کے) طلاق دے دی تھی اور طلاق نامہ بڑے ٹھنڈے اور نرم الفاظ میں لکھ بھیجا تھا اور بحمد اللہ ادائے مہر ونفقہ واجبہ وغیرہ سے زائد ہی کا انتظام ہنسی خوشی کر لیا تھا، ان بیچاری کی طرف سے ان کے بعض نافہم عزیزوں کی لکھی ہوئی ایک بڑی لمبی تحریر حضرت کے پاس پہنچی، جس میں اس سیہ کار پر اتہام ہی اتہام تھے، اب سنیئے کہ حضرت نے اس تحریر سے کیا اثر لیا اور اس کے اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اور یہی بات تو دنیا کے بتانے کی ہے۔

لفافہ کے اندر سے اب کی ایک چھوٹا سا الگ پرچہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا، علاوہ اس اتہام نامہ کے جو مولانا کے پاس بھیجا گیا تھا، برآمد ہوا، پرزہ کا عنوان تھا ''جسارت'' پوری نقل ملاحظہ ہو۔

''جسارت''

اگر خلاف مذاق ہو معاف فرمائیں، میں جو دوسرا پرچہ رکھتا ہوں نیت اس میں حاجت مند کی حاجت پہنچانے کی ہے، اس کو کسی مناسب شکل میں پورا کرنا یہ اپنی مصلحت پر ہے، اس کو جسارت اس لیے کہا کہ شاید واقعۂ تفریق کا مجھ پر ظاہر ہونا گراں ہو لیکن اگر مجھ پر ظاہر نہ ہوتا تب تو کبھی آپ سے بھی نہ پوچھتا، اس گرانی کے احتمال کی رعایت کرتا، لیکن ظاہر ہونے کے بعد اب یہ مجھ پر گراں ہے کہ مجھ پر ظاہر ہو جاتا آپ پر ظاہر نہ ہو، یہ حقوق تعلقات کے خلاف ہے، مگر اس اول احتمال پر میں اس کو جسارت سمجھتا ہوں اور عذر مذکور کے سبب قابل معافی سمجھتا ہوں، اس پرچہ کا میں نے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ ممکن ہے آپ کی مصلحت کے خلاف ہوتا، میں اس سے زیادہ دخل دینا نہیں چاہتا کہ افتراق کی صورت میں اگر ان کے گزارہ کے لیے کچھ مقرر کرنا سہل ہو دریغ نہ کیا جائے اور ان کو تسلی کے ساتھ اطلاع بھی دے دی جائے، آئندہ جو مصلحت ہو''۔

یہ تھا ان بزرگ کا اندازِ تحریر اپنے ہر طرح کے ایک خورد کے نام! کتنے مختلف اور کیسے کیسے باریک پہلوؤں کی رعایت! یہی ادائیں تو تھیں، جنھوں نے حکیم الامت کو حکیم الامت بنادیا تھا، محض رسمی درویشوں کے ہاں، خالی ذاکروں شاغلوں کے ہاں کہیں بھی یہ حقائق ملیں گے؟ ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
تم سے جہاں میں لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

اس کے بعد کا مکتوب 17 اگست کا ہے، اسی درمیان میں ایک اور واسطہ سے خبر ملی کہ حضرت کی چھوٹی بیوی صاحبہ اپنی صاحبزادی (یعنی حضرت کی ربیبہ) کا علاج کرانے لکھنؤ تشریف لائی تھیں، بڑی حسرت ہوئی، اطلاع ذرا قبل سے ہو جاتی تو میرے گھر میں ان سے ملنے لکھنؤ ضرور چلی جاتیں، انھیں تھانہ بھون کے قیام میں ان سے اچھی خاصی نیازمندی حاصل ہو چکی تھی، اب کی عریضہ میں اس کا ذکر بھی بصورت شکایت ناگزیر سا تھا اور اب کی نیاز نامہ ایک پہلو سے شکایت نامہ تھا، ملاحظہ ہو:

''والا نامہ نے سرفراز کیا، کبر کی حقیقت کا مجمل بیان بھی حسب معمول جامع و مانع ثابت ہوا اور میرے سوالات کے حل کے لیے کافی جزاک اللہ (1)۔

زوجۂ مطلقہ کی طرف سے جو خط جناب کی خدمت میں پہنچا، اس پر کیا عرض کروں، حیف ہے کہ لوگ بزرگوں کی خدمت میں اپنا دردِ دل کہتے وقت بھی بڑی ہی بڑی غلط بیانیوں اور مکر و تلبیس سے ذرا نہیں چوکتے، جواب میں میرا کچھ عرض کرنا بلا ضرورت بھی ہے اور جناب کے وقت عزیز کے لیے خواہ مخواہ باعث تضییع ...... اب فقہی مسئلہ یہ ارشاد ہو کہ مطلقہ کی طرف سے بصورت انکار رقوم مہر و نفقہ کی بابت شوہر کب تک انتظار کرتا رہے، آیا ختم عدت تک یا اس کے بعد بھی (2)؟

ایک صاحب سے بالواسطہ یہ روایت پہنچی کہ رشیدہ سلمہا کی والدہ ماجدہ انھیں بغرض علاج لے کر حال میں لکھنؤ آئی ہوئی تھیں اور کچھ عرصہ تک قیام پذیر رہیں، یہ اگر صحیح ہے تو غالباً مجھے نیازمندانہ شکایت کا حق پہنچتا ہے، اگر اس کی خبر ذرا قبل سے مل جاتی تو گھر میں لکھنؤ جا کر موصوفہ سے ضرور مل آتیں۔ لکھنؤ برابر آمد و رفت رہا ہی کرتی ہے، ایسے موقعے ہر روز کہاں نصیب ہوتے ہیں (3)۔

جواب آیا، اوران ہی ''خشک'' مولانا تھانوی کا آیا:

(1) آپ کو پسند آئی اس سے مسرور ہوا۔

(2) جورقم شرعاً واجب ہے وہ بدوں معاف کیے معاف تو ہو نہیں سکتی، تو اس صورت میں دینا ضروری ہوگا، لیکن جب وہ نہیں لیتیں تو کیا صورت ادا کی ہو، وہ صورت یہ ہے کہ رقم واجب کسی کے ذریعہ ان کے روبرو اس طرح رکھ دی جائے کہ اس پر قبضہ کرنا ان کو ممکن ہو اور رکھ کر وہاں سے جدا ہو جائیں، شرعاً وہ ادا ہو جائے گی، پھر اگر نہ اٹھایا اور وہ ضائع ہوگئی تو ان کی ضائع ہوگی اس سے شرعی برأت تو ہوگئی، باقی قانونی سو وکلا سے مشورہ لے لیا جائے۔

(3) میں تو اس شکایت کو نیاز مندانہ قرار دے کر محظوظ ہوں، واقعی میرا ذہن اس طرف اس لیے نہیں گیا کہ دریاباد اور لکھنؤ کا فاصلہ مجھ کو معلوم نہ تھا، وہ ابھی لکھنؤ سے نہیں آئیں، خواجہ صاحب سے مدت قیام پوچھ کر حال معلوم ہو سکتا ہے، اگر گھر میں تکلیف فرما کر مل لیں گی تو ملیں گی وہ اور مسرور ہوں گا میں''۔

اس آخری فقرہ کی لطافت کیا اردو کے نامور شاعر و ادیب غالب کے لطیف فقروں سے کچھ کم ہے؟

اسی مکتوب کے ساتھ خواجہ صاحب کا پتہ بھی ایک لفافہ پر حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا موصول ہوا، خواجہ صاحب سے یوں بھی تعلقات قائم تھے، اسی وقت ان کے نام لکھنؤ خط پہنچا، مجذوب آخر مجذوب تھے، دن پر دن گزر گئے اور خط کا جواب نہ آیا، ستمبر کی کوئی تاریخ تھی جب مولانا کو اس ظلم کی شکایت لکھنی پڑی، جواب کارڈ پر حسب ذیل آیا:

''خواجہ صاحب کی تاخیر جواب اخلاقی غلطی ہے لیکن اس سے کوئی مضرت نہیں ہوئی، اس لیے کہ میں نے جناب کو ان کے لکھنؤ ہونے کی اطلاع دی تھی، اسی کے متصل بعد ان کا خط کانپور سے آگیا تھا کہ سب کانپور آگئے، اگر خواجہ صاحب فوراً ہی جواب دیتے، تب بھی آپ کے پاس ایسے وقت پہنچتا کہ وہ لکھنؤ نہ ہوتیں اور غالباً اسی نتیجہ کے خیال سے انھوں نے جواب میں عجلت ضروری نہ سمجھی ہو، بہر حال بقول جناب کے ظلم ضرور ہوا، مگر اس ظلم کا گناہ کسی کو نہیں ہوا، سب معذور تھے، اللہ تعالیٰ خیریت رکھے اور آپ دونوں صاحب ہم لوگوں کو ملاقات سے مسرور فرما کر

احسن الیٰ ما اساء کا اجر حاصل کریں، ہم کو بھی فخر کا موقع ملے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے ایسے احباب دیے ہیں کہ کوتاہیوں کے عوض میں کرم کرتے ہیں، عزیزہ دوائیں استعمال کر رہی ہیں، قلب و دماغ پر اچھا اثر بتلاتی ہیں، جس سے امید شفا ہے، خواجہ صاحب مجذوب ہیں معذور ہیں"۔

اس سے بہتر، اس سے زیادہ شگفتہ، اس سے زیادہ حکیمانہ کوئی معذرت نامہ ہو سکتا تھا؟

بار بار عرض کیا جا چکا ہے اور ایک بار پھر بے ساختہ عرض ہے کہ حضرت کے ولی اللہ ہونے کی شہادت تو کوئی ولی اللہ ہی دے سکتا ہے، یہاں تو حضرت کی روزمرہ کی معاشری، ذاتی، زندگی ہی پر دل فدا ہوتا رہا۔

(40)

سچ (ہفتہ وار) لکھنؤ سے اپنی ادارت میں کئی سال سے نکل رہا تھا۔ براہ راست سیاسی مضامین بہت کم ہوتے، مضامین عموماً علمی اور سب سے زیادہ کلامی رنگ کے ہوا کرتے، لوگ خصوصاً انگریزی خوان نوجوان مذہبی عنوانات، پردہ، سود، تعدد ازواج وغیرہ سے متعلق اپنے شبہات وسوالات لکھ لکھ کر بھیجا کرتے اور ان کے جوابات نکلتے رہتے، مسئلہ جبر واختیار علم کلام میں ہمیشہ سے بڑا معرکۃ الآرا چلا آرہا ہے۔ اس پر بھی کئی بار سوالات آچکے تھے۔ آخر اس پر ایک بار، ایک میڈیکل کالج کے طالب علم کے استفسار کے جواب میں ایک طویل مضمون ذرا نئے عنوان سے سپرد قلم کیا، لکھنے والے بہت کچھ اس پر لکھ گئے ہیں، لیکن حق تعالیٰ کی دین کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اپنے کو چھپنے کے بعد ایسا نظر آیا کہ شاید انگریزی خوانوں کے حق میں یہ خاص طور سے مفید اور شبہات کا قاطع ہو، پھر بعد کو خیال آیا کہ حضرت کی نظر اصلاح اگر اس پر ہو جائے تو کیا کہنا۔ خود اس مضمون کی تحریر بھی بہت کچھ مولانا ہی کے افادات قلم کی ممنون تھی، تاہم اپنے کسی مضمون کو مولانا کی خدمت میں پیش کرنے کی ہمت مشکل ہی سے ہوتی تھی۔ اس خاص مضمون کو، کئی دن کے حیص بیص کے بعد بالآخر روانہ کر ہی دیا، دل میں خیال یہ آتا رہا۔

بنمائے بہ صاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نہ تواں گشت بہ تصدیق خرے چند!

جواب تنقیدی رنگ کا آیا۔ پورا شرح صدر اس سے ہوا یا نہیں، یہ الگ سوال ہے، بہر حال

بصیرت تو بہت کچھ ہو ہی گئی۔ اصل مضمون تو ضمیمہ میں درج ملے گا، یہاں عریضہ مورخہ 11 ستمبر مع جواب حاضر ہے:

م۔ اپنی ایک ناچیز تحریر جو ایک اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ سائل کے جواب میں ہے، حاضر خدمت کر رہا ہوں، از راہ شفقت و نوازش کچھ وقت نکال کر اس پر ایک نظر فرمالی جائے۔

ا۔ میں مستفید ہوا۔

م۔ اور جو اسقام خیال مبارک میں آئیں ان سے مطلع فرمادیا جائے۔

ا۔ میں بیچارہ اسقام کیا نکالتا مگر امتثال امر کردیا۔ زصاف وررد پیش آرانچہ داری پر عمل کرلیا۔

مجموعہ مکتوبات محفوظ میں اس کے معا بعد عریضہ مورخہ 24 ستمبر ملتا ہے۔ سلوک وفقہ کے دو سوالوں کا جامع:

م۔ صوفیا کے ہاں ایک اصطلاح "نسبت" ہے۔ آپ کے مواعظ وتصانیف میں بھی بار بار یہ لفظ آیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے۔

ا۔ نسبت کے اصطلاحی معنی وہی ہیں جو لغوی معنی ہیں، یعنی تعلق یا لگاؤ۔ اتنا فرق ہے کہ لغوی معنی مطلق ہیں کسی کا تعلق کسی سے ہو اور اصطلاحی معنی مقید ہیں۔ یعنی عبد کا تعلق حضرت حق سے اور یہ تعلق دو قسم سے ہے۔ ایک عام جو ہر مومن کو ہے اور یہ دلالت عامہ ہے۔ اللہ ولی الذین آمنوا میں اسی کا ذکر ہے اور ایک خاص جو مخصوص ہے اولیاء اللہ کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق جس کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں کثرت ذکر ودوام طاعت، یعنی یہ دو چیزیں مثل امر طبعی کے ہو جائیں اور اس کے صلہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے تعلق رضا کا ہو۔ ان دونوں تعلق کے مجموعہ کا نام نسبت ہے اصطلاح میں۔

م۔ اور اس کی شناخت کیا ہے کہ فلاں شخص صاحب نسبت ہے۔

ا۔ اس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ کثرت ذکر ودوام طاعت کی رغبت پیدا ہو۔

م۔ ایک شخص ایک زن منکوحہ سے حرام کاری کا مرتکب ہو گیا تھا۔ وہ عورت اور اس کا شوہر دونوں وفات پاچکے ہیں۔ اب یہ شخص نہایت درجہ نادم ومنفعل ہے لیکن اب کفارہ کی صورت بجز

توبہ واستغفار کے اور کیا ممکن ہے۔

ا۔ اصل تدارک توبہ واستغفار ہی ہے اور اس کی تکمیل اس عورت کے شوہر کے لیے دعائے مغفرت اور تصدق بالمال کہ غضب ربانی کا بجھانے والا ہے۔

آج آپ کے بڑے بھائی صاحب بھی سہارنپور سے تشریف لائے۔ اس وقت تین بجے واپس تشریف لے گئے ہیں، میں نے آپ کا خط بھی دکھلا دیا تھا''۔

یہ بھائی صاحب اُس وقت سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، کئی سال تک وہیں رہے اور وقتاً فوقتاً مولانا کے پاس تھانہ بھون بھی حاضری دیتے رہتے۔ حضرت بھی ان پر خاص لطف وکرم رکھتے۔ حضرت کے ہاں دنیوی حکام، رؤسا، عہدہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رہتا تھا یعنی نہ ان لوگوں کی طرف گرنا (جیسا کہ بعض مشہور آستانوں اور خانقاہوں میں دستور سا پڑ گیا ہے) اور نہ ان سے اپنے کو بالکل کھینچے رکھنا، جیسا کہ بعض غیر محقق مشائخ نے تقویٰ و درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے۔

اکتوبر کا آخری عشرہ تھا، جب ایک طویل قیام کے لیے مع زنانہ سفر تھانہ بھون کا ارادہ کیا، جہاں کئی مہینے حاضری کو ہو جاتے تھے، طبیعت میں شدید تقاضا پیدا ہو جاتا تھا اور حسب معمول کئی ہفتے قبل عرض بھی کر دیا کہ مکان کا ٹھیک ٹھاک ہو رہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ نیاز فتح پوری کے ماہنامہ نگار کی سخت ملحدانہ اور مسلم آزار روش کے مقابلہ میں سچ کو بڑی قوت واہتمام کے ساتھ میدان میں آنا پڑا تھا اور مہینوں یہ معرکہ جاری رہا تھا۔ سچ کی غل وپکار سے بحمد اللہ سارا اسلامی پریس بیدار ہو گیا تھا اور ملت بھر میں کہنا چاہیے کہ آگ سی لگ گئی تھی۔ اطلاعی عریضہ کا جواب کارڈ پر حسب ذیل ملا:

''وعدۂ قدوم کی مسرت میں بجز اس کے کیا عرض کروں، کرم نما وفرود آ کہ خانہ خانہ تست۔ مکان فی الحال کوئی ذہن میں نہیں۔ میرے رہنے کے دو مسکن ہیں۔ ایک میں والدۂ رشیدہ ہیں۔ ایک میں مولوی جلیل احمد۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ سعی کروں گا جس میں کامیابی کی امید ہے۔ لیکن چونکہ مردانہ کے رہنے اور زنانہ کے رہنے میں ضروریات میں کسی قدرت اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تنہا تشریف آوری ہوگی یا مع گھر کے لوگوں کے۔ تو غالباً تجویز مکان میں سہولت ہوتی۔

نیاز کے مقابلہ میں جو قلمی خدمت دین کی کی گئی ہے وہ جہاد ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا کیا۔

مولوی حبیب احمد بھی باوجود بعض امور میں شدید رائے رکھنے کے بیحد مسرور و مداح تھے خود مجھ سے اپنی اس کیفیت کو ظاہر کیا اس وقت گھر چلے گئے ہیں اور غالباً پورے نومبر گھر رہیں۔ علالت کے سبب تبدیل آب وہوا کی غرض سے گئے ہیں۔ والسلام''

مکان کا انتظام چند ہی روز میں ہوگیا اور جس کارڈ پر مولوی شبیر علی صاحب (حضرت کے بھتیجے اور کارکن) کی ڈالی ہوئی تاریخ 27 اکتوبر ہے۔ حسب ذیل موصول ہوا:

''اس روز سے مکان ہی کی فکر میں رہا، خدا خدا کر کے آج مکان موقع کا ملا جس کو شبیر علی ابھی دیکھ کر آئے ہیں اور اس کی کیفیت پشت پر لکھ رہے ہیں۔ اس خوف سے کہ کسی اور کو نہ دے دیں ابھی سے کرایہ پر لے لیا ہے۔ جہاں شبیر علی رہتے ہیں، اسی کے قریب یہ مکان ہے۔ میرے دونوں گھروں سے کچھ دور ہے۔ پہلا مکان مالک نے اپنے ایک عزیز کو دے رکھا ہے۔ تاخیر جواب سے طبعاً خجلت ہے، گو عقلاً معذوری ہے''۔

وطن سے روانگی حسب ارادہ شروع نومبر میں ہوئی لیکن سہارنپور پہنچا تو بھائی صاحب کی طبیعت زیادہ خراب پائی۔ جاڑوں میں ہمیشہ ہی دمہ کے دورے انھیں سخت پڑتے رہتے ہیں، اب کی اور زیادتی پائی۔ اس حال میں بن نہ پڑا کہ انھیں اس حال میں چھوڑ فوراً تھانہ بھون روانہ ہوں۔ والدۂ ماجدہ کی یہ رائے تو تھی ہی، خود مولانا کا بھی مذاق طبیعت یہی تھا اور اس باب میں دوسرے مشائخ کے لیے ایک بڑا نمونہ موجود ہے۔ تاریخ وقت مقرر پر تھانہ بھون نہ پہنچ سکا اور معذرت نامہ حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجا اور جواب یہ مرحمت ہوا۔

''الطاف نامہ عین انتظار میں پہنچا۔ جس سے بجائے انتظار کے جناب بھائی صاحب کی ناسازئ مزاج سے انتشار پیدا ہوگیا۔ اللہ صحت کاملہ عاجلہ بخشے۔ آپ کی تو خود یہی رائے ہونا چاہیے مگر میں بھی ادائے حق کے لیے یہ عرض کرتا ہوں کہ جب تک ممدوح عافاہم اللہ تعالیٰ کی کیفیت طبیعت کی قابل اطمینان نہ ہوجائے سفر میں عجلت نہ فرمائی جائے۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام۔

ایک تکلیف دی جاتی ہے۔ برخورداری رشیدہ تپ ولرزہ میں مبتلا ہے۔ طبیب کی اجازت

سے کیلے کی پھلی کی رغبت ظاہر کرتی ہے۔ایک درجن خرید کر لیتے آئیں۔مگر قیمت قبول کرنا پڑے گی اس میں تکلف منظور نہ ہوگا۔

بخدمت جناب ڈپٹی صاحب۔اگر مولوی عبدالماجد تشریف نہ رکھتے ہوں تو جناب کو بھی تکلیف دیتا ہوں ۔ ایک درجن پھلیاں خرید کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مولوی ولی محمد گورداسپوری کے پاس مع اس کارڈ کے کسی نوکر کے ہاتھ بھجوادیجیے وہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ یہاں بھیج دیں گے''۔

یہ کارڈ 5 نومبر کو ملا۔ بھائی صاحب کی طبیعت ٹھیک ہوگئی اور میں دو ہی ایک روز بعد تھانہ بھون حاضر خدمت ہوگیا۔

(41)

تھانہ بھون پرانا قصبہ ہے۔مکانات پرانی وضع کے عالیشان اوراونچے اونچے، پرانی لکھوری اینٹوں کے بنے ہوئے، مکینوں سے تقریباً خالی بنے ہوئے۔ان کے پھاٹک علی الخصوص شان دار ان ہی میں سے ایک مکان لب سڑک اب کی بھی ملا۔سڑکیں قصبہ کے اندر کھنجو کی بنی ہوئیں۔ برسات میں گویا نا قابل گزر۔ یہ مکان خانقاہ اور مولانا کے مسکن کے وسط میں تھا اور خانقاہ سے مولانا کے مسکن کا فاصلہ کہیں اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کا تھا۔مشہور یہ تھا کہ اس مکان کے کوٹھے پر کوئی جن رہتے ہیں اور یہی شہرت قصبہ کے بعض اور پرانے مکانوں سے متعلق بھی تھی۔ جنات کے قصے سن سن کر شوق بارہا ہوا کہ کبھی کسی سے ملاقات ہوجائے یہ کبھی آرزو پوری نہ ہوئی۔اس ''جنات زدہ'' مکان میں قیام خاصے عرصہ تک رہا۔ یہاں بھی یہ شوق پورا نہ ہو پایا۔ معمولات اب کی بھی کئی ہفتہ کے قیام میں وہی رہے، جو ہمیشہ رہتے تھے۔ پانچوں وقت کی نماز خانقاہ کی مسجد میں مولانا کی امامت میں، جو بجائے خود ایک ایسی لذیذ نعمت تھی، جس کے لیے حق تھا کہ تھانہ بھون تک کا سفر اختیار کیا جائے،خصوصاً فجر اور عشا کی جہری نمازیں اوران میں بھی اخص، نماز فجر اوراس میں مولانا کی وہ نہایت دلکش لحن اور جاذب قلب قرأت،نو اور دس کے درمیان سے گھنٹہ سوا گھنٹہ کے لیے مجلس خاص میں باریابی اور بعد ظہر دو سوا دو گھنٹہ کے لیے مجلس عام میں حاضری۔ پھر کبھی بطور استثنا بعد مغرب یا بعد عشا بھی چند منٹ کی حضوری، باقی وقت اپنا اوراس میں

سچ کے لیے ترتیب مضامین، مطالعۂ کتب واخبارات ورسائل "برکات" کا نور اور "انوار" کا ظہور ایک وجدانی مشاہدہ ہے۔ کوئی دوسروں کی آنکھیں چیر کر کیسے دکھاوے:

مجلس خاص کی اصطلاح تو ذہن میں ہوگی۔ مولانا کے ہاں مجلس کا وقت وہی ایک ہوتا تھا ظہر کے بعد سے عصر تک۔ 1929 میں جب سے اس نامہ سیاہ کی حاضری ہونے لگی از راہ کرم خاص وشفقت مخصوص کچھ وقت بعد چاشت مرحمت فرمایا گیا اور اس میں مخصوص مہمانوں کو شرکت کی اجازت ملنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ مجلس بھی مستقل قرار پا گئی۔ یہاں کہنے بلکہ شاید دہرانے کی بات یہ ہے کہ اس عنایت خاصہ کے باوجود یہ کبھی اتفاق سے بھی نہ ہوتا کہ مولانا اس وقت مجھے بلا بھیجتے یا میں خود ہی لپکا ہوا چلا آتا بلکہ ہر روز یہ ہوتا کہ اس وقت صرف یہ کہلا بھیجتے کہ "اب میں فارغ ہوں، جی چاہے تو آجایئے" اور بار بار فرماتے کہ "اگر کسی روز جی نہ چاہے یا کسی دوسری مشغولیت در پیش ہو تو ہرگز نہ آیئے بلکہ صاف عذر کہلا بھیجے جب ہی میں سمجھوں گا کہ آپ آزادی اور بے تکلفی سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ مجھے شبہ تکلف کا رہے گا"۔ اللہ اللہ کیا ٹھکانا ان معاشری ومجلسی نکتہ سنجیوں ودقیقہ شناسیوں کا ہے۔ باتیں وہی رہتیں، جو ان کے سے حکیم ومصلح شفیق کے شایان شان تھیں۔ اکثر اپنے بزرگوں، استادوں کے قصے اور حکایتیں نقل کرتے اور ان ہی کے ضمن میں سب کچھ کہہ جاتے۔ حدیث پر تو کم تفسیر پر گفتگو نسبتاً زیادہ رہتی اور ان دونوں سے کہیں بڑھ کر فقہ اور تصوف کے موضوع چلتے رہتے۔ صحیح تصوف وسلوک کی حقیقت اپنی فہم ناقص کے مطابق تھوڑی بہت جو کچھ بھی سمجھ میں آئی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنا زیادہ دخل ان ہی مجالس اشرفی کو ہے اور اہل فقہ کی طرف سے جو بغض دل میں مدت سے بیٹھا ہوا اور خود علم فقہ کی جو حقارت اور بے وقعتی ذہن میں جمی ہوئی تھی، یہ سارا رنگ بحمد اللہ کہنا چاہیے کہ ان ہی صحبتوں کی برکت سے دور ہوا تھا۔ فقہا کی تحقیقات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور کنز، ہدایہ، فتح القدیر، درمختار، ردالمختار اور ان کی شرحوں اور حاشیوں اور مبسوط وغیرہ کے متن کی اوراق گردانی، الٹی سیدھی اور بے سمجھے بوجھے سہی جو کچھ بھی اپنے نصیب میں آئی سب اسی در کے فیض سے اور یہ ساری تعلیمات بالکل سادہ، بے تکلف، عام فہم، دلچسپ گفتگو کے ضمن میں ہوتی رہتیں۔ یہ پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ کچھ سکھایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی فارسی اور اردو شاعری کے تذکرے بھی چھڑ جاتے اور مولانائے روم، سعدی وحافظ کے علاوہ اکبر

الہ آبادی اور مجذوب کے کلام کا دور بھی چلنے لگتا۔

طویل قیام کے دوران میں اچھے اچھے اہل علم واہل طریق کی بھی زیارت کا شرف حاصل ہو جاتا۔ دیوبند، سہارنپور، دہلی کے اکابر تو اکثر ہی آتے رہتے۔ کبھی یہ کرتا کہ میں خود بھی جامعہ وغیرہ سے کسی کو بلا بھیجتا کہ میرے ہی بہانہ سے مولانا کی خدمت میں حاضری واستفادہ تو ہو جائے۔ چنانچہ اب کی جامعہ کے ایک سینئر اور بڑے ہونہار طالب علم مولوی رئیس احمد جعفری ندوی خیرآبادی کو بلایا جو آگے چل کر سیرت محمد علیؒ کے مصنف ہوئے اور اس وقت پاکستان میں ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ اس وقت مولانا کی طرف سے (ان کے بعض مریدوں کی مثالیں دیکھ کر) خاصے بدگمان وبدعقیدہ تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ یہاں بس تشدد ہی تشدد ہے۔ میری دعوت پر آئے اور دو ایک روز ٹھہر کر مولانا کی مجلسوں میں شریک ہوئے۔ پھر جو واپس گئے تو منتقد کے بجائے معتقد اور بدگمان کے بجائے مخلص ہو کر۔ اب اتنا حافظہ کمبخت کہاں سے لاؤں کہ 1931 کی تفصیلات وجزئیات 1948 میں دماغ کے خزانہ سے اگلنے لگوں اور اتنی سمجھ اس وقت کہاں نصیب تھی کہ اسی وقت مجلس اور گفتگوؤں کو قلمبند کرتا جاتا، یا یادداشتیں لکھتا جاتا۔ آہ وہ بیش قیمت ذخیرہ جو محض سہو، غفلت ونسیان کی نذر ہو گیا۔

شروع دسمبر کی کوئی تاریخ تھی جب واپسی کی اجازت چاہی اب کی زنانہ میں علاوہ بیوی اور بچیوں کے آخری چند روز میں والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ معظمہ کو بھی بلا لیا تھا اور وہ دونوں تہجد گزار بندیاں مولانا کے ارشادات سے خاص طور پر مستفید ہوتی رہی تھیں۔ سارے قافلہ کے ساتھ بجائے ریل کے لاری پر چلنے میں زیادہ سہولت نظر آئی۔ بھائی صاحب سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے ہی۔ بلا زحمت پوری لاری کا انتظام تھانہ بھون سے سہارنپور تک کے لیے ہو گیا۔ ایک راستہ گنگوہ ہو کر تھا، قصداً وہی اختیار کیا کہ مزار رشیدی پر بھی فاتحہ خوانی ہوتی چلے۔ خیر گھر پہنچ کر پہلا عریضہ حضرت کی خدمت میں 15 دسمبر کو لکھا:

''خط لکھنے کو بار بار جی چاہا، نوبت آج سے قبل نہ آسکی (1)۔ بڑا وقت فتنہ نگار کے سلسلہ میں صرف کرنا پڑ رہا ہے۔ ظالم نے زبردست اور جان توڑ پروپیگنڈہ کر کے بہت سے سادہ دل اور بھولے بھالے مسلمانوں کو بھی اپنا لیا ہے اور وہ لوگ الٹے مجھ سے اور مولوی ظفر الملک سے فرمائش

کرر ہے ہیں کہ کیوں خواہ مخواہ ایک شخص کے پیچھے پڑے ہو، جب وہ معافی مانگ رہا ہے تو قصہ ختم کرو خیر۔ انشاءاللہ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ(2)۔

بھائی صاحب کے خط آتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت گونسبتاً بحمداللہ بہتر ہے، پھر بھی قابل اطمینان نہیں (3) گھر کے لوگ، لڑکیاں وغیرہ وہیں سہارنپور میں ہیں، تنہا وطن آیا ہوا ہوں، فتنہ نگار کے سلسلہ میں جو کچھ کرنا ہے لکھنؤ ہی میں کرنا ہے۔ دل سے ساتھ دینے والے مولوی ظفر الملک اور دو ہی چار صاحب اور میں (4)۔ بھائی صاحب کے پاس بھی ان کی اس علالت کے زمانہ میں پہنچنا ضروری ہے۔ انشاءاللہ 10، 20 دن میں یہاں کے زیادہ ضروری کاموں سے فراغت پا کر وہیں پہنچوں گا اور ماہ مبارک کے آخر تک وہیں رہوں گا (5)۔ اور درمیان میں ایک آدھ روز کے لیے سرسری حاضری تھانہ بھون کی انشاءاللہ ہوگی (6)۔

پچھلے زمانہ حاضری کی ممنونیت کی داستان کہاں تک پھیلاؤں، البتہ اتنی شکر گزاریوں کے ساتھ ایک شکایت بھی ہے، اس کا اظہار ضروری ہے (7)۔ شکایت یہ ہے کہ اب کی جب حاضر ہوا تھا تو تاریخ و وقت حاضری صرف ظن غالب کے طور پر عرض کیا تھا لیکن جناب نے اسٹیشن تک زحمت فرمائی اور میں اس گاڑی سے پہنچنے سے معذور رہا۔ (چنانچہ معذرت نامہ پہلی ڈاک سے روانہ کر دیا تھا) اس کا علم مجھے ایک عرصہ کے بعد محض اتفاقاً مولوی محمد محمود صاحب (سابق سر دفتر دیوبند) سے ہوا (8)۔ اور دل کو بڑی ندامت و تکلیف ہوئی (9)۔ آئندہ کے لیے ادب کے ساتھ دست بستہ اس قسم کے اخلاق سے معافی چاہتا ہوں (10)۔ مجھے اس سے بجائے راحت کے تنگی ہوتی ہے اور اپنی آزادی میں فرق محسوس کرتا ہوں۔ اپنی آزادی کا بڑا حریص ہوں اور تھانہ بھون حاضر ہوتے ہی جو الگ مکان لے لیتا ہوں اس کا اصل محرک بھی یہی حرص آزادی ہے۔ اپنے شیخ کے بھی اس عمل سے مجھ پر بڑی گرانی ہوتی تھی، اور میری بڑی منت و سماجت کے بعد اب انھوں نے دیوبند اسٹیشن پر تشریف لانا چھوڑا ہے (11)۔

اس دو ہفتہ کے اندر کم از کم تین بار جناب کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا ہوں۔ عموماً مسجد ہی میں دیکھتا ہوں یا نماز پڑھتے ہوئے یا اس کے اہتمام میں۔ شب گزشتہ پھر مشرف ہوا۔ دیکھا کہ آپ ایک بڑی جماعت کے ساتھ مسجد کے اندر ہیں اور نماز کی تیاری ہو رہی ہے۔ میری

طرف التفات خاص ہے۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب کو بھی دیکھا (حالانکہ ان سے کبھی نہیں ملا ہوں) کہ وہ آپ سے متصل کھڑے ہیں اور آپ ان کے متعلق بہت ہی مدحیہ الفاظ فرما رہے ہیں، یہاں تک کہ یہ ارشاد فرمایا کہ ''بظاہر میں مرشد ہوں اور یہ مرید، لیکن حقیقتاً یہ علم اللہ ہی کو ہے کہ مرشد کون ہے اور مرید کون''۔ خواجہ صاحب کو بھی دیکھا (12)۔

تھانہ بھون سے لاری پر سہارنپور آتے قصداً گنگوہ کا راستہ اختیار کیا اور تلاش کر کے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مزار پر حاضری دی۔ ایک عجب خنک نورانیت اور سکینت قلب نے محسوس کی۔ سبحان اللہ۔ ہٹنے کو دل نہیں چاہتا تھا (13)۔

جواب کے ملاحظہ میں بھی زحمت انتظار کیوں اٹھایئے۔

(1) محبین کے سب واقعات میں حکمت ہوتی ہے، چنانچہ اشتیاق کا بڑھنا اس کی حکمت ہوئی۔

(2) جب محبین کے افعال میں حکمت ہے، محبوب المحبین کے تصرفات میں حکمت کیوں نہ ہوگی اس میں یہ حکمت ہوئی کہ آپ کا یہ جہاد جہاد خالص ہوگیا، حظ نفس کا حصہ بھی آخرت ہی کے لیے ذخیرہ ہوگیا۔

(3) یہاں بھی دردناک خط آیا تھا، دردمند دل سے دعا کرتا ہوں۔

(4) بارک اللہ تعالیٰ فیہم

(5) اللہ تعالیٰ اس قیام کو ان کے لیے مایۂ تسلی مسبب شفا فرمائے۔

(6) ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خرسند ست

(7) بہت ضروری۔ ع

بے شکایت نہیں اے ذوق، محبت کے مزے

مگر جیسے شکایت میں مجھ کو مزہ آیا امید ہے اس روایت کے (جو کہ ہمارے اس لطف کی) خلاف واقعہ ثابت ہونے سے آپ کو اس سے زیادہ مزہ آئے گا۔

(8) یہ ان کا اجتہاد تھا۔ نہ میں نے ان سے ظاہر کیا نہ واقع میں اس قصد سے گیا تھا۔ اس

وقت یہ تو مجھ کو یاد نہیں رہا کہ کیوں گیا تھا، مگر یہ یاد ہے کہ اس قصد سے نہیں گیا تھا، خاص کر جب اپنے دوست پر بار پڑنے کا احتمال ہو۔

(9) اس کے ذمہ دار سر دفتر صاحب ہیں، میں نہیں۔

(10) میں تو واقعی آپ کے دست بستہ ہونے سے پہلے ہی پابستہ ہوں، میں کبھی تکلیف دینا نہیں چاہتا، اطمینان فرمائیں۔

(11) میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آزادی کا احرص ہوں، اپنے لیے بھی دوستوں کے لیے بھی اور مولانا کی سی تواضع مجھ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے مجھ پر اس کا احتمال بھی نہ فرمائیں۔ اگر کبھی دل چاہے گا تو آپ کی اجازت کے بعد ایسا کر سکتا ہوں اور اجازت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

(12) صلحا کی زیارت مبارک ہو۔ خیر مجھ کو تو نصیب نہیں ہوتی، مگر آپ نے مجھ کو شریک زیارت دیکھا، یہ بھی نعمت ہے۔

(13) مبارک ہو۔ اب تو غالباً جوش پر اس کو راجح فرمائیں گے''۔

(42)

1931 اب ختم ہو رہا تھا، لیکن ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اپنے ایک عزیز دوست اور محترم کرما فرما اور نامور ہم نام کی وفات کی خبر گویا اچانک ملی۔ مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایوں کے مشہور و قدیم خاندان علما و مشائخ کے ایک فرد تھے۔ خود بھی عالم، تحریک خلافت کے بڑے پر جوش کارکن جمعیۃ العلما کے ممتاز رکن اور بڑے ہی خوش تقریر۔ بیان ان کا سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ عقائد میں بڑے زبردست ''قادری'' اور ذرا غالی قسم کے صوفی تھے۔ حضرت مولانا کی طرف سے قدرتاً دل صاف نہ تھا۔ دوران گفتگو نا ملائم الفاظ زبان پر آ جانے ناگریز سے تھے۔ وفات کی خبر سنتے ہی ذہن ادھر منتقل ہوا کہ دعائے مغفرت حضرت سے کرانی چاہیے۔ بے تکلف ایک عریضہ اس مضمون کا لکھ بھیجا، جوابی کارڈ پر مہر 18 دسمبر کی ہے۔ یہ رنگ بھی مولانا کا اگر آپ نے نہ دیکھا تو گویا مولانا کو دیکھا ہی نہیں۔ دیکھیے ایک عمر بھر کے مخالف کا ذکر کس انداز سے کرتے ہیں:

''میں کل کے خط کا جواب لکھ کر روانہ کر چکا ہوں کہ دوسرا کارڈ آیا۔ جس سے ایک محب اسلام و اہل اسلام کی مفارقت ناسوتی کا علم ہو کر قلق ہوا۔ رائے کا اختلاف میری نظر میں کچھ زیادہ

وزنی نہیں ہے۔ اصول اور نیت پر نظر رہتی ہے۔ سو مرحوم کے متعلق اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی۔ اس لیے خاص قلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائیں اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائیں۔ مجھ سے جو فرمائش ان کی گفت وشنید کے معاف کرنے کے متعلق فرمائی ہے میں اس کا اس لیے شکر گزار ہوں کہ اس میں دو مسلمانوں کا بھلا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے قلب میں بحمد اللہ تعالیٰ کسی کی طرف سے غل نہیں ہے اور ایسی گفت وشنید میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ ان کو گناہ بھی نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ روایات کے تحت میں معذور ہیں۔ اس لیے معافی کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن اس سے آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔ اس لیے آپ کے مذاق کا اتباع کر کے صریح الفاظ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا، آپ بھی معاف فرمائیں اور ان کو تو ایک خاص امتیاز تھا کہ وہ بدایوں کے متوطن تھے جو وطن ہے ہمارے شیخ المشائخ حضرت سلطان جی کا۔ میں تو خیر اہل بدایوں کے لیے یہ سمجھ کر ایسے امور کو گوارا کرتا ہوں کہ ''بدا۔یوں۔ ہی تھا''۔ حضرت مولانا کی زیارت مبارک ہو''۔

مولانا (وہی خشک مزاجی کے لیے بدنام مولانا) رعایت لفظی کے استاد ماہر تھے۔ بدایوں کی مناسبت سے پورا فقرہ ''بدا۔یوں ہی تھا کیا خوب!

وطن تو چند ہی روز ٹھہرنا ہوا، وہی فتنۂ نگار کے سلسلہ میں دسمبر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ پھر سہارنپور آ گیا اور آتے ہی اطلاع حضرت کو کر دی۔ جوابی کارڈ یکم جنوری کو ملا:

''قرب مسافت سے مسرت ہوئی۔ خدا تعالیٰ عافیت سے ملا دے۔ بھائی صاحب کی تکمیل صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ تفصیل الدین کے مضامین کے پسند آنے سے اس وجہ سے زیادہ مسرت ہوئی کہ جب غیر مقصود مضامین کی اتنی قدر فرمائی ہے جس روز مضامین مقصود کی طرف توجہ فرمائیں گے، کس درجہ قدر فرمائیں گے۔ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا عِلْماً نَافِعاً وَّعَمَلاً صَالِحًا''۔

یہ تفصیل الدین یقیناً مولانا ہی کا کوئی مقالہ یا رسالہ ہوگا۔ اب اتنے دن کے بعد بالکل خیال نہیں پڑتا کہ اس میں کیا تھا۔ جنوری 1932 شروع ہو چکی تھی اور رمضان اب شروع ہونے ہی کو تھا کہ وہ ایک روز کے لیے پھر تھانہ بھون حاضری دے آیا۔ غالباً 27 شعبان کو گیا تھا واپسی بہر حال 29 کو قریب شام کے ہوئی۔ آمد رمضان پر وہ مسجد کی رونق، خانقاہ کی آبادی اور چہل

پہل، دونوں میں اضافہ، استقبال رمضان کا اہتمام، یہ سب دیکھنے کے قابل تھا اور اسی کا شوق دید اب کی لے بھی گیا تھا۔

مجلس کے مذاکرے تو اکثر ہی یاد رکھنے اور نوٹ کیے جانے کے قابل ہوتے تھے۔ ایک روز کی گفتگو آج تک یاد ہے۔ صبح کی مجلس خاص میں مسئلہ جزائے اعمال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خاص جوش کے ساتھ ارشاد ہوا کہ اہل کشف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ دنیا کی بداعمالیاں حشر میں نامۂ اعمال کی مدد اور واسطہ سے نہیں پیش ہوں گی بلکہ بعینہٖ مجسم و متشکل ہو کر موجود ہو جائیں گی۔ شرابی کا نامۂ عمل ہی نہیں پیش ہوگا، بلکہ شرابی بجنسہٖ شراب پیتا ہوا آئے گا اور سب کو کاغذ اور فرشتوں کی گواہی ہی سے بالواسطہ علم نہیں ہوگا، بلکہ عین عمل کا براہ راست مشاہدہ ہو جائے گا۔ عین اس وقت حضرت اکبرالٰہ آبادی کا بھی یہ ملفوظ ذہن میں آگیا تھا کہ وقت کے گزرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وقت حق تعالیٰ کے پاس واپس چلا گیا اور وہیں سب ذخیرہ ہوتا جاتا ہے۔ حشر میں حکم ہوگا کہ وقت کی تجدید از سرنو ہو پس جب وقت آئے گا تو مافی الوقت کا بھی اعادہ بعینہٖ ہو جائے گا۔

12 جنوری 1932 کو عریضہ سہارنپور سے لکھا:

خدا کرے اب مزاج گرامی بالکل صحیح ہو گیا ہو (1)۔ اس روز کچھ ناساز تھا۔

چھوٹی بچی زہیرا سلمہا تین چار دن سے علیل ہے۔ بخار، نزلہ وغیرہ۔ ماں یوں ہی اختلاجی ہیں، پرسوں سے بہت پریشان تھیں آج خود بھی بیمار پڑ گئیں (2)۔

اس روز صبح کی مجلس میں بعض اہل کشف کے حوالہ سے ارشاد ہوا تھا کہ یہاں کی بداعمالیاں روز حشر مجسم ہو کر سامنے آجائیں گی۔ چنانچہ چور اپنے کو چوری کرتا اور حرامکار اپنے کو حرامکاری کرتا ہوا پائے گا۔ کیا قرآن مجید بھی جناب کے خیال میں اس تعبیر کی تائید کرتا ہے (3)۔

عرصہ ہوا آپ نے قصبہ گلاؤٹھی کی ایک صاحب کشف نا کتخدا خاتون کا ذکر فرمایا تھا۔ غالباً مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے بیعت تھیں۔ گھر میں ان کا ذکر آیا، تو بڑی مشتاق ہوئیں۔ ان کا پتہ دریافت کرنے کو مجھ سے بار بار کہہ چکی ہیں۔ محض ان کے پیامبر کی حیثیت سے جناب کی خدمت میں ان کا یہ اشتیاق پہنچا رہا ہوں (4)۔

15 رمضان کے بعد ایک بار پھر سرسری حاضری کا قصد ہے (5)۔

میں نے ایک بار نا سمجھی سے اپنے ایک عریضہ میں خواجہ صاحب کے نام سلام لکھ دیا تھا، بعد کو ایک وعظ میں نظر سے گزرا کہ اس سے طبع مبارک پر بار ہوتا ہے(6)۔ نادم ہوا۔ وہ وعظ نہ پڑھ چکا ہوتا تو آج بھی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا قاری محمد طیب صاحب اور خود خواجہ صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا۔ لیکن اب ایسی بے تہذیبی کی جرات نہیں کرسکتا(7)۔

یہ خط ڈاک میں جا ہی رہا تھا کہ گھر میں دورہ پڑ گیا۔ اختلاج کئی دن سے تھا ہی اس زور کا(8)''

جواب پہلی ڈاک سے بھی پہلے دستی وصول ہوا۔

(1) بالکل تو نہیں ہوا۔ بالبعض بلکہ بالاکثر ہوگیا۔ شب گزشتہ سے معتد بہ انحطاط محسوس ہو رہا ہے۔ آج حکیم صاحب نے بھی فرمایا کہ بخار نہیں رہا۔ مجھ کو بھی سب آثار میں کمی معلوم ہوتی ہے۔ اگر انحطاط کی یہی رفتار رہی تو امید ہے کہ ایک ہفتہ میں بالکل طبیعت صاف ہو جائے گی۔

(2) دوسرے خط میں اس کے متعلق معروض ہے۔

(3) اس وقت بھی ایک آیت اس کی تائید میں تلاوت کی تھی۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا لیکن وہ اس دلالت میں قطعی نہیں۔ حاضراً کی دوسری تفسیر بھی ہوسکتی ہے۔

(4) گلاؤٹھی میں صوفی کرم حسین ایک مشہور عامل ہیں۔ یہ ان کی بیٹی ہیں۔ بظاہر ثقہ ہیں۔ اب ان کی شادی ہوگئی۔

(5) بسروچشم تشریف لائیں۔

(6) جن کے دوسرے بار میرے ذمہ ہیں۔ یعنی اصلاح وتربیت وغیرہ کا ان کا یہ فعل بار میں اضافہ کر دیتا ہے اور جن کا کوئی بار ہی نہیں ان کا بار بار ایسا کرنا بھی بار نہیں۔

(7) اس لطافت کے ساتھ تو اہل بار کا بھی بار نہ رہتا اور آپ تو اوپر کے قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے سب کی خدمت میں سلام پہنچا دیا۔

(8) اللہ تعالیٰ شفا بخشے''۔

دوسرا عریضہ معاً بعد کا، گویا اسی کا ضمیمہ تھا اور وہ عجلت کے خیال سے بجائے ڈاک کے سہارنپور دستی بھیجا گیا:

م۔"کل سہ پہر کی ڈاک سے ایک عریضہ خدمت والا میں بھیجا ہے، جو اس نیاز نامہ کے پہنچنے کے بعد ملاحظہ میں آئے گا۔ چھوٹی بچی کی طبیعت اس عریضہ کے بعد ہی بہتر ہونا شروع ہوگئی اور آج صبح سے تو خدا کے فضل سے نمایاں افاقہ ہے۔

ا۔الحمدللہ۔

م۔اب تو یہ تجربہ بار بار کا ہو چکا کہ ادھر دعا کے لیے عریضہ روانہ ہوا کہ ادھر قبول دعا کے آثار نمایاں ہوگئے اور حضرت رومیؒ کے قول کی تصدیق ہوگئی ۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں ۔۔۔ می دہد یزداں مراد متقین

ا۔جب تک میرے پاس خط نہ پہنچے اس وقت تک تو چنیں خواہی کا مصداق آپ ہوں گے الحمدللہ بہت تواضع کے بعد ایک کمال کا تو اقرار کیا۔

م۔اس نمایاں اثر کو دیکھ کر گھر میں شفائے کامل وعاجل کے لیے اور زیادہ تقاضا پیدا ہوا۔ چنانچہ انہی کی فرمائش پر یہ نامہ روانہ ہو رہا ہے۔

ا۔دل سے دعائے صحت کرتا ہوں"۔

مولانا جس لطیف انداز سے مزاح فرماتے رہتے، اس کی مثالیں تو اوپر بھی جا بجا گزر چکی ہیں۔باقی یہ "تو چنیں خواہی" کے تحت میں لطیفہ تو بھولنے والی چیز ہی نہیں!

خانقاہ کے اطراف میں مکانات پختہ اور عالیشان تو بہت سے تھے لیکن زیادہ تر وہی پرانی وضع کے اور بعض بعض تو بہت بوسیدہ۔ٹھہرنے میں کچھ زیادہ آرام ان لوگوں کو نہ ملتا جو ذرا جدید تمدن کے خوگر ہوتے۔مولانا کے حقیقی چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب قصبہ کے خوش حال لوگوں میں تھے اور گورکھپور وغیرہ کی طرف کیں کورٹ آف وارڈس کے اسپیشل منیجر تھے۔ان کا مکان ذرا جدید تمدن کی رعایتیں لیے ہوئے تھا اور قصبہ میں شاید سب سے بہتر سمجھا جاتا۔بڑے بڑے عمائد جب کبھی باہر سے اتفاق سے آجاتے تو اسی میں اتارے جاتے۔حضرت کی جو روز افزوں شفقت اس عاصی کے حال پر تھی، اس کا ایک نمونہ یہ بھی اب ظاہر ہونے لگا، کہ اب جو دو ہی چار دن کے لیے حاضری کا اتفاق ہوتا اور اپنے کھانے رہنے کا کوئی الگ اور مستقل انتظام نہ کرتا تو بجائے مہمان خانہ خانقاہ کے یہاں ٹھہرایا جاتا۔اس مکان کے آرام کا کیا کہنا۔خانقاہ کے مہمان خانہ میں

بھی حتی الامکان آسائش کی رعایتیں ہیں۔ لیکن بہر حال وہ اللہ والوں ہی کے ٹھہرنے کے لیے مناسب جگہ تھی۔ ہم جیسے تن پرستوں، آرام طلبوں کے لیے جن کا شمار نہ ذاکروں میں، نہ شاغلوں میں نہ درویشوں میں، یہی مکان موزوں ترین تھا، سونے کو گدے دار مسہری، بیٹھنے کو کرسیاں اور تخت کا فرش لگا ہوا چوکا، نہانے دھونے کو کمرہ سے متصل ہی غسل خانہ وغیرہ۔

(43)

خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ کئی ہفتے گزر گئے اور مراسلت کی نوبت نہ آئی، جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا تو طبیعت بے چین ہونے لگتی۔ آخر 15 مارچ کو دل نہ مانا اور کاغذ کے صفحہ پر کہنا چاہیے کہ کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ فتنۂ روزگار نگار کے معاملہ نے بڑی طوالت اختیار کر لی تھی۔ ایک مذہبی رنگ کے مسلمان جو اس وقت عارضی طور پر اور چند روز کے لیے گورنمنٹ کے بہت بڑے اور ذی اختیار عہدہ دار تھے، چاہتے تھے کہ میں ان سے جا کر ملوں تو وہ توہین مذہب کا مقدمہ دائر کرانے کی اجازت دے دیں۔

''مدت سے مزاج گرامی کی خیریت میں دل لگا ہوا ہے۔ خدا کرے ہر طرح بہ صحت وعافیت ہو (1)۔ جہاں چند ہفتے گزر جاتے ہیں، طبیعت حاضری کو بے اختیار چاہنے لگتی ہے اور عریضہ نگاری کا داعیہ تو اس سے بھی کہیں قوی ہوتا ہے (2)۔ بعض دفعہ یہ سوچا کرتا ہوں کہ خط لکھوں تو آخر کیا لکھوں (3)۔ پھر دل یہ کہتا ہے کہ کچھ بھی سہی، ادھر سے جواب تو آئے۔

یہی صورت اس وقت بھی تھی۔ طبیعت میں تقاضا کئی دن سے تھا۔ اتفاق سے بیان القرآن میں آیۂ لیغفر لک من ذنبک ما تقدم و ما تاخر پر نظر پڑ گئی۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔ ساتھ ہی سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی بھی تفسیر پڑھ لی عربی کی۔ 8۔ 10 تفسیریں اور اردو کی بھی 3۔4 موجود تھیں۔ سب میں ان مقامات کو دیکھا۔ کسی صاحب کی بھی توجیہ اتنی معقول و دلنشیں اور سارے اطراف کی جامع نظر نہ آئی۔ کمال یہ ہے کہ عتاب قرآنی بھی اپنی جگہ پر بالکل حق بجانب رہتا ہے اور ساتھ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ میں بھی کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ (4)۔

آج کل اپنے اندر ایک خاص مرض پا رہا ہوں۔ عریضہ کی ضرورت اس غرض سے بھی تھی،

یعنی اپنے اندر جاہ پسندی زیادہ پانے لگا ہوں(5)۔امرا و حکام سے ملاقات ادھر سالہا سال سے گویا بالکل ترک تھی۔اب ادھر نفس میں اس کا تقاضا پھر پیدا ہونے لگا ہے(6)۔اعلیٰ حضرت نظام دکن ابھی چند روز ہوئے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ان کی خدمت میں حاضری اور امرائے دولت سے ملنے کا ولولہ دل میں اچھا خاصا پیدا ہوا(7)۔اور لکھنؤ گیا بھی اس ارادہ سے۔وہاں پہنچ کر اس پر عمل البتہ نہ کیا(8)۔صرف ایک وزیر صاحب سے ملا تھا جن سے تعلقات قدیم اور بے تکلفانہ تھے۔

اسی طرح بعض انگریز حکام سے بھی ملنے کو دل چاہنے لگا ہے(9) نفس تو بڑا مجتہد ہے، ہر موقع کے لیے عذرات بھی تلاش کر لیتا ہے،لیکن پھر بھی جانتا ہوں کہ یہ سب تسویلات و تاویلات ہیں۔حقیقی ضرورت کوئی بھی نہیں(10)۔آج سے پندرہ سال قبل میرے تعلقات اونچے اونچے انگریز حکام سے ہمسرانہ اور بے تکلفانہ تھے اور ان تعلقات پر فخر کیا کرتا۔جب سے زندگی میں انقلاب ہوا اور سوٹ بوٹ کی جگہ جسم پر کھدر کے کرتہ اور چپل نے لے لی اور لکھنؤ چھوڑ کر دریاباد میں گوشہ نشین ہو گیا تو ان بڑے بڑے حکام کے خطوط (جو اس وقت تک بڑی احتیاط سے جمع کر رکھے تھے) کے پشتارہ کو آگ لگا دی۔اب الحمدللہ ان میں سے کوئی کاغذ باقی نہیں(11)۔برسوں کے بعد اب ادھر چند روز میں دل نے پہلی بار اپنی اس حماقت پر افسوس محسوس کیا(12)۔

نفس ایسے موقع پر عذرات یہ پیش کرتا ہے کہ فلاں حاکم سے مل کر فلاں موذی دشمن ملت کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔یا فلاں مسلمان کو فلاں فلاں قسم کے نفع پہنچائے جائیں۔لیکن پھر اپنے ان خیالات پر لعنت بھیجتا ہوں(13)۔اور کہتا ہوں کہ مجھ سے پیشتر شیطان نے جتنوں کو پھسلایا اور پھسلایا ہے سب کو اسی طرح تو دانہ ڈال کر جال میں پھانسا ہے(14)۔

مرض کا مفصل حال حکیم امت کی خدمت میں بہ امید و استدعائے علاج پیش ہے(15)۔

گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں(16)۔

جواب کے لیے آپ ہمہ تن اشتیاق ہوں گے۔بہتر ہے،شوق پورا کر لیجیے:

(1) الحمدللہ اب طبیعت صاف ہے۔

(2) اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ عطا فرمائے۔

(3) اپنی خیریت۔

(4) اس فضل کا واسطہ مقبولان الٰہی ہیں۔ وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم۔

(5) جاہ پسندی ذمیمہ نہیں امر طبعی ہے۔ خواہ عام نہ ہو۔ اس کے لیے تدبیر کرنا یہ مذموم ہے۔ سووہ اوراس کا ترک دونوں اختیاری ہیں، اس لیے آدمی اس سے بچ سکتا ہے۔

(6) اگر تقاضا پر عمل نہ ہوتو کچھ ملامت نہیں۔

(7) آخر وہ محسن ہیں اور امرا شاید واسطۂ احسان ہوں۔ اگر یہ بنا ہوتو ایک قسم کی شکر گزاری ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوتب بھی محسن کو خوش کرنا امر طبعی ہے۔ لامحمود ولا مذموم۔

(8) بس تو اس ارادہ کا تدارک بھی ہو گیا۔

(9) کسی مصلحت سے یا بلا مصلحت۔

(10) تو اپنے ہاتھ کی بات ہے کہ عمل نہ کیا جائے۔

(11) جملہ اوراق و کتب درنار کن سینہ راازنور حق گلزار کن، یہی تھا۔

(12) یعنی جلانے پر۔ تو اب اس افسوس پر افسوس کر لیجیے، تدارک ہو جائے گا۔

(13) بس تو کفارہ ہو گیا۔

(14) یہ بصیرت مبارک ہو، حق تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر کیجیے اور اس سے کام لیجیے یعنی اعدائے اسلام سے کام نہ لیجیے۔ حق تعالیٰ سے کہیے جو کہنا ہو اگر کامیابی نہ ہو تو اجر یقینی ہے۔

(15) میں کیا، میری حکمت کیا، عوام کے لقب دینے سے کیا ہوتا ہے لیکن خدمت سے عذر نہیں۔ جا بجا تشخیص و نسخہ کے اجزا عرض کر دیے۔ قواعد پر منطبق کر کے خود تصحیح فرما لیجیے۔

(16) میرا بھی سلام مع الدعا کہہ دیجئے۔

ضمیمہ

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ مجاہدۂ اختیاریہ ہے جو قانونی علاج ہے۔ ایک مجاہدۂ اضطراریہ ہے جو موہوب غیر مکسوب ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر چاہتے ہیں اور مجاہدۂ اختیاریہ سے اس کو قاصر و عاجز دیکھتے ہیں تو ایسے اسباب غیب سے پیدا فرما دیتے ہیں جس سے اس کے امراض نفسانیہ حب جاہ وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولاناؒ اسی کو فرماتے ہیں۔

ہم بدلہا اونماید خویش را ہم بدوز وخرقۂ درویش را

مثلاً اس پر کوئی مرض مسلط ہو جاتا ہے یا کوئی عدو مسلط ہو جاتا ہے جو اس کو ایذائیں خصوصاً بدنامی کی ایذا پہنچاتا ہے جس کی روایات کو اگر کوئی غلط سمجھتا ہے تو دوسرا صحیح سمجھتا ہے اور اس طرح سے وہ رسوا ہو جاتا ہے جو اول اول نفس کو بے حد ناگوار ہوتا ہے مگر صبر ورضا جب اختیار کرتا ہے تو پھر اس میں ایسی قوت تحمل کی ہو جاتی ہے کہ نہایت محبت کے ساتھ یہ کہنے لگتا ہے۔

ساقیا برخیز و در دہ جام را خاک بر سرکن غم ایام را

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان مانمی خواہیم ننگ و نام را

پھر اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کے موافق اس کو قبول عام وعزت نصیب فرماتے ہیں جس میں اس کو ناز نہیں ہوتا۔ جس قدر رفعت بڑھتی جاتی ہے نیاز میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ بس جاہ عظیم میسر ہوتی ہے اور جاہ پسندی فنا ہو جاتی ہے''۔

کیا عرض کیا جائے، معمولی سا ایک ایک خط کیسے کیسے بیش بہا مضامین کا مجموعہ ہوتا تھا! خوش قسمت تھا ایسے مکتوب کا مکتوب الیہ کہ گھر بیٹھے اُسے یہ دولت حاصل رہی۔ بدقسمت تھا وہ مکتوب الیہ کہ یہ ایک نعمت بھی اس سے اور زائد کیوں نہ حاصل کر لی۔

اس کے بعد کا عریضہ 20 اپریل کو لکھا۔ بطور ضروری تمہید کے یہ سن لیجیے کہ مملکت آصفیہ کے مشہور پیشکار اور سابق وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کا انتقال اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ مہاراجہ بڑے تصوف دوست اور مسلم دوست تھے۔ نعتیہ نظمیں بھی کہتے تھے لیکن بہر حال باقاعدہ اسلام لے آنے کی کوئی روایت سننے میں نہیں آئی۔ اب آگے مکتوب ملاحظہ ہو:

''م۔ پچھلا والا نامہ جس میں حب جاہ کی حقیقت وعلاج پر لفظاً مختصر لیکن معناً جامع وشافی تقریر تھی۔ خاص طور پر آیہ رحمت ومایہ سعادت ثابت ہوا۔ بار بار پڑھا، اور رو رو کر بھی پڑھا۔ ہنس ہنس کر بھی پڑھا، پھر بھی جی نہ بھرا۔ جزائے خیر اللہ پاک ہی دے سکتا ہے۔

ا۔ میں اس سے خوش ہوا کہ آپ کو مضمون سے خوشی ہوئی۔

م۔ ایک روز خواب یہ دیکھا کہ جناب والا کے دستر خوان پر کھانا کھا رہا ہوں۔ علمائے فرنگی محلی میں سے بھی دو ایک صاحب موجود ہیں۔ میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ دیکھیے حضرت، یہ

لوگ کہہ رہے ہیں کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں، اس لیے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں مشرف ہو چکے ہیں۔ حالانکہ مطلق رویت ہرگز نجات کے لیے کافی نہیں، رویت مع الایمان ہونی چاہیے۔ ورنہ مطلق زیارت تو خواب میں نہیں، بیداری میں ابوجہل وابولہب کو ہر روز ہوتی ہی رہتی تھی۔ جناب اس پر سر جھکائے ہوئے کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ الفاظ مطلق یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ تائید میرے ہی خیال کی فرمائی ہے۔ اس کے بعد چند قاشیں کسی حلوے کی مجھے خاص طور پر عنایت ہوئیں۔ دیکھنے میں وہ حلوہ معمولی تھا، لیکن اس کی لذت وحلاوت حد بیان سے باہر تھی، ایسی کہ تین چار ہفتہ گزر جانے پر بھی نہیں بھولی ہے۔ اسی افراط تلذذ میں آنکھ کھل گئی۔

پرسوں خواب دیکھا کہ مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تم دعا اچھی طرح نہیں مانگتے ہو۔ ذرا جی لگا کر مانگا کرو، اس کے عجیب وغریب اثرات کا مشاہدہ خود ہو جائے گا۔

ا۔ مبارک اور مبشر بالعلم والعمل خواب ہیں۔

م۔ یہ تو خواب تھا۔ باقی واقعہ یہ ہے کہ مجھ سے دعا زیادہ مانگی ہی نہیں جاتی۔ مانع صرف دو ہیں۔ ایک تو یہ خیال کہ وہ ارحم الراحمین خود ہی ہر طرح عالم وبینا ہیں ان کے سامنے اتنی تفصیلی عرض حاجت کی ضرورت کیا۔

ا۔ معروضات اعلام کے لیے نہیں ورنہ مختصر دعا بھی لاحاصل ہوتی۔ بلکہ اظہار احتیاج کے لیے ہیں اور یہ اظہار جس قدر ممتد ہو عین مطلوب ہے۔

م۔ دوسرا یہ کہ خود اتنی زائد خواہشوں اور حاجتوں کا ہجوم ہونے لگتا ہے کہ طبیعت اس سے اکتا جاتی ہے اور دل کہنے لگتا ہے کہ کس کس چیز کے لیے کہا جائے۔

ا۔ ایک ایک چیز کا نام لینا ضروری نہیں۔ ادعیہ جامعہ کا تکرار دیر تک جی لگا کر کیا جائے۔ ایسا کرنے سے تھوڑی ہی دیر میں ایسا لطف پیدا ہوگا کہ دوسرے وقت ایسے موقع کا انتظار رہے گا۔

م۔ میرے ایک مخلص دوست...... حیدرآباد میں ایک معزز عہدہ پر مامور ہیں۔ بیچارے کچھ عرصہ سے سخت دنیوی افکار میں پریشان ہیں۔ مجھ سے اصرار ہے کہ میں الحاح واہتمام کے ساتھ حضرت والا میں دعا کے لیے عرض کروں۔

ا۔ میں دل سے دعائے خیر کرتا ہوں۔ وہ بھی دعا کرتے رہیں۔ اس دربار میں ایسی ہی ملی جلی چیزیں مقبول ہوتی ہیں۔

م۔ ظالموں نے میرے خلاف جو پمفلٹ بازی شروع کی ہے اس کا سلسلہ جاری ہے۔ پمفلٹ میں میرے ساتھ ساتھ جناب کو بالواسطہ اور مولانا حسین احمد صاحب کو براہ راست شریک جرم کرنا چاہا ہے۔

ا۔ لیکن جب کہ وہ جرم جرم ہی نہیں تو شرکت فی الجرم کیسے ہوسکتی ہے۔ تو شریک جرم کرنہیں سکتے، ہاں کہہ سکتے ہیں۔ تو اس کہنے سے کیا ضرر ہوسکتا ہے۔

م۔ گیہوں کے ساتھ گھن کا پسنا تو سنتا تھا، یہ گھن کے ساتھ گیہوں پسا جارہا ہے۔

ا۔ تو ضرر کیا پہنچا۔ اس کو تو اور قابل انتفاع بنادیا۔ پسنے کے قبل تو وہ روٹی نہیں بن سکتا تھا، پسنے سے روٹی بن گیا۔

م۔ طرح طرح کے جعلی دستخط، جعلی تحریریں، جعلی حلف نامے برابر تیار ہورہے ہیں۔ حق تعالیٰ کے حلم پر حیرت ہوتی ہے کہ کیسی کیسی مہلتیں دی جارہی ہیں۔ جس بیچاری کے نام سے یہ ساری فرضی کارروائیاں ہورہی ہیں وہ دق میں مبتلا، نقل وحرکت سے معذور، زندگی کے دن، جوں توں پورے کررہی ہے۔ اسے خبر نہیں، اس بیچاری کے حق میں دعائے خیر فرمائی جائے۔

ا۔ آپ کی برابر تو نہیں۔ مگر آپ کے قریب قریب میرا بھی دل دکھا۔ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے بھی دعائے خیر کرتا ہوں۔

م۔ اگر کہیں میرا نفس بھی انتقام لینے اور کچا چٹھا چھاپ دینے پر آمادہ ہوگیا تو اس غریب کی زندگی دس دن کے بجائے دو ہی دن میں ختم ہوجائے گی۔

ا۔ آپ کا نفس آپ پر غالب آکر آمادہ نہیں ہوسکتا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیے''

جدیدہ کی طلاق عرصہ ہوا واقع ہوچکی ہے۔ بعض مہربانوں نے ان ہی کے نام سے ایک پمفلٹ ''عبدالماجد دریابادی بے نقاب'' (ٹھیک نیاز صاحب کے انداز تحریر وعنوان میں) چھاپ کر لکھنؤ وحیدرآباد وغیرہ میں گھر گھر شائع کیا تھا۔ آخری سطروں میں اشارے سب اسی طرف ہیں۔

سہیل صاحب اعظم گڑھی، علی گڑھ کے ایم۔اے۔ایل ایل۔بی اور شہر کے نامور وکیل ہونے کے علاوہ شاعر بھی بہت اچھے ہیں، اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی۔ مولانا حسین احمد صاحب کا جانا جب سرائے میر (اعظم گڑھ) کے مدرسہ میں ہوا، تو انھوں نے ان کے استقبال میں ایک بڑی پر لطف فارسی نظم کہہ کر ایک خوش لحن طالب علم سے پڑھوادی۔ جی میں آیا کہ حضرت کو بھی (جن کے ذوق شعر و ادب پر ہمیشہ ان کی عالمانہ اور درویشانہ شہرت پردہ ڈالے رہی) اس لطف میں شریک کرلیا جائے اور جب خط لکھنے بیٹھا تو حسب معمول کچھ اور باتیں بھی دینی اور علمی رنگ کی یاد پڑ گئیں۔ خط پر تاریخ 11 مئی کی ہے:

م۔''چند روز ہوئے مولانا مدظلہ سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لے گئے تھے، اعظم گڑھ میں ایک صاحب فارسی کے بہت اچھے کہنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک طالب علم سے خیر مقدم کی نظم پڑھوادی، جو اتنی پر لطف ہے کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے حضرت تک بھی پہنچادوں پشت صفحہ پر حاضر ہے۔

ا۔ واقعی نفیس ہے اور لطف یہ کہ سلیس ہے۔ گویا سہل ممتنع ہے۔ میں نے نقل کرلی۔

م۔ اللہ آپ کا ان کا دونوں بزرگوں کا سایہ مدتوں قائم رکھے، بعد کو لوگ ان صورتوں کو ترسیں گے۔

ا۔ حسب وعدہ صادق مصدوق بہت سے بادل پیدا ہوتے رہیں گے جو ہم سے زیادہ برسیں گے۔

م۔ شب میں اپنے مولانا کے ساتھ مولانا محمد قاسمؒ کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔

ا۔ مبارک ہو۔

م۔ بیان القرآن، تفسیر سورۃ الطلاق میں اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ کے تحت میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ استطاعت لسان کا مسئلہ مفسرین، محدثین حنفیہ کے کلام میں تو دیکھا گیا مگر فقہ کی کسی کتاب میں نہ ملا۔ عرض ہے کہ عینی شرح کنز میں یہ مسئلہ اسی طرح مسطور ہے۔

ا۔ میں نے بھی ابھی عینی منگا کر دیکھا۔ انھوں نے بھی مذہب کے طور پر نہیں لکھا۔ آیت نقل کرکے حضرت ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر نقل کی ہے۔ اس کو مذہب نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو نسخہ میں

نے دیکھا وہ بطور حاشیہ کے ہے۔ آپ نے جو نسخہ دیکھا ہے شاید وہ مکمل شرح ہو اس میں مذہب کے طور پر نقل کیا ہو''۔

وسط مکتوب گرامی میں نفیس کا قافیہ ''سلیس'' اور میرے ''ترسیں گے'' کے جواب میں ''برسیں گے'' یہ ان ہی ''خشک'' مولانا کے قلم سے ہے۔

سرمایہ تسکین اور دانش آموز تو حضرت کا ایک ایک والا نامہ ہوتا تھا۔ 10 جون کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م۔ ''پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے۔ ایک صاحب نے ایک مشورہ مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جز نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی۔ معاذ اللہ۔ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے بیان القرآن، سورۃ المائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات ومودت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افترا کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا۔ اس دوسرے افترا کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچۂ سچ میں کر رہا ہوں۔

ا۔ یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔

م۔ حیرت ہی ہوتی رہتی ہے کہ بعض لوگ افترا کرنے پر اور بعض لوگ ہر ضعیف سے ضعیف بلکہ مہمل سے مہمل روایت کے قبول کر لینے پر کیسے آمادہ ومستعد رہتے ہیں۔

ا۔ حکمت نہ معلوم ہونے پر حیرت لازم ہے۔ مگر مجھ کو حیرت نہیں ہوتی حکمت معلوم ہو گئی ہے۔ اس حکمت کا حاصل ایک مثال سے سمجھ لیجیے کہ جس امام کے پیچھے جتنے مقتدی کم ہوں گے اگر غلطی بھی کرے گا تب بھی اس سے ہلکا رہے گا جس کے زیادہ مقتدی ہوں۔

م۔ حیدرآباد کے جن عہدہ دار صاحب کے حق میں دعا کے لیے میں نے عرض کیا تھا۔ اب وہ تازہ خط میں پھر مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی اجابت دعا کا آج

تک منتظر ہوں۔

ا۔اور میں اس انتظار کے رفع کا منتظر ہوں۔

م۔بیچارے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ادھر دعا ہوئی اور ادھر ان کا مقصود پورا ہو گیا۔

ا۔اس خط کشیدہ عبارت پر اگران کو بھی اطلاع ہو جائے تو مناسب ہے۔

م۔گھر میں حمل کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔حفاظت کا تعویذ مرحمت ہو۔

ا۔ملفوف ہے گلے میں اس طور پر ڈالا جائے کہ زیر ناف رہے"۔

اسلام پر عجب عجب وقت ہر زمانہ اور ہر ملک میں پڑتے رہتے ہیں اور امت کے صبر کا امتحان عجب عجب طریقوں سے ہر دور میں ہوتا ہے۔ 1931 میں فتنۂ نگار جس طرح پھیلا ہے اس کا ذکر بالا جمال تو پچھلے صفحات میں آ ہی چکا ہے۔ 1931 میں اس سے کہیں زیادہ کریہہ و دلآزار صورت نمودار ہوئی۔ برما میں ایک عیسائی نے بیہودگی اور گندہ ذہنی کی حد ہی کر دی۔ دو باتیں خط پڑھنے سے قبل پیش نظر رکھ لیجیے۔ ایک یہ کہ برما اس وقت تک ہندوستان ہی میں شامل تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت کے عزیز قریب اور مسترشد مولانا ظفر احمد تھانوی وہاں کے ذی اثر علما میں سے تھے،

29 جولائی کا عریضہ اصلاً اسی کے متعلق ہے۔ گو دوسرے مضامین بھی بجائے خود اہم ہی ہیں:

"بہت روز سے خیریت مزاج دریافت نہیں ہوئی۔ دل لگا ہوا ہے(1)۔

حال میں رنگون سے بیچ کے ایک خریدار نے ایک انگریزی ماہنامہ میرے پاس روانہ کیا ہے۔ جو وہاں کے سینٹ گبرئیلس ہائی اسکول کے پادریوں کی طرف سے نکلتا ہے۔ اس کے دسمبر نمبر میں صفحہ 13 پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق، حرمت خنزیر کے سلسلہ میں، اس درجہ بیہودہ، دلآزار، اشتعال انگیز عبارت لکھی ہے کہ اسے پڑھ کر ہر کلمہ گو کا خون بے اختیار جوش کھانے لگتا ہے۔ میرے لیے تو اصل الفاظ نقل کرنے بھی دشوار ہیں...... بیچ کے علاوہ میں اور مسلمان اخبارات کو بھی آمادہ کر رہا ہوں اور اپنی بساط بھر اس کی پوری کوشش کروں گا کہ شتم رسول کی شرعی سزا نہ سہی، کم از کم وہ سزا تو اس گندہ ذہن کو مل ہی رہے جو خود تعزیرات ہند میں ایسے مجرموں کے لیے درج ہے(2)۔ ضرورت اس کی ہے کہ خود رنگون میں بھی یہ تحریک زور وقوت کے ساتھ اٹھائی جائے، مولانا ظفر احمد صاحب اگر رنگون میں ہوں اور جناب والا کوئی مضائقہ نہ خیال فرمائیں تو

انھیں بھی تحریر فرما دیا جائے(3)۔ یہ مسئلہ تو ایسا ہے جس پر ہر فرقہ اور ہر طبقہ مسلمانوں کا متحد و متفق ملے گا(4)۔

کل شام کو نماز میں سجدہ سے سر اٹھا ہی رہا تھا کہ یک بیک بڑے زور کی گرج ہوئی، زبان پر اضطراراً آیۂ کریمہ "یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ" الخ آ گئی۔ نماز اس سے کہیں ٹوٹ تو نہیں گئی(5)۔

اپنے متعلق ایک عرض یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک اچھے اچھے خواب بہ کثرت دیکھا کرتا تھا۔ کبھی اپنے کو مصروف عبادت پاتا، کبھی اولیا و صالحین سے ہم کلام دیکھتا، اب ان خوابوں میں بہت کمی آ گئی، یہاں تک کہ خود جناب کو یا مولانا مدظلہ کو بھی مدتوں سے نہیں دیکھا۔ خواب کوئی امر اختیاری نہیں اور اس لیے آپ ہی کی تعلیم کے طفیل میں اس پر معصیت کی طرح تو متاسف نہیں، تاہم ایک دولت سے محرومی پر اس سے بعض اوقات ایک حسرت ضرور پیدا ہو جاتی ہے(6)"۔

علوم و معارف کے خزینہ دار کے ہاں سے جواب میں دیر یا کمی کی وجہ ہو ہی کیا سکتی تھی۔ جواب فوراً آیا:

(1) اللہ تعالیٰ اس عنایت پر جزائے خیر دے۔ بحمد اللہ تعالیٰ میں خیریت سے ہوں۔

(2) خدا کے لیے ضرور کوشش کیجیے گو آپ کو میرے اس لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ لکھنا بھی اسی ہیجان کا اثر ہے جو ہر مسلمان کو اس ناپاک ناول سے ہونا لازمی ہے۔

(3) میں ضرور لکھوں گا اور آج ہی لکھوں گا اور وہ وہاں کے سب ذی اثر اپنی جان آڑ دیں گے۔

(4) بیشک ایسا کون ہوگا جو اس میں اختلاف یا سکوت یا صبر کر سکے۔ جتنا جس سے ہو سکے۔

(5) ٹوٹتی کیوں اور زیادہ کامل ہو گئی۔

(6) حسرت ہونا امر طبعی ہے۔ اور دلیل ہے ان امور غائیہ کی محبت کی جو محمود بلکہ مقصود ہے، گو یہ حسرت مقصود نہیں مگر محمود ضرور ہے۔ اور جس مضرت کا اس حسرت میں احتمال تھا کہ مقصودیت کا اعتقاد نہ ہو جائے۔ جب یہ اعتقاد نہیں ہے تو محمود محض رہ گئی۔ اسباب ایسے تغیرات کے مختلف ہوتے ہیں، طبعی بھی، حکم و مصالح غیبی بھی۔ اول کو اطبا اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان اسباب کا تعلق اختلاف امزجہ و حصول اغذیہ و قوائے نفسانیہ سے ہوتا ہے اور ثانی کو اہل طریق سمجھتے ہیں، کاملین تو درجۂ اطمینان میں اور ہم جیسے درجہ ظن و تخمین میں، چنانچہ اسی درجہ میں جو سبب اس تفاوت

کا میں سمجھا ہوں وہ معروض ہے۔ وہ یہ کہ اس وقت رجوع الی الطریق جدید تھا۔ جدید کا اثر طبعاً نمایاں ہوتا ہے بیداری میں بھی اور بیداری کی تبعیت میں خواب میں بھی اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یا ظن میں تو اثر حق کا قوی ہوتا جاتا ہے، گر تاثر طبعی کم ہوتا جاتا ہے۔ اسی کو مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ایک ذاکر کی اس شکایت کے جواب میں کہ اب پہلی جیسی لذت ذکر میں نہیں فرمایا کہ پرانی جورواماں ہو جاتی ہے اور اسی کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمایا کـذالک کـنـا مـن قبـل و الأن قـسـت قلوبنا ۔امام غزالیؒ نے اس قول کے یہی معنی فرمائے ہیں ۔جس وقت تلاوت کے وقت ایک شخص کو روتے دیکھا"۔

ہر ہر خط، مختصر پیانہ پر سہی، تحقیقات عالیہ کا ایک گنجینہ ہوتا تھا۔

23 اگست کا عریضہ پھر اسی گندہ ذہن مسیحی مضمون نگار کے سلسلہ میں ہے اور ایک اور فقہی سوال کو لیے ہوئے۔

م۔" خیر و عافیت مزاج گرامی کا خواستگار ہوں۔

ا۔جواب ہر جز کا ساتھ معروض ہے۔ باقی بفضلہ تعالیٰ سب خیریت ہے دعائے خیر کا طالب ہوں اور آپ کے لیے کرتا ہوں۔

م۔مولانا ظفر صاحب کا خط رنگون سے جناب کے گرامی نامہ کے حوالہ سے آیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ اس مضمون نگار نے معافی مانگ لی اور اپنے اسکول میں مسلم طلبہ کے ساتھ رعایتیں منظور کر لیں، اس لیے اسے معاف کر دیا گیا۔ میری تشفی اس جواب سے نہ ہوئی۔ قانون میں تو ہین مذہب کی جدید دفعہ (جو مولانا محمد علیؒ کی سعی جمیل سے ابھی چند سال ہوئے بڑھائی گئی ہے) نا قابل مصالحت ہے، چوری، ڈکیتی وغیرہ کی دفعات کی طرح۔ یعنی اس کا مجرم ثبوت جرم یا اقبال جرم کے بعد جیل جانے سے بچ ہی نہیں سکتا اور اقبال جرم تو وہ اپنے معافی نامہ میں کر ہی چکا۔ شرعی حیثیت سے شاتم رسول کی جو سزا قاضی عیاضؒ کی الشفا اور ابن تیمیہ کی الصارم المسلول علی شاتم الرسول کے مطالعہ کے بعد، مجھ پر واضح ہوئی ہے، وہ مجھ سا عامی مولانا ظفر جیسے عالم کے سامنے کیا عرض کر سکتا ہے۔ باقی میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جب قتل پر قدرت نہیں، تو تعزیراً جیل خانہ تو بھجوانا ہی چاہیے۔ یہ سب میں نے انھیں لکھ بھیجا ہے، لیکن جناب کا ارشاد بہر صورت مقدم و مسلم رہے گا۔

ا۔رائے تو ہر مسلمان کی یہی اور حکم شرعی بھی یہی ہے۔مجھ کو سوچنے سے یاد آیا کہ وہاں اسی زمانہ میں اس میں مشورہ ہوا تھا۔اکثر باخبر لوگوں نے یہ کہا کہ اب تو وہ معافی بھی مانگتا ہے۔اگر دعویٰ کیا گیا اور عیسائیت کی رعایت میں کوئی پہلو براءۃ کا نکل آیا، حکام کا بالکل بھروسہ نہیں۔تو پھر اور زیادہ جرات ہوجائے گی۔اس لیے بادل نخواستہ اس کو گوارا کرلیا گیا۔مگر چونکہ ایک جماعت کی صلح دوسری جماعت پر حجت نہیں۔اس لیے قانون سے غالباً مسلمان ہر وقت استغاثہ کرسکتے ہیں خواہ رنگون کے نہ ہوں۔تو اگر کسی باخبر خواہ اسلام شخص سے مشورہ کر کے لکھنؤ وغیرہ میں دعویٰ دائرہ کردیا جائے اب بھی ممکن ہے۔جی ٹھنڈا ہو جائے گا اگر کوئی کافی سزا ہوگئی آئندہ جو رائے ہو۔

م۔ایک فقہی مسئلہ بھی دریافت کرنا ہے۔مسماۃ عائشہ کے پاس ان کے استانی مسماۃ فاطمہ نے کچھ روپیہ امانتاً یہ کہہ کے رکھ دیا تھا (حسب بیان عائشہ) کہ اس سے ہم تم حج کو چلیں گے، اب فاطمہ بہت سخت علیل ہیں۔صحیح طور پر بات کرنے کے نا قابل۔تو اگر اسی میں ان کا انتقال ہوگیا تو وہ روپیہ آیا، ان کے شرعی ورثا میں تقسیم ہوجائے گا۔

ا۔جی ہاں

م۔یا عائشہ ان کی طرف سے حج کرادیں۔

ا۔نہیں، کیونکہ کوئی صیغہ وصیت کا نہیں پایا گیا اور اگر فرضاً پایا بھی جاتا تب بھی اس شرط سے وہ وصیت نافذ ہوتی کہ یہ روپیہ ان کے ثلث ترکہ سے زائد نہ ہوتا''۔

(45)

''حکیم الامت'' ایک طرح کی ''قلمی'' تصویر بھی ہے حضرت حکیم الامت کی۔مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں سے۔لیکن مصور کی اس بے تمیزی کو کیا کیجیے کہ حضرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی سیرت کو بھی جو بجا عریاں کرتا جارہا ہے! وہ بچنا چاہے بھی تو بچنے کی کیا صورت؟ مولاناؒ تو اس کے لیے ''مشیر باتدبیر'' بھی تھے اور ''پیر روشن ضمیر'' بھی۔

اے تو افلاطون و جالینوس ما!

ان کے آگے تو وہ نیک و بد، برا و بھلا، گفتنی ناگفتنی سب ہی کچھ اگل کر رکھ دیتا تھا۔اب برسوں کے بعد وہ سب کے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے، سب کچھ کیسے چھاپ ڈالے! قلم رک رک

جاتا ہے۔ طبیعت ہچکچاتی ہے، ہمت کا قدم جواب دے دے جاتا ہے۔ لیکن نہیں، مولانا کے افادات کے کسی جز سے بھی دنیا کو محروم رکھنا ناظرین پر ظلم کرنا ہے۔ ہنس لیجیے، طنز کے ٹھٹھے لگا لیجیے، بہر حال آپ بیتی کی ہر ضروری جھلک ان اوراق پر من وعن ہی نقل ہوگی۔

بیوی، محبوب وقدیم بیوی، چند ہفتے کے لیے اپنے مائکہ گئی ہوئی ہیں اور ادھر ان کا فراق خاصا ستا رہا ہے۔ کیسے احمق اور فطرت بشری سے جاہل وناول نویس اور شاعر ہیں جنھوں نے وصل وفراق کی ساری کیفیتوں کو صرف نوجوانوں یا نئی دلہنوں کے ساتھ مخصوص ومحدود رکھا ہے۔ اس عالم میں نیاز نامہ حضرت کو لکھا۔ خط پر تاریخ 4 ستمبر 1933 کی ہے۔ لکھنے والے کی عمر مستحضر کر لیجیے 40 سال کی۔

م۔ ''گھر میں آج کل اپنے مائکہ باندا گئی ہوئی ہیں۔ اولاد کی محبت پہلے بھی بہت زائد تھی، چھوٹی اولادوں کی موت نے اسے اور بڑھا دیا اور اب جب سے اختلاجی دورے پڑنے لگے ہیں، بچیوں کی خفیف سی بیماریوں پر بھی بالکل بےقرار ہو جاتی ہیں۔ چھوٹی لڑکی کئی دن ہوئے زکام وبخار میں مبتلا ہوئی۔ بس اتنی تکلیف بھی دیکھی نہ گئی۔ غش کھا کر کھڑے سے زمین پر گریں اور دورہ پڑ گیا۔ حمل کا زمانہ، اللہ نے یہی بڑا فضل کیا کہ چوٹ زائد نہیں آئی۔ یہ سب داستان اس لیے دہرا رہا ہوں کہ شاید کوئی مناسب تدبیر خیال مبارک میں آجائے۔

ا۔ تدبیر کی حقیقت ہے سبب مرض کا ازالہ اور یہاں سبب ضعف قلب ہے۔ اس کا ازالہ جس طریق سے ہو یہی تدبیر ہے۔ اس کے طرق مختلف ہیں۔ مقویات قلب، مفرحات قلب کا استعمال۔ ایسے واقعات کے وقت کسی عاقل کا پاس ہونا اور جب قرائن سے اس کا احتمال ہو یعنی کوئی واقعہ ایسا ہو جائے جس سے ایسے آثار کا شبہ ہو جائے اس وقت ان کے دل کو بہلایا جائے۔ تسلی آمیز گفتگو کی جائے۔ بزرگوں کے تذکرے، حق تعالیٰ کی حکمت اور رحمت ایسے واقعات میں گوش گزار کی جائیں۔

م۔ یہ سوال تو ان کے متعلق بہ حیثیت تیمار دار میں نے پیش کیا۔ اب دوسرا سوال اپنے متعلق بہ حیثیت بیمار پیش کرتا ہوں۔ وہ تو اپنی اولاد کے حق میں بیقرار رہتی ہیں اور میں خود ان کے لیے، یہ آج سے نہیں مدت سے۔

ا۔ اصل چیز سے موافقت سنت کی بنا پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اب آگے احوال کی خصوصیات سے آثار خاصہ مختلف ہوتے ہیں۔اس پر کلام باقی رہا۔

م۔سن کی زیادتی سے اس کیفیت میں کمی نہیں، اضافہ ہی ہے۔

ا۔محبت میں کمی نہیں ہوا کرتی، جس چیز میں سن کی زیادتی سے کمی ہو جاتی ہے وہ ہیجان نفسانی ہے اور محبت کی خاصیت شراب جیسی ہے۔

خودقوی تر می بود خمر کہن

م۔حد یہ ہے کہ چندروز کی مفارقت بھی سخت گراں گزرتی ہے۔ مائکہ بھیجتا ہوں تو اپنے نزدیک ایک سخت مجاہدہ کرتا ہوں۔ دوسروں پر حیرت ہوتی ہے کہ مہینوں بے تکلف اپنی بیویوں سے جدا رہتے ہیں۔

ا۔تو ان سے حقوق بھی نہیں ادا ہوتے الا نادراً۔ والنادر کالمعدوم اور اگر حقوق بھی ادا ہوجائیں تب بھی ایک لذت سے محروم ہیں۔ان پر رشک کیسا۔

م۔اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ چندروز جدائی میں تو دل پر بن جاتی ہے، تو دائمی جدائی کے وقت کیا گزرے گی۔

ا۔اوّل تو مومن کی منجانب اللہ اعانت ہوتی ہے۔ وقوع کے وقت اللہ تعالیٰ کا تعلق ایسا غالب کردیا جاتا ہے کہ دوسرے تعلقات مغلوب ہوجاتے ہیں۔ گوحزن طبعی کسی درجہ میں رہے۔ جیسا کہ موت کی کراہت حیات میں کسی درجہ میں ہوتی ہے مگر عین موت کے قریب اکثر تو یہ کراہت مبدل بہ شوق اور اقل درجہ میں مبدل بہ گوارا کی جاتی ہے کما ورد فی الحدیث ویشاہد کثیرا۔

م۔پوری کیفیت عرض کرتے حجاب آتا ہے۔

ا۔حجاب کیسا۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

م۔حد یہ ہے کہ بارہا جنت بھی اس لیے عزیز معلوم ہوئی ہے کہ وہاں ان کا ساتھ بلا اندیشۂ مفارقت رہے گا۔

ا۔شافعیؒ کی سنت پر عمل نصیب ہوا، وہ فرماتے ہیں جب سے مجھ کو معلوم ہوا کہ جنت میں

دوستوں سے ملنا ہوگا مجھ کو جنت کی تمنا ہوگئی اور راز اس کا یہ ہے کہ جنت لذات ہی کے لیے مقصود ہے اور لذات میں اعلیٰ لذت محبوب کا قرب ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو قرآن مجید میں اسباب ترغیب جنت میں یہ نہ فرماتے۔ "هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلَالٍ" الخ بس اتنی ترمیم کی ضرورت ہے کہ بجائے اس عبارت کے کہ "جنت اس لیے عزیز" یہ عبارت کر دیجیے کہ "جنت اس لیے بھی عزیز" الخ۔

م۔ دوسروں سے کہوں تو لوگ ہنسیں اور ٹھٹھے لگائیں۔

ا۔ اگر کوئی ایسا کرے تو آپ کے پاس قرآنی جواب ہے۔ "اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ"۔

م۔ نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ خلوت خاص کے وقت دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ جنت میں بجائے حور کے یہی انعام میں مرحمت ہوں۔

ا۔ یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بیویاں حوروں سے افضل و اجمل ہوں گی اور اجمل کی طلب نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف نقل۔ اتنی ترمیم یہاں بھی کیجیے کہ اگر کسی حکمت سے دونوں عطا نہ ہوں تو بجائے حور کے الخ۔

ضمیمہ: میں نے باوجود جی چاہنے کے اس کی نقل اس لیے نہیں کرائی کہ راز ہے۔ اگر آپ اس خط کو چاک کریں تو قصہ پاک ہے اور اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو ایک نقل مجھ کو بھی بدون تصریح نام کے صرف اس عنوان سے کہ ایک شخص نے یہ سوال کیا یہ جواب دیا گیا۔ آئندہ جو مصلحت ہو میں راضی ہوں"۔

اس کے بعد کا عریضہ 17 ستمبر کا ہے۔ حاجی محمد شفیع بجنوری وقت کے اچھے بزرگوں میں ہیں۔ مولانا کے شاگرد رشید اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اور حضرت حاجی امداد اللہ شاہ مہاجر مکیؒ جیسے کاملین کے مسترشد۔ خود ایک زمانہ میں زبردست صاحب جذب تھے، ماشاء اللہ اس وقت بھی (یعنی 1950 میں) سلامت باکرامت ہیں۔ حضرت کے متعدد وعظوں میں ان کے کیف و جوش کا ذکر مدح کے ساتھ بغیر ان کے نام کی تصریح کے ہے۔ آگے کے خط میں ذکر ان ہی کا آرہا ہے اور بجنور سے مراد شہر لکھنؤ سے متصل ایک قصبہ ہے۔

م۔ ''تعمیل ارشاد میں عریضہ سابق کی نقل بہ حذف اجزائے غیر متعلقہ دوسرے کاغذ پر کر کے ارسال خدمت ہے۔

ا۔ ممنون ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ ایک جگہ صورت یہ پیش ہے کہ محلہ کی مسجد میں جو صاحب امامت اکثر اوقات میں کرتے رہتے ہیں، وہ علاوہ امامت کے دوسرے شرائط کے مفقود ہونے کے قرآن مجید عادتاً اور مستقل غلط پڑھتے ہیں۔ مثلاً ''عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ'' کی جگہ ''عَنِ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ''. ''بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'' کی جگہ ''بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''. ''مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کو ''مَا فِيْ السَّمٰوٰتِ وَمَا فِيْ الْاَرْضِ'' . ''فَاَصَّدَّقَ'' کو ''فَاَصَدَّقَ'' (بلاتشدید صاد) وغیرہا۔ ان کی امامت سے اختلاف میں نزاع وجدال کی صورت پیش آنا یقینی ہے۔ ایسے میں کیا کیا جائے۔

ا۔ بہتر ہے کہ تنہا پڑھ لی جائے۔ پوچھنے پر کوئی عذر کر دیا جائے اور اگر یہ بھی خلاف مصلحت ہو تو اقتدا کر کے پھر اعادہ کر لیا جائے۔

م۔ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری کچھ روز ہوئے یہاں تشریف لائے۔ فرماتے تھے کہ اب لوگ بہت پریشان کرنے لگے، سکون کا کوئی وقت نہیں ملتا۔ ارادہ ہے کہ تھانہ بھون جا کر مولانا کے سایۂ عاطفت میں پناہ لوں۔

ا۔ سر آنکھوں پر آئیں۔

م۔ اپنے لڑکے ...... سے بہت نالاں تھے۔ آبدیدہ ہو کر فرماتے تھے کہ تعلیم و تربیت کی ساری کوششیں رائگاں گئیں...... کی صحبت میں رہ کر بالکل ''مقہور'' ہو گیا ہے اور واقعی کہاں باپ کا وہ رنگ اور کہاں صاحبزادہ کے یہ ڈھنگ۔ حضرت نوحؑ اور ان کے فرزند کا قصہ قرآن مجید میں نہ ہوتا تو شاید بعض صالح والدین فرطِ یاس سے دیوانے ہو جاتے۔

ا۔ طبعی قلق تو ہوتا ہی ہے۔ خود حضرت نوح علیہ السلام کو ہوا۔ پھر راضی بہ قضا ہو رہے۔ اب دو طرح سے اتباع نصیب ہوتا ہے۔ طبعی قلق سے اور عقلی تفویض سے''۔

اس کے بعد کا عریضہ اس لحاظ سے تشنہ و ناتمام ہے کہ اس میں بعض صرف سوالات ہی ہیں

بغیر جوابات کے۔تاریخ اس پر 13 اکتوبر کی پڑی ہے۔

م۔"حاضری کو کئی مہینے گزر گئے اور اب پھر دل بہت چاہنے لگا ہے۔انشاء اللہ دو ہفتہ میں حاضر خدمت ہوں گا، گو وہی ایک روز کے لیے:

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خورسند است

م۔آبائی زمینداری تھوڑی سی ہے۔انتظام اور دیکھ بھال دوسرے عزیز کرتے ہیں۔لیکن بہر حال آمدنی تو میرے ہی صرف میں آتی ہے۔آمدنی کی مختلف صورتیں دل میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ فقہ کی عام کتابوں میں صریح و واضح احکام مجھ عامی کو نظر آئے نہیں، ممکن ہے زیادہ تفحص و تلاش سے مل جائیں۔ذیل کی صورتیں عام ہیں:

(1) رعایا جب مکان بنانا چاہتی ہے یا پرانے ہی مکان میں ترمیم، تو زمیندار سے اجازت لینا ہوتی ہے اور ساتھ ہی نذرانہ کی ایک رقم پیش کرنا ہوتی ہے۔جو اکثر "بہ طیب خاطر" نہیں بلکہ بہ اکراہ پیش کرتی ہے۔

(2) رعایا میں سے جو پیشہ ور ہیں، ان سے بھی ہم لوگ منتفع ہوتے ہیں مثلاً قصابوں سے گوشت کسی قدر رعایتی شرح سے لیتے ہیں، یا گدیوں سے عید و بقر عید کے موقع پر دودھ کی مقدار بہ طور نذر کے۔

یہ آمدنیاں خدا معلوم کہاں تک جائز ہیں اور یہ دو صورتیں تو محض بہ طور مثال عرض کی گئیں۔ ورنہ خلجان اکثر معاملات میں رہا کرتا ہے۔

ا۔ان سوالات میں شوق میں تحریر کافی نہ ہوگی۔انشاء اللہ تعالیٰ بر وقت ملاقات مفصل عرض کرنے سے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔اگر یہ پرچہ دکھلا دیا جائے تو اولیٰ ہے، ورنہ زبانی سہی۔

م۔ایک عزیزہ ہیں جناب کی بڑی معتقد۔بہشتی زیور برابر پڑھتی رہتی ہیں۔مرید ہونا چاہتی ہیں۔لیکن شوہر اور خوشدامن رسوم و بدعات میں غرق ہیں۔اب وہ بیچاری کشش و پنج میں ہیں اور مجھ سے مشورہ کی طالب ہیں۔اگر اپنے عقیدہ پر عمل کرتی ہیں اور آپ سے بیعت، تو وہ لوگ اسے روکیں گے تو نہیں۔البتہ اس کے بعد زندگی ان پر تنگ کر دیں گے۔

ا۔ یہ مرید ہونے کی وجہ سے یا شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے۔ شق اوّل ہو تو مرید ہونا مناسب نہیں۔ ایک امر غیر مؤکد کے لیے کیوں پریشانی میں پڑیں اور شق ثانی پر میں کیا عرض کروں ان کے تنگ کرنے کی تفصیل معلوم ہو تو حکم شرعی عرض کروں۔ بہتر ہے کہ یہ بھی زبانی ہی طے ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بہ عافیت ملائے۔ والسلام۔ دعا گو و دعا جو۔ اشرف علی''۔

اب ملاقات کے وقت خدا معلوم یہ سوالات زبانی پیش کرنے یاد نہ رہے، یا ان کے جوابات ملے اور وہ ذہن سے نکل گئے۔ بہر حال اب کوئی صورت ان جوابات کی اشاعت کی نہیں۔

(46)

دوسرا خط تین ہی دن بعد 30 اکتوبر کا ہے۔ طبیبوں کے عامی ہم نشینوں کو بھی طبیب یا نیم طبیب سمجھ لیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ علاج کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔ خود انھیں بھی سنی سنائی دوائیں کچھ یاد ہی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی وہ کام بھی دے جاتی ہیں۔ ان سطور کے راقم کے نام بھی ایسے ہی خطوط معالجہ کے سلسلہ میں آتے رہتے ہیں اور مدت سے صدق میں ''مشورے اور گزارشیں'' کا عنوان ہی ان کے جوابات کے لیے وقف رہتا ہے۔ اصل عریضہ ملاحظہ ہو، حسب دستور اسی تلخیص کے ساتھ:

''شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی مسجد ہے، بلکہ گویا دو تین مسجدیں ہیں، سب کے صحن متصل، کچھ ایسا منظر جیسے درگاہ خواجہ اجمیری میں جہانگیری اور شاہجہانی مسجدوں کے اتصال کا ہے۔ مجمع عظیم بھی وہیں کا سا۔ میں وہیں مقیم ہوں۔ اتنے میں ظہر کی جماعت یک بیک کھڑی ہوگئی۔ میں جب وضو کر چکا، تو اب جماعت میں کہیں جگہ نہیں۔ سب گھری ہوئی۔ درمیان میں البتہ جگہ خالی ہے۔ لیکن وہاں عورتیں اور بچے ہیں۔ میں دل میں پیچ و تاب کھا رہا ہوں کہ اتنی بڑی مسجد اور یہ بے ترتیبی۔ جماعت چاہے ترک ہو جائے۔ لیکن میں عورتوں کی صف میں یا ان کے پیچھے تو نہ کھڑا ہوں گا۔ خیر کسی طرح ایک کونہ میں جگہ ملی اور امام نے اسی وقت سلام پھیر دیا۔ امام سے مجھ سے بڑا فاصلہ ہے۔ شکل کیا دکھائی دیتی، آواز تک نہیں سنائی پڑتی۔ لیکن معاً یہ القا ہوا کہ امام آپ ہیں اور مسجد مسجد حرم ہے۔ میں نماز پڑھتا جا رہا ہوں لیکن توجہ ساری اس طرف کہ اللہ اکبر! حرم مکہ کی امامت جناب کے حصہ میں آئی۔ یہ خیال کر کر کے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے، گویا خود

مجھے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی۔ آنکھ اس جوش مسرت میں کھل گئی۔ وقت چار بجے کا تھا قبل فجر(1)۔

لکھنؤ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بیمار ہوکر علاج کے لیے آئے ہیں۔ میرے دوست ہی نہیں، محبوب بھی ہیں۔ اب ادھر چند روز لکھنؤ میں ان کے پاس گزارنے ہیں۔ خدا کرے وہ جلد شفایاب ہوکر روانہ ہولیں۔ اس وقت انشاءاللہ حاضری کا قصد کروں گا(2)۔

دنیا عجب اندھی ہے۔ بہت سے مریض مجھے طبیب سمجھ کر میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ بعض سے تو پیچھا چھڑا لیتا ہوں لیکن بعض کو ایک پرانے مریض کی حیثیت سے، طبیبوں کی زبان سے سنی سنائی دوائیں کچھ الٹی سیدھی بتا دیتا ہوں۔ حال میں ایک انگریزی خواں نوجوان نے اپنا حال لکھ بھیجا کہ ایک عزیز قریب لڑکی سے انھیں محبت ہوگئی ہے۔ وہ لڑکی بھی ان پر فریفتہ ہے، لیکن بدبختی سے وہ صاحب خود اس لڑکی کی ماں سے ملوث رہ چکے ہیں۔ اب مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ گناہ کا کفارہ کیا ہے، نیز آیا اس لڑکی سے عقد اب جائز ہے، بصورت انکار لڑکی کی جان کا اندیشہ ہے۔

میں نے جواب لکھ دیا کہ ایسی لڑکی حکماً خود آپ کی بیٹی ہے، اس سے عقد حنفی مذہب میں تو کسی طرح جائز نہیں اور محض اس سے بچنے کے لیے مذہب حنفی سے تحول بھی جائز نہیں۔ اب آپ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ پچھلے گناہوں پر صدق دل سے توبہ کیجیے اور محض زبانی توبہ واستغفار کافی نہیں بلکہ اس کا عملی ثبوت یوں دیجیے کہ اس لڑکی سے عقد کا خیال بالکل ترک کرا دیجیے۔ ہر نماز کے بعد پانچوں وقت حضور قلب اور خشوع کے ساتھ اس کی دعا کرتے رہیے اور بعد نماز عشا دس پندرہ منٹ تک برابر یہ مراقبہ جاری رکھیے کہ وہ لڑکی آپ کی بیٹی ہے اور آپ اس کے ساتھ برتاؤ حقیقی بیٹی کا سا کر رہے ہیں۔ نیز عمل اور برتاؤ سے آج کی تاریخ سے اس کے ساتھ وہ طرز اختیار رکھیے جو باپ کا بیٹی کے ساتھ ہوتا ہے۔ محبت کے جذبات جس طرح پرورش سے بڑھتے ہیں اسی طرح عدم پرورش سے کمزور ہوکر تدریجاً فنا بھی ہوجاتے ہیں۔ لڑکی کے ذہن میں جب یہ اتر جائے گا کہ حکماً تو آپ کے والد ہیں، تو اس کا دل آپ کی طرف سے ایک ممکن شوہر کی حیثیت سے بالکل ہٹ جائے گا، بلکہ ممکن ہے کہ اسے اور نفرت پیدا ہوجائے۔

یہ خلاصہ ہے میرے جوابات کا، سارا قصہ جناب والا کی خدمت میں اس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو براہ کرم ان سے مطلع فرمادیا جائے کہ اب بھی ان صاحب کو لکھ بھیجوں(3)"۔

جواب کے لیے انتظار پیدا ہونا امر طبعی تھا، لیکن قبل اس کے کہ انتظار شروع ہو، جواب ہی آ گیا۔ بسم اللہ:-

(1) "خیر میں تو جیسا ہوں خود ہی جانتا ہوں مگر آپ یقینی خوش قسمت ہیں کہ ایسے مقام اور ایسی جماعت میں اپنے کو دیکھا۔

(2) مناظر احسن کے مناظر احسن واہم ہیں، عجلت نہ فرمایئے جب تک کافی اطمینان نہ ہوجائے۔

(3) حالت موجودہ میں تو یہی علاج متعین ہے۔ سچ یہ ہے کہ میری سمجھ تو یہاں تک پہنچتی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عمل کی توفیق دے اور نفع بخشے۔ ماشاء اللہ سب پہلوؤں کی جامع تدبیر ہے۔ والسلام۔

بعد تحریر سطور ہذا ایک نئی بات خیال میں آئی۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے آپ میں حسن ظن کی صفت غالب فرمائی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ آپ نے اس شخص کی طبیعت کو سلیم سمجھ کر یہ علاج تجویز فرمایا ہو۔ سو اگر واقع میں ایسا ہی ہو تو علاج کے نافع ہونے کے متعلق میری وہی رائے ہے جو اوپر کی سطروں میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن اگر طبیعت میں سلامتی نہ ہو، جیسا اس وقت عام طور پر دیکھا ہے تو یہ طریق عجب نہیں کہ زیادہ مضر ہو اس لیے اس سے تعلق بڑھے گا۔ پھر تعلق کے بعد رکنا کارے دارد۔ اس صورت میں متعین علاج یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں میں تباعد ہونا چاہیے۔ یعنی پردہ بھی گہرا ہو۔ ایک دوسرے کی آواز تک کان میں نہ پڑے۔ بلکہ دوسرے شخص کی زبان سے تذکرہ تک نہ سنا جائے۔ اس میں اوّل سخت کلفت ہوگی۔ پھر عادۃ اللہ ہے کہ سکون شروع ہو جاتا ہے۔ خصوص جب اس کے ساتھ عقد کا خیال بالکل دل سے نکال دیا جائے اور کسی قدر ذکر و مراقبہ سے بھی کام لیا جائے۔ اس تدبیر میں بہت قوت ہو جائے گی۔ ذکر لا الٰہ الا اللہ کا جس قدر سہل ہو اس تصور کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل نشیں ہو رہی ہے اور مراقبہ عقوبت

وحساب کا یہ سب پہلو آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔اب آپ اپنی خداداد بصیرت سے کام لے کر تجویز فرمایئے"۔

اللہ اللہ حق تعالیٰ نے کیسی گہری نظر اور کیسی دقیق بصیرت مرحمت فرمائی تھی! عقلائے فرنگ کو اپنی نفسیاتی تحقیق پر بڑا ناز ہے۔کیسا نفسیاتی دقائق پر نظر حضرت سے بڑھ کر بھی کسی کی ہوگی۔

شروع نومبر میں کسی تاریخ کو تھانہ بھون غالباً تین روز کے لیے ہوا آیا۔"غالباً" اس لیے کہ اب مدت تو یاد نہیں، لیکن عام عادت یہی تھی کہ جب مختصر حاضری ہوتی، تو تین دن کے لیے ہوتی۔ ملفوظات عالی جو کچھ مختلف مجلسوں میں ہوئے، وہ تو بالکل ذہن میں نہیں۔صرف اتنا یاد رہ گیا کہ اب کی بار طبیعت کو ذرا ناساز پایا اور اتنا ہی نہیں بلکہ ایک روز صبح کی مجلس خصوصی میں کچھ الفاظ اس طرح کے ادا فرمائے، جس سے معلوم ہوتا تھا، اب اپنا وقت موعود قریب سمجھ رہے ہیں۔کلمات میں یاس کا پہلو مطلق نہ تھا۔کچھ اس طرح کا ذکر تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کام جو کرنا تھا، وہ کر چکے۔یہ کلمات کچھ اس موثر انداز میں زبان مبارک سے نکلے کہ میرا تو دل لرز گیا اور یہ خیال کر کے کہ شمع اب جلد ہی بجھنے والی ہے۔وہیں سر محفل آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔خیر بیماری کے لحاظ سے تو کھانسی بہ شدت آتے ہوئے دیکھی۔اس سے قدرتاً دل بہت دُکھا۔نزلہ اس زمانہ تک مجھے خود بہت رہا کرتا تھا۔ایک آدھ تدبیر جو اپنے حق میں تجربہ سے مفید ثابت ہوئی تھی حضرت کو بھی بتا آیا۔مثلاً یہ کہ پانی جب نوش فرمایا جائے تو ناک بند کر کے اور عناب ولایتی برابر منہ میں پڑے رہیں، کہ اس کا عرق آہستہ آہستہ حلق میں جاتا رہے۔

ایک خاص بات اب کی یہ رہی کہ ایک مجلس میں مشائخ قابل بیعت کا ذکر آ گیا۔میں نے عرض کیا کہ حضرت کے خیال میں اس وقت کون کون صاحب اس کے اہل ہیں۔فرمایا کہ کسی وقت پرچہ پر لکھ کر دے دوں گا۔چنانچہ اسی دن ایک چھوٹے سے پرزہ پر یہ نو نام اسی ترتیب سے لکھے ہوئے مرحمت ہوئے۔

مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری۔

مولانا اللہ بخش صاحب بھاول نگر۔ریاست بھاول پور۔

مولانا محمد الیاس صاحب۔نظام الدین دہلی۔

مولانا محمد زکریا صاحب، شیخ الحدیث، سہارنپور۔
حافظ فخر الدین اسٹیشن ماسٹر۔
مولانا عاشق الٰہی صاحب۔ میرٹھ کمبوہ دروازہ۔
مولانا انور شاہ صاحب۔ ڈابھیل سورت۔
مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دیوبند۔
مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

یہ لازم نہیں کہ حضرت کی یہ رائے ان سب صاحبوں کے متعلق آخر وقت تک بھی قائم رہی ہو، بہرحال شروع نومبر 1932 تک تو یہ حضرات مولانا کے معیار انتخاب پر پورے اتر رہے تھے۔ لکھنؤ کے ایک مشہور معاصر بزرگ کو حضرت نے ایک بار اپنی مجوزہ فہرست میں جگہ دی تھی۔ بعد کو جب ان بزرگ کے مزید حالات حضرت کے علم میں آئے تو ان کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا۔

وطن آتے ہی دریافت خیریت کا کارڈ لکھا۔ جواب میں چند روز بعد کارڈ خوب مفصل موصول ہوا۔

''میں سخت شرمندہ ہوں کہ جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی جس کی وجہ عنقریب عرض کروں گا میں ممنون ہوں کہ میری خیریت دریافت فرمائی۔ کھانسی ہلکی تو ہے مگر رفع نہیں ہوئی۔ علاج برابر جاری ہے۔ آج ایک دوا اور منگائی ہے جو پہلے بھی نافع ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اب جلد ہی صحت ہو جائے گی۔ عناب اسی روز سے بالالتزام استعمال میں ہیں۔ ہر وقت جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ناک بند کرنے کی پابندی یاد نہیں رہتی۔ جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی ٹھنڈا پانی بالکل بند ہے۔

اب وجہ تاخیر جواب کی عرض کرتا ہوں، آپ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص صالح مصلح ندوہ کے لیے اگر ذہن میں آئے مطلع کیا جائے۔ مجھ کو تب ہی سے خیال تھا۔ مشورہ بھی کرتا رہا۔ آخر ایک شخص ذہن میں آ گیا، مگر ان کا پتہ یاد نہ تھا۔ مولوی طیب صاحب آنے والے تھے، احتمال تھا کہ شاید ان کو یاد ہو۔ ان کے انتظار میں دیر لگی۔ وہ آئے معلوم ہوا کہ ان کو بھی یاد نہیں بلکہ مدرسہ دیوبند

میں محفوظ ہے جو مولوی طاہر صاحب ناظم رسالہ القاسم سے معلوم ہوسکتا ہے۔ سو اگر دل چاہے مولوی طاہر صاحب سے پتہ دریافت فرما کر ان کو خط لکھ دیا جائے اور ضروری امور طے کر لیے جائیں۔ ان کا نام ہے مولوی میرک شاہ صاحب کشمیری۔ باقی کوئی نیا حال نہیں بھائی صاحب کی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں''۔

حضرت کی صحت اتنی اچھی رہا کرتی تھی کہ شاید کھانسی کا آنا ایک بالکل نئی بات معلوم ہوئی۔ اور صحت اچھی بھی کیوں نہ رہتی۔ قواعد صحت کا اتنا لحاظ رکھنے والا اور اتنا محتاط و پابند بھی تو کوئی ہو لے۔ ''پرہیز گار'' حضرت اپنے متعارف معنی کے علاوہ خالص طبی حیثیت سے بھی تھے۔ اب حضرت کا سن کچھ اوپر ستر سال کا تھا۔ لیکن قویٰ بحمداللہ اتنے اچھے تھے کہ پچاس کے سن والے کا ہاتھ اگر پکڑ لیتے تو وہ چھڑا نہ سکتا۔

(47)

16 نومبر کا عریضہ اپنے ایک سوال کے جواب کے لحاظ سے بڑی اور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اخباری معترض کے اصل اعتراضات محفوظ نہ رہے اور ان کے بغیر جوابات کا بھی پورا لطف نہیں آ سکتا، تاہم جواب کے سیاق عبارت سے اعتراض کی نوعیت بالا جمال تو سمجھی ہی جاسکتی ہے:

''ایک تراشہ پیغام صلح کا ملفوف ہے۔ یہ لاہور کی قادیانی جماعت کا پرچہ ہے، یہ لوگ ٹھیٹھ قادیانیوں کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہیں (1)۔ مضمون کی تمہید میں ذکر عام علما کا ہے۔ اسے چھوڑ کر جتنا جز جناب والا سے متعلق ہے، اس کا جواب لکھ کر خود اسی پرچہ میں چھپواؤں گا، یہ آپ کی ذات کی نہیں حق کی نصرت و حمایت ہے (2)۔ اگر جناب والا کے اصول یا مصالح یا معمولات کے بالکل ہی منافی نہ ہو، تو از راہ کرم اعتراضات کے جواب میں چند مختصر کلمات بہ طور اشارات تحریر فرما دیے جائیں، اپنی عبارت میں انھیں لکھ دوں گا، پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ یہ دفاع آپ کی ذات کی طرف سے نہ ہوگا، خود دین و مذہب کی طرف سے ہوگا، اس لیے توقع ہے کہ میرا یہ التماس رد نہ فرما دیا جائے گا (3)۔

ایک بات اب کی زبانی عرض کرنا رہ گئی۔ مکان مسکونہ میں اکثر تیز خوشبوئیں، جیسے اگر کی

بتیاں یا لوبان جلنے کی، محسوس ہوتی رہتی ہیں، خصوصاً شب کے اوقات میں، کوئی ماڈی سبب خیال میں نہیں آتا، دیوار کے نیچے ہی ایک مزار ہمارے خاندان کے مورث اعلیٰ کا ہے جو آج سے 5 سو سال قبل ایک نامور چشتی نظامی بزرگ گزرے ہیں۔ کچھ خیال ان ہی کے مزار کی طرف جاتا ہے۔ قبر کھلے ہوئے احاطہ میں ہے۔ چھت وعمارت وغیرہ کی سخت ممانعت کر گئے تھے (4)"۔

جواب حسب ذیل عنایت ہوا:

(1) میں اس میں موافقت کرنے سے اس لیے معذور ہوں کہ ان کے ضرر کو معتقدین نبوت مرزا کے ضرر سے اشد سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ لوگ جب نبی کہتے ہیں سب کو نفرت ہو جاتی ہے اور محفوظ رہتے ہیں اور یہ لوگ جب نبوت کی نفی اور ولایت کا اثبات کرتے ہیں تو نفرت نہیں ہوتی اور اشتیاق ہوتا ہے اس کی کتابیں دیکھنے کا، پھر دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔

(2) خیر یہ تو ایک مستقل بحث ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اگر وہ اس پر پھر لکھے، تو کیا پھر لکھا جائے گا اور یہ سلسلہ کہاں تک چل سکتا ہے تو اس صورت میں کیا نتیجہ۔

(3) میں چونکہ عبث سمجھتا ہوں اس لیے اپنے دل سے تو نہیں مگر آپ کے شوق سے لکھ دیا ہے۔ مگر آئندہ میں اس سلسلہ میں کوئی شرکت نہیں کر سکتا۔ اس کے نباہ اور عدم نباہ کو خود غور فرما لیجیے۔

(4) ایسے واقعات کے ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں مگر عادتاً ان کو دوام نہیں ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مخفی مخلوق جن وغیرہ اس کا سبب ہو۔ غالباً ایسی تحقیقات مقصود تو نہیں'۔

دوالگ پرچوں پر اعتراضات کے جوابات حضرت کے قلم سے ہیں:

"جواب نمبر 1۔ جو الزام معترض نے دوسروں پر رکھا ہے یعنی عدم تحقیق، اس میں خود اپنے مبتلا ہونے کی خبر نہیں۔ کیا اس کی تحقیق کر لی ہے کہ یہ نقش وتعویذ میرے لکھے ہیں۔ کیا کسی عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے۔ یا اس پر میرے دستخط ہیں۔ اگر مطبع والے ہی سے پوچھ لیتے تو خبر ہو جاتی۔ میرا ترجمہ وتفسیر جو میری رائے اور اجازت اور تجویز سے چھپی ہے وہ مطبع مجتبائی میں چھپی ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے مختلف اشکال میں اسی سے لے کر اور کچھ تصرفات واضافات کر کے چھاپا جس کی نہ مجھ کو اطلاع اور نہ میری اجازت نہ مجھ سے مشورہ لیا گیا۔ اب بتلایا جائے کہ اس کی

نسبت میری طرف کرنا کیسا ہے۔

بہشتی زیور کے مسئلہ کا جواب نمبر 2 میں ہے۔اسی طرح نشر الطیب والا سوال بھی بے خبری سے ناشی ہے۔ جس رسالہ کا یہ مضمون ہے وہ دوسرے بزرگ کا ہے۔جن کا نام بھی اس میں لکھا ہے۔ لطافت کے سبب اس کو نشر الطیب میں نقل کر دیا گیا ہے۔تو یہ مضمون ان ہی کا ہے۔ میری طرف نسبت چہ معنی۔اور یہ امر نا مناسب تھا کہ اس کا صرف وہ حصہ چھوڑ دیا جاتا کہ تصرف تھا۔ دوسرے کے کلام میں حفظ الایمان کا جواب بھی نمبر 2 میں ہے۔

جواب نمبر 3۔ضابطہ کا تو جواب ہو گیا کہ دوسروں کے کلام کو میری طرف منسوب کرتے ہو یہ کہاں کی تحقیق ہے۔باقی تبرعاً میں ان اصحاب مضامین کی طرف سے کہتا ہوں کہ قرآن کی آیات کا رقیہ میں استعمال کرنا حدیثوں میں وارد ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع سے لدیغ کا قصہ منقول ہے۔تو اگر کسی نے تجربہ کی بنا پر یا بزرگوں کے کلام سے نقل کر کے بہ طور حواشی لکھ دیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بلکہ اکثر جہلا تو کفار و مشرکین سے ایسے امور میں رجوع کرتے ہیں ان کی حفاظت ہو گئی۔اسی طرح نشر الطیب کی طرف جس مضمون کی غلط نسبت کی ہے اگر کسی بزرگ نے بہ طور نکتہ اور لطیفہ کے اپنے ذوق عاشقانہ سے لکھ دیا جو نہ کسی نص کے خلاف نہ کسی دلیل عقلی کے خلاف، تو کیا خرابی ہوئی۔خصوص جب کہ ذوق موید بالمشاہدہ ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت زلیخا کا جو حال ہوا وہ کسی کا بھی نہیں۔یعنی عموماً اور دواماً نہیں ہوا۔گو زنان مصر پر دفعتاً وقتی اثر ہوا لیکن جیسا استمراری اثر ان دونوں پر ہوا ویسا دوسروں پر نہیں ہوا۔اسی طرح دوسرا جز کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عاشق نہ ہونا غیرت الٰہی کے سبب ہوا اس کی اصل دلیل تو ایک بزرگ کا ذوق ہے۔ باقی تائید اس کی اس طرح ہے کہ حضور سب کمالات میں سب انبیا سے افضل ہیں۔تو حسن میں بھی۔ پھر اس کے آثار کا اس قوت کے ساتھ ظاہر نہ ہونا اس کا سبب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آثار کو ظاہر نہیں فرمایا جن میں ضرور حکمت تھی۔اس حکمت کا نام غیر الٰہی رکھ دیا تو کون سا گناہ ہوا۔ پھر اخیر بات یہ ہے کہ جب مرزائیوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ اب بھی بندوں سے کلام فرماتا ہے تو اگر ان بزرگ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرما دی ہو تو کیا محال ہے۔

تتمہ جواب نمبر 2۔اب رہ گیا اعتراض بہشتی زیور وحفظ الایمان کا سواس کے لیے علم کی ضرورت ہے۔اگر معترض کو حاصل ہے تو وہ مخاطب ہیں۔ ورنہ کیوں خود تکلیف اٹھائی اور کیوں اوروں کو تکلیف دی۔قابل غور ہے کہ اگر میاں بیوی پاس ہوں اور بچہ ہو تب بھی اس کی کیا دلیل ہے کہ بچہ اسی کا ہے۔بجز اس کے کہ ان میں باہم نکاح ہوا ہے اور حالت ایسی ہے کہ صحبت ممکن ہے۔حدیث الولد للفراش کے یہی معنی ہیں۔غرض دلیل نقلی ہے اور امکان عقلی۔یہی بات یہاں ہے کہ نکاح بھی ہوا ہے اور امکان عقلی گو استبعاد ہے لیکن استبعاد سے امکان کی نفی نہیں ہوتی۔بعض لوگ مخفی آکر بیوی سے مل لیتے ہیں۔تسخیر جن یا کسی بزرگ کے خارق سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔یہ تو تحقیقی جواب ہے۔باقی قانونی جواب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کا بچہ ہے۔یہ معنی نہیں کہ واقع میں ایسا ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ قانوناً اس کا ہے۔اور قانون عقلا کا بھی اسی کے موافق ہے۔ چنانچہ اگر ایسی ہی صورت میں باپ کی اگر کوئی جائداد ہو اور وہ عدالت میں درخواست دے دے کہ فلاں لڑکا میرا ہے میرے مرنے کے بعد اس کو جائداد ملے۔یا درخواست بھی نہ دے مگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس کی منکوحہ سے ہے۔تو کیا اس کو جائداد اسی بنا پر نہ ملے گی۔شریعت کا مقصود یہ ہے کہ محض اس استبعاد پر اس کو ولد الحرام اور بیوی کو زانیہ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔اب اس میں کیا اعتراض رہا۔رہا حفظ الایمان کی عبارت کا مطلب،سو جس نے سمجھ لیا وہ اعتراض ہی نہیں کر سکتا۔اس میں جو یہ عبارت ہے کہ ایسا علم تو زید وبکر الخ ایسا سے مراد علوم نبوی نہیں بلکہ بعض غیوب کا علم ہے۔اب بھی اگر اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اغبیا کا کیا علاج''۔

30 نومبر کے عریضہ اور اس کے جواب کو اس سابق نیاز نامہ سے بالکل متصل اور اسی سلسلہ کی دوسری کڑی سمجھنا چاہیے۔

''عریضۂ سابق کا جواب باصواب پا کر دل سے شکر گزار ہوا۔لاہوری پرچہ کے جواب میں انشاءاللہ اس انداز سے لکھا جائے گا کہ انھیں زیادہ گنجائش ہی الجھادے پیدا کرنے کی نہ رہے گی۔ بالفرض یہ توقع نہ بھی پوری ہوئی، جب بھی اپنا تو کچھ گیا ہی نہیں،ایک فرض ادا ہو گیا۔بہر حال یہ عریضہ اظہار شکر کے لیے ہے(1)۔

ایک انگریزی خواں کی طرف سے سوال آیا کہ حدیث میں یہ جو ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت حسانؓ سے مشرکین کی ہجو کہلائی۔ یہ کسی کی ہجو کہلانا اخلاق پیمبری سے بہت فروتر معلوم ہوتا ہے۔

میں اس کا جواب یہ لکھ رہا ہوں کہ ہجو علی الاطلاق ہرگز معیوب و مذموم نہیں، اگر کسی غرض صحیح سے ہے تو جب قتال تک جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب و فرض ہے تو ہجو تو اس سے بہت ہلکی چیز ہے، خصوصاً جب کہ ہجو کا مقصد اپنے ذاتی دشمنوں سے نہیں بلکہ دشمنان دین وحق سے انتقام لینا ہو، اور تجربہ سے اس حربہ کا موثر وکارگر ہونا ثابت ہو چکا ہو(2)۔اس جواب میں اگر اضافہ کی ضرورت ہو، تو ایماں فرمایا جائے''۔

جواب متصل ہی پڑھیے:

(1) ''ایک بات اور خیال میں آئی، وہ پہلے لکھنے سے رہ گئی تھی۔وہ یہ کہ جیسے بعض امور میں دوسروں کے افعال میری جانب منسوب کیے اسی طرح تمام فقہا کا لکھا ہوا مسئلہ ثبوت نسب کا میری طرف منسوب کیا۔ پس جو جواب میں نے لکھا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ تبرعاً فقہا کی طرف سے لکھا ہے۔ بلکہ حفظ الایمان کا الزام یہ بھی اسی قبیل سے ہے کیونکہ اسی کے قریب قریب عقائد کی کتابوں میں عبارت ہے۔بسط البنان وتفسیر العنوان میں موجود ہے، دیکھ لیجیے (پھر وہ عبارت میں نے خود دوسرے پرچہ پر نقل کردی)''**فی شرح المواقف. الموقف السادس. المرصد الاول. المقصد الاول فی جواب الفلاسفة وقلنا ما ذکرتم مردود بوجوه اذ الاطلاع علی جمیع المغیبات لایجب للنبی اتفاقا بیننا وبینکم ولهذا قال سید الانبیاء ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر ومامسنی السوء والبعض الاطلاع علی البعض لایختص به امی بالنبی''.**

انصاف درکار ہے۔کیا **لایختص** کا وہی مفہوم نہیں ہے جو عبارت **حفظ الایمان** کا ہے؟ اور اس عبارت سے بھی **اصرح واشبه مطالع الانظار شرح طوالع الانوار للبیضاوی** کی عبارت ذیل ہے جو صفحہ 408 طبع استنبول وصفحہ 199 طبع مصر میں ہے حکما کے جواب میں ''**وان ارادو به الاطلاع علی بعضها فلا یکون ذلک خاصة النبی اذ مامن احد الا ویجوزان یطلع علی بعض الغائبات''.**

خط کشیدہ عبارت میں زید و بکر وصبی و مجنون سب آ گئے۔

اگر جواب نہ لکھا ہو اس وقت اس مضمون کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے اور ایک بات اور یاد آئی کہ مسئلہ ثبوت نسب میں جو معترض نے یہ شبہ نکالا ہے کہ اس سے باب زنا مفتوح ہو جائے گا اس لیے مہمل ہے کہ حقیقت میں معاملہ بالعکس ہے۔ جس کا شوہر حاضر ہو اس کے زنا کا تو پتہ بھی نہیں لگتا، اس میں زیادہ احتمال ہے فتح باب زنا کا اور غائب زوج والی تو ڈرے گی کہ میں بدنام ہو جاؤں گی اور اس دقیق عذر کو کون قبول کرے گا۔

(2) الاضافۃ فی الجواب، قولہ'' ثابت ہو چکا ہو''۔ چنانچہ اس حکمت کی طرف خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ قریب بہ صراحت فرمایا ہے۔ ''حیث قال اھجوا قر یشاء فانه اشد عليها من رشق النبل وقال صلى الله عليه وسلم ان روح القدس يويدك ما فاضحت عن الله ورسوله وقال صلى الله عليه وسلم هجا هم حسان تشفى واشتفى (مسلم. فضائل حسان) وقال النووى فيه جواز الانتصار من الكفار وقال فيه جواز هجو الكفار مالم يكن امان واما امر صلى الله عليه وسلم بهجاء هم الٰى قوله فالمقصود منه النكاية فى الكفار وقد امره الله تعالى بالجهاد فى الكفار والاغلاظ عليهم وكان هذا الهجو اشد عليهم من رشق النبل فكان مندوباً لذٰلك مع مافيه من كف اذاهم بيان نقصهم والانتصار بهجائهم المسلمين قال العلماء ينبغى ان لايبدوا المشركون بالسب والهجاء مخافة من سبهم الاسلام وهله. قال الله تعالى ولايسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدواً بغير علم ولتنزيه السنة المسلمين عن الفحش الا ان تدعوا الٰى ذٰلك ضرورة لابتدائهم به فكيف اذاهم ونحوه كما فعل النبى صلى الله عليه وسلم''۔ اس عبارت میں اس حکمت کی شرح اور آداب و شرائط بھی جمع کر دیے گئے اور ایک حکمت زائد بھی بتلائی۔ فی قولہ مع مافیہ من کف اذاہم فی قولہ فکیف اذاہم۔ یعنی کفار کی جرات اور زیادتی کا روکنا بھی مقصود تھا۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم کہیں گے تو اس سے زیادہ سنیں گے تو پھر ان کی ہمت ٹوٹ جائے گی تو اس میں مسلمانوں کی حفاظت ہے اور اہل حق کی حفاظت شر و ایذا سے

اعظم اخلاق مطلوبہ سے ہے اور یہ حکمتیں فلسفیانہ ہیں اور ایک حکمت صوفیانہ بھی نہایت لطیف ہے۔ وہ یہ کہ خود بدلہ نہ لینے سے ان پر غضب خداوندی شدید ہوتا اور انتقام لینے سے اس میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ تو اس میں عین ان کی خیر خواہی ہے۔ دلیل اس شدت وخفت کی ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ کی کسی نے چوری کی۔ انھوں نے بددعا کی۔ آپ نے فرمایا بددعا کرنے سے اس کی عقوبت میں تخفیف ہو جائے گی اور آپ کی اسی حکمت کی نظیر دوسری حدیث میں ہے کہ مرض وفات میں گھر والوں نے آپ کے دہن مبارک میں دوا ڈالی اور منع کرنے پر بھی ایسا کیا۔ آپ نے اپنے سامنے سب کے منہ میں دوا ڈالنے کا حکم دیا۔ رواہ البخاری فی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔ وہاں محققین نے یہی حکمت بیان فرمائی ہے کہ اگر آپ انتقام نہ لیتے تو ان پر کوئی وبال نازل ہوتا۔ آپ نے ان کو بچا دیا۔ غرض یہ ہے کہ آپ کا اصلی مذاق تو یہ تھا کہ حدیثوں میں وارد ہے کہ آپ سے کفار کے لیے بددعا کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے انکار فرما دیا اور اصلی مذاق کے خلاف جہاں ہوگا کسی قوی عارض کی وجہ سے ہوگا۔

(48)

یہ بحثیں ذرا ختم ہوئیں، تو ایک دوسری بحث چھڑی، خاصی طویل۔ کلمہ گو فرقوں کی تکفیر کے باب میں (ان کی ساری گمراہیوں اور زیادتیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی) مجھے شرح صدر کبھی نہیں ہوا اور اب تک بھی نہیں ہے چنانچہ اس بارہ میں اس عاصی کا مسلک اپنے اکابر سے بہت بڑی حد تک اب بھی الگ ہے۔ میرے 3 دسمبر کے عریضہ کے جواب میں مولانا کا والا نامہ مولانا کے مسلک کا ترجمان ملے گا:

م۔ ''پیغام صلح'' نے میرے خط کا نہ جواب دیا، نہ اپنے اخبار میں چھاپا۔ خیر، خدا کرے دل ہی میں ندامت ہوئی ہو۔

ا۔ متردد یا جاہل بہ جہل بسیط نادم ہو سکتا ہے اور جاہل بہ جہل مرکب نادم بھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کی رائے میں ضرورت کا مضمون ہے آپ کا اخبار موجود ہے۔ باقی میرا مذاق تو معلوم ہی ہے۔

م۔ ایک نوجوان انگریزی طالب علم نے آیۂ کریمہ ''لَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا'' پر سوال میرے پاس بھیجا کہ ایک نبی کی عصمت کاملہ پر اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے مختلف تفسیریں

الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ امام رازیؒ کی تقریر سب سے بہتر نظر آئی، لیکن بیان القرآن کی اس سے بھی بڑھ کر رہی۔ ماشاءاللہ ہر پہلو سے جامع و تشفی بخش ہے۔ جزاکم اللہ خیرالجزا۔

1۔ میں آپ کے خوش ہونے سے خوش ہوا اور خوش ہو کر تفسیر منگا کر دیکھی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کیا۔ باقی میں کیا بلا ہوں۔

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود   با حریفاں آنچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

م۔ ایک فتویٰ تکفیر شیعہ کی نقل ملفوف ہے۔ اس پر علاوہ دوسرے اکابر علما کے ہمارے مولانا تک کے دستخط ثبت ہیں۔ کیا عرض کروں، مجھے شرح صدر اب بھی نہیں۔ شیعوں کو مبتدع، فاسق العقیدہ، گمراہ اور جو کچھ بھی کہہ لیا جائے، لیکن کافر اور خارج از اسلام کہتے دل لرز اٹھتا ہے۔

ا۔ یہ علامت ہے آپ کی قوت ایمانیہ کی۔ مگر جنھوں نے یہ فتویٰ دیا ہے ان کا منشا بھی وہی قوت ایمان ہے کہ جس کو ایمانیات کا منکر دیکھا بے ایمان کہہ دیا۔

م۔ اگر سب گمراہ فرقے یوں ہی خارج از اسلام کیے جاتے رہے تو مسلمان رہ ہی کتنے جائیں گے۔

ا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ کیا خدانا کردہ اگر کسی مقام میں بہ کثرت لوگ مرتد ہو جائیں اور تھوڑے ہی مسلمان رہ جائیں تو کیا اس مصلحت سے ان مرتدین کو بھی کافر نہ کہا جائے گا۔

م۔ شیعوں سے مناکحت اگر تجربہ سے مضر ثابت ہوئی ہے تو بس تہدیداً اس کا روک دینا کافی ہوگا۔

ا۔ اس تہدید کا عنوان بجز اس کے کوئی ہے بھی نہیں۔ غور فرما لیا جائے۔

م۔ میرا دل تو قادیانیوں کی طرف سے بھی ہمیشہ تاویل ہی تلاش کرتا رہتا ہے۔

ا۔ یہ غایت شفقت ہے لیکن اس شفقت کا انجام سیدھے سادے مسلمانوں کے حق میں عدم شفقت ہے۔ کہ وہ اچھی طرح ان کا شکار ہوا کریں گے۔

م۔ جو بناء تکفیر قرار دی گئی ہے یعنی عقیدۂ تحریف قرآن۔ اسی میں تو گفتگو ہے۔ اگر یہ عقیدہ ان کے مذہب کا جز ہوتا تو ہمارے قدیم محققین شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہ سے مخفی نہ رہتا۔

ا۔ جب ان کی مسلم کتابوں سے جزئیت ثابت ہے پھر حضرت شاہ صاحبؒ کا سکوت ثابت

ہے جس کی مجھ کو تحقیق نہیں تو ان کے سکوت میں تاویل ہوگی نہ کہ جزئیت میں۔

م۔ بہت زائد خلش مجھے اس کی ہے کہ اب تک ہم آریوں اور عیسائیوں کے سامنے کلام مجید کے غیر محرف اور محفوظ ہونے کو بہ طور ایک بالکل مسلم و ناقابل اختلاف عقیدہ کے پیش کرتے رہے ہیں۔ اب ان معاندین کے ہاتھ میں ایک نیا حربہ آجائے گا کہ دیکھو خود تمھارا ہی کلمہ پڑھنے والے اور تمھارے ہی قبلہ کو ماننے والے قرآن کو ناقص و محرف مان رہے ہیں۔

ا۔ اس سے تو اور زیادہ ضرورت ثابت ہوگئی ان کی تکفیر کی۔ پھر ہمارے پاس صاف جواب ہوگا کہ وہ مسلمان ہی نہیں۔

م۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کا جو مکتوب سر سید احمد خاں کے نام تھا اور مجھے اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے اسے اہتمام کے ساتھ سچ میں شائع کیا تھا(1) میری فہم ناقص میں اسی کو معیار رکھنا چاہیے اور اسی کے مطابق برتاؤ تمام گمراہ فرقوں سے رکھا جائے۔ یعنی نہ مداہنت اور نہ ہی ایسی مخالفت کہ ان میں اور آریوں، عیسائیوں میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔

ا۔ لیکن اگر وہ خود ہی اپنے کو کافر بنائیں (بالنون) تو کیا ہم اس وقت بھی ان کو کافر نہ بتائیں (بالتاء) دنیا میں آج تک اپنے کو کسی نے کافر نہیں کہا بلکہ کوئی عیسائی کہتا ہے کوئی یہودی مگر چونکہ ان کے عقائد کفریہ دلائل سے ثابت ہیں اس لیے ان کو کافر ہی کہا جائے گا۔ تو مدار اس حکم کا عقائد کفریہ پر ٹھہرا، تو اگر ایک شخص اپنے کو فرقہ شیعہ سے کہتا ہے اور کوئی عقیدۂ کفریہ اس مذہب کے اجزا یا لوازم سے ہے، تو اپنے کو اس فرقہ میں بتلانا بدلالت التزامی اس عقیدہ کو اپنا عقیدہ بتلانا ہے۔ پھر عدم تکفیر کی کیا وجہ۔ اور اگر ان کے ہاں یہ عقیدہ مختلف فیہ بھی ہوتا تب بھی کسی کی تکفیر میں تردد ہوتا۔ لیکن یہ بھی نہیں، اور جو اختلاف ہے وہ غیر معتد بہ ہے، جس کو خود ان کے جمہور رد کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اصل تو کفر ہوگا البتہ اگر کوئی صراحتاً کہے کہ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ یا کوئی فرقہ اپنا لقب جدا رکھ لے مثلاً جو علما ان کے نافی ہیں تحریف کے، ان کی طرف اپنے کو منسوب کیا کریں مثلاً اپنے کو حدوقی یا تقی یا مرتضوی یا طبری کہا کریں، مطلق شیعہ نہ کہیں، تو خاص اس شخص کو یا اس فرقہ کو اس عموم سے مستثنیٰ کہہ دیں گے۔ لیکن ایسے استثناؤں سے قانونی حکم نہیں بدلتا ہے۔ حرمت

---

(1) اس کا ذکر ان ہی اوراق میں کہیں پہلے گزر چکا ہے۔

نکاح وحرمت ذبیحہ احکام قانونی ہیں۔ یہ اس پر بھی جاری ہوں گے جب تک وہ فرقہ متمیز ومشہور نہ ہو جائے۔ خصوص جب تقیہ کا بھی شبہ ہو تو خواہ سوءظن نہ کریں مگر احتیاطاً عمل سوءظن ہی جیسا ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا معاملہ اس کے عقیدہ کے موافق ہوگا۔ اگر کوئی ہندو توحید کا بھی قائل ہو اور رسالت کا بھی، لیکن اپنے کو ہندو ہی سمجھتا ہو تو اس کے ساتھ آخر کیا معاملہ ہوگا، یہی حالت یہاں کی ہے۔ ضلع فتح پور میں ہندوؤں کی ایک جماعت ہے جو قرآن وحدیث پڑھتے اور نماز روزہ کرتے ہیں، مگر اپنے کو ہندو کہتے ہیں، لباس اور نام سب ہندوؤں جیسا رکھتے ہیں، اگر وہ اپنے کو ہندو کہیں اور اپنا مشرب ظاہر نہ کریں، تو کیا سامع کے ذمہ تفصیل واجب ہوگی۔

م۔ جناب کو ہر معاملہ میں اپنا کچا چٹھا لکھ بھیجتا ہوں، خدا کرے اس باب میں بھی آپ کا جواب باصواب میرے حق میں ذریعہ تشفی ہو جائے۔

ا۔ تشفی کا ذمہ تو مشکل ہے، خصوص اسی خشیت کا غلبہ خود مجھ پر بھی ہے۔ مگر حضرت جنیدؒ نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے حسین بن منصور کے خلاف فتویٰ لکھا تھا محض حفاظت شرع کے لیے ہم لوگ بھی ان ہی کے متبع ہیں اور راز اس کا وہی ہے کہ اس رعایت میں سادہ لوح مسلمانوں کی ہلاکت ہے۔ مولوی محمد شفیع صاحب (1) نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع اور نافع رسالہ لکھا ہے بعض اجزا میں میں بھی الجھا۔ مگر ان کی تقریر وتحریر سے قریب قریب صاف ہو گیا، وہ عنقریب چھپ جائے گا۔ میں نے اس کا نام رکھا ہے اصول الافکار الی اصول الاکفار (2)۔

م۔ ہاں حضرت ایک ضروری بات اب یاد پڑی۔ ایک بڑے ذی علم معتبر شخص نے حال میں مجھے لکھا کہ جناب نے اپنی کسی تصنیف میں نظر بد کا علاج یہ لکھا ہے کہ اس کی شرمگاہ دھوکر مریض پر پانی چھڑکا جائے۔ وہ فرماتے تھے کہ اس علاج میں حدیث نبویؐ کے لفظ داخلۃ الازار سے حضرت کو دھوکا ہوا ہے، جس کے معنی شرمگاہ کے کیے گئے ہیں، جو صحیح نہیں۔ ان کا قول تھا کہ یہی دھوکا حضرت سے قبل شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کو ہو چکا ہے۔ انھوں نے تو حوالہ بہشتی زیور کا دیا تھا، مگر مجھے سرسری تلاش میں نہ ملا۔

---

(1) مراد ہیں مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی مرحوم۔ سابق مفتی دیوبند۔ ومفتی اعظم پاکستان (قاسمی)

(2) وہ طبع ہوا ہے یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ (قاسمی)

ا۔میرے ذہن میں تو یہی تفسیر ہے۔اگر کسی نے اس کے خلاف لکھا ہو میں رجوع کرلوں گا۔

اس عامی کا ذہن ان ارشادات عالیہ سے تشفی نہ پاسکا۔10 دسمبر کے عریضہ میں پھر جرات کر کے کچھ عرض کیا اور پھر ادھر سے کچھ مزید جوابات ملے۔

م۔''تکفیر شیعہ کے مسئلہ میں ارشادات گرامی سے مستفید ہوا۔لیکن غالباً پہلے عریضہ میں اپنا مفہوم پوری طرح واضح نہ کرسکا تھا۔یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ وہ تحریف قرآن کے قائل ہیں، بیشک فتوئی وہی ہوگا جو آپ حضرات دے رہے ہیں۔لیکن یہی تو اصل مدار کلام ہے۔آیا یہ عقیدۂ تحریف قرآن ہے بھی، واقعتاً ان کے مذہب کا جز؟ مولانا(1) نے اپنے والا نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مولانا عبدالشکور صاحب کی نظر اس باب میں،ہم سب سے زیادہ وسیع ہےاور ایسا ہی کچھ جناب کے گرامی نامہ سے بھی مترشح ہے۔تو گویا تکفیر کا مدار ایک عالم کی روایت ٹھہرا۔

ا۔نہیں۔ بلکہ اس فرقہ کی مسلمہ کتابوں کی متواتر روایات۔ جو کتابیں ہم لوگوں نے نہیں دیکھیں۔ایک عالم نے دیکھیں۔مگر مدار صرف اس کے دیکھنے پرنہیں۔ بلکہ وہ دکھلانے پر تیار ہیں۔ وہ ایک عالم پتہ دینے والے ہیں۔اس سے صرف ان کے قول کا مدار ہونا لازم نہیں آتا۔

م۔میرا اصلی اشکال یہی ہے کہ اتنی بڑی اہم روایت جس سے لاکھوں افراد کا خروج عن الاسلام لازم آتا ہے،تنہا ایک راوی کے اعتماد پر (وہ راوی کیسا ہی متدین سہی) مان لیا جائے درانحالیکہ ہمارے ہاں کے صدہا علماء محققین اس مذہب کی کتابوں کا ہزار بارہ سو سال سے مطالعہ برابر کرتے آرہے ہیں اور اس فرقہ کی گمرہی پر بھی سب متفق ہیں اور پھر خود اس فرقہ کے علما اس عقیدہ سے انکار و تبری کررہے ہیں۔

ا۔تو وہ ان کتابوں کا کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا وہ کتابیں مسلم نہیں؟

م۔مولانا رشید احمد گنگوہیؒ،مولانا محمد قاسم نانوتویؒ،مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سب نے رد شیعہ میں لکھا ہے لیکن یہ بنائے تکفیر کسی نے نہیں تحریر فرمائی۔

ا۔کتابوں کے ہوتے یہ احتمالات کیا قوت رکھتے ہیں۔کیا عدم التفات اس کا سبب نہیں ہوسکتا۔

م۔میری فہم ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ ان سب حضرات کے اقوال میں تاویل کرنے سے یہ

(1) یعنی مولانا حسین احمد صاحب۔

آسان تر ہے کہ خود مولانا عبدالشکور صاحب کی تحقیق میں تاویل کر لی جائے، خصوصاً جب کہ مصالح ملت بھی اسی کے داعی ہیں۔

ا۔ کیا تاویل؟ اور آیا وہ اس تاویل پر مطلع ہو کر قبول بھی کریں گے۔ یا وہ تاویل المقول بما لا یرضیٰ به القائل میں داخل ہوگی۔

مشورہ: مولانا عبدالشکور صاحب سے بھی ان سب خیالات کو پیش فرمایا جائے۔

م۔ یہ خط بند ہی کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے ڈاک سے مشہور و مستند شیعہ مجتہد قاضی نور اللہ شوستری کی کتاب مصائب النواحب سے حسب ذیل اقتباس بھیج دیا ہے:

ما نسب الی شیعة الامامیة بوقوع التغیر فی القرآن لیس من ماقال به جمهور الامامیة انما قال به شر ذمة قلیلة ولا اعتداد بهم	شیعہ امامیہ کی جانب جو عقیدہ تغیر فی القرآن کا منسوب کیا گیا ہے، تو جمہور امامیہ اس کے قائل نہیں۔ یہ قول تو صرف ایک حقیر سی جماعت کا ہے، جو قابل اعتنا نہیں!

ا۔ اس کا مفصل جواب تو مولوی عبدالشکور صاحب دیں گے۔ مگر میں اس وقت قاضی صاحب کی نسبت اتنا سوال کرتا ہوں کہ اس شرذمہ قلیلہ کو جمہور امامیہ مسلمان سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو تصریح دکھلائی جائے اور اگر مسلمان سمجھتے ہیں تو کافر کو مسلمان سمجھنا اور تحریف قرآن کے عقیدہ کو کفر نہ سمجھنا یہ بھی کفر ہے یا نہیں، اگر نہیں تو کیوں۔ اگر ہے تو جمہور امامیہ کیا ٹھہرے''۔

(49)

وہ طویل مکتوب 10 دسمبر والا ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی چل رہا ہے اور یہ پورا نمبر بھی اسی کی نذر ہوگا۔ بہرحال پچھلے نمبر کی حضرت کی عبارت سے مسلسل آگے پڑھیے:

''جواب سابق جانے کے بعد اس کے متعلق ایک مختصر مضمون اور ذہن میں آیا تھا اگرچہ اس کی چنداں حاجت نہیں مگر ضیافت طبع کے طور پر اس کی نقل جداگانہ کاغذ پر بھیجتا ہوں۔

تنقیح علیٰ اصول الفقہ۔ تکفیر کے دو درجے ہیں۔ ایک فی ما بینہ و بین اللہ۔ یعنی جو معاملات عبد اور حق تعالیٰ کے درمیان ہیں ان کا مدار تو کفر باطنی پر ہے جس کا باتعیین کسی پر حکم نہیں لگایا جا سکتا اور دوسرا درجہ احکام ظاہرہ کے اعتبار سے ہے۔ اس کا مدار قوانین خاصہ پر ہے جو علما کے کلام

میں مدون ہیں۔ اس درجہ میں احتمالات غیر ناشی عن دلیل ملحوظ نہیں۔ ورنہ کسی کافر پر جہاد تک بھی جائز نہ رہے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ یہ دل میں مومن ہو اور اظہار کفر میں اس کے پاس کوئی واقعی عذر ہو اور ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر خلط اور خبط لازم آتا ہے۔

توضیح علیٰ اصول الکلام۔ ایمان جس طرح ایک اجمالی ہے، ایک تفصیلی اور دونوں مدار احکام ہیں۔ اسی طرح کفر بھی ایک اجمالی ہے ایک تفصیلی اور دونوں مدار احکام ہیں۔ پس جیسا فرقۂ اسلامیہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالایمان ہے گو ایک ایک عقیدۂ اسلامیہ کی تفصیل نہ کرے۔ اسی طرح کسی فرقۂ کفریہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالکفر ہے گو ایک ایک عقیدۂ کفریہ کی تفصیل نہ کرے۔ آگے ایک ضعیف سوال رہ جاتا ہے کہ اگر ایسے فرقہ کی طرف اپنے کو منسوب کرے جس کے کچھ عقائد اسلامیہ ہوں کچھ کفریہ اس کا کیا حکم ہوگا۔ سو قواعد سمعیہ وعقلیہ اس پر متفق ہیں کہ مجموعہ ایمان وکفر کا کفر ہی ہے۔ ''وَقَدْ صَرَّحَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا''۔ ورنہ دنیا میں ایسا کوئی کافر نہ نکلے گا جس کا ہر عقیدہ کفریہ ہی ہو کثرت سے کافر صانع کے قائل ہیں۔ کثرت سے معاد کے قائل ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر ننانوے وجوہ کفر کی ہوں اور ایک ایمان کی تو ایمان کا حکم کیا جائے گا۔ اس سے مراد کسی ایک ہی قول یا فعل کی وہ وجوہ ہیں جن میں دونوں احتمال ہیں جیسے ایک کلام کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔

م۔ حال میں ایک دوست کے پاس بسط البنان(1) کا انگریزی ترجمہ دیکھا۔ انگریزی ترجمہ کے لیے اس خاص رسالہ کے انتخاب کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ انگریزی خوانوں کو اس بحث سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر مترجم صاحب نے ترجمہ بھی (شاید افراط عقیدت کی بنا پر) لفظی ہی کیا ہے، انگریزی اور اردو طریق ادا میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ لفظی ترجمہ تقریباً مہمل ہو جاتا ہے

ا۔ مجھ کو رنگون کے خطوط سے معلوم ہوا کہ کسی بدعتی نے حفظ الایمان پر وعظوں میں میری تکفیر کی۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ وہاں اس عبارت کے جواب کی ضرورت ہوئی جو خود میں نے

---

(1) حضرت کا ایک پرانا رسالہ حفظ الایمان تھا۔ اس پر اہل بدعت کی طرف سے اعتراضات کا ہجوم تھا، آخر میں حضرت نے اپنی سابق تحریرات کی توجیہات لطیف کر کے اس رسالہ کا نام بسط البنان رکھ دیا تھا۔

جواب لکھا ہے وہ عدالت میں پیش کرنا تھا، اس لیے اس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا گیا، عوام کے لیے نہیں۔

م۔البتہ اس کے مقابل بڑی خوشی حل الاعتبابات (1) کو دیکھ کر ہوئی۔ کتاب البتہ انگریزی خوانوں کے ہاتھوں میں جانے کی تھی۔ میں حکیم صاحب کو طبیب حاذق جانتا تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ میدان تصنیف وتالیف کے بھی مرد ہیں۔ ماشاء اللہ خوب لکھا ہے۔ اعتبابات اس حل کے بعد کہیں زیادہ مفید ہو گئی ہے۔ دل آپ کی متعدد تصانیف کے لیے یہی چاہا کرتا ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کی شرح اسی طرح لکھ دے، تسہیل المواعظ اور تسہیل قصد السبیل والوں نے محض اتنا کیا ہے کہ بعض مشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ رکھ دیے ہیں۔ شرح لکھنے کا حق حکیم صاحب ہی نے ادا کیا ہے اور اصل ضرورت جس قسم کی شرح کی تھی وہ لکھ دی ہے۔ فالحمد للہ وجزاہ اللہ۔ کاش انگریزی زبان میں بھی اس کے منتقل ہونے کا اللہ تعالیٰ سامان کرا دے۔

یہ کام انگریزی دانوں کا ہے۔ مگر ان میں دو طرح کے لوگ ہیں۔

کریماں را بہ دست اندر درم نیست　　　خداوندانِ نعمت را کرم نیست

م۔لفظ داخلۃ الازار سے متعلق (بہ سلسلۂ عریضۂ گزشتہ) عرض ہے کہ لغت میں اس کے معنی لباس کے اس حصہ کے ہیں جو اندر کی طرف ہو۔

داخلة الازار طرفه الذی یلی الجسد (قاموس)

داخلة الازار طرفه الداخل الذی یلی الجسد (لسان العرب)

داخلة الازار طرفے کہ بہ تن رسد (صراح)

وفی حدیث الزھری فی العائن ویغسل داخلة ازاره قال ابن اثیر اراد یغسل الازار شرمگاہ کے لیے لفظ داخلۃ الرجل کا آتا ہے (لسان العرب)

لیکن یہ قول بھی لغت میں مل گیا۔

وقیل اراد یغسل العائن موقع داخلة ازاره من جسده ولا ازاره (لسان العرب)

---

(1) مولانا کے کلامی رسالہ الاعتبابات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ کی قابل قدر شرح از مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی۔

گویا لغت میں اصل اور صریح معنی تو لباس ہی کے نکلے، باقی ایک قول حصہ جسم کے متعلق بھی ہے اور ابھی ابھی زمخشری کے لغت غریب الحدیث الفائق پر نظر پڑی۔ اس میں لغت دخل کے تحت ملا۔ **قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد احدکم ان یضطجع علٰی فراشہ فلینزع داخلۃ ازارہ وروی صفۃ ازارہ ثم لینفض فراشہ فانہ لا یدری ماخلفہ علیہ ھی حاشیۃ الازار التی یلی جسدہ۔**

ا۔ میں نے بھی احتیاطاً مجمع البحار میں دخل و غسل کے مادہ میں دیکھا۔ مختلف فیہ تفسیر ہے۔ البتہ ترجیح غسل ثوب ہی کی تفسیر کو ہے۔ مجھ کو کبھی شبہ ہی نہ ہوا تھا۔ اب ترجیح الراجح (1) میں لکھوا دیا ہے اور وقت پر شائع ہو جائے گا اور یہ ترجیح تو قواعد روایت سے ہے لیکن قواعد روایت سے ترجیح معنی مجازی کو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس تدبیر میں بقیہ مغسولات سب اعضا ہیں دوسرے اگر کوئی صاحب ازار نہ ہو تو وہاں یہ تدبیر مکمل نہ ہو سکے گی۔

م۔ اب کی ترجیح الراجح صفحہ 52 پر، جو النور نمبر 2 و 3 کا صفحہ 8 ہے۔ کسی صاحب نے حدیث لولاک لما الخ کی کسی حد تک توثیق کرنا چاہی ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ شوکانی نے اپنی الفوائد المجموعہ فی بیان الاحادیث الموضوعہ میں اسے موضوعات میں شمار کیا ہے اور صفحہ 116 (وطبوعہ محمدی پریس لاہور) پر اسے درج کر کے لکھا ہے وقال الصعانی موضوع۔ اور بعینہٖ یہی عبارت طاہر الفتنی کی تذکرۃ الموضوعات (مطبوعہ مصر) کے صفحہ 86 پر درج ہے۔

ا۔ اول تو بعض حضرات ان احکام میں متشدد ہوتے ہیں، دوسرے اگر نفی حدیث کو روایت باللفظ پر اور مثبت حدیث کو روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے تو کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ پھر یہ احکام میں سے نہیں، فضائل میں سے ہے جن میں توسع ہے"۔

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا، جب تحقیقات عالی اور مضامین گرامی سے بھرے ہوئے ایسے لمبے لمبے والا نامے صادر ہوا کرتے تھے! اب وہ دن ہی خواب و خیال ہیں اور ان خوش نصیبوں کی جگہ صرف ان کی یاد اور ان کی حسرت لیے ہوئے ہے۔

---

(1) یہ رسالہ النور میں ایک مستقل عنوان ہوتا تھا، حضرت کو جب کبھی اپنی تحقیق سابق میں کچھ ترمیم کرنا ہوتی، اس عنوان کے ماتحت دے دیا کرتے۔

اب وفا ہے نہ جفا یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

حضرت سے اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود، جیسا کہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے، میں مقلد جامع نہ تھا اور فقہیات وکلامیات دونوں میں کبھی کبھی اپنی کم نظری سے اپنی ہی بات پر قائم رہتا تھا۔ حضرت نے بھی اس ڈھٹائی کی خوب اجازت دے رکھی تھی۔

مراسلت کا عام دستور یہ تھا کہ عریضہ نگاری کی ابتدا اس طرف سے ہوتی، ادھر سے اسی خط کے اوپر حاشیہ وغیرہ میں جوابات لکھ کر وہ خط واپس آ جاتا۔ لیکن از راہ کرم والتفات مزید، کبھی کبھی اس دستور عام کے خلاف حضرت خود مکاتبت میں ابتدا فرما دیتے اور ایسا اتفاق عموماً ہر سال ایک آدھ بار ہو جاتا۔ پچھلے والا نامہ کو آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا ہوگا کہ 21 دسمبر کو (19 دسمبر کا چلا ہوا) والا نامہ موصول ہو گیا۔

''ایک مضمون جواب معہود کے متعلق اور ذہن میں آیا۔ بس میرا اصلی مذاق یہ ہے۔ ازالۂ غلط فہمی کے لیے بڑھایا گیا ہے، اطلاع کے لیے آپ کی خدمت میں بھی لکھنے کو دل چاہا۔

تصریح (1) الجواب علیٰ اصول التصوف۔ جواب بالا مع اپنے کل اجزا کے درجہ منع میں ہے۔ یعنی فتویٰ مذکورہ پر جو شبہات تھے، ان کا جواب ہے۔ جواب بالا خود فتویٰ نہیں۔ چونکہ سرسری نظر میں اس کو فتویٰ سمجھا جا سکتا تھا اس لیے تسہیل امر کے لیے اپنی تحقیق خاص اس باب میں معروض ہے اور یہ تحقیق بہ اعتبار اپنی حقیقت کے فقہ اور کلام ہی میں داخل ہے۔ مگر بہ اعتبار صورت کے اس کو تصوف سے خاص قرب ومناسبت ہے۔ اس لیے عنوان میں اس کا لحاظ رکھا گیا۔ وہ تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی خاص شخص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو خواہ تردد کے اسباب علما کا اختلاف ہو، خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض ہو تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جائے نہ اسلام کا۔ حکم اول میں تو خود اس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دوسرے مسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے، پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا۔ یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتدا

---

(1) تسہیل (قاموس)

کریں گے نہ اس کا ذبیحہ کھائیں گے اور نہ اس پر سیاسیات کا فرانہ جاری کریں گے۔ اگر تحقیق کی قدرت ہو تو اس کے عقائد کی تفتیش کرلیں گے اور اس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے احکام جاری کریں گے اور اگر تحقیق کی قدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے۔ اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے لا تصدقوا اهل الكتاب ولا تكذبوا هم وقولوا آمنا بالله وما انزل الينا رواه البخاری۔ دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کے ہیں۔ يوخذ فيه بالاحوط والاوثق فی امور الدين وان لا يحكم بثبوت حكم وقع الشك فی ثبوته واذا وقف خلف الامام قام بين صف الرجال والنساء ويصلی بقناع ويجلس فی صلاته جلوس المرأة ويكره له فی حياته لبس الحلی والحرير وان يخلو به غير محرم من رجل او امرأة او يسافر من غير محرم من الرجال وان مات لم يغسله رجل ولا امرأة وتيم بالصعيد ويكفن كما يكفن الجارية"۔

(50)

وہ بحث تو ابھی چل ہی رہی تھی، گو اسے اب اپنی طرف سے ختم کر رہا تھا۔ بزرگوں کے ساتھ اپنا ایک معمول، خود ان ہی بزرگوں سے سیکھا ہوا یہ بھی رہا کہ دو ایک بار کے ردوبدل کے بعد ادباً خود ہی خاموشی اختیار کر لیتا ہوں۔ ایک سیاسی بحث کا بھی ایک نیا پہلو سامنے آ گیا اور کچھ اثر اس کا بھی پڑا کہ حضرت اب اپنے وقت موعود کو بہت قریب محسوس فرما رہے ہیں۔ یہ سارے تاثرات ملے جلے ہوئے سال کے آخری عریضہ 23 دسمبر 1932 والے میں نظر آئیں گے۔

م۔ "گرامی نامہ نے سرفراز کیا۔ اس شفقت بزرگانہ (1) پر دل خاص طور پر سیاسی گزرا ہوا ایک علاحدہ پیکٹ میں ایک شیعی عالم کا رسالہ اس مبحث (2) پر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

ا۔ اب کی بار جواب میں خلاف عادت قدرے دیر ہوئی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ایک روز رسالہ کے دیکھنے اور اتفاق سے مولوی حبیب احمد آ گئے تھے ان کے دکھلانے میں صرف ہوا۔ پھر

---

(1) یعنی اب کی مکاتبت میں ابتدا کرنا اور مسئلہ کا فیصلہ اپنے اصلی مذاق کے مطابق، مسلک تصوف پر کرنا۔
(2) یعنی "تحریف قرآن کی حقیقت" از مولوی سید علی نقی صاحب (امامیہ مشن لکھنؤ)

چونکہ ان کی نظر اس جماعت کی کتابوں پر ہے میں نے ان سے اس کے متعلق رائے لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کی نقل میں ایک دن کی دیر ہوئی۔ چنانچہ وہ تحریر بھی ہمراہ ہے۔ اصل رسالہ بھی تطبیق مقامات کے لیے مرسل ہے۔ مولوی حبیب احمد کی استدعا ہے کہ ایسا ہی رسالہ اگر ممکن ہو بہ قیمت یہاں بھجوادیا جائے میں اطمینان سے مفصل تنقید کروں گا۔ یہ ان کا قول ہے۔ اب میرا قول ہے کہ اگر آسکے تو اس کی قیمت میرے ذمہ ہے۔ مولوی صاحب کے عنوانات کو نہ دیکھیے، مضمون کو رسالہ پر منطبق کر کے دیکھیے اور میری نظر ان کی کتابوں پر ہے نہیں، میں زیادہ مدد نہیں دے سکتا۔

م۔ جناب کا تو ایک خاص مسلک انزوا اور عزلت کا ہے، مجھے زیادہ فکر وحیرانی دوسرے علما سے متعلق ہے۔ خصوصاً حضرات فرنگی محل اور جمعیۃ العلما اور سب سے بڑھ کر خود اپنے مولانا کے متعلق۔ ان حضرات کا شیعوں کا ساتھ سیاسی جلسوں میں برابر رہا کرتا ہے۔ یہ شیعہ رئیسوں کی مہمانداری قبول کرتے ہیں، ان کے ہاں ٹھہرتے ہیں، شیعہ اکابر کو جلسوں کا صدر بناتے ہیں (1) غرض سارا اختلاط بالکل مسلمانوں کا سا۔ فتویٰ تکفیر کے ساتھ ان اعمال کا تطابق میری سمجھ سے باہر ہے۔

ا۔ ایسے برتاوے میں تو میں بھی مبتلا ہوں۔ میں اگر کہیں نہیں جاتا سو وہ تو میرے پاس آتے ہیں۔ میں بھی برتاؤ مسلمانوں جیسا کرتا ہوں صرف اس بنا پر کہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور حقیقت اس برتاؤ کی محض خوش اخلاقی ہے (2)۔

م۔ رسالہ استواء (3) کے خاتمہ پر جو عربی عبارت درج ہوئی ہے اس سے دل بہت متاثر ہوا۔ پچھلے مہینہ زبانی میں نے جناب والا سے یہی مضمون سنا تھا۔ اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے (4) بلا تشبیہ وہی کیفیت ہوئی جو آیۂ کریمہ **الیوم اکملت لکم دینکم** الخ کو سن کر حضرت صدیقؓ کی ہوئی تھی۔

ا۔ آپ کی عین محبت ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔ میرا دل آپ کے اس تاثر سے متاثر ہوا جس کا

---

(1) چند ہی روز قبل لکھنؤ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جلسے بہت دھوم دھام سے ہوئے تھے، ان میں سنی علما نہ صرف شیعہ ممبروں کے ساتھ شیر وشکر تھے بلکہ متعدد علمائے کرام مشہور شیعی رئیس، راجہ احمد علی خان (سلیم پور) کے برابر مہمان رہا کیے۔ (2) یہ یقیناً مولانا کی خوش اخلاقی تھی کہ اپنی مثال ان علما کے ساتھ پیش کر دی۔ دونوں کے طرز عمل میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ (3) رسالہ کا پورا نام اب یاد نہیں، بہرحال مولانا نے اس میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اب تصنیف وتالیف کا دور ختم ہوگیا۔ (4) ملاحظہ ہو نمبر (46)۔

اجر دونوں کے لیے متوقع ہے۔ کیونکہ یہ اثر ہے حب فی اللہ کا۔

م۔ خدا جانے آپ کو کیا کچھ معلوم ہوا ہوگا جب ہی تو آپ نے اپنی تصانیف کے خاتمہ کا اعلان فرما دیا۔

ا۔ صرف بڑھاپا اور کچھ نہیں۔

م۔ میں تو خالص اپنی خودغرضی کی بنا پر دعا کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں، کم از کم اس وقت تک تو ضرور ہی جناب کو بھی زندگی عطا ہو۔

ا۔ اور اگر پھر کوئی یہی دعا کرے تو میں کہاں تک کھنچتا چلا جاؤں۔ یہ دعا کیجیے کہ وہاں سب مل جائیں۔

م۔ پنجاب سے ایک صاحب نے بیچ میں سوال کیا ہے کہ اسلام تو عین سیاست ہے اور جہاں فرض۔ پھر یہ دیو بند والوں نے طلبہ کے لیے سیاسیات میں شرکت کیسے منع قرار دے دی(1)۔ اس کا جواب یہ لکھ رہا ہوں کہ دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایک تو نفس جہاد ہے۔ یعنی ظالم و غاصب بے دین اور دشمن دین حکومتوں سے بہ قدر استطاعت مقابلہ کرتے رہنا، سو یہ تو عین اسلام ہے اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں، اب اس کے آگے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ امت کے فلاں فلاں افراد، یا فلاں فلاں طبقہ، یا فلاں فلاں ادارے کے لیے خود مصالح امت کے لحاظ سے اس میں شرکت مفید و مناسب ہوگی یا مضر و نامناسب، تو یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کے اندر مسلک و رائے کے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ سرپرست مدرسہ و مہتمم مدرسہ کے تجربہ میں اگر طلبہ کی شرکت مضر و نامناسب ثابت ہوئی ہے تو یہ کچھ اس حکم عموی کے منافی نہیں۔ اپنے اس جواب کی بابت رائے عالی چاہتا ہوں۔

ا۔ اپنے درجہ میں یہ بھی اچھی تحقیق اور اچھا فرق ہے۔ خصوص ان مخاطبین کے لیے بالکل کافی ہے۔ مگر چونکہ ہم طالب علم لوگ(2) اپنے درسی اصول پر انطباق کے منتظر رہتے ہیں اور ایسا

(1) حضرت مولانا اس وقت تک مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے۔ سرپرست اور مہتمم کی طرف سے بیان شائع ہوا تھا کہ طلبہ عملی سیاسیات میں حصہ نہ لیں۔

(2) مولانا کے محاورہ میں اس سے طبقہ علما مراد ہوتا تھا۔

انطباق میرے ذہن میں آیا نہیں اس لیے ایک تقریر میں نے لکھی ہے، وہ پیش کرتا ہوں۔ یہ بالکل منطبق ہے۔ محض آپ کی تفریح کے لیے لکھی ہے نہ کہ ان سائلین کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے۔ لیکن اگر کوئی جملہ آپ کے مضمون میں داخل ہو سکے اور آپ جز بنانا چاہیں تو میری طرف منسوب نہ فرمایا جائے''۔

خوش تر آن باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

دوسرے پرچہ پر اصل تقریر حضرت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ وہو ہذا:

''تین رفیق سفر کر رہے ہیں۔ کسی مقام پر پہنچ کر دیکھا کہ عین راستہ پر ایک شیر کو تین چار بھیڑیے لپٹ رہے ہیں اور راستہ بند ہے۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں۔ البتہ ان کے سامنے اینٹیں اور پتھر پڑے ہیں۔ ان تینوں میں اختلاف رائے ہوا اور رائے کے اختلاف سے عمل میں اختلاف ہوا۔ ایک کی رائے ہوئی کہ شیر کی امداد کرنا مناسب ہے۔ اگر یہ غالب آ گیا تو طبعاً اس احسان سے متاثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کرے گا اور میں اطمینان سے اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ یہ خیال کر کے اینٹوں سے بھیڑیوں کو مارنا شروع کیا۔ دوسرے کی یہ رائے ہوئی کہ شیر اکیلا، بھیڑیے متعدد ہیں۔ غالباً غلبہ ان ہی کو ہوگا۔ اگر ان کی نصرت کی تو طبعاً یہ اس احسان سے متاثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کریں گے اور میں امن وامان کے ساتھ اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ یہ خیال کر کے اینٹوں سے شیر کو مارنا شروع کیا۔ تیسرے کی یہ رائے ہوئی کہ اینٹیں نہ شیر کی مدافعت کے لیے کافی ہیں نہ بھیڑیوں کے لیے کافی ہیں اور ایسی حالت میں اگر منصور مغلوب ہو گیا تو غیر منصور کو خواہ مخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنالیا اور اگر غالب بھی ہو گیا تب بھی جانور ہے جس کی طبیعت عقل پر غالب ہے، کیا توقع ہے کہ احسان سے متاثر ہو کر رعایت کرے گا، موقع پا کر وہ بھی طبعاً مزاحمت کرے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ جب تک قابل اطمینان اپنے پاس مدافعت کا سامان نہ ہو کسی کی نصرت نہ کی جائے بلکہ جس طرح ممکن ہو اپنی حفاظت کی کوشش کی جائے۔ پھر غلبہ کسی کو ہو۔ ممکن ہے کہ ہمارے عدم تعرض کے سبب یہ بھی تعرض نہ کرے اور اگر تعرض بھی کیا تو اس کا افسوس تو نہ ہوگا کہ ہم نے خواہ مخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنالیا۔ اس لیے یہ دونوں سے علاحدہ ہو کر اپنی حفاظت

میں مصروف ہوگیا اور جس طرح بن پڑا ان کی زد سے سکوت وسکون کے ساتھ نکل گیا اور دور سے چکر کاٹ کر اسی راستہ پر جا پڑا۔ اب آگے اس کی قسمت کہ وہ شیر یا بھیڑیے وہاں بھی پہنچ گئے۔

یہ تین جدا جدا طریقے ہیں جن کو ان تین شخصوں نے اپنے لیے اختیار کیا۔ اگر ان لوگوں نے صریح قوانین عقلیہ کی مخالفت کی ہو اور نیت بھی کسی کی فاسد نہ ہو تو کسی شخص پر کوئی عقلی ملامت نہیں ہو سکتی اور اگر کسی شخص کو اس کے مجوزہ طریق کا مضر ہونا صحیح دلائل سے بتلا دیا جائے اور اس کے پاس کوئی معقول جواب بھی نہ ہو اور وہ پھر بھی اسی پر مصر رہے تو پھر وہ ضرور مستحق ملامت ہوگا۔ یہ مثال ہے بعض خاص معاملات اور آرا کی واللہ اعلم، بیزان کل مضمون بروایت بعض شعرا مجنون۔

جبکہ دو موذیوں میں ہو کٹ پٹ　　　　اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ"

سیاسیات حاضرہ سے متعلق حضرت کی اصل رائے یہی تھی جو اس تمثیل کے پیرایہ میں بیان فرما دی گئی۔ یہ مسلک کہاں تک صحیح تھا اس سے بحث نہ اس وقت تھی نہ اب ہے۔ بہر حال مولانا کا اصل مسلک اسی تمثیل سے واضح ہو جاتا ہے۔ انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان "رسہ کشی" میں وہ مسلمانوں کو بالکل غیر جانبدار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے، ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مرادف ہوگا اور سارا زور اسی پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوت نظم پیدا کریں۔

(51)

1932 ختم ہو کر 1933 شروع ہو چکا ہے اور جنوری شروع ہونے سے تین دن پہلے ہی ماہ رمضان المبارک 1351ھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ تفسیر بیان القرآن سے کام تو پہلے ہی سے لے رہا تھا۔ اب اور زیادہ لینے لگا ہوں اور جتنا زیادہ کام لے رہا ہوں، گرویدگی بھی اسی نسبت سے بڑھتی جا رہی ہے۔ عربی کی مشہور تفسیریں اکثر پہلے سے موجود تھیں۔ ایک روح المعانی البتہ اب تک نہیں ہے اور اس کا اشتیاق بیان القرآن ہی میں اس کے بار بار حوالہ دیکھ کر بڑھتا جا رہا ہے اور دل میں کچھ نہ کچھ کرید اب بھی اسی مسئلہ تکفیر شیعہ کے متعلق باقی ہے۔ 4 جنوری (7 رمضان) کا عریضہ مع جواب حسب ذیل ہے:

م۔ "والا نامہ مولوی حبیب احمد کی تحریر کامل گیا تھا۔ میرے لیے تو خود جناب ہی کے

ارشادات زیادہ موثر رہے۔

ا۔آپ کی محبت سے مجھ کو اس کا یقین ہے، وہ چونکہ ان مباحث کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، آسانی کے لیے ان سے لکھوالیا اور میرا یہی معمول ہے کہ کام کو مقصود سمجھتا ہوں خواہ کسی کی طرف منسوب ہو۔

م۔کتاب کئی روز ہوئے ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ میرے پاس ایک دوسرا نسخہ موجود تھا۔اس لیے قیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ا۔پہنچ گئی۔آپ سے کیا انکار ہے۔

م۔کچھ روز سے ترجمۂ کلام مجید پڑھانا شروع کیا ہے۔ زمانہ درس میں بیوی اور لڑکیاں ہوتی ہیں، مردانہ درس میں دو چار ملنے والے ہوتے ہیں۔اندر شیخ الہند کا ترجمہ کام میں رہتا ہے اور باہر آپ کی حمائل مترجم۔درس سے قبل میں خود دو چار تفسیروں کا مطالعہ کر رکھتا ہوں۔ بیان القرآن سے کام تو عرصہ سے لے رہا ہوں۔لیکن اب اس ضرورت سے جو اس کو غور سے پڑھنا پڑا تو اس کی پوری قدر اب جا کر ہوئی۔ ربط آیات میں تو ماشاء اللہ بے نظیر ہے، قصہ ہاروت و ماروت پر جب پہنچا تو طبیعت پھڑک گئی۔قدیم مفسرین نے تو خوش عقیدگی میں غلو کر کے فرشتوں کا مبتلائے فسق ہونا نقل کر دیا ہے اور بعض مفسرین حال نے ان فرشتوں کو شیاطین قرار دے دیا ہے۔افراط و تفریط سے الگ، توسط واعتدال کی راہ تو بس آپ ہی کی تفسیر میں نظر آئی۔ سبحان اللہ وجزاک اللہ۔

ا۔آپ کی دعا پر میں یہی دعا دل سے دیتا ہوں کہ جزاک اللہ۔

م۔ہاں سورۂ یوسف میں اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِھِنَّ عَلِیْم کے تحت میں کید سے مراد زنان مصر کا نہیں بلکہ جنس نسوانی کا کید لیا ہے۔ میرے دل کو تو یہی تفسیر لگی۔لیکن یہ قول اور کہیں منقول نہیں دیکھا۔روح المعانی میرے پاس نہیں، ممکن ہے اس میں ہو۔ باقی ابن کثیر، معالم، خازن، کشاف، بیضاوی وغیرہ میں تو زنانِ مصر ہی سے مراد لی گئی ہے۔

ا۔روح المعانی اس وقت دیکھی۔اس میں ایک قول یہ بھی لکھا ہے۔مگر تضعیف کے ساتھ سو یہ ان کا مذاق ہے، جو دوسروں پر حجت نہیں۔

م۔تکفیر شیعہ کے سلسلہ میں ابھی ایک اور شبہ پیش کرنے سے رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ ہمارے

محدثین نے ان کی روایتیں قبول کی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ دینی امور میں اہل صحاح نے شہادتیں ان کی قبول کی ہوں جنھیں وہ کافر سمجھتے تھے۔

ا۔ وہ شیعہ اہل غلو نہ تھے۔ ورنہ اہل غلو کی روایت کو تصریحاً رد کیا ہے۔ تمام اصول حدیث میں مسئلہ مصرح ہے۔ ایک عبارت ذہبی کی لکھوا کر بھیجتا ہوں۔

م۔ دل میں ایک تمنا عرصہ سے پال رہا ہوں۔ حسب دستور اسے صاف صاف خدمت والا میں عرض کیے دیتا ہوں۔ ظناً تو ہر مسلم کو ناجی اور ہر غیر مسلم کو ناری سمجھتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات بے اختیار دل یہ چاہتا ہے کہ ایک قطعی جنتی اور کسی ایک یقینی جہنمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، بیداری میں نہ سہی خواب میں سہی۔ اس آرزو کے پورے ہونے کا کوئی امکان ہے؟

ا۔ مگر یقینی جنتی یا یقینی دوزخی ہونا بدوں وحی کے کیسے معلوم ہوگا اور وحی منقطع ہے تو پھر اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے''۔

بعض بعض خطوط تمامتر ذاتی اور خانگی ہی باتوں پر مشتمل ہوتے۔ مولانا تو میرے سب ہی کچھ تھے۔ ع

اے تو افلاطون و جالینوسِ ما!

ان میں سے جو خط جوابی کارڈ کی صورت میں ہوتے، ان کے تو صرف جواب ہی محفوظ رہ گئے ہیں اور اس کے جاننے کی صورت اب نہیں کہ اصل خط ادھر سے کیا گیا تھا۔ دو پوسٹ کارڈ شروع 1932 کے اسی قسم کے نکلے۔ 16 رمضان المبارک (13 جنوری) یوم جمعہ کی شام کو گھر میں لڑکی کی ولادت ہوئی۔ یقیناً دوسرے ہی دن حضرت کو اطلاعی کارڈ لکھا ہوگا، مع نام رکھنے کی درخواست کے۔ بہرحال 17 جنوری کا کارڈ حسب ذیل ملا:

''تولد دختر نیک اختر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ صاحب عمر و صاحب علم و صاحب عمل و صاحب نصیب کرے۔ سوچنے سے سمیراء اچھا معلوم ہوا۔ ایک صحابیہؓ کا نام بھی ہے جو قیس کی بیٹی ہیں کذا فی القاموس۔ سمرت کے معنی مشہور ہیں لون بین البیاض والسواد جس کو گندمی رنگ کہتے ہیں اور ایک نا عفیراء بھی ہوسکتا ہے۔ عفراء کے معنی بیضاء کے لکھے ہیں اور ایک عورت کا نام بھی ہے کذا فی القاموس، باقی دعا کرتا ہوں''۔

یہ دونوں نام اس مناسبت سے تھے کہ دو بہنوں کے نام حمیراء اور زہیراء موجود تھے۔ میں نے دوسرے خط میں یقیناً یہ عرض کیا ہوگا کہ یہ نام عورتوں کے عام فہم نہیں معلوم ہوئے۔ ایک دوسرا قافیہ خاندان میں 'عابدہ' کا بھی چل رہا ہے۔ اگرچہ گھر میں آپ سے اتنی عقیدت ہے کہ آپ کی تجویز میں کسی ترمیم کو بھی وہ گوارا نہیں کرتیں۔ بہرحال 21 جنوری کا چلا ہوا کارڈ اس کے جواب میں یہ آیا:

''میں تو اتنی عقیدت کو بھی پسند نہیں کرتا جس قدر آپ لیے ہوئے ہیں تو ان کی عقیدت کو تو کیا پسند کرتا۔ آپ کی عقیدت کو صغیرہ سمجھتا ہوں ان کی عقیدت کو کبیرہ۔ آپ کبیرہ پر تعجب فرماتے ہیں مگر ناقص العقل سے مستبعد نہیں۔ میں اس سے زیادہ صغیرہ پر تعجب کرتا ہوں کہ کامل العقل سے وہ بھی مستبعد ہے۔ مگر خیر اس کا انتظام تو میں کیا کرتا، چند نام لکھے دیتا ہوں۔ ماجدہ، ساجدہ، راشدہ، شاہدہ، جو عام پسند ہو''۔

اس کتاب میں خطوط عموماً صرف اپنے نام کے درج کر رہا ہوں۔ لیکن دو ایک خط اگر دوسروں کے (خصوصاً اپنے عزیزوں، قریبوں کے) نام کے بھی درج کر دوں، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت کا معمول ''سفارشوں'' کے باب میں بھی بڑی احتیاط کا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اس بارہ میں صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں۔ یعنی صاحب غرض کا کام کسی طرح نکل جائے اور اس رخ پر غور ہی نہیں کرتے کہ جس حاکم یا صاحب اختیار کے پاس سفارش جا رہی ہے اس کی طبیعت پر کیا بار پڑے گا۔ فرماتے تھے کہ کسی کا کام نکال دینا ایک امر مستحب ہے۔ لیکن مسلمان کو اذیت قلب سے بچانا تو درجۂ واجب میں ہے۔ استحباب کے لیے یہ ترک واجب کیسے جائز ہوگا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ان دنوں میرے بھائی صاحب سہارنپور میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ ان کے اجلاس میں ایک مقدمہ آیا۔ صاحب معاملہ نے جا کر حضرت کو گھیرا۔ ذیل کا مختصر و جامع سفارش نامہ (لفافہ پر مہر 15 مارچ 1933 کی ہے) حضرت کی اسی محتاط عادت اور حکیمانہ روش کا کیسا قابل تقلید نمونہ ہے۔

''از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی جناب ڈپٹی صاحب دام لطفہم۔ السلام علیکم۔

ایک صاحب میرے ملنے والے...... ہیں۔ ان کے ایک عزیز کا مقدمہ آپ کے اجلاس

میں ہے۔ مجھ کو واقعہ معلوم نہیں۔ دوسرے پرچہ پر مجمل یادداشت (1)...... کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میرے عادت اپنے عنایت فرماؤں کو مجبور کرنے کی نہیں۔ لیکن جائز رعایت سے مسلمان کو نفع پہنچانا مستحسن ہے۔ یہ دونوں پرچے چاک فرما دیجیے۔ والسلام۔ از تھانہ بھون"۔

مارچ کے مہینہ میں طبیعت خراب ہوئی۔ اور بخار و نزلہ کئی دن تک برابر قائم رہا یہ معذری اور نیم معذوری خود ایک سبب بن گئی ذیل کے مکتوب اشرف کا:

م۔ آج ایک ہفتہ سے مسلسل تپ میں مبتلا ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عاجل عطا فرمائے۔

م۔ گو بحمد اللہ شدید نہیں لیکن قائم ہر وقت ہے، کبھی ہلکی، کبھی تیز۔

ا۔ سب رحمت ہے۔

م۔ دو ایک روز تکلیف زائد رہی۔ اب بحمد اللہ ہر تکلیف میں تخفیف ہے۔

ا۔ الحمد للہ۔

م۔ لیکن طبیعت تو فوری ازالہ چاہتی ہے، محض افاقہ پر کب قانع ہوتی ہے۔

ا۔ جب ہی تو مجاہدہ ہو سکتا ہے۔

م۔ اب زیادہ تکلیف دردسر کی ہے۔

ا۔ یہ بھی افتقار ہے جو مطلوب ہے۔

م۔ خصوصاً سجدہ کے وقت۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گدی کے اوپر ہتھوڑی کی ضرب پڑتی ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ راحت و سکون بخشے۔

م۔ شروع میں دو چار روز ہمت کر کے وضو کرتا رہا۔ اب ہمت چھوٹ گئی۔ تیمم پر گزر رہے۔

ا۔ وہ بھی عذر کی حالت میں وضو سے کم نہیں۔

م۔ مسجد بحمد اللہ جاتا ہوں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نماز بھی مجھی کو پڑھانا پڑتی ہے۔ "جماعت" میں دو ہی چار آدمی جو شریک ہوتے ہیں، بیچارے معمولی ناظرہ خوان تک نہیں۔ اب نہ ترک جماعت کرتے بنتی ہے، نہ محض تیمم سے نماز پڑھانے پر دل آمادہ ہوتا ہے۔ عجب کشمکش رہتی ہے۔

(1) یہ یادداشت کل چار سطروں سے بھی کم کی ہے!

ا۔ قانون شرعی کے ہوتے ہوئے کشمکش کی کیا ضرورت ہے جب مقیم کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔

م۔ ایک آدھ وقت تو کسی اور صاحب کو پکڑ بلایا، لیکن اب ہر وقت اس سے کیونکر کام چلے۔

ا۔ یہ کام نہ چلنا ہی زیادہ نافع ہے کہ امامت کی فضیلت نصیب ہوتی ہے۔

م۔ التماس دعا ظاہر ہی ہے۔

ا۔ دل سے دعا ہے۔

م۔ تعویذ صحت بھی مرحمت ہو جائے تو نور علیٰ نور۔

ا۔ پیشکش ہے، اگرچہ اس کام کا نہیں ہوں۔ اس میں بخار اور دردِ سر دونوں کی رعایت ہے"۔

(52)

وسط اپریل کے لیے مختصر حاضری کا پروگرام تھا اور حسب دستور خدمت والا میں اطلاع کردی گئی۔ 11 اپریل کے جوابی کارڈ میں صرف اتنا ملتا ہے۔

"اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملادے۔ جو جو تجویز فرمایا ہے ویسا ہی عمل ہوگا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون"۔

کب پہنچا اور کب تک ٹھہرا اور کیا کیا باتیں رہیں، یہ اب ذہن میں کچھ بھی محفوظ نہیں۔ اغلب یہ ہے کہ حسب دستور تین دن ٹھہرا ہوں گا۔ ایک دن کا صرف ایک ملفوظ سن لیجیے۔ یہ یقینی نہیں کہ یہ ملفوظ اسی مرتبہ کی حاضری میں حاصل ہوا۔ ممکن ہے اس سے پہلے کی کسی حاضری میں ہو چکا ہو۔ بہرحال یہ کوئی اہم فرق نہیں اور یاد تو اسی موقع پر پڑ گیا ہے۔ گفتگو مرد کی دو بیویوں یا دو شادیوں پر چلی۔ ارشاد ہوا کہ دو بیویوں کو نباہنا سلطنت کے چلانے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس پر ذرا حیرت ہوئی کہ یہ کیا فرمایا جا رہا ہے۔ معاً آگے ارشاد ہوا کہ یہ اس لیے کہ سلطنت کے انتظامات محض ضابطے سے ہوتے ہیں اور میاں بیوی کے معاملہ میں تعلق دل کا بھی ہو جاتا ہے۔ اس کو سنبھالنا سلطنت کے سنبھالنے سے نازک تر اور دشوار ہے۔

اتنا حکیمانہ کلمہ حکیم الامت ہی کی زبان سے نکل سکتا تھا۔

واپسی کے بعد خدا معلوم خط ڈاک میں کہاں ضائع ہوگیا کہ تین چار ہفتہ تک کچھ خیریت نہ دریافت ہوئی۔ مضطرب ہوکر جوابی کارڈ لکھا۔ جواب 16 مئی کا چلا ہوا یہ موصول ہوا:

''تعجب ہے خط کہاں رہا اور یہاں نہیں پہنچا۔ ورنہ میں تو عموماً سب کو التزام سے جواب دیتا ہوں اور خصوصاً احباب کو زیادہ التزام کے ساتھ۔ میں بفضلہ تعالیٰ بالکل خیرت سے ہوں اطمینان فرمائیں۔ آپ کی اس محبت کا جس سے دوسرے احتمالات پیدا ہوئے ممنون ہوں''۔

اس درمیان میں یعنی مئی کی کوئی تاریخ تھی کہ چھوٹی بچی کو معمولی آشوب چشم کی شکایت ہوئی اور سوا تفاق کہ اسی میں اس کی ایک آنکھ کے دیدہ میں سفیدی آگئی اور اس کی بصارت جاتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اختلاج زدہ ماں بدحواس ہوگئیں اور مجھ سے اسی وقت حضرت کی خدمت میں خط لکھوایا۔ وہ خط تو میرے ذخیرہ سے کہیں غائب ہوگیا۔ اس کے بعد کا میرا خط 28 مئی کا لکھا ہوا ہے۔ حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری میرٹھی مرحوم کا نام تو آپ کو یاد ہوگا، ذکر ابھی قریب ہی کے کسی نمبر میں آچکا ہے۔ ایک حاذق ترین طبیب تھے، خصوصاً آنکھ کے معالجات میں۔ ان کا تذکرہ آگے بار بار آئے گا۔ اب وہ 28 مئی کا عریضہ مع جواب ملاحظہ ہو:

م۔ ''میری حماقت کہ پچھلے جوابی کارڈ کے اوپر اپنا پتہ لکھنا خیال ہی نہ رہا۔

ا۔ رنج کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے۔ خدا نہ کرے حماقت ہوتی تو یاد آنے کا افسوس ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ افسوس نتیجہ ہے ادراک کا، اور حماقت مضاد ہے ادراک کے۔

م۔ جب خط ڈاک میں جا چکا تو خود ہی یاد پڑا، لیکن اب بے سود تھا۔

ا۔ ہوسکتا تھا کہ ایک غیر جوابی کارڈ پر پتہ لکھ کر بھیج دیا جاتا مگر رنج کے غلبہ میں اکثر ایسے امور بھی ذہن میں نہیں آتے۔

م۔ حسب ارشاد والا جناب حکیم محمد مصطفیٰ صاحب کے لیے لڑکی کا حال عرض کرتا ہوں۔

ا۔ وہ پرچہ اتار کر یادداشت میں رکھ لیا ہے مع پتہ کے۔ وہ آئیں گے تو پیش کر کے جواب لکھ کر بھیجوں گا۔

م۔ ایک طبیب حاذق میرے عزیز قریب بھی ہیں۔ انھوں نے آنکھ دیکھ کر کہا کہ اتنی کمسنی میں مرض کا ازالہ ہو جانا اور بصارت کا پوری طرح عود کر آنا دشوار نہیں۔

ا۔جی کوتو لگتا ہے۔خدا کرے یہاں بھی یہ خیال صحیح ہو۔

م۔عورتیں کہتی ہیں کہ دیدہ کے باقی حصہ میں چمک تندرست آنکھ ہی کی طرح ہے۔ والامر بیداللہ۔

ا۔تسلی ہوئی۔مجھ کو جب بھی خیال آجاتا ہے تجدید دعا کرتا ہوں۔

م۔مولانا مدظلہ (1) نے ارشاد فرمایا کہ بچی کی ماں ہر نماز کے بعد آنکھ پر سات بار آیۂ کریمہ فکشفنا عنک غطاء ک الخ دم کر دیا کریں، نیز صبح و شام سات سات بار سورۂ فاتحہ ومعوذتین۔

ا۔میں اکثر ایسی شکایات کے لیے بتلایا کرتا ہوں کہ بعد نماز پنج گانہ یا نور 150 بار آنکھوں پر دم کر دیا جائے اور چونکہ آیات قرآنی نہیں، اس لیے زمانہ تاخیر نماز میں بھی جائز ہے''۔

مکتوب کا موضوع کیسا ہی ذاتی اور خانگی قسم کا سہی، لیکن ہر جواب کے اندر کوئی نہ کوئی تعلیم موجود، اس کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا ہوگا اور اب تازہ نمونہ مل گیا۔ان ہی موقعوں کے لیے ایک اور عارف (2) نے کہا ہے۔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

وہ ذاتی موضوع مکاتیب کا اب بھی چل رہا ہے۔لیکن اب اس میں کچھ اور غیر ذاتی چیزیں بھی شامل ہو گئیں۔8 جون کے مکتوب میں ہے:

م۔''حکیم صاحب امید ہے اس وقت تک خدمت والا میں پہنچ چکے ہوں اور بچی کی آنکھ کا تذکرہ ان سے آچکا ہو۔

ا۔انتظار رہتا ہے مگر ابھی نہ خود آئے نہ کوئی خط آیا۔لڑکی کے حالات کا پرچہ رکھا ہوا ہے، آنے پر پیش کر دوں گا۔

م۔خدا کے فضل سے یوں بھی علاج سے افاقہ ہی معلوم ہو رہا ہے۔

ا۔الحمدللہ۔میرے رائے میں اگر افاقہ ہو رہا ہے تو علاج بدلنا مناسب نہ ہوگا۔

م۔حال میں ان حکیم صاحب کے منجن کا ایک عجیب و غریب تجربہ مجھے ہوا۔کسی اور کے

---

(1) یعنی مولانا حسین احمد صاحب (2) یعنی خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب صاحب اشرف السوانح

سامنے تو زبان سے نکالا نہیں۔ جناب ہی کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، دانتوں کی تکلیف ادھر بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے ہاں سے منجن موسوم بہ سنون مستحکم کو شب کے وقت استعمال کیا اور حسب ہدایت بغیر کلی کیے سو رہا۔ اصل مرض میں تو خیر نفع ہوا ہی، عجیب تر یہ کہ تینوں بار رویائے صالحہ نصیب ہوئے...... (1) ممکن ہے تینوں بار اتفاق ہی ہو، بہ ظاہر تو کوئی تعلق قریب منجن اور رویائے صالحہ میں نظر نہیں آتا۔ بہر حال اب تو چاٹ سی پڑ گئی ہے اور جی چاہتا ہے کہ روز ہی اسے لگاتا رہوں۔

ا۔ مناسب ہے۔ اس میں احتمال دونوں ہیں۔ اتفاق ہونے کے اور ایک قاعدہ کے تحت میں سنون کے اثر ہونے کے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ مقبولین کے تلبس کی اشیا میں بھی برکت ہوتی ہے۔ سنون کا تلبس حکیم صاحب سے ظاہر ہے کہ ان کا تجویز کیا ہوا اور بنایا ہوا ہے اور رویائے صالحہ کا برکت ہونا بھی ظاہر ہے۔ یہ تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر حال میں مقاصد میں سے نہیں۔

بعد تحریر ہذا ایک اور تعلق خیال میں آیا۔ وہ یہ کہ ملائکہ کو نجاسات و روائح کریہہ سے نفرت ہے اور طہارات و نظافات سے رغبت اور منجن سے مقاصد مسواک کے حاصل ہیں کہ ازالہ ریح کریہہ میں دونوں شریک ہیں۔ تو ممکن ہے کہ اس سے جو طیب نکہت پیدا ہوتی ہے اس لیے ملائکہ سے قرب ہوتا ہو اور قرب ملائکہ سے عالم ملکوت کے انکشاف کا تعلق ظاہر ہے اور خواب بھی انکشاف ہے ملکوت کا۔

م۔ زمیندار پر زکوٰۃ کے احکام کیا ہیں۔ اسے سادہ و مختصر لفظوں میں جان لینا چاہتا ہوں۔ فقہ کی کتابیں دیکھیں، کوئی بات صاف سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔ بہ قول مفتی بہ یہ زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ یعنی عشر زمیندار کے ذمہ نہیں۔ کاشتکار کے ذمہ ہے۔ البتہ اگر بٹائی کا معاملہ نہ ہوا ہو یعنی کوئی اجرت معین نہیں نہ غلہ نہ نقد۔ بلکہ جو پیدا ہو جس نسبت سے معاہدہ ہو جائے پیداوار تقسیم کر لیں اس صورت میں دونوں کے ذمہ اپنے اپنے حصہ میں عشر واجب ہے"۔

اس کے 12 روز بعد یہ ضمیمہ بہ شکل کارڈ صادر ہوا:

---

(1) آگے خط میں جو تفصیل تھی، وہ عام ناظرین کے لیے غیر ضروری ہے۔

''حکیم صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔ میرٹھ سے خط آیا تھا۔ کچھ عوارض کو سبب تاخیر لکھا تھا آپ کا لفافہ رکھ لیا۔ خدا کرے جلدی آجائیں تو ان کو دکھلا کر جواب لے کر آپ سے سرخ رو ہوں میں خیریت سے ہوں بچی کے لیے دعائے شفا کرتا ہوں''۔

حکیم صاحب پھر بھی وہاں نہ پہنچ سکے، تو چند روز بعد یہ دوسرا ضمیمہ والا نامہ کی شکل میں موصول ہوا:

''اب تک حکیم صاحب کا انتظار کیا، مگر شب کو دفعتاً خیال ہوا کہ ضرورت معالجہ متحمل توقف نہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ڈاک ہی سے مشورہ کر لیا جائے۔ میں خط یہاں ہی سے بھیج دیتا مگر خیال ہوا کہ شاید مرض کی کیفیت میں کچھ تغیر تبدل ہوا ہو، اس لیے آپ کے پاس اپنا رقعہ ان کے نام کا بھیجتا ہوں۔ مرض کی حالت مع اس رقعہ کے ان کے پاس بھیج دیجیے ان کا پتہ یہ ہے......''

اب وہ سفارشی رقعہ بھی حکیم صاحب کے نام کا ملاحظہ ہو:

''از اشرف علی۔ مشفقم مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم

آپ جناب مولوی عبدالماجد صاحب کو تو جانتے ہوں گے اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مجھ کو ان سے کیسا تعلق ہے۔ مولوی صاحب موصوف کی ایک بچی کی کچھ شکایت آنکھ کی ہوگئی۔ جس کی مفصل کیفیت مولوی صاحب کے پرچہ ملفوفہ سے واضح ہوگی۔ میں نے بھی مشورہ دیا کہ آپ سے بھی مشورہ فرمالیں۔ چنانچہ پرچہ حالات مرض کا میرے پاس آگیا اور اب تک آپ کے انتظار میں رکھا رہا۔ چونکہ زیادہ دیر کرنا مناسب نہ تھا اس لیے مصلحت معلوم ہوئی کہ آپ کے پاس ڈاک ہی سے بھیج دیا جائے چنانچہ مع جوابی لفافہ کے جس میں مولوی صاحب موصوف کا پتہ لکھا ہے مرسل ہے۔ توجہ وتامل سے مشورہ سے مدد دیجیے اور جو حالات قابل تحقیق ہوں، مولوی صاحب سے براہ راست پوچھ لیجیے۔ اور دعا بھی کیجیے کہ اس کو شفا ہو۔ میں بھی دعا کر رہا ہوں۔ مولوی صاحب کی وجہ سے اس بچی کا مجھ کو خاص خیال ہے۔ والسلام۔ از تھانہ بھون''۔

اپنے نیازمندوں اور متوسلین کے ساتھ شفقت والتفات کے تعلقات اس درجہ کے قائم رکھنا، ایسے کثیر الاشغال بزرگ کے لیے بجائے خود ایک کرامت ہے اور کچھ خوش فہم ایسے بھی ہیں جو اس خدمت خلق کو ولایت وکمالات روحانی کے منافی سمجھے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک ولایت

شاید معنی ہیں جنگل میں تن تنہا جا بیٹھنے کے۔

(53)

مولیٰ کے خاص خاص کرم کبھی کبھی اپنے نااہل سے نااہل بندہ پر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے شیخ یا مصلح کے سامنے تو ان کے پیش کر دینے میں مضائقہ نہیں، لیکن دنیا کے سامنے بلا ضرورت شدید ان کی پکار کرنا اپنی ہی کم ظرفی کو اچھالنا ہے...... 8 جولائی کا مفصل عریضہ ایک ایسے ہی انعام الٰہی سے متعلق ہے۔ وہ دنیا کی نظر سے مستور رہے گا، حالانکہ اس کے سلسلہ میں بھی حضرت کے قلم سے جوارشادات نکلے، انھیں مخفی رکھنا بھی یقیناً ایک طرح کا بخل ہے۔ بہر حال اس پر افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھیے۔ شروع اگست کا کارڈ خدا معلوم کن مسئلوں سے متعلق تھا۔ محض جواب سے کچھ موٹا اندازہ ہر صاحب فہم کر سکتا ہے۔ اس جوابی کارڈ پر مہر 7 اگست کی ہے:

''آپ کی خوشی سے خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کو ہمیشہ مفتاح خیر بنادے۔

مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ دست بردار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ زبان سے یا عمل سے یہ کہہ دیا کہ ہم دست بردار ہو گئے نہیں لیتے۔ دوسرے یہ کہ جس کے حق میں دست بردار ہونا چاہتے ہیں اس کو وہ حصہ ہبہ کر دیا، یا اس کے ہاتھ بیع کر کے زر ثمن معاف کر دیا اور ہبہ کی صورت میں سب شرائط کو جمع کر دیا۔ ان دو صورتوں میں سے اول صورت میں وہ حصہ صاحب حصہ کی ملک سے خارج نہیں ہوا، کیونکہ وہ ابرا ہے اور ابرا دیون میں ہوتا ہے۔ اعیان میں نہیں ہوتا جب وہ حصہ ملک سے خارج نہیں ہوا تو اس کے ورثہ کو ہمیشہ اختیار ہے کہ اپنے حصہ کا مطالبہ کریں اور دوسری صورت یعنی ہبہ و بیع میں اس کی ملک سے خارج ہو گیا، اس لیے پھر مطالبہ نہیں ہو سکتا، امید ہے کہ جواب صاف ہو گیا ہوگا''۔

اس کے بعد کے دو جوابی کارڈ جن پر مہریں 13 اگست اور 18 اگست کی ہیں، لڑکیوں کی بیماری سے متعلق ہیں۔ یہ تو اوپر بار بار گزر چکا ہے کہ خاندان والوں کو ہر بیماری میں پہلی دوڑ مولانا کی دعاؤں کی طرف ہوتی تھی۔ منجھلی لڑکی (حمیرا سلمہا) کو میعادی بخار آیا تھا اور کسی طرح نہیں اتر رہا تھا۔

''صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحت کاملہ عاجلہ بخشے۔ اگر تکلیف نہ ہوتو بعد صحت بھی مطمئن فرمایا جائے''۔

یہ مضمون پہلے کارڈ کا تھا، دوسرے کارڈ میں شاید دوسری بچی کی بھی علالت لکھی تھی:

''بہت دل دکھا۔ دکھے دل سے کئی بار صحت کاملہ کی دعا کر چکا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ کرتا رہوں گا اور کیا عرض کروں''۔

اب دونوں بچیوں کو افاقہ ہو چکا ہے اور نیت چند روز بعد سفر تھانہ بھون کے لیے اور کئی ہفتہ کے قیام کی ہوگئی ہے۔ آخر اگست کا کارڈ:

''بیحد تشویش تھی اور مضاعف تشویش تھی اور الحمدللہ دونوں بچیوں کے افاقہ سے طمانیت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بقیہ تکلیف اور ضعف کو بھی رفع فرمادے، اچھا ہوا مولوی محمد شفیع صاحب(1) کی برکت بھی حاصل ہوگئی۔

مژدۂ قدوم سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملادے۔ گھر میں پوچھنے لگیں کہ گھر میں سے لانے کو تو نہیں لکھا، میں نے کہا نہیں''۔

گھر میں دونوں پیرانی بیویوں سے تعلقات نیازمندی تھے، چھوٹی پیرانی صاحبہ سے اور زیادہ اور مکتوب میں اشارہ ان ہی کی جانب ہے۔

ستمبر کے پہلے عشرہ میں سفر تھانہ بھون کا ارادہ پختہ ہوگیا۔ یہ بھی طے کرلیا کہ زنانہ بھی ساتھ چلے گا، گو زنانہ کا قیام وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں، بلکہ کل مدت قیام کا صرف نصف رہ سکے گا۔ اسی درمیان میں حضرت کے کسی مطبوع ملفوظات میں یہ مضمون نظر سے گزرا کہ صبح کی مجلس خصوصی اسی تباہ کار کی خاطر قائم فرمائی گئی۔ دل نے بڑی خجالت محسوس کی کہ یہ تو حضرت کے اوقات عزیز پر ایک خواہ مخواہ کا بار پڑا۔ 12 ستمبر کا مہری پوسٹ کارڈ حسب ذیل موصول ہوا:

''قرب زمانہ ملاقات سے مسرت ہوئی اور گھر میں زنانہ کے آنے سے بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ گو ان کا قیام کم ہوگا، مگر ''للذکر مثل حظ الانثیین'' کے قاعدہ سے ان کا نصف قیام بھی کافی ہے۔ مکان کی تجویز انشاء اللہ تعالیٰ بذریعہ شبیر علی کے کی جائے گی۔ وہ دہلی گئے ہیں، پانچ

---

(1) یہ جوار لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولوی حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بجنوری ہیں۔ جن کا ذکر چند نمبر قبل آچکا ہے۔

چھ روز میں انشاء اللہ تعالیٰ آجائیں گے۔ آپ کا کارڈ یادداشت میں رکھ لیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے یاد رکھ کر کہہ دوں گا اور انتظام ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سب موانع کو رفع فرمادے اور ملازم کو بھی صحت بخشے (1)۔

ترمیم نشست صباح کی اجازت سے ممنون ہوا واقعی بنا تو اس وقت کی مجلس کی بھی ہے اور آپ کے رہنے تک تو مطلق بار کا احتمال ہی نہ تھا۔ بعد میں احتمال ہو سکتا تھا مگر اس کے مصالح ایسے مشاہد ہوئے کہ ضرورت دائمی معلوم ہوئی۔ لیکن کسی روز ناغہ بھی کر دیتا ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس روز جو موقع ہوگا کروں گا''۔

وعدہ کتنا جامع اور ہمہ جہتی تھا۔ ہوا یہ کہ مجلس صبح کا موقع ہر روز ہی حضرت کو ملتا رہا اور ہر روز عمل اس مجلس کے وقوع ہی کا ہوتا رہا۔

17 ستمبر کا عریضہ حسب دستور عام خاصہ مفصل ہے اور ایک نہیں متعدد اہم پہلوؤں پر شامل:

''مولوی شبیر علی صاحب اس وقت تک واپس آگئے ہوں گے (1) اور انشاء اللہ مکان کے لئے حسب معمول زحمت تلاش گوارا فرمارہے ہوں گے (2)۔

کانپور کے ایک نامور بیرسٹر خان بہادر حافظ ہدایت حسین ہیں۔ گورنمنٹ میں رسوخ یافتہ اور ساتھ ہی بڑے مسلمان اور ملت اسلامی کے ہمدرد و غمخوار۔ ولایت کئی بار آچکے ہیں۔ اس پر بھی نماز کیا معنی، تلاوت کی پابندی میں فرق نہیں آتا (3) مجھ سے ابھی ایک کمیٹی کے متعلق مراسلت کا اتفاق ہوا میں نے لکھا تھا کہ آپ کی کمیٹی اکتوبر میں ہوگی، اس میں شریک نہ ہو سکوں گا، وطن سے دور تھانہ بھون حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ مولانا زیارت کے قابل ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ انھیں بدنام کر رکھا ہے۔ اس کے جواب میں آج ہی ان کا عنایت نامہ آیا لکھتے ہیں کہ'' آپ مولانا کی خدمت میں ضرور جایئے، ان کے ہاں کی حاضری باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ میں خود بھی ان کی خدمت میں وقف کمیٹی کے سلسلہ میں حاضر ہو چکا ہوں اور دل میں ان کی بزرگی کا گہرا اثر رکھتا ہوں۔ لیکن مولانا بدنام خود اپنے ہی مریدوں کے سبب سے ہوتے ہیں''۔ اس کے آگے کانپور کے ایک مولوی صاحب کا نام لے کر لکھا ہے کہ انھوں نے یہ لکھا کہ حضرت

---

(1) میں نے لکھا تھا کہ سفر میں ساتھ آنے والا ملازم بیچارہ بھی بیمار ہے۔

حسینؓ کو سید الشہدا لکھنا ناجائز ہے۔ دوسرے فریق نے جواب دیا، سلسلۂ بحث چل نکلا۔ اس پر بیرسٹر صاحب نے اس اخبار کو لکھا ہے کہ ایسی بحثیں اس وقت بے محل وخلاف مصلحت ہیں، مخالفین اسلام اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس پر ان مولوی صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا جس کے آخر کے 15 صفحوں میں بیرسٹر صاحب کی بھی بری طرح خبر لی اور ان کے لیے سخت دل شکن الفاظ استعمال کیے (4)۔

یہ خلاصہ ہے بیرسٹر صاحب کی تحریر کا۔ میں نے خود نہ وہ رسالہ دیکھا نہ اس سلسلہ کا کوئی اور مضمون۔ بیرسٹر صاحب نے اپنے خط کے آخر میں لکھا ہے کہ ''جب آپ وہاں جائیں تو مولانا سے میرا اسلام کہہ دیں اور یہ بھی عرض کر دیں کہ خدا کے لیے اپنے مریدوں کو لہجہ کی درشتی اور خشونت اور دوسروں کی نیت پر حملہ کرنے سے روکیں (5) ان کا پیام ختم ہوا۔

اب اپنا مرض عرض کرتا ہوں اور ایک استفسار۔

عرض مزمن یہ ہے کہ بعض اوقات بہت ہی خفیف قصور پر ملازمین کو بہت سخت بلکہ کریہہ الفاظ کہہ بیٹھتا ہوں۔ سوچنے کا موقع ہی کہاں ہوتا ہے۔ اشتعال فوری ہوتا ہے اور اسی میں یہ بک جھک جاتا ہوں چند ہی منٹ میں یہ کیفیت فرو ہو جاتی ہے تو پچھتاتا ہوں۔ اپنے کو ملامت کرتا ہوں اور آئندہ کے لیے عہد کرتا ہوں لیکن پھر وہ عہد ٹوٹ ہی جاتا ہے۔

یہ تو ہوا مرض۔ اب استفسار گھریلو موذی جانوروں کے اہلاک سے متعلق ہے۔ جیسے کھٹل، مچھر، بھڑوں کا چھتا، یا مکھیوں کی افراط۔ بعض دواؤں سے یہ فوراً مارے جاسکتے ہیں، یا چھتے میں آگ لگائی جاسکتی ہے۔ کسی کسی وقت تو طبیعت جھنجھلا کر ان تدبیروں پر آمادہ ہو جاتی ہے، لیکن پھر بعض وقت اپنے پر شبہ شقاوت قلب کا ہونے لگتا ہے اور دل کہتا ہے کہ یہ تو بے زبان مخلوق کا ستانا ہوا۔ اس میں اکثر متردد رہا کرتا ہوں''۔

جواب ہر ہر جز کا نمبروار درج ہے:

(1) آ گئے، مکان کی گفتگو بھی ہوگئی۔

(2) ایک مکان جو نہ تنگ ہے نہ فراخ، نظر میں ہے، دوسرے وسیع مکان کے لیے بھی کوشش کی جائے گی۔ شاید وہ مل جائے مگر پورا بھروسہ نہیں۔

(3) میں ملا بھی ہوں اور مجھ کو طبعاً اس سے انس بھی ہے اور وہ بھی محبت سے پیش آئے تھے۔

(4) یہ ان کا خیال ہے کہ جس کا سبب واقعات کی ناتمام اطلاع ہے۔ یہ تو استقرا سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محبین تو میری طرف ناگوار واقعات منسوب نہیں کرتے اور مخالفین ایسا بھی کرتے ہیں اور اصل بدنامی ایسے واقعات سے ہے۔ باقی بعض دوستوں کا ایسی حرکت کرنا اوّل تو ایسے دوست کم ہیں۔ دوسرے یہ کون منصف سمجھے گا کہ یہ حرکت میں نے کرائی اور اگر کوئی بلا دلیل ایسا سمجھے تو اس کا انتظام محال ہے۔ بعضے مسلمانوں سے اسلام بدنام ہو تو اسلام کیا تدبیر کرے۔

(5) کچھ مضمون مجھ کو بھی دکھلایا تھا اور میں نے شفقت کے لہجہ میں اس سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن شفقت کا اثر ہوتا ہی نہیں۔ سختی اس لیے نہیں کرتا کہ کوئی امر کھلم کھلا شریعت کے خلاف نہ تھا۔ میں نے ان کو جو لکھا تھا وہ یہاں موجود ہے دکھلاؤں گا۔ امر اجتہادی میں کیونکر کسی کو دبایا جائے۔ اگر آج کوئی شافعی یا غیر مقلد مجھ سے بیعت ہو (اور ہیں بھی) میں ان کو فروع اجتہاد میں کیسے مجبور کروں گو طبیعت کے بھی خلاف ہو۔ جیسے خود ترک تقلید میرے ذوق کے بالکل خلاف ہے اور طبعاً گراں بھی۔ مگر میں زور سے نہیں کہہ سکتا البتہ جو مخل تربیت ہو اس میں سختی کرتا ہوں اور بدنام ہوں۔

(6) میں اپنی تحریر اس باب میں دکھلاؤں گا جو روکنے سے بڑھ کر ہے۔ مگر جبر کا کیا حق ہے جیسا اوپر تفصیل عرض کی۔

(7) تدبیر کی ضرورت ہے کہ بعد میں ان ملازمین کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا جائے پھر نفس صلح کر لے گا۔

(8) مقصود ستانا نہیں، ان کے ستانے سے بچنا ہے اور وہ بدوں اس صورت کے ممکن نہیں اس لیے بادل نخواستہ کیا جاتا ہے اور ذبح کو گوارا کر لیا گیا حالانکہ وہ محض جلب منفعت ہے تو یہ تو سلب مضرت ہے۔ بدرجہ اولیٰ گوارا کی گئی''۔

(54)

ادھر ستمبر کا مہینہ آخر ہو رہا تھا۔ ادھر سفر تھانہ بھون کی تاریخ قریب آتی جارہی تھی۔ روانگی سے قبل ایک اور کارڈ لکھا۔ اس کا کیا مضمون تھا، یہ بالکل خیال میں نہیں۔ حضرت کے جواب سے یہ

اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کی کوئی ضروری چیز ہوگی اور عجب نہیں کہ حضرت کی شرح مثنوی مولانائے روم کلید مثنوی کی داد لکھ کر بھیجی ہو (1) بہرحال وہ جواب حاضر ہے۔

''سب اہل جلسہ مضمون خط پر مطلع ہو کر مسرور ہوئے۔ باقی میں سو آپ کو میری اصابت رائے سے مسرت ہوئی اور مجھ کو واقعی آپ کی مسرت سے مسرت ہوئی۔ دو وجہ سے، ایک تو اپنے دوست کی مسرت دوسرے ایک قدر دان کی مسرت۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسرور رکھے۔ بجز دعا کے اور کیا عرض کروں۔ باقی مثنوی کا سمجھنا میرا کیا منہ ہے، مگر گاہ باشد کہ کودکے نادان کی مثل صادق ہو جاتی ہے''۔

لذیذ کھانے آپ نے بارہا نوش فرمائے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہوگا کہ اس کھانے کو آپ نہ پہچان سکے اور یہ نہ بتا سکے کہ وہ کھانا تھا کیا، لیکن باوجود اس کے اس کا خوش ذائقہ پوری طرح محسوس ہوا اور اس کی لذت زبان کو کسی طرح نہ بھولی، بس کچھ ایسا ہی حال مولانا کے اس قسم کے خطوط کا بھی ہے۔ موضوع و مفہوم متعین طور پر سمجھے ہوئے بغیر بھی ایک حلاوت و لذت موجود!

اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی کہ لمبے قیام کے ارادہ سے تھانہ بھون حاضر ہو گیا۔ اب کی مکان خوش قسمتی سے وہ ملا جو خود حضرت کا آبائی مکان تھا۔ حضرت کا بچپن اسی مکان میں گزرا تھا اور اب یہ مکان حضرت کے سوتیلے چھوٹے بھائی (خان بہادر محمد مظہر صاحب ڈپٹی سپر نٹنڈنٹ پولیس) کی ملک تھا۔ اس مکان کی برکتوں کا کیا کہنا، مادی اعتبار سے بھی ہر طرح وسیع و آرام دہ۔ سوا اس کے کہ جا بجا سے مرمت طلب تھا۔ اب وہی معمولات قدیم شروع ہو گئے۔ یعنی بعد ظہر کی مجلس عام کے علاوہ وقت چاشت کی مجلس خاص بھی اور وہی علوم و معارف کی بارش۔

ایک روز صبح کی مجلس میں حضرت کی زبان سے لکھنؤ کے بنے ہوئے بالائی کے پانوں کی تعریف سننے میں آئی۔ دل نے کہا کہ یہ حضرت کی ایک مرغوب غذا کا خوب پتہ چل گیا۔ اسی وقت چپکے سے ایک دوست کے نام خط لکھ کر ڈال دیا کہ لکھنؤ سے ان پانوں کا پارسل آ جائے۔ پارسل آیا۔ لیکن اب خدا معلوم مجھ سے لکھنے میں غلطی ہوئی یا ان صاحب سے سمجھنے میں کہ پان بجائے بالائی کے دودھ کے نکلے جو اس سے مختلف چیز ہی ایک بالکل دوسری تھی۔ بہرحال وہی دودھ کے

---

(1) اس کا ذکر بھی کسی پچھلے باب میں گزر چکا ہے۔

بنے ہوئے سبز رنگ کے پان اس پرچہ کے ساتھ خدمت والا میں بھجوا دیے کہ ''لکھنؤ کا بنا ہوا ایک حقیر ہدیہ حاضر خدمت ہے۔ امید ہے کہ شرف قبول سے سرفراز کیا جائے گا''۔ جواب معاً آیا کہ ''وہ لطف کا جامع ہدیہ موجب فرحت وحلاوت ہوا، بجائے سر آنکھوں کے کام ودہن میں رکھا۔ اللہ تعالیٰ فرحت بخشے''۔

تحفوں اور ہدیوں سے متعلق بھی حکیم الامت کے ہاں خاص خاص آداب اور قاعدے تھے، سب حکیمانہ فرماتے تھے کہ ہدیہ پیش کرنے والے اپنے مذاق کا اتباع کرتے ہیں حالانکہ پیش نظر اس شخص کا مذاق رکھنا چاہیے، جس کے سامنے ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی طریقہ سے اس کا عندیہ پہلے سے لے لیا جائے اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ اسے فرحت یا رغبت آج کل کس چیز کی زیادہ ہے۔ یہ بھی فرمایا کرتے کہ ہدیہ مقدار تعداد میں یا قیمت میں بہت زائد نہ ہونا چاہیے۔ ہمیشہ پیش کرنے والے کی حیثیت کے اندر ہی ہو۔ اگر بہت زائد یا بالکل بلاضرورت ہوگا تو قبول کرنے والے پر ایک بار ہو جاتا ہے۔ حکیم الامت کے ہاں کی کون سی چیز حکیمانہ نہ تھی؟

خود تو حسب پروگرام پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو ہفتہ بعد زنانہ کو بھی سہارنپور سے بلا لیا۔ مکان اس حیثیت سے بھی خوب تھا کہ مولوی شبیر علی صاحب کے زنانہ مکان کا راستہ اندر ہی اندر تھا۔ وہاں آمد ورفت ہر وقت بہ آسانی ممکن۔ باقی حضرت کے بھی دونوں گھروں کا فاصلہ کچھ زائد نہیں۔ خانقاہ بھی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ۔ ہمارے ہاں کی بیویوں (غافلات مومنات) کی سادہ دلی بھی بعض وقت قابل رشک ہوتی ہے۔ گھر میں مدت سے تمنا یہ تھی کہ حضور رسالت کا زمانہ اگر نصیب ہوتا تو فلاں اور فلاں کھانے میں اپنے ہاتھ سے پکا کر پیش کرتی۔ گویا مثنوی کے اس چرواہے سے ملتی ہوئی کہانی، جس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہ آرزو کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کہیں مل جائیں تو انھیں اپنے خیمہ میں لاکر رکھوں، ان کی خدمت میں اپنے ہاں کے جانوروں کا خالص دودھ پیش کروں، ان کے پیر دابوں، انھیں موزہ پہناؤں وغیرہا۔ بہرحال، انھوں نے ایک بار اپنی اس کیفیت قلب کا اظہار حضرت کے سامنے کیا تھا۔ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ آرزو بہت مبارک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضوری تو اب ممکن نہیں۔ کسی نائب رسولؐ کی خدمت میں وہ ہدیہ پیش کرکے آرزو پوری کی جاسکتی ہے۔ یہ بات کان میں پڑی ہوئی مدت سے

تھی۔اب کی جوان کا تھانہ بھون آنا ہوااور گھر کا کارخانہ جم کرکیا۔تو خیال آیا کہ اس سے بہتر موقع اور کب ملے گا۔موسم بھی معتدل وخوشگوار ہے۔چنانچہ اکتوبر کی 28 تھی کہ کئی کھانے،قورمہ،مرغ، پلاؤ وغیرہ اور کئی قسم کے نوریات اپنے ہاتھ سے تیار کر کے حضرت کی خدمت میں روانہ کردیے۔ رسید میں پرچہ حسب ذیل موصول ہوا:

''ماشاء اللہ کل کھانا اتنا بھیجا کہ نصف کے قریب بڑے گھر بھیج دیا بقیہ چھوٹے گھر کے پورے خرچ کے لیے کافی ہوگیااور پھر بچ رہا۔حقیقت تو اس کی تالف تھی مگر صورت اس کی تکلف کی ہوگئی۔جزاکم اللہ تعالیٰ۔

جواب میں عرض کیا گیا:

''کھانا میں نے نہیں پیش کیا تھا۔گھر میں محض اپنی خوشی سے اور بالکل اپنی مرضی کے مطابق تیار کیا تھا،جہاں تک میرے مشورہ کا تعلق تھا،میں برابر یہی کہتا رہا کہ نہ مقدار میں زیادتی ہونے پائے نہ تعداد وتنوع میں،میں تو اب کسی قدر ملازمان والا کے مذاق سے واقف ہو ہی گیا ہوں۔وہ ابھی بڑی حد تک ناواقف ہیں''۔

جواب الجواب میں ارشاد ہوا:

''کھانے کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا تھا اب ان کی خدمت میں معروض ہے مع دعائے برکت۔

مولانا حمید الدین الفراہی،مولانا شبلی نعمانی کے عزیز قریب،پھریا ضلع اعظم گڑھ کے ایک بڑے ذی علم وصاحب فکر بزرگ تھے،قرآن مجید کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے اور کلام جاہلیت کے گویا حافظ وماہر،تفسیر نویسی کا ایک خاص انداز رکھتے تھے،مسلک وطرز جمہور سے بالکل مختلف۔تصنیف وتالیف عربی میں کرتے۔ان کی بعض تفسیروں کا ذکر حضرت سے اس کے قبل کر چکا تھا۔اب کی ان کی تفسیر سورۃ القیٰمۃ ساتھ لیتا گیا تھا اور ایک روز موقع پا کر پیش کردی تھی۔ دوسرے روز رائے عالی ایک پرچہ پر لکھ کر آگئی تھی اور افسوس ہے کہ وہ پرچہ محفوظ نہ رہا۔صرف اتنا ذہن میں ہے کہ رائے کچھ زیادہ موافقانہ نہ تھی۔یہ بھی لکھا تھا کہ اچھا ہوا کہ مولانا نے زبان تصنیف بجائے اردو کے عربی رکھی جس سے حلقہ اشاعت صرف اہل علم تک محدود رہے گا۔دو دستی رقعوں میں اس کا بھی ذکر ہے:

''مولانا حمید الدین صاحب کی تفسیر سورۂ قیٰمہ کے متعلق جو مضمون لکھا تھا یا تو اصل بھیج دیجیے میں نقل کرا کے واپس کر دوں گا، خواہ نقل کر کے اصل بھیج دیجیے پھر نقل کی ضرورت نہ ہوگی''۔

حضرت اسے النور میں دینا چاہتے تھے اور واقعی دینا تھا بھی ضروری۔ لیکن وہ پرچہ میرے پاس سے جدا ہو چکا تھا چنانچہ عرض کر دیا کہ:

''تفسیر نظام القرآن کے متعلق وہ پرچہ میں نے اسی روز مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس ان کی اطلاع و واقفیت کے لیے بھیج دیا تھا اور واپسی کو لکھ دیا تھا۔ لیکن وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے ہیں، توقع نہیں کہ وہ پرچہ جلد واپس آسکے''

جواب مرحمت ہوا کہ:

''اس پرچہ کی واپسی کی جلدی نہیں، جب حاصل ہو جائے بھیج دیجیے۔ خواہ کتنی ہی مدت بعد ہو، بلکہ اگر محفوظ نہ رہے نہ سہی''۔

''مستشرقین، فرنگ کو اکابر ملت اسلامی کی تفضیح میں خاص الخاص لطف آیا کرتا ہے۔ عجب عجب قصے تصنیف کر کے شائع کرتے رہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی) میں اسی قسم کا ایک گندہ افسانہ حضرت خالد بن ولیدؓ سیف اللہ کے متعلق نکلا تھا۔ معارف میں رفیق دار المصنفین مولوی شاہ معین الدین احمد نے اس کا مدلل و شافی جواب دیا۔ حضرت رسالے وغیرہ زیادہ کہاں پڑھتے تھے۔ میں نے اس مضمون کا ذکر کیا اور رسالہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دستی پرچہ میں اس کا بھی ذکر تھا:

''رسالہ معارف شب کو ساتھ لے گیا اور مضمون مقصود کا مطالعہ کیا، فارغ کر کے بھیجتا ہوں بہت کافی بلکہ شافی وافی اور شبہات کا نافی لکھا ہے''۔

حضرت اس سن تک رات کے وقت پڑھنے لکھنے کا کام بے تکلف بلا عینک کی مدد کے کر لیتے تھے۔

(55)

تاریخ کوئی اکتوبر کی ہے یا شروع نومبر کی سنہ وہی 1933 عیسوی۔ برسات قاعدہ سے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن بارش سہارنپور و مظفر نگر کے اطراف میں اب بھی، نہ صرف ایک حد تک بے فصل کی ہو رہی ہے۔ بلکہ غیر معمولی شدت سے بھی، اور ایک دن تو نہ پوچھیے کہ کس شدت کی ہوئی،

تھانہ بھون میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے مستقل بادل کے ٹکڑے پھٹ پھٹ کر زمین پر آرہے ہیں، جل تھل سب بھر گئے، اوپر سے موسلا دھار بارش اور نیچے کھڑنجے کی سڑک پر پانی کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کھڑا ہوا، چلنے کا ارادہ کیجیے تو گھٹنے سے اوپر تک پانی میں غرق، ایسے میں کسی بشر کی ہمت تھی کہ عشا کے وقت رات کے اندھیرے میں خانقاہ کی مسجد تک جانے کے لیے نکلتا، چنانچہ اس خاکسار نے تو مختصر سی جماعت گھر ہی پر کرلی۔ لیکن دیکھیے وہیں ایک بشر ہے، 72 سال کا بوڑھا، وہ دو چار گز کی نہیں، ڈیڑھ دو فرلانگ کی مسافت طے کر کے اسی عالم میں مسجد پہنچ رہا ہے۔ آپ نے پہچانا؟ یہ ہے وہی شیخ طریقت، سب کے لیے رخصت کی آسانیوں کا فتویٰ دینے والا، لیکن خود اپنے لیے مقام عزیمت کی دشواریاں اختیار کرنے والا!

رات بڑھے پانی کچھ دھیما ہوا، ادھر فجر کا اوّل وقت آیا کہ پھر وہی بے پناہ شدت! الامان والحفیظ! عین خانقاہ والوں کو سائبان کے نیچے نیچے بھی چند سنٹ چل کر مسجد کے دالان تک پہنچنا دشوار۔ لیکن جوان ہمت رات والا پیر مرد ہے کہ اس وقت بھی، لنگ چڑھائے ایک مضبوط ڈنڈے کی مدد سے پانی کو چیرتا پھاڑتا مسجد کی طرف چلا جارہا ہے۔ اہل طریق سچ کہتے ہیں کہ رسوخ فی الدین اگر حاصل کرنا ہے تو محض کتابیں کافی نہیں، بزرگوں کی صحبت میں عرصہ تک رہ کر ان کے عملی نمونوں سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے۔

یاد نہیں کہ قیام اب کی کل کتنے دن رہا۔ پانچ ہفتے تو بہرحال رہا ہوگا، اغلب ہے کہ اس سے زائد ہی، شفقتوں اور عنایتوں کی وہی بے پناہ بارش۔ حاضری دیتے اب 5، 6 سال تو ہو چکے تھے (ابتدا جولائی 1928 سے ہوئی تھی) اور قیام مختصر اور لمبے ہر قسم کے بار بار ہو چکے تھے۔ عقیدت تو جتنی قائم ہونی تھی پہلے ہی دن، پہلی ہی ملاقات میں قائم ہو چکی تھی، لیکن محبت تھی کہ ہر آمد و رفت کے ساتھ برابر بڑھتی ہی گئی اور اب تو مدت سے مولانا ''بزرگ'' محض شیخ یا مصلح کے معنی میں رہے ہی نہ تھے بلکہ بزرگ خاندان، یعنی باپ چچا کے معنی میں بھی بن چکے تھے اور اس مرتبہ کے قیام نے اس نقش کو اور زیادہ گہرا کر دیا۔

بچی جو جنوری 1931 میں پیدا ہوئی تھی (ملاحظہ ہو نمبر) اور جس کا نام زہیرا (1) بھی حضرت

---

(1) پروفیسر محمد سلیم قدوائی کی والدہ مرحومہ (قاسمی)

ہی کارکھا تھا۔اب کی ساتھ تھی اگر چہ ابھی پورے تین سال بھی پورے نہ ہوئے تھے،لیکن خیال آیا کہ مولانا کی سی مقدس ہستی آسانی سے بار بار کہاں ملے گی' بسم اللہ' ابھی کیوں نہ کرادی جائے۔ ایک روز عرض کیا۔ بڑی خوشی سے اسے قبول فرمالیا گیا اور ایک روز اپنی زبان مبارک سے اس کی بسم اللہ کرادی۔غرض تعلقات اب ہر جہت سے بالکل عزیزانہ ہوتے چلے گئے۔

حضرت کی نظر کتابوں پر بہت زیادہ نہیں رہتی تھی۔علوم ومعارف کے چشمے تو بس اندر ہی سے ابلتے رہتے تھے۔''فی الحقیقت خودتوئی ام الکتاب'' تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، سب کا کتابی مطالعہ بس بقدرِ ضرورت وکفایت ہی رہتا تھا اور آخر زمانہ میں تو اور بھی کم ہوگیا تھا۔ یہ بالکل نہ تھا کہ کتب بینی کی ہوس ہو، نئی نئی مطبوعات کی آمد برابر جاری رہے اور تاریخ، سیاحت، مناظرہ، محاضرہ کسی فن کی جو چھپی ہوئی کتاب بھی سامنے آجائے، پڑھ ضرور لی جائے۔ ضائع کرنے کو حضرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ وہاں تو

صد کتاب وصد ورق درنار کن　　　سینہ را از نور حق گلزار کن

کا گلزار ہر وقت کھلا رہتا تھا اور حضرت ہر وقت فرماتے رہتے کہ'' آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں، لیکن نظر کی اس وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کردیا ہے، لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں، لیکن گہری نہیں ہوتیں، صرف سطح پر رہتی ہیں۔ اپنے مضامین، مقالات میں حوالے تو خوب دے دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے، لیکن فہم مسائل کی استعداد نہیں بڑھتی، سمندر سے موتی وہی نکال کر لاسکتے ہیں جو گہری غواصی کرسکتے ہیں، محض سطح سمندر پر دور تک پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگلے علما، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہم کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا، لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کیے۔'' حضرت کی محفل میں ایک بے علمایہ خاکسار ہی تھا جو اکثر ذکر پرچوں، رسالوں، نئی کتابوں کا چھیڑ دیتا اور حضرت شاید اس کی ہمت افزائی کے خیال سے ہر ذکر کو بڑی دلچسپی سے سنتے رہتے۔ خطیب بغدادی (المتوفی 463ھ) کی تاریخ بغداد 12 جلدوں میں اسی زمانہ میں مصر سے حسن طبع وتہذیب کے جملہ لوازم کے ساتھ چھپ کرنئی نئی آئی تھی۔ ایک روز اس کا

ذکر کیا۔ حضرت نے بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا، خصوصاً حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حسین بن منصور حلاج کے حالات کا تذکرہ، تبصرہ، حضرت تصنیف وتالیف کا سلسلہ اس وقت تک گویا چھوڑ ہی چکے تھے، لیکن اس وقت حلاج پر ایک رسالہ زیر تحریر تھا، اس لیے خطیب کے صفحات میں حلاج کے مفصل موافقانہ ومخالفانہ تذکرہ کا حال سن کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت کی ہمدردیاں حلاج کے ساتھ تھیں اور آپ اس کو مظلوم سمجھتے تھے۔

دوران قیام میں اب کی بھی اچھے اچھے اور قابل زیارت لوگوں سے ملاقات رہی۔ حضرت کے ہاں تو ایسے زائرین کا تانتا ہی لگا رہتا تھا۔ اب کی مولانا کے خلیفہ خاص وقدیم اور ایک حاذق ترین طبیب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری میرٹھی مرحوم سے بھی خوب ملاقات رہی۔ غائبانہ نیاز ان سے اور ان کے کمالات سے مدت سے تھا اور پھر اچھا خاصا رہا، شخصاً اب کی زیارت پہلی بار ہوئی۔ دہلی کے بعض نامور اور خاندانی اطبا کو دیکھ کر جو نقشہ ذہن میں ایک حکیم حاذق کا قائم ہوجاتا ہے، حکیم صاحب اس معیار پر بالکل نہ تھے۔ نہ لحیم شحیم نہ خوب سرخ وسفید، بلکہ دبلے پتلے، منحنی جسم کے، یہاں جب دیکھا تو مسجد ہی میں کبھی نفلیں پڑھتے کبھی ذکر کرتے پایا، نامور حاذق اطبا متعدد نظر سے گزرے ہیں، لیکن ایسے طبیب جنھیں مجتہد فن کہا جاسکے، کل دو ہی اپنے تجربہ میں آئے، ایک حیدرآباد کے حکیم امتیاز الدین مرحوم اور دوسرے یہ حکیم صاحب، حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری (1) لکھنوی کے بعض خوارق وکمالات بھی حکیم صاحب سے خوب معلوم ہوئے۔ حکیم صاحب اور وہ کانپور میں حضرت مولانا ہی کی شاگردی میں ہم سبق رہ چکے ہیں۔

ملاقات تو اور اور حضرات سے بھی ہوئی۔ سب نہ اب یاد ہیں اور نہ سب کا ذکر ہی ضروری۔ لیکن ایک صاحب سے تو بہرحال ملتے چلیے۔ جوان عمر آدمی، چہرہ پر نرمی اور اسی کے متناسب ریشم کے سے ملائم، چھوٹی سی داڑھی کے بال، شرمیلے اور کم سخن، الٰہ آباد کے ایک انگریزی اسکول میں فارسی کے استاد، ذہین، سخن فہم اور صاحب استعداد۔ اقبالؒ کے مداح وشیدائی، خانقاہ کے عام رنگ سے ذرا الگ تھلگ (اقبال کا نام مدح کے ساتھ لینا اہل خانقاہ کے نزدیک خود ایک جرم تھا)

(1) لفظ بجنوری کے اشتراک سے دونوں صاحبوں کی ہم وطنی کا خیال نہ گزرے۔ حاجی صاحب کا بجنور ایک چھوٹا سا قدیم قصبہ ہے، لکھنؤ سے متصل اور حکیم صاحب کا بجنور شہر اور ضلع ہے علاقۂ روہیل کھنڈ میں۔

مہذب شائستہ، مجھ سے بڑھ کر ملے اور برابر ملتے رہے۔ ہفتوں سے خانقاہ میں مقیم تھے۔ ان کی ملاقات کی کیا اہمیت تھی، یہ کسی قدر انتظار کے بعد آپ پر خود واضح ہو جائے گا۔

نومبر کا عشرۂ اول تھا کہ حضرت سے واپسی کی اجازت لی اور سہارنپور ٹھہرتا ہوا وسط ماہ تک گھر پہنچ گیا اور 21 نومبر کو یہ عریضہ حاضر خدمت کیا۔ جواب کے لیے الگ انتظار کیوں کیجیے، ساتھ ہی ساتھ پڑھتے چلیے:

م۔ ''اب کی طویل قیام میں جو کرم خاص رہا اس کا نقش دل پر بالکل تازہ ہے۔

ا۔ هذا من حبكم۔

م۔ ایک بات بالکل بے تکلفانہ بلکہ گستاخانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو عقیدت وعظمت کا تعلق دل میں ہے اس میں تو اس پانچ ساڑھے پانچ برس کے عرصہ میں اتار چڑھاؤ رہا کیا اور رہا کرتا ہے، یعنی اکثر تو معارف ومسائل زبان گرامی سے سن کر یا قلم سے دیکھ کر عقیدت بہت ہی ترقی کر جاتی ہے۔

ا۔ یہ جز مطابق واقع کے نہیں، اس میں تاویل کی ضرورت ہوگی کہ حبک الشيء يعمي ويصم۔ کیونکہ مسائل کو بناء عقیدت ٹھہرانا ہی غلط اصول کا ثمرہ ہے۔

م۔ اور کبھی بعض چیزوں کو دیکھ کر اور سن کر دل یہ کہنے لگتا ہے کہ بس یہ بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔

ا۔ یہ بالکل مطابق واقع ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ واقع کے قریب ہے۔ اگر اس میں یہ قید نہ ہوتی کہ ''ہم ہی جیسے'' تو مطابق واقع کے ہوتا اور اب قدرے واقع سے بعد ہو گیا۔ کیونکہ واقع میں تو میں دوسروں سے بھی کم ہوں اور یہ کوئی تکلف نہیں۔ اس پر حلف کر سکتا ہوں، کیونکہ اپنی حالت کا خود اور دن سے زیادہ مشاہدہ کرتا ہوں۔ چونکہ ایسا اعتقاد میرے اعتقاد کے مطابق ہے اس لیے ایسے اعتقاد سے مسرور ہوں کہ اس میں میری موافقت ہے اور پہلے اعتقاد میں مخالفت۔

م۔ یہ معاملہ تو تعلق عقیدت وعظمت کے ساتھ ہوا۔

ا۔ دوستوں کے ساتھ تو جز رومد مضر نہیں۔ لیکن اپنے شیخ کے ساتھ کم اعتقادی مضر ہے خواہ وہ کمی مطابق واقع ہی کے ہو مگر اس میں تاویل واجب ہے، کیونکہ اس اعتقاد کا اثر طالب کے عمل پر

پڑتا ہے۔ جیسے طبیب پر اگر کمال کا اعتقاد نہ ہو تو علاج میں خلل ہوگا اور راز اس میں یہ ہے کہ اعتقاد کی کمی سے اعتقاد میں کمی ہوگئی اور اعتماد ہی مدار ہے اتباع کا اور اتباع ہی مدار ہے کامیابی کا۔

م۔ لیکن جو تعلق محبت کا ہے، اس میں بحمد اللہ اس ساری مدت میں برابر ترقی ہی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اب اس طرح کی محبت معلوم ہوتی ہے جیسے اپنے والد یا حقیقی چچا کے ساتھ ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اگر کوئی بات ایسی دیکھنے یا سننے میں آتی بھی ہے جو میری فہم ناقص میں آپ کے شایان کمال نہیں، تو معاذ ہن میں ایسی توجیہ بھی آجاتی ہے جو باپ چچا کے متعلق آتی۔

ا۔ توجیہ کی بھی ضرورت نہیں، نقص متعین بھی مقلل محبت نہیں اور یہ میرا عین مذاق ہے کہ محبت سے دل خوش ہوتا ہے اور عقیدت سے گرانی''۔

(56)

مکتوب پچھلے نمبر میں ختم نہیں ہوا تھا، ناتمام چھوڑ دیا گیا تھا، باقی حصہ اب ملاحظہ ہو:-

م۔ ''اب اپنا ایک مرض عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ اخلاص عمل قائم نہیں رہتا، ابتداءً جب کسی دینی کام کا خیال آتا ہے تو بحمد اللہ کچھ ٹوٹا پھوٹا اخلاص ہوتا ہے، یعنی محض خدمت دین ہی مقصود ہوتی ہے۔ لیکن جوں ہی عمل شروع ہوا، بس دوسرے مصالح واغراض بھی ہجوم کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب یوں مقبول ہوگی، یوں بکے گی، وغیرہ وغیرہ۔ اللہ کا فضل وکرم ہے ارادتاً ان چیزوں کو بنا عمل نہیں رکھتا، تاہم دل یہ کہتا ہے کہ معصیت نہ سہی، جب بھی اخلاص نیت کا اجر تو گیا۔

نیم بہر حق شد وینمے ہوا   شرکت اندر کار حق نبود روا

ا۔ جیسے اخلاص اختیاری ہے اسی طرح اس کی ضد بھی اور جو حالات تحریر فرمائے ہیں وہ غیر اختیاری ہیں لہٰذا وہ مزیل اخلاص نہیں۔ البتہ اگر ان کو مستحسن سمجھا جائے تو وہ بھی بوجہ اختیاری ہونے کے اخلاص کے مضاد ہیں۔

م۔ ایک روز مجلس میں حضرت عمرؓ کے فضائل کے ذکر میں ایک حدیث کا یہ مضمون ارشاد ہوا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے کوئی ان کا دوست نہ باقی رکھا(1)۔ اگر بلا زحمت وتردد تلاش خیال پڑ جائے

---

(1) حضرت نے جس موقع پر یہ حدیث بیان فرمائی تھی، اس کا خاص اثر مجلس پر پڑا تھا اور یہ نامہ سیاہ تو بہت ہی متاثر ہوا تھا آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹے پیمانہ پر مولانا محمد علیؒ کی مثال پڑتی تھی۔ آخر میں بیچارہ کا کوئی دوست باقی نہیں رہ گیا تھا۔

تو اس حدیث کا ماخذ ارشاد ہو۔

ا۔ فی المشکوٰۃ آخر باب مناقب العشرۃ بروایۃ الترمذی، "عن علیؓ رحم الله عمرؓ یقول الحق وان کان مرا له الحق وماله من صدیق"۔

م۔ گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں۔

ا۔ میری طرف سے بھی سلام فرمائیے۔

یاد دہانی۔ تفسیر الفرقان بالفرقان کی نسبت جو رائے تحریری پیش کی تھی اس کی اصل یا نقل عطا ہو اگر محفوظ ہو، ورنہ تردد نہ فرمائیں۔

کسی کو اجرت دے کر ابن المنصور کے حالات تاریخ خطیب سے نقل کرا کے وی پی فرما دیجیے یا اجرت سے مطلع فرما دیجیے، فوراً بھیج دوں گا"۔

تاریخ خطیب اور ابن المنصور حلاج کا ذکر دو ہی بار ایک صفحہ اوپر نمبر 55 میں آچکا ہے۔

اس مکتوب کے ورود کے گویا معاً بعد 26 نومبر کو دوسرا مفصل عریضہ لکھا، لمبی حاضری کے بعد یہ نہیں ہوتا تھا کہ طبیعت سیر ہو جائے اور سوالات پیش کرنے کی ضرورت کچھ کم ہو جائے۔ اکثر تو یہ ضرورت کچھ بڑھ ہی جاتی تھی۔ یہ 26 کا عریضہ خاصا بڑا تھا۔ اس کا کچھ حصہ تو متفرق امور پر تھا اور بڑا حصہ ایک مستقل مسئلہ اتباع شیخ پر۔ سمجھنے میں سہولت اسی میں ہوگی کہ دونوں حصے الگ الگ نقل ہوں:

م۔ "خطیب کی کتاب میں حلاج کے حالات پورے 30 صفحوں میں آئے ہیں، ناقل کو عربی میں بھی استعداد ہونا چاہیے۔ نقل کے بجائے مجھے یہ سہل معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب ہی خدمت والا میں ڈاک سے ارسال کر دوں، یا جیسا ارشاد ہو۔

ا۔ بہت اچھا۔ اگر محصول کا ویلو کر دیجیے تو جانبین کو سہولت ہو۔

م۔ شروع کی 10 سطروں کی نقل اپنے ہاتھ سے الگ پرچہ پر ملفوف کرتا ہوں۔ اس کے بعد سے آخر تک مخالف و موافق دونوں قسم کے اقوال درج ہیں۔

ا۔ دیکھ لیا۔

م۔ مولانا حمید الدین کی تفسیر قرآن پر جو رائے عالی ظاہر فرمائی گئی تھی وہ میں نے مولانا سید

سلیمان ندوی کو اعظم گڑھ بھیج دی تھی، کئی ہفتے ہوئے ان سے واپس منگائی تھی جواب نہ آیا۔ اب آج ہی کل میں پھر لکھوں گا۔

ا۔ اگر مل جائے بھیج دیجیے، ورنہ زیادہ کوشش نہ کیجیے۔

م۔ بڑی لڑکی کے لیے چاہتا ہوں کہ کوئی معمر حافظ خاتون اگر مل جائیں تو اسے کلام مجید حفظ کرادوں۔ محض تذکرہ جناب والا کی خدمت میں عرض کر دیا۔ ممکن ہے کوئی نام اس وقت یا کبھی ذہن میں آجائے اس کے لیے کسی فکر کرنے یا اہتمام رکھنے کا بار ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔

ا۔ میں خیال رکھوں گا۔ مگر اس قصبہ میں یا گردوپیش میں اس کی توقع نہیں۔ البتہ پانی پت میں عورتوں کی عادت ہے حفظ قرآن کی۔ اگر کہیے وہاں تحقیق کروں"۔

خط کا جز قلیل تو یہ تھا، جز غالب اتباع شیخ کے حدود کی بابت مفصل استفسار تھا، جو ابھی درج ہو رہا ہے۔ اپنی درازنفسی کا احساس تھا، اس لیے خط کے خاتمہ پر معذرت بھی تھی:۔

م۔ "آپ نے فرط کرم سے مجھے جو آزادیاں دے رکھی ہیں، ان ہی کے بل پر گستاخانہ سب کچھ لکھ ڈالتا ہوں اور سب کچھ بک جانے کے بعد یہ مصرع بھی پڑھ لیتا ہوں ؏

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

ا۔ یہ گستاخی نہیں بہ قول مولانا

گفتگوئے عاشقاں درکار رب | جوشش عشق است نے ترک ادب

اب عریضہ کا وہ اصل حصہ ملاحظہ ہو، تلخیص کے بعد:۔

"شیخ کے اتباع کامل سے متعلق جناب نے اس والا نامہ میں بھی ارشاد فرمایا ہے(1) اس کے علاوہ بھی بارہا زبان مبارک سے سنا۔ دوسرے بزرگوں کے ہاں بھی اس کی تاکید دیکھی۔ لیکن اسے نفس کی شرارت سمجھا جائے یا جو کچھ بہرحال پوری تشفی اس مسئلہ میں نہ ہوئی۔ شبہ نفس اتباع میں نہیں، اتباع کامل میں بار بار پیدا ہوتا ہے اور دل کہتا ہے کہ یہ صورت تو شرک فی النبوۃ کی سی ہے۔ آنکھ بند کر کے اتباع تو صرف نبی معصوم کا کیا جا سکتا ہے۔ باقی اور کوئی صاحب کیسے ہی بزرگ ہوں بہرحال رائے میں بھی غلطی کریں گے اور عمل میں بھی اور یہ نہ ہو تو پھر ان میں اور

(1) ملاحظہ ہو نمبر 55

معصوم میں فرق ہی کیا رہے گا؟ ہم ہزار ہا غلطیاں کریں گے اور روزمرہ، وہ بہت کم کریں گے اور کبھی کبھی، لیکن بہرحال جب حضرات صحابہؓ تک نہ عملی معصیتوں سے محفوظ رہے نہ اجتہادی لغزشوں سے، تو دوسرے حضرات کا رتبہ تو ان سے بھی فروتر ہے۔ میرے دل کو تو سب سے زیادہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا قول (جناب ہی کی روایت سے سنا ہوا) لگتا ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل جب کسی خاص مسئلہ میں ان سے گفتگو کرتے کرتے خلاف ادب سمجھ کر رک گئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو شرک فی النبوۃ ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے جو معاملہ اپنے مرشد کے رسالہ فیصلہ ہفت مسئلہ سے متعلق کیا وہ بھی عین اسی کی تائید میں ہے۔

اعتقاد کامل اور اعتماد کامل اور انقیاد کامل جس شے کا نام ہے وہ زندہ بزرگوں کے ساتھ کیا معنی، کسی پچھلے بزرگ کے ساتھ بھی نہیں پیدا ہو۔ یعنی ایسا اعتقاد کہ ان کا ہر قول، ہر عمل، بلا استثنا واجب الاتباع سمجھنے لگوں، یہاں تک کہ مولانائے روم سے بھی نہیں جن کی مثنوی کا عاشق ہوں اور جس کو اپنا اصلی ہادی سمجھ رہا ہوں۔ حضرات صحابہؓ تک میں بعض کی قابل جس اور بعض کی قابل رحم لغزشیں آخر روایات صحیحہ سے ثابت ہیں یا نہیں۔ تو پھر دوسرے بزرگوں کے اتباع کامل کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں''۔

جواب حسب معمول معناً شافی و جامع آیا اور اب کی لفظ و عبارت کے لحاظ سے بھی اتنا مفصل کہ ایک پورا نمبر اسی کے لیے چاہیے۔ مفید اتنا معلوم ہوا کہ حضرت کی اجازت سے سچ میں اسی وقت درج کیا تھا۔ (سچ 29 دسمبر 1933) رسالچہ کا نام بھی حضرت ہی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ ورق الٹیے اور حضرت کا اصل مقالہ مع سچ کی تمہید اور توضیحی حاشیوں کے ملاحظہ میں لائیے۔

(57)

الاعتدال فی متابعۃ الرجال

(منقول از سچ جلد 6 نمبر 70 مورخہ 29 ستمبر 1933)

(اتباع شیخ کا مسئلہ، تصوف وسلوک کے مہمات مسائل میں ہے۔ اگلے اور پچھلے سارے مشائخ اور ائمہ فن اس پر زور دیتے اور اس کی تاکید کرتے چلے آئے ہیں۔ عام ذہنوں میں اس کی تعبیر یوں ہے کہ شیخ نائب رسولؐ ہوتا ہے اور اس لیے مطاع مطلق، جس کا ہر قول، ہر فعل مرید کے لیے بمنزلہ حکم، اس کی کسی رائے، کسی قول، کسی فعل میں مرید کے لیے گفتگو کی گنجائش نہیں۔ نصوص صوفیہ کا ظاہر بھی اسی خیال کی تائید میں، لیکن یہ عقیدہ، اس صورت میں، شریعت وعقل دونوں کے معارض ہے۔ شرعاً بعد انبیا معصومین کے، کوئی بزرگ کیسا ہی کامل ہو، معصوم وغیر خاطی بہرحال نہیں، مشاہدہ بھی یہی ہے کہ تجربہ کی، عمل کی، علم کی، لغزشوں اور کوتاہیوں سے یکسر محفوظ کوئی بھی بشر نہیں، زلات اور خطاء اجتہادی سے صحابہؓ تک خالی نہیں، چہ جائیکہ دوسرے بزرگ جو ان سے بہرصورت کمتر ہیں، ایسوں کا اقتدا مطلق کیوں کر واجب ہوسکتا ہے، چند روز ہوئے یہی شبہات ایک مفصل مکتوب کی صورت میں حضرت مولانا تھانوی کی خدمت میں پیش کیے گئے جو اپنی تدقیقات باطنی و معالجۂ امراض نفسی کے لحاظ سے اپنے وقت کے امام غزالیؒ ہیں۔ مولانا مدظلہٗ کا جواب اس درجہ شافی، مفصل اور مسئلہ کے تمام اطراف وجوانب کو حاوی ہے کہ سچ کی برادری تک اسے نہ پہنچانا ایک صریح بخل معلوم ہوا۔ مولانا نے از راہ کرم اجازت اشاعت بھی مرحمت فرمادی۔ مکتوب مذکور فخر ومسرت کے ساتھ درج ذیل ہے۔ انشاء اللہ اس سے بہتوں کی الجھن اور

طریق کی طرف سے وحشت و بیگانگی رفع ہو جائے گی، بعض مشکل فقروں پر حاشیے دے دیے گئے ہیں اور بعض عبارتوں کو زیر خط کر دیا گیا ہے۔ ج)

مکرمی سلمہٗ السلام علیکم

غالباً میرے کل معروضات اس کے متعلق ذہن میں جمع اس لیے نہیں رہے کہ شاید ایک جلسہ میں مجتمعاً بیان نہیں کیے گئے۔ اب اس کا ملخص مجموعاً عرض کرتا ہوں۔ یہ اتباع وعقائد میں ہے نہ کشفیات میں، نہ جمیع مسائل میں، نہ امور معاشیہ میں (1)۔ صرف طرق تربیت وتشخیص امراض وتجویز تدابیر اور ان مسائل میں ہے جن کا تعلق اصلاح تربیت باطنی سے ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ان کا جواز مرید وشیخ کے درمیان متفق علیہ ہو اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا خلاف طریق ہے اور امتثال امر خلاف شریعت ہے (2)۔ ایسی صورت میں ادب جامع بین الادبین (3) یہ ہے کہ علما سے استفتا کر کے یا اپنی تحقیق سے حکم متعین کر کے شیخ کو اطلاع کرے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے۔ مجھ کو کیا کرنا چاہیے۔ اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ یہ معنی ہیں اتباع کامل کے یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو، یا جو عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ ومریدین متفق علیہ ہو تجویز کیا ہو ان چیزوں میں اتباع کامل کرے، ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں۔ امید ہے کہ سب شبہات کا جواب ہو گیا ہوگا۔ اگر کوئی جز باقی ہو تو تعیین وتصریح کے ساتھ تحریر فرمائیے۔

خلاصہ مبحث کا اس باب میں یہ ہے کہ اتباع کا محل معلوم نہ ہونے سے یہ سب شبہات پیدا ہوئے۔ میں اس کا محل وقیود وحیثیت متعین کیے دیتا ہوں۔ سو محل تو اس کا صرف شیخ کی تعلیمات قولیہ ہیں۔ (4) جن کا تعلق تربیت واصلاح باطن سے ہے اور قید اس کی یہ ہے کہ وہ فعل جس کی

---

(1) یعنی امور دنیوی (ج) (2) مختلف فیہ ہونے کے معنی ہی ہیں کہ شیخ تو اسے جائز سمجھ رہا ہے اور مرید اپنی بصیرت وضمیر کے موافق شرعاً ناجائز، ایسی صورت میں مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ سے مناظرہ کرنا تو خلاف آداب طریقت ہے اور اپنی دیانت کے خلاف شیخ کا اتباع کر لینا ایک فعل ناجائز کا، خلاف شریعت کا ارتکاب کرنا ہے۔ (ج) (3) یعنی آداب طریقت واحترام شریعت (ج) (4) نہ کہ شیخ کی پوری زندگی (ج)

تعلیم کی جارہی ہے شرعاً جائز ہو، جس کا جواز طالب کے اعتقاد میں بھی ہو اور حیثیت اس کی شیخ کا مصلح ہونا ہے، یعنی مصلح ہونے کی حیثیت سے صرف تعلیمات سلوک میں۔ اس کے اقوال پر عمل شرط نفع ہے۔ اب ان قیود کے فوائد احترازیہ بتلاتا ہوں۔ ''تعلیمات قولیہ'' کی قید سے خود شیخ کے افعال بھی نکل گئے، خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز ہوں جیسے شیخ پانچ سو رکعات نفل روزانہ پڑھتا ہو یا صوم داؤدی (1) ہمیشہ رکھتا ہو۔ اس میں اتباع ضروری نہیں اور خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز نہ ہوں۔ خواہ مختلف فیہ ہونے کے سبب، جیسے شیخ فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہو اور طالب اس کو مکروہ جانتا ہو۔ خواہ شیخ غلطی سے کسی فعل ناجائز میں مبتلا ہو، جیسے غیبت کرتا ہے اس میں اتباع جائز بھی نہیں۔

اور اسی قید سے شیخ کے کشفیات نکل گئے، خصوصاً جب کہ طالب کا کشف اس کے خلاف ہو۔ اسی طرح سے جمیع مسائل اصولیہ وفرعیہ جن کا تعلق تربیت سے نہیں، خارج ہو گئے۔ البتہ ان میں جو امور شرعاً بھی ضروری ہیں، وہ لازم العمل ہیں، گو شیخ بھی نہ کہے اور اگر شیخ حکم دے تو یہ حکم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حیثیت سے ہوگا۔ مصلح ہونے کی حیثیت سے نہ ہوگا اور ان میں اختلاف کرنا شریعت کی مخالفت ہوگی نہ کہ شیخ کی مخالفت۔ البتہ شریعت کی بنا پر شیخ ایسے طالب سے قطع تعلق کر سکتا ہے اور یہ قطع تعلق شیخ کے ساتھ خاص نہیں ہر مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے، اس کا تعلق مسئلہ متابعت شیخ سے کچھ نہیں۔ اسی طرح اس قید سے امور معاشیہ نکل گئے مثلاً شیخ کسی طالب سے یہ کہے کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے سے یا کسی اور سے کر دو، یہ بھی متابعت کا محل نہیں اور قید جواز (2) کا فائدہ یہ ہے کہ جس چیز کی تعلیم کرتا ہے وہ اگر شرعاً ناجائز ہو اس میں اتباع جائز بھی نہیں خواہ اجماعاً ناجائز ہو جیسے کوئی معصیت خواہ ناجائز اختلافاً ہو، جیسے مسائل مختلف فیہا کی کوئی خاص شق، جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں اور اس تقریر میں ضمناً حیثیت کا فائدہ بھی مذکور ہو گیا (3) اب اس کے متعلق سب سوال حل ہو گئے۔ سو یہ تو طے ہو گیا کہ بعض امور ہی محل متابعت نہیں جن میں بعض میں تو متابعت واجب نہیں جیسے امور معاشیہ اور بعض میں جائز بھی نہیں

---

(1) ایک دن ناغہ کر کے برابر روزہ رکھنا (ج) (2) اوپر آچکا ہے کہ جو فعل تعلیم کیا جا رہا ہو وہ شرعاً جائز بھی ہو (ج)
(3) اور شیخ کی حیثیت مصلحانہ کا ذکر آچکا ہے (ج)

خواہ ان کا عدم جواز متفق علیہ ہو، جیسے معاصی، خواہ مختلف فیہ ہو، جیسے مسائل اختلافیہ جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔ اب یہ بات باقی رہی کہ جو امور محل متابعت نہیں، ان میں اگر شیخ حکم دے تو اگر وہ شرعاً جائز اور طالب کی قدرت میں ہیں تو مروت کا مقتضا یہ ہے کہ ان میں متابعت کرے، جیسے شیخ اپنا کوئی ذاتی کام یا کوئی خاص خدمت کرنے کی فرمائش کرے اور اگر وہ شرعاً ناجائز ہے خواہ وہ واقع میں بھی خواہ(1) اس کے اعتقاد میں بھی ادب سے عذر کردے اور اگر وہ اصرار کرے تو اس سے قطع تعلق کردے مگر گستاخی وایذا کا معاملہ کبھی نہ کرے۔

یہ تو اس وقت ہے جب وہ خلاف شرع کا حکم دے اور اگر طالب کو ایسا حکم نہ دے مگر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو تو اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہے تو تاویل کرے اور اس سے قطع تعلق نہ کرے اور اگر تاویل کی گنجائش نہیں تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر احیاناً اس کا صدور ہو جاتا ہو تو بشریت واحتمال توبہ پر محمول کر کے تعلق قطع نہ کرے اور اگر اصرار یعنی اعتیاد ہے تو اگر وہ صغیرہ ہے تو قطع تعلق نہ کرے اور جو کبیرہ اور فسق وفجور یا ظلم وخیانت کے درجہ میں ہے تو قطع تعلق کردے مگر ان سب حالات میں اس کے لیے دعائے صلاحیت کرتا رہے کہ حقوق احسان میں سے ہے۔ ارادہ تھا خلاصہ کو مختصر لکھنے کا مگر وہ اصل سے بھی زیادہ مبسوط ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت بے ساختہ ذہن میں آیا کہ اس تحریر کا ایک لقب تجویز کردیا جائے، الاعتدال فی متابعۃ الرجال۔

9 شعبان 52ھ (2)

(58)

اس کے بعد کا عریضہ اس سے بالکل متصل ہی پڑھنے والا ہے مورخہ 2 دسمبر:-

م۔ ''گرامی نامہ مسئلہ اتباع شیخ پر تو اس قدر شافی اور اتنا جامع موصول ہوا کہ میں تو پڑھ کر اچھل پڑا۔ دل بے اختیار یہ چاہتا تھا کہ سامنے ہوتا تو لکھنے والے کی انگلیاں ہونٹوں اور آنکھوں سے لگاتا۔ سبحان اللہ، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔ گو ساتھ ہی یہ خیال کرکے ندامت بھی ہوئی کہ میرے باعث اتنا طویل مضمون لکھنے کا تعب برداشت کرنا پڑا۔

ا۔ مجھ کو تو آپ کی خوشی سے خوشی ہوئی۔ رہا تعب، اوّل تو ہوا نہیں، پھر بضرورت دینیہ ہوا۔

---

(1) یعنی طالب کے (ج) (2) مطابق 28 نومبر 1933

پھر آپ نے بدلہ تو کردیا کیونکہ اچھلنے سے بھی تعب ہوتا ہے۔

م۔اس تشریح وتوضیح کے بعد اب نفس مسئلہ تو صاف ہوگیا۔اب سوال صرف تعامل کا رہا۔ عمل اس کے مطابق کیوں نہیں ہوتا۔ جہاں تک دیکھا اور سنا،عمل اس کے خلاف ہی ہر جگہ پایا۔ ایک حاجی صاحبؒ کے ہاں عمل تو البتہ اسی تعلیم کے مطابق سننے میں آیا ہے۔

ا۔اس کا سہل جواب تو یہ ہے کہ اہل تعامل اس کے ذمہ دار ہیں اور تبرع کے درجہ میں جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں یا تو ان کو حدود کا علم نہیں اور یا محبت وعظمت سے مغلوب ہیں۔

م۔اب اجازت چاہتا ہوں کہ کوئی مصلحت اگر مانع نہ ہو تو مقالہ گرامی کو اپنی تمہید کے ساتھ سچ میں شائع کردوں۔انشاءاللہ بہت نافع ہوگا۔

ا۔خوشی سے آپ کا ہم رائے ہوں مگر تمہید میں مبالغہ نہ ہو۔اگر اوّل میں دیکھ لوں تو احتیاط کی بات ہے۔

م۔تاریخ خطیب آج ہی بذریعہ رجسٹری روانہ کی ہے۔ارشاد ہوا تھا کہ محصول کا وی پی کردیا جائے۔اس ارشاد کی تعمیل پر اپنے کو کسی طرح آمادہ نہ کرسکا۔عدم تعمیل کی معافی چاہتا ہوں۔

ا۔ایسی عدم تعمیل کرنے والے کسے نصیب ہوتے ہیں کہ مجھ کو نفع پہنچائیں اور میرے پیسے خرچ نہ ہونے دیں۔

م۔واپسی کا محصول اسی لفافہ کے اندر ملفوف ہے، میری خوشی تو یہی ہے کہ انہی ٹکٹوں کو کام میں لایا جائے۔

ا۔بالراس والعین۔

م۔باقی اگر اس کے قبول کرنے میں کچھ زیادہ گرانی محسوس فرمائی جائے تو زیادہ اصرار بھی نہیں کرتا۔

ا۔زیادہ کیا کم بھی نہیں ہوئی۔ایسے مخلصین سے تو سوال بھی جائز ہے۔

م۔تذکرۂ حلاج کتاب کے صفحہ 112 پر ہے۔

ا۔اس وقت کتاب پہنچ گئی، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔منشی......خیرآبادی(1) لکھنؤ سے یہاں ایک روز کے لیے آئے تھے۔جناب والا سے

(1) اصل مکتوب میں نام تھا، یہاں حذف کردیا گیا۔

اب انھیں بیحد محبت وعقیدت ہوگئی ہے لیکن اندازہ کچھ ایسا ہوا کہ شاید مقصود کی تعیین میں غلطی کرر ہے ہیں۔ہم لوگ جس طرح خشیت سے خالی ہیں۔ان کے ہاں اس کی افراط ہے۔بالکل فرشتہ ہی بن جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انھیں مشورہ یہ دیا ہے کہ جناب کی تصانیف اور مواعظ کثرت سے پڑھیں اور سمجھ سمجھ کر پڑھیں اور اگر حالات مساعدت کریں تو خانقاہ جاکر خاموشی کے ساتھ طویل قیام رکھیں اور اختلاج قلب کا طبی علاج بھی کرتے رہیں۔

ا۔نیک مشورہ ہے''۔

وہی خط ابھی چل رہا ہے،ختم نہیں ہوا ہے۔

م۔''مذاق والا کے سمجھنے کا بہترین نسخہ یہی طویل صحبت ہے،میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ ہر مرتبہ کے قیام کے ختم پر یہی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا لیکن ہر نئی حاضری کے بعد اپنے پچھلے خیال پر لاحول پڑھتا ہوں۔

ا۔آپ کی محبت ہے۔میں تو زیادہ باتیں کر کے خود شرمندہ ہوتا ہوں۔

م۔حافظہ خاتون کے لیے میں تو اتنی جرات نہ کرتا،آپ نے خود ہی غایت کرم سے پانی پت سے تحقیق کرنے کو فرمادیا ہے لیکن اس مراسلت کا بار جناب پر کیوں ڈالوں،صرف وہاں کا پتہ ارشاد ہوجائے،مراسلت میں خود کرلوں گا۔

ا۔آپ نے کام بہت ہی سہل فرمادیا۔میرے چھوٹے گھر میں کے بھائی ہیں ان کا پتہ لکھتا ہوں وہ نہایت فہیم ومستعد ہیں۔انتخاب بھی صحیح کریں گے۔کوشش بھی کریں گے،آپ کو جواب بھی اہتمام سے دیں گے۔میرے حوالہ سے لکھ دیجیے۔اور جواب کے لیے لفافہ رکھ دیجیے۔پتہ یہ ہے۔حافظ ناظر حسن،محلہ مخدوم زادگان۔پانی پت۔

م۔سورۃ الکہف میں ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعا سے متعلق ایک نکتہ سننے میں آیا، مجھے تو بہت پسند آیا۔تصویب کے لیے خدمت والا میں پیش کرتا ہوں۔وہ یہ کہ تین سو کے عدد اور نو کے دونوں کے الگ الگ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ بحساب شمسی وہ مدت پورے تین سو سال کی تھی اور بحساب قمری وہی مدت 309 سال کی۔تین سال کا فرق ہر صدی میں دونوں سنون میں ہوجاتا ہے امروہہ کے کوئی عالم تیس چالیس سال اُدھر مولوی محمد حسن نامی تھے۔

ا۔ان کو مدت سے جانتا ہوں۔ بالکل مجازفات اور تخمینات سے کام لیا ہے۔ تحقیق سے مس نہیں۔ میں نے اُن کی تفسیر بھی دیکھی ہے۔ ناشافی، ناکافی، نادانی ہے۔

م۔ان کی نظر ہندوؤں اور اہل کتاب کی کتابوں پر بہت تھی۔ ان ہی نے اپنی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔

ا۔ مجھ کو تو مدت سے یہ معلوم ہے مگر میں نے تفسیر میں اس لیے نہیں لیا کہ اس پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ سال شمسی تھے اور بے دلیل قرآن میں جزماً دعویٰ کرنا بہت خطرناک امر ہے۔ ہاں غایۃ ما فی الباب یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید یہ ہنا ہو واللہ اعلم۔

مولوی محمد حسن صاحب امروہوی کی پوری تفسیر دو جلدوں میں ہے اور اس کا نام غایۃ البرہان فی تاویل القرآن ہے۔ اس وقت تک میری نظر سے اصل تفسیر نہیں گزری تھی۔ بعد کو پڑھ کر حضرت کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ حقیقت سنجی سے کہیں زیادہ اس میں صفحہ صفحہ پر خیال آفرینی ہے اور مجھے تو مرزا صاحب قادیانی بلکہ مولوی محمد علی صاحب لاہوری بھی ان کے اچھے خاصے خوشہ چین نظر آئے، گو ان غریب کا حوالہ شاید کوئی بھی نہیں دیتا۔

البتہ نفس اس قول کے غیر محقق ہونے کے باب میں حضرت مولانا کے ارشاد سے ایک حد تک اختلاف ہے۔ اکابر سلف سے تو برابر یہ تفسیر نقل ہوتی چلی آرہی ہے اور ابن کثیر، معالم، بحر المحیط، جلالین، روح المعانی وغیرہ سب میں اس کا ذکر موجود ہے بلکہ بعض نے تو اسے حضرت علیؓ کا قول بتایا ہے۔ **وقد نقله بعضهم عن عليؓ (روح) روی عن عليؓ الخ (معالم)** یہ سب چیزیں بعد کو نظر سے گزریں۔ اس وقت اگر علم میں آگئی ہوتیں تو ضرور حضرت کی خدمت میں ان معلومات کو بھی پیش کرتا۔

''بڑی سخت ضرورت اہل سنت کی طرف سے ایک انگریزی ترجمۃ القرآن کی ہے''۔

''پھر آپ ہی کیوں نہیں اس کام کو شروع کر دیتے ہیں''۔

''اللہ پر بھروسہ کر کے شروع تو کیجیے، دشواریاں حل ہوتی جائیں گی''۔

''ترجمہ بالکل نیا نہ ہو، نہ سہی، موجودہ ترجمے جو انگریزی میں ہیں، ان ہی میں ترمیم و تنسیخ سے کام لیجیے، محمد علی لاہوری کا ترجمہ انگریز مترجمین سے تو بہر حال غنیمت ہے۔ اسی کو زمین بنا کر

اس میں کاٹ چھانٹ کر دینا کیا کافی نہ ہوگا''؟

''آپ ہمت کیجیے تو''۔

شاید شروع نومبر، غالباً آخر اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی، جب تھانہ بھون میں ایک کہنے والے نے مسلسل یہ افسون کان میں پھونکنا شروع کیا، یہ کہنے والا کون تھا؟ اس کے لیے نمبر 55 کا آخری پیراگراف ایک بار پھر ملاحظہ کرلیا جائے۔ مولوی حاجی سراج الحق مچھلی شہری (استاد فارسی، گورنمنٹ کالج الہ آباد) کا شمار اب بھی مشاہیر میں نہیں، اس وقت تو بیچارہ بالکل گمنام سے تھے لیکن اخلاص محض سے مشورہ دینے والوں کو اپنی ناموری اور گمنامی کی پرواہی کب ہوتی ہے؟ ادھر سے یکسر اصرار اور ادھر سے اپنی نااہلی کی بنا پر قطعی انکار برابر جاری رہا اور اسی پر گفتگو ختم ہوگئی۔

بات ختم کہاں ہوئی۔ ان کی زبان تو بیشک خاموش کردی، لیکن اپنے دل میں خلش برابر جاری رہی۔ شروع ہی نہ کردوں؟ کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ بطور آزمائش پارہ آدھ پارہ کا تو کرہی ڈالوں؟ کاش مولانا محمد علیؒ زندہ ہوتے! ان سے کتنی بڑی مدد مل جاتی۔ زبان پر اصلاح دینے والا اُن سے بہتر کون ہوسکتا تھا؟ مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی تو آج زندہ نہیں! فہم قرآنی کے باب میں کیا نکتہ رس دماغ پایا تھا، اب ان لوگوں کو کہاں سے لاؤں؟ ہا، ان لوگوں کی زندگی میں کبھی یہ خیال نہ آیا، یا اللہ، کیسے اتنا بڑا کام ہو سکے گا؟ انگریزی آتی ہی کیا ہے اور تھوڑی بہت جو کچھ آتی تھی، اب تو اس کے بھی لکھنے کی مشق نہیں رہی اور اپنی عربی استعداد تو اتنی بھی نہیں! لیکن نہیں، اردو میں تو اچھے اچھے متعدد ترجمے موجود ہیں اور عربی تفسیروں سے بھی بڑی مدد مل جائے گی اور ترجمے انگریزی میں ایک دو نہیں، کئی کئی موجود ہیں، کوئی ایک ترجمہ تو بیشک بہت اچھا اور کافی نہیں لیکن سب مل جل کر ضرور کافی ہو جائیں گے۔ کچھ اس میں سے لیا، کچھ اس میں سے، انتخاب اپنے ہاتھ میں ہوگا، کام کچھ تھوڑا بہت ہی ہو جائے، تو کیسی زبردست خدمت ہوگی۔ یہ خیالات تھے اور ان کی الٹ پلٹ ادھیڑ بن۔ اس ترجمہ کی فرمائش تو اور بھی بعض صاحب اور نسبتاً زبردست شخصیتیں رکھنے والے صاحب پہلے کر چکے تھے۔ پہلے کبھی ذرا بھی اسے قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ پر اب کی یہ فرمائش کس منہ اور زبان سے نکلی ہے کہ دل سے نکالے نہیں نکلتی۔ کھٹک ہے کہ برابر ہوئے جاتی ہے۔ سچ کہا ہے ہمیشہ سچ کہنے والے نے کہ انسان کا قلب تو حضرت حق کی انگلیوں کے درمیان رہتا ہے۔

وہ جس طرف چاہے اسے پھیر دے۔

(59)

ایسے اہم ترین منصوبے زندگی کے اہم ترین منصوبے سے کیسے ممکن تھا کہ حضرت کو باخبر نہ کرتا۔ مشورے، ہدایتیں، بہت کچھ وہیں سے حاصل کرنی تھیں۔ 8 دسمبر کا عریضہ (ملخصا) سارے کا سارا پڑھیے۔

م۔ ''تمہید کی عبارت حسب ارشاد والا ملاحظہ کے لیے ملفوف ہے (1)۔

ا۔ بہت مناسب ہے۔ بجز غزالی وقت وغیرہ الفاظ کے۔

م۔ ایک نہایت درجہ اہم معاملہ میں آپ کی توجہ، دعا، ہدایت، ارشاد سب کا محتاج ہوں۔ خیال دو چار ہفتہ سے انگریزی ترجمہ قرآن مجید کا برابر مسلط ہوتا جا رہا ہے۔

ا۔ میرے ذہن میں تو اس کی ضرورت سالہا سال سے ہے مگر دو چیزوں کی اس میں ضرورت ہے۔ کام کرنے والے آدمی اور کافی رقم ضبط کے اور طباعت کے لیے بھی، اس لیے دل کی دل میں رہ جاتی تھی کیا عجب ہے اب اس کا وقت آ گیا ہو۔

م۔ اب تک اہل سنت کا کوئی ترجمہ انگریزی میں نہیں۔ یا تو انگریز مسیحیوں کے ہیں، جنھوں نے جی بھر کر چوپٹ کیا ہے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ اور یا پھر لاہوری مرزائی جماعت کا ہے جو انگریزوں کے ترجموں سے تو بیشک بہت غنیمت ہے، تاہم اپنے مخصوص عقائد کا اتباع اس میں بھی ہے۔ صرف ایک ترجمہ اور ہے جو مرزا حیرت دہلوی کی جانب منسوب ہے۔ خدا معلوم کس کا کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں اسے خرید کر پڑھا۔ زبان کی لغزشوں کے علاوہ ادائے مفہوم میں بھی موٹی موٹی غلطیاں ملیں۔ میری انگریزی استعداد مبتدیوں جیسی اور عربی استعداد مبتدیوں سے کمتر۔ اس لیے بار بار سوچتا ہوں، ہمت باندھتا ہوں، پھر ہچکچا کر رہ جاتا ہوں۔ مولانا نے بھی ایک بار دیوبند میں فرمایا تھا، اس وقت صاف میں نے اپنی نااہلی کا عذر کر دیا تھا۔ وہ احساس تو اب بھی اپنی جگہ پر ہے لیکن دوسری طرف

(1) ملاحظہ ہوں نمبر 56، 57۔

ضرورت کا خیال دباتا چلا آتا ہے۔ بارہا اس درمیان میں توفیق حق وشرح صدر کی دعائیں نمازوں کے بعد کر چکا ہوں۔

ا۔ اللہ کا نام لے کر شروع تو کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ سامان بھی ہو جائے گا۔ اصل ضرورت ذمہ داری کی ہے تو آپ سے اچھا کون ملے گا۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ ہم سب کو اطمینان رہے گا اور یہ بھی اطمینان رہے گا کہ آپ ہم لوگوں سے مشورہ لیتے رہیں گے۔ گویا ہم ہی لوگ کام کرنے والے ہوں گے۔

م۔ اگر کام شروع کر دیا تو بیچ کو کم سے کم سال ڈیڑھ سال کے لیے بند رکھنا ہوگا۔

ا۔ اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کوچہ سے ناآشنا ہوں۔

م۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ قرآن مجید کی خالص خدمت کے ساتھ دوسرے کام جمع نہیں ہو سکتے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ پیش نظر تو متعدد تفسیروں اور ترجموں کو رکھوں گا لیکن اصل اعتماد جناب والا کے اور شیخ الہندؒ کے اردو ترجموں پر رکھوں گا(1)۔

ا۔ کافی تو حضرت ہی کا ترجمہ تھا لیکن شاید کسی جگہ تفصیل مناسب ہو، اس لیے بیان القرآن بھی سامنے رہے تو اچھا ہے لیکن اگر کسی جگہ کچھ اختلاف ہو تو تقدیم حضرت ہی کے ترجمہ کی کیجیے۔

م۔ حیدرآباد کے عماد الملک سید حسین بلگرامی اگرچہ شیعہ تھے لیکن برائے نام ہی شیعہ تھے آخر عمر میں انھوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر ہدایت انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی بہت ممتاز تھے۔ انشاء اللہ کئی پاروں تک اس سے بھی مدد مل جائے گی۔

ا۔ مگر صرف زبان تک مدد محدود رہے، احکام وعقائد تک اثر نہ پہنچے۔

م۔ بزرگوں اور دوستوں میں تقریباً جناب ہی سے اس کو پہلے پہل ظاہر کر رہا ہوں۔ اپنے کو تو اپنی ہر چیز ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اگر فی الواقع کوئی دینی خدمت ہے تو خاص طور پر دعا اور صرف توجہ فرمائیں۔

---

(1) یہ خیال اس وقت تھا۔ عملی تجربہ جوں جوں ہوتا گیا حضرت تھانوی ہی کے کام کی افضلیت واشرفیت ظاہر ہوتی گئی۔

ا۔ دل سے دعا کرتا ہوں اور کروں گا۔

مشورہ نمبر 1۔ پاؤ پارہ لکھنے کے بعد مناسب ہے کہ معتمد علما کو دکھلا کر ترمیم وغیرہ کے متعلق رائے لے لیجیے۔

مشورہ نمبر 2۔ اس میں بھی غور کیجیے کہ تفسیر کے درمیان درمیان عقائد باطلہ کے رو سے تعرض مناسب ہوگا یا نہیں۔ خصوص جنھوں نے ان عقائد کو مدلول بنانے کی کوشش کی ہے''۔

مولانا کا مکتوب اس سے بہتر اور اس سے زیادہ حوصلہ افزا اور کیا ہوتا لیکن کام درحقیقت حضرت کے جواب کے اور آغاز رمضان کے انتظار کے بغیر ہی کچھ نہ کچھ شروع کر دیا۔ کم از کم مختلف ترجموں اور تفسیروں کا غور سے پڑھنا اور کچھ آیتوں کو بالکل ابتدائی مشق کی طرح انگریزی میں منتقل کرنا اور جب نظر غائر سے پڑھنا شروع کیا تو میں ترجموں اور تفسیروں کی عبارتوں کی داد دیا کرتا تھا، اب ان ہی پر سوال پیدا ہونے لگے، کام کا ایک پورا خاکہ ذہن کے سامنے رکھ لیا تھا۔ 12 دسمبر کے عریضہ سے بہت سے امور کھل جائیں گے۔

''انگریزی ترجمۂ قرآن سے متعلق جناب والا کی ہمت افزائی نے دل کو بڑی ہی تقویت پہنچا دی۔ انشاء اللہ رمضان سے کام شروع کر دوں گا۔(1)۔ مولانا پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ آج ادھر ہی سے سلہٹ کے لیے گزرنے والے بھی ہیں۔ زبانی بھی عرض کروں گا(2)۔ ماہ مبارک سلہٹ میں بسر فرماتے ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ رات میں استراحت برائے نام ہی کرتے ہیں۔ نوافل وغیرہ میں بڑی کثرت فرما دیتے ہیں(3)۔

دوران ترجمہ حضرات علما سے ہدایات حاصل کرتے رہنا تو شروع ہی سے ذہن میں تھا۔ جناب والا اور حضرت مولانا کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی یہ اصحاب اربعہ تو پیش نظر ہیں ہی۔ ان کے علاوہ اور جو نام ارشاد ہوں(4) لیکن درحقیقت مدد ان ہی حضرات سے زیادہ مل سکتی ہے جو انگریزی بھی جانتے ہوں(5)۔ طبقۂ علما میں اس طرح کے کوئی صاحب خیال میں نہیں آتے۔ ندوہ میں مراقش کے ایک مالکی استاد تقی الدین الہلالی ہیں، عربی کے ادیب بھی اور انگریزی سے واقف بھی لیکن ان کے عقائد اور قرآن فہمی پر پورا اعتماد نہیں(6) غیر انگریزی دانوں کو انگریزی عبارت سمجھانی مشکل ہے۔ ترجمہ در ترجمہ سے مطلب کچھ کا کچھ

ہو جاتا ہے(7)۔

جناب والا نے مصارف کے باب میں جو فکر ظاہر کی ہے، تو اس میں تو شبہ نہیں کہ طباعت کے کل مصارف ہزار ہا ہزار کے ہوں گے، کاغذ اعلیٰ، جلد نفیس، یہ سب اگر نہ ہو، تو انگریزی خواں طبقہ کتاب کو چھوئے گا بھی نہیں لیکن اس کا انتظام تو انشاء اللہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کے خزانہ سے ہو جائے گا(1)۔ میری ہر کتاب کے لیے مصارف طبع کی منظوری اب کی ہی سال وہاں سے ہوئی ہے(8)۔ اب تک یہ نہ تھا۔

البتہ دوسرے انگریزی تراجم، عربی تفاسیر، عربی انگریزی لغات وغیرہ کی فراہمی، نیز اور چند ابواب مصارف جو شروع ہی میں پیش آئیں گے، ان کے لیے میرا تخمینہ 4۔5 سو کا ہے(2) ہے۔ اس کی بھی انشاء اللہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی(9)۔

جناب والا کے ترجمۂ قرآن میں جزاء المحسنین وغیرہ کے موقع پر جزا کا ترجمہ پاداش سے فرمایا گیا ہے۔ آج کل بیان القرآن کی نظر ثانی جاری ہے۔ بہ ادب گزارش ہے کہ اس لفظ پر ہی مکرر نظر فرمائی جائے۔ پاداش فارسی میں تو بیشک مطلق جزا کے معنی میں ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال میری فہم ناقص میں عموماً موقع ذم ہی پر آتا ہے۔ اگر خیال والا میں بھی یہ تحقیق طلب ہو تو کسی صاحب زبان سے مشورہ فرما لیا جائے(10)''

جواب نمبروار پڑھیے:-

(1) اس خبر سے میری تو رمضان ہی میں عید ہوگئی۔

(2) خدا کرے دعا بھی کی ہو۔

(3) مجھ کو اپنے حال پر تاسف ہوتا ہے کہ رمضان میں کوئی خاص کام نہیں ہوتا(3)۔

(4) اس وقت تو کوئی نام ذہن میں نہیں۔ اگر یاد آ گیا تو عرض کر دوں گا مگر میرا مذاق تو یہ ہے،

---

(1) بعد کو مہربانوں نے اگرچہ یہ فیض کا دروازہ بند کرا کے چھوڑا لیکن اس وقت یعنی 33 میں نواب اکبر یار جنگ بہادر (ہوم سکریٹری) نے یہ منظور کرا دیا تھا کہ اس خاکسار کی ہر کتاب سرکار عالی کے مصارف سے طبع ہوا کرے گی۔

(2) اب اپنی سادہ دلی پر حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت اتنا مختصر تخمینہ کیسے ذہن میں آیا تھا۔ ہزار ہا کی رقم محض کتابوں کی خریداری میں صرف ہوگئی۔ (3) یہ حضرت کی محض تواضع ہے ورنہ جتنا اہتمام حفظ اوقات کا حضرت کے ہاں سال کے سال رہتا تھا اس پر کسی اضافہ کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

(5) خیر، اگر ایسا کوئی جامع نہ ملے تو تیسرا شخص جو دونوں کو جمع کرسکتا ہے آپ سے بہتر اس وقت دوسرا نہیں۔

(5) تب تو میں یہی عرض کردوں گا "لاتقربا هٰذه الشجرة"

(7) میں تو آپ کے فیصلہ کو کافی سمجھتا ہوں۔

(8) الحمدللہ، مبارک

(9) احسان ہوگا میری بھی شرکت منظور فرمالیجیے۔ پچاس سے کم نہیں، سو سے زیادہ نہیں۔ اور اگر یہ ذخیرہ وقف رہے تو کسی کو شبہ نہ ہو۔

(10) میں کسی کو ڈھونڈتا پھروں گا، میرے جی کو تو یہ مشورہ لگ گیا۔ لفظ صلہ بدل دیا گیا اور یہ معلوم نہیں کہ آیا ہر جگہ یہی ترجمہ ہوا ہے یا صرف اسی آیت میں۔ اگر دو چار مواقع ذہن میں ہوں اطلاع فرمانے سے تلاش سے بچ جاؤں گا۔

(نوٹ) یہ ایک امر طے ہونا باقی رہا کہ اہل باطل کے تمسکات کا بھی تفسیر کے درمیان درمیان جواب ہوگا یا نہیں''۔

طویل عریضہ کا ایک جزا بھی رہ گیا۔ جواب کے ساتھ اب حاضر ہے۔

م۔ ''ایک ندوی عالم نے جو کتابوں پر نظر رکھتے ہیں لیکن تصوف سے مس نہیں، ایک مضمون معمولات صوم سے متعلق سچ میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے۔ ملفوف ہے۔ آخر کا ٹکڑا پنسل سے نشان زدہ ملاحظہ فرمالیا جائے۔ عجب نہیں یہ تعریض جناب والا کے ہاں کے معمولات پر ہو(1)۔

ا۔ اگر ان کی یہ مراد ہے تو بالکل ہی بے اصل ہے۔ یہاں تو اس واقعہ کا نشان بھی نہیں۔

م۔ میں اس مضمون کو نیم تائیدی نیم تردیدی نوٹ کے ساتھ چھاپنے کا ارادہ کررہا ہوں، تھانہ بھون کے معمولات کا حال معلوم ہوجاتا تو مجھے اپنے حاشیہ میں بڑی سہولت ہوجاتی۔

ا۔ یہاں کوئی بات نئی نہیں ہوتی۔ عام عادت یہ ہے کہ نماز سے پہلے معمولی طور پر فرداً فرداً کھانا کھالیتے ہیں۔ جس میں اجتماع ہوتا ہے نہ اہتمام ہوتا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہوکر اپنے کام

---

(1) اصل عبارت مولانا ندوی کے مضمون میں، آئندہ نمبر میں، ختم مضمون سے ذرا قبل ملاحظہ ہو۔

میں یا آرام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نہ چائے کا دور ہوتا ہے نہ اور کسی قسم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اپنے طور پر کسی کو چائے کی عادت ہو تو وہ انتظام کر لیتا ہوگا جس کی کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

میں بعض اہل علم کو یہ خط سنا رہا تھا کسی نے کہا کہ شاید مولانا (1) پر تعریض ہو سکے۔ میں نے یہ پوچھنا اچھا نہ سمجھا کہ تم کہاں سے کہتے ہو آپ سے نقل کر دیا کہ شاید حاشیہ میں اس کی رعایت ہو سکے۔ ندوی صاحب کا مضمون دیکھ کر جی چاہا کہ اس باب میں اپنی معلومات بھی پیش کر دوں جس میں ان کو خطاب مقصود نہیں۔ آپ کا شوق تحقیق یاد آ کر اس تحریر کا باعث ہوا۔ مقصود اس کے بھیجنے سے اشاعت نہیں، صرف آپ کو معلوم کرانا ہے۔ پھر خواہ اپنے تک رکھیے یا دوسروں کو پہنچائیے، پھر خواہ زبان سے خواہ قلم سے۔

اطلاع مستقل:- مسئلہ تقلیل طعام فی رمضان میں میرا ایک مستقل وعظ ہے۔ میرے پاس کوئی نسخہ نہ تھا۔ ایک صاحب سے عاریت لے کر بھیجتا ہوں، شاید معلومات میں اضافہ ہو کر حاشیہ میں کچھ مدد ملے یا نفس مضمون ہی کو فی الحال ملتوی کر دینے کی رائے ہو جائے۔ اگر دل چاہے بعد ملاحظہ واپس کر دیجیے صفحہ 49 خصوصیت سے دیکھیے۔

معذرت:- مضمون ہمراہی میں بوجہ درد سر قلت فرصت کے دیر لگ گئی۔ تکلیف انتظار معاف فرمائیے۔

مشورت:- ایک صاحب جامع انگریزی و عربی کے یاد آئے۔ بعض چیزوں کا ترجمہ ان کی نگرانی میں ہوا بھی ہے مولوی محمد عیسیٰ، ماسٹر انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد، اگر فرمائیے ان سے پوچھوں۔

(60)

حضرت نے تو غایت کرم سے پورا رسالہ ہی حکمت صوم پر تحریر فرما دیا۔ ندوی عالم کا اصل مضمون اس پر سچ کا مختصر حاشیہ اور پھر حضرت کا اصل مقالہ، یہ سب جس طرح سچ جلد 9 نمبر 50 (29 دسمبر 33ء) میں شائع ہوئے تھے، آج ان صفحات میں بھی اسی طرح درج ہو رہے ہیں۔

---

(1) یعنی مولانا حسین احمد صاحبؒ۔

ہمارے روزے

(از مولانا عبدالسلام ندوی: مصنف اسوۂ صحابہؓ وغیرہ)

مکرمی السلام علیکم!

صوم رمضان کے متعلق ایک نہایت ضروری اصلاح کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، آپ نے اب تک اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول نہیں فرمائی ہے

یہ مسلّم ہے کہ رمضان کے روز دن کا اصلی مقصد قوت بہیمیہ کو مغلوب اور قوت ملکیہ کو غالب کرنا ہے، اسی لیے شارع نے ان مہیّجات ومحرکات سے چند دنوں کے لیے روکا ہے، جس سے قوت بہیمیہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کھانا، پینا، عورتوں سے متمتع ہونا اوران تینوں چیزوں کے چھوڑ دینے کے بعد مادّی حیثیت سے روزہ کی حقیقت مکمل ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم اسرار الدین کے ماہرین نے روزہ کی تکمیل کے لیے جو باتیں ضروری قرار دی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ غذا میں جہاں تک ممکن ہو کمی کی جائے۔ چنانچہ امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:-

''روزہ کی تکمیل کی پانچویں شرط یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال کھانا بھی اس قدر نہ کھایا جائے کہ پیٹ میں امتلا پیدا ہوجائے کیونکہ خدا کے نزدیک کوئی ظرف اس پیٹ سے زیادہ مبغوض نہیں جو حلال کھانے سے بھرلیا جائے، درحقیقت روزہ سے خدا کے دشمن کی شکست اور خواہش نفسانی کی مغلوبیت کیونکر ممکن ہے؟ جب کہ روزہ دار اپنے افطار کے وقت اس کمی کی تلافی کرے جو دن میں کی گئی ہے بلکہ بسا اوقات طرح طرح کے کھانوں سے وہ اس پر اضافہ کرلیتا ہے، یہاں تک کہ یہ ایک مستقل عادت ہوگئی ہے کہ رمضان کے لیے ہر قسم کے کھانے مہیا کیے جاتے ہیں اور اس میں وہ وہ کھانے کھائے جاتے ہیں جو اور مہینوں میں نہیں کھائے جاتے۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ روزہ کا مقصد بھوکا رہنا اور خواہش نفسانی کو شکست دینا ہے تاکہ نفس کو تقویٰ حاصل کرنے کی قوت حاصل ہو لیکن جب معدہ کو صبح سے شام تک خالی رکھا جائے، یہاں تک کہ اس کی خواہش طعام میں ہیجان پیدا ہوجائے اور اس کی رغبت غذا کی طرف بہت زیادہ ہوجائے، پھر اس کو لذیذ کھانے کھلا کر آسودہ وسیر کردیا جائے۔ تو اس کی لذت طلبی بڑھ جائے گی، اس کی قوت دوگنی ہوجائے گی اور وہ خواہشیں ابھر جائیں گی جو تقریباً دبی ہوئی تھیں، غرض روزہ کی روح، ان قوتوں کو

ضعیف کرنا ہے جو برائی کی طرف میلان پیدا کرنے میں شیطانی آلے ہیں اور یہ غرض صرف تقلیل غذا سے حاصل ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ روزہ دار صرف وہی کھانا کھائے جو رمضان کے علاوہ معمولاً کھاتا تھا لیکن اگر صبح وشام دونوں وقت کا کھانا ملا کر کھائے تو اس کو روزہ سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ آداب صوم میں یہ ہے کہ روزہ دار دن کو بہت نہ سوئے تاکہ اس کو بھوک اور پیاس کا احساس ہو اور اپنی قوت کا ضعف معلوم ہونے لگے''۔

(احیاء العلوم۔ جلد اوّل۔ مطبوعہ مجتبائی پریس۔ ص 147)

احادیث کے مطالعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ عہد نبوت اور عہد صحابہؓ میں رمضان کے کھانے کا کوئی مزید اہتمام نہیں کیا جاتا تھا بلکہ معمولی غذا رمضان میں بھی کھائی جاتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور یا پانی سے افطار کرتے تھے، سحر میں بھی، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صرف کھجوریں کھائیں۔ بعد کو بعض صحابہؓ ستو گھول کر لائے تو ستو بھی پی لیا، اس سے زیادہ مجھے اس مبارک عہد میں غذاؤں کی رنگینی اور بوقلمونی نظر نہیں آتی لیکن اس وقت مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟ رمضان نے ایک تہوار یا تقریب کی صورت اختیار کر لی ہے، معمولی آدمی کے لیے بھی افطار کے وقت گھنگنی یا پھلوڑی تو لازمی ہے۔ سحر کے لیے دودھ بھی ایک اہم چیز فرض کر لی گئی ہے۔ کھانے میں بھی جو شخص دال روٹی کھاتا تھا وہ کم از کم ترکاری کا تو اضافہ کر ہی لیتا ہے۔ اہل مقدرت کے دستر خوان تو رمضان میں گویا رنگین غذاؤں کا گلدستہ بن جاتے ہیں۔ دعوتوں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ روزہ کشائی کی رسم تو خالص شادی کی تقریب بن جاتی ہے۔ یہ حالت معمولی دنیاداروں کی نہیں ہے، علما وصوفیہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، رمضان میں بجائے اس کے کہ حدیث وقرآن کا درس دیا جائے، راحت طلبی کے لیے ہمارے عربی مدارس میں تعطیل ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک خاص تصوف کے مرکز کے متعلق ایک مضمون پڑھا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مغرب سے سحر کے وقت تک تمام لوگ جو اس مرکز سے روحانی فیض اٹھاتے ہیں، بیدار رہتے ہیں اور زیادہ تر عمدہ غذاؤں کا لطف اٹھاتے ہیں، تراویح سے پہلے، تراویح کے بیچ میں اور تراویح کے بعد تین بار چائے کا دور چلتا ہے۔ چونکہ آپ نے زیادہ تر علما وصوفیہ کا فیض اٹھایا ہے اس لیے براہ کرم مجھ کو اور ناظرین سچ کو اس معاملہ میں اپنی معلومات سے فائدہ پہنچائیے اور یہ بتائیے کہ اس

کی سند کیا ہے اور یہ حالت مقاصد صوم کے منافی ہے یا نہیں''؟

ج:- مولانا کا مضمون بالا حضرت محقق تھانوی مدظلہ کی خدمت میں بجنسہٖ بھیج دیا گیا۔ حضرت موصوف نے غایت کرم سے اس پر پورا مقالہ قلمبند فرمادیا، جو تحقیق مطالب وجامعیت بیان کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ ہے۔ آگے اسے بصد مسرت وافتخار درج کیا جاتا ہے۔ موجودہ مسرفانہ ''افطار پارٹیوں'' اور دھوم دھام کی دعوتوں کی تائید حضرت مولانا تھانویؒ کے مقالہ سے ہرگز نہ سمجھی جائے۔ حضرت نے صرف اصولی حیثیت سے گفتگو فرمائی ہے، باقی ان صحبتوں کی جو خرابیاں مشاہدہ ہوچکی ہیں ان کے بعد ان لغویتوں کی تائید کر ہی کون سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم

(از حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہٗ(1))

بعد الحمد والصلوٰۃ، تحقیق مقصود کے قبل مبادی کی ضرورت ہے۔

(1) احکام باعتبار ثبوت کے تین قسم ہیں۔ منصوص، اجتہادی، ذوقی۔ اجتہادی میں اجتہاد سے مراد وہ ہے جس کو فقہا اجتہاد کہتے ہیں اور ایسے اجتہاد سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں وہ واقع میں نص ہی سے ثابت ہوتے ہیں۔ اجتہاد سے صرف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے **القیاس مظھر لا مثبت**. اور ذوقی وہ احکام ہیں جو نص کا مدلول نہیں، نہ بلا واسطہ جو منصوص کی شان ہوتی ہے نہ بواسطہ جیسے اجتہادیات کی شان ہوتی ہے بلکہ وہ احکام محض وجدانی ہوتے ہیں اور اس ذوق و اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ احکام اجتہادیہ مدلول نص ہیں اور یہ مدلول نص نہیں۔ اسی واسطے مجتہدین سے ایسے احکام منقول نہیں نہ کسی پر ان احکام کا ماننا واجب ہے۔ محض اہل ذوق کا وجدان ان احکام کا مبنیٰ ہوتا ہے۔ البتہ ان میں بعض احکام ایسے ہوتے ہیں کہ اشارات کتاب وسنت سے ان کی تائید ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ان کا قائل ہونا جائز ہے اور اگر کتاب وسنت کے خلاف ہو تو اس کا رد ہونا واجب ہے اور اگر کتاب وسنت سے نہ متاید ہوں نہ اس کے خلاف ہوں تو اس میں جانبین کی گنجائش ہے۔ اسی طرح اگر ایک صاحب ذوق کو متاید معلوم ہوں اور دوسرے کو خلاف تب بھی اس میں جانبین میں گنجائش ہے اور یہ اجتہادیات(1) جز فقہ ہیں اور ذوقیات(2) جز تصوف۔

---

(1) حیات کی تحریر ہے، ورنہ دونوں مرحوم ہو چکے ہیں (قاسمی)

(2) اجتہادیات، ذوقیات، دونوں کی تشریح ابھی اوپر ہو چکی ہے۔ (ج)

(2) احکام اجتہادیہ کا مبنیٰ علت ہوتی ہے جس سے حکم کا تعدیہ کیا جاتا ہے اور ذوقیات کا مبنیٰ محض حکمت اور وہ بھی غیر منصوص جس سے حکم متعدی نہیں ہوتا، نہ حکم کا وجود وعدم اس کے ساتھ دائر ہوتا ہے۔ (اور یہ عدم دوران حکمت منصوصہ میں بھی عام ہے جیسے طواف میں رمل کہ اس کی بنا ایک حکمت تھی مگر وہ مدار حکم نہیں رہی) مگر تمام مسائل تصوف کو اس شان کا نہ سمجھا جائے ان میں بھی بعض اجتہادی ہیں اور بعض منصوص بھی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ان میں جو ذوقیات ہیں ان کی یہ شان ہے جو مذکور ہوئی۔

(3) ایک دوسرے اعتبار سے احکام کی اور دو قسمیں ہیں مقاصد اور مقدمات۔ یہ احکام ذوقیہ صرف مقدمات ہوتے ہیں۔ مقاصد نہیں ہوتے۔ مقاصد صرف منصوص ہوتے ہیں یا اجتہادی(1)۔

(4) احکام منصوصہ واجتہادیہ شریعت ہے۔ احکام ذوقیہ شریعت نہیں، البتہ اسرار شریعت ان کو کہا جا سکتا ہے اور یہ سب مبادی ماہر قواعد شرعیہ کے نزدیک ظاہر ہیں۔

اب مقصود عرض کرتا ہوں کہ مسئلہ زیر بحث نہ منصوص ہے نہ اجتہادی۔ صرف ذوقی ہے اور جو کچھ اس باب میں احیاء العلوم میں فرمایا ہے وہ اسی ذوق پر مبنی ہے اور ان کے نزدیک کچھ رمضان کی تخصیص نہیں مطلق جوع کے باب میں وہ اسی کے قائل ہیں اور بعض کا ذوق اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ علی قاریؒ شرح شمائل ترمذی میں ابن الجوزیؒ سے نقل کرتے ہیں۔ **ومن جهلة الصوفية من يقلل المطعم او ر اكل الرسم حتٰى يبس بدنه ويعذب نفسه بليس الصوف ويمتنع من الماء البارد وما هذه طريقة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا طريق صحابته واتباعهم وانما كانوا يجوعون اذا لم يجدوا شيئا فاذا وجدوا اكلوا الخ (من حاشيه تقليل الطعام بصورت الطعام)** اور حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب الصوم میں فرماتے ہیں:۔

ثم ان تقليل الاكل والشرب له طريقان احدهما ان لايتناول منهما الا قدراً يسيراً والثاني ان تكون المدة المتخللة بين الا كلات زائدة على القدر

---

(1) یعنی مقاصد میں شمار صرف وہی احکام ہوتے ہیں جو ثابت یا تو نص سے ہیں اور یا ائمہ فقہ کے اجتہادات سے (ج)

المعتاد والمعتبر فی الشرائع هو الثانی لانه یخفف وینفه ویذیق بالفعل مذاق الجوع والعطش ویلحق البھیمة حیرة ودھشة ویاتی علیھا اتیاناً محسوساً والاول لایاتی تحت التشریع العام الا بجھد فان الناس علیٰ منازل مختلفة جداً الخ.

اس سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ مسئلہ متکلم فیہا میں ذوق مختلف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سا ذوق اقرب الی الکتاب والسنّت ہے۔ اس کا موازنہ دونوں ذوق کے مؤیدات میں غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔ سو ذوق اوّل کے یہ مؤیدات ہو سکتے ہیں (الف) کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون. اے کے تحذروا المعاصی فان الصوم یعقم الشھوۃ التی امھا او یکسرھا (ب) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجآء رواہ الشیخان (ج) احادیث فضیلت جوع وذم شبع۔

مگر ان سب استدلالات میں شبہات ہیں۔ (الف) میں یہ کہ یہ تفسیر متعین نہیں، دوسری تفسیر بھی محتمل ہے، چنانچہ ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے فتتقون من الطعام والشرب والنساء مثل ما اتقوا قبلکم. اور تفسیر نیشاپوری میں ہے لعلکم تتقون بالمحافظة علیھا لقدمھا وبعیرا سطر او لعلکم تنتظمون فی سلک اھل التقویٰ فان الصوم شعارھم ۔ اور اگر وہی تفسیر مان لی جائے تب بھی دلالت علی المقصود میں یہ شبہ ہے کہ کسر قوت بہیمیہ تقلیل طعام پر موقوف نہیں۔ کما مر قریباً عن حجة اللہ البالغہ وسیاتی ایضا اور (ب) میں یہ کہ اس میں صوم کی خاصیت بیان کی گئی ہے تشریع صوم کی حکمت بیان نہیں کی گئی اور یہ خاصیت موقوف نہیں ہے تقلیل اکل پر کیونکہ تجربہ ہے کہ باوجود شبع من اللذات کے رمضان میں ضعف معتد بہ ہو جاتا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ عادت تھی دو وقت رغبت کے ساتھ کھانے کی اور اب رغبت کے ساتھ نہ صرف ایک وقت کھایا جاتا ہے یعنی شام کو اور سحر کے وقت بوجہ عادت نہ ہونے کے رغبت سے نہیں کھایا جاتا۔ اس لیے وہ جز بدن اور بدل ما یتحلل نہیں بنتا۔ پھر جب

وقت آتا ہے عادت کے سبب طبیعت کو اشتیاق ہوتا ہے اور باوجود اشتیاق کے کھانا نہیں ملتا، اس لیے طبیعت ضعیف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ضعف عشرۂ وسطیٰ میں کمی کے ساتھ اور عشرہ اخیرہ میں زیادتی کے ساتھ بین طور پر محسوس ہوتا ہے۔ البتہ اگر کئی مہینہ کے روزے ہوتے تو چند روز میں کھانے کے اوقات معتادہ بدل جاتے، پھر رغبت سے دونوں وقت کھانا کھایا جاتا اور جز بدن بنتا اور ضعف نہ ہوتا اور قوت شہویہ میں انکسار نہ ہوتا اور اسی راز سے صوم دہر پسند نہیں کیا گیا اور صوم داؤدی میں عادت قدیمہ نہیں بدلتی اور لیے اس کی اجازت مع بیان الفضیلت دی گئی۔

اور یہی تقریر (الف) میں بھی ہو سکتی ہے کہ اگر اس تفسیر کو متعین بھی مان لیا جائے تب بھی صوم ہر حالت میں قوت شہویہ کا سر ہے۔ **وهذا هو الذی وعدناه قریباً فی قولنا وسیاتی ایضاً** اور (ج) میں یہ کہ احادیث فضل جوع وذم شبع (1) میں یہ احتمال ہے کہ جوع سے مراد جوع اضطراری ہو۔ یعنی اگر میسر نہ ہو تو اس کی فضیلت کو یاد کر کے صبر کرے جیسے نصوص میں بیماری کے فضائل بیان کیے گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمداً بیمار ہو جایا کرے۔ چنانچہ آیت **ولنبلونکم** الخ میں جوع کو مصائب میں شمار فرمایا ہے اور سب مصائب مذکورہ آیت غیر اختیاری ہیں تو جوع سے وہی مراد ہوگا جو غیر اختیاری ہو۔ اسی طرح شبع مذموم میں یہ احتمال ہے کہ شبع مفرط (2) یعنی فوق الشبع مراد ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں اکثرہم شبعا (3) فرمایا ہے من شبع منھم نہیں فرمایا۔ سو ایسے شبع کو فقہا نے بھی حرام فرمایا ہے۔ کذا فی الدر المختار ورد المختار کتاب الکراہت۔

یہ تو ذوق اوّل کے مؤیدات پر کلام تھا۔ اب ذوق ثانی کے مؤیدات عرض کرتا ہوں۔

(د) حدیث میں ہے **شهر یزاد منه رزق المومن کذا فی المشکوٰة عن البیهقی** ۔ تو کیا یہ امر معقول ہے کہ رزق زائد تو رمضان میں دیا جائے اور اس سے منتفع ہونے کے لیے شوال کے انتظار کا حکم دیا جائے (ہ) افطار کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول منقول ہے **ذهب الظماء وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء الله تعالٰی** (رواہ ابوداؤد) ظاہر ہے کہ ذہاب ظماء (4) اور ابتلال عروق (5) بدوں سیراب ہو کر پانی پینے کے نہیں

---

(1) شکم سیری (ج) (2) خوب ٹھونس ٹھونس کر کھالینا (ج) (3) حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں اکثرھم شبعا فی الدنیا اطولھم جوعاً یوم القیامة (ج) (4) پیاس کا بجھنا (ج) (5) رگوں کا تر و تازہ ہو جانا۔

ہوسکتا اور باوجود اس کے وہ منقص اجر نہیں ہوا۔ چنانچہ مثبت الاجر اس میں نص ہے اور کھانے اور پانی میں کوئی معقول فرق نہیں کہ ایک سے سیری پسندیدہ ہو دوسرے سے ناپسندیدہ ہو (د) حدیث میں اشباع (1) صائم کی فضیلت اور ثواب وارد ہے (مشکوٰۃ عن البیہقی) اگر شبع ناپسندیدہ ہوتا۔ لان مقدمۃ الشی ملحق بہ۔ نہ کہ موجب ہوتا۔ (ز) شبع اور ری تو مقدمات شہوت سے ہیں اور جماع خود تقاضائے شہوت ہے۔ اگر شبع اور ری مفوت روح صوم (2) ہے تو جماع بدرجۂ اولیٰ اس کا مفوت ہے مگر اس کی تقلیل کی کسی نے ترغیب نہیں دی بلکہ اس کی اجازت وسیعہ کو موقع امتنان میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''فالآن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم'' اور اس کے ساتھ کلوا واشربوا کو بھی مقرون فرمایا ہے اور سب کے لیے غایت فرمائی۔ ''حتٰی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر'' (خ) اگر تقلیل طعام فی رمضان کوئی امر مقصود ہے تو فضائل صوم کے ساتھ اس کی فضیلت اور منکرات صوم کے ساتھ شبع کی مذمت نصوص میں یا مجتہدین کے کلام میں کیوں وارد نہیں ہوئی۔ کیا اس سے ''اکملت لکم دینکم'' میں اشکال وارد نہیں ہوتا۔ یا پانچ مؤیدات ہیں ذوق ثانی کے جو اس وقت ذہن میں حاضر ہو گئے۔ اگر اہل ذوق اوّل ان تائیدات میں بھی کوئی خدشہ نکالیں ہم کو مضر نہیں کیونکہ احکام مختلف فیہا میں جانبین میں گنجائش ہوتی ہے اس لیے اس کا بھی مطالبہ کیا جائے گا کہ اہل ذوق اول بھی اہل ذوق ثانی پر طعن وتشنیع اور ان کی تحقیر وتقبیح سے باز رہیں کیونکہ ذوقیات میں ایسا اختلاف کوئی امر منکر نہیں ہے۔ چنانچہ قوم میں دعا وترک دعا کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور مباشرت اسباب وترک اسباب کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور بہت مسائل ایسے ہی ہیں، اسی طرح یہ مسئلہ فقہی نہیں جس کا اتنا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ فقہا نے باوجودیکہ مستحبات تک کی تدوین فرمائی مگر اس سے کہیں تعرض نہیں فرمایا اور اگر فقہی بھی ہوتا تو مختلف فیہ ہونے کی صورت میں پھر بھی یہی حکم ہوتا۔ اس تقریر سے امید ہے کہ اصل اجزا مسئول عنہا کا جواب ہو گیا ہو گا باقی زوائد کے متعلق بھی کچھ مختصر عرض کیے دیتا ہوں۔

(1) صحابہؓ کے وقت میں اہتمام نہ ہونا حجت نہیں کیونکہ ان کے یہاں ہر چیز میں سادگی تھی اسی عادت کے موافق یہاں بھی عمل تھا۔

---

(1) روزہ دار کو پیٹ بھر کھلانا (ج) (2) روح صوم کو ضائع کرنے والا۔ (ج)

(2) اور اس کو تقریب بنالینا اگر حدود کے اندر ہو تو کیا حرج ہے۔ خود حدیث میں ہے کہ رمضان کے لیے جنت کی زینت سال بھر تک ہوتی رہتی ہے۔ (مشکوٰۃ عن البیہقی) تو اگر اس کی تقلید میں یہاں بھی کچھ اہتمام ہو تو کیا حرج ہے۔

(3) دعوتوں کا ہنگامہ یہ فرد ہے مواساۃ کی۔ حدیث میں اس کو شہر المواساۃ فرمایا گیا ہے۔ (مشکوٰۃ عن البیہقی)

(4) روزہ کشائی کی تقریب بھی ایک فرد ہے، فرح عند الفطر کی، اولاد کی توفیق دین سے فرح کیوں مذموم ہو۔

(5) تعطیل مدارس کی راحت اور اعمال رمضان کے لیے کیوں منکر ہے اور وہ عادتاً درس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

(6) صوفیہ کی طرف سے جواب دینا خود صوفیہ کے مذاق کے خلاف ہے۔ وہ بیچارے خود ہی اپنے کو سب سے اخس وازون سمجھتے ہیں اور اپنی نصرت کو خود اس طرح منع کرتے ہیں۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اس احقر کو صوفیہ کے اور اعمال میں تو ان کی تقلید کی توفیق نہیں ہوئی مگر یہ رسم سن کر جواب تک نہ سنی تھی حرص ضرور ہوئی کہ واقعی جاگنے کا دور جاگنے کی تو اچھی تدبیر ہے مگر حرص ہی ہو کر رہ گئی اس لیے کہ پھر نیند سے محرومی ہو جائے گی جس کا میں اس سے زیادہ حریص ہوں اور جس طرح تقلیل طعام میں وہ ذوق پسند آیا جس میں شبع بھی ہاتھ آئے اسی طرح تقلیل منام میں وہ مسلک پسند ہے جو مخل نوم نہ ہو۔ وہ مسلک یہ ہے۔ حدیث۔ **من صلى العشاء فى جماعة فكانما قام نصف الليل ومن صلى الصبح فى جماعة فكانما صلى الليل كله لمالك ومسلم. تفسير عن انس تتجافىٰ جنوبهم عن المضاجع قال ما بين المغرب والعشاء وعنه ايضا نزلت فى انتظار الصلوٰة التى تدعى العتمة وعنه ايضا فى قوله تعالىٰ كانوا قليلا من الليل مايهجعون قال ينتقظون يصلون ما بين هاتين الصلاتين ما بين المغرب والعشاء عن محمد بن على قال لاينامون حتىٰ يصلوا العتمة وعن ابى العالية قال لاينامون بين المغرب والعشاء (تفسير ابن جرير)**

وفی الدار المنثور کانوا لاینامون اللیل کله، فالقلیل لایقابل الکثیر بل یقابل الجمیع فی معنی البعض (کذا فی بیان القرآن) اثر. قال سعید بن المسیب من شهد العشاء من لیلة القدر فقد اخذ بحظ منها (مؤطا الامام مالک) فقلت فکانه تفسیر المرفوع من حرم خیرها فقد حرم فالذی شهد فی جماعة لم یحرم خیرها.

اس نوم کی پسندیدگی سے وہ چائے کی غرض بھی جاتی رہی اور اپنے جی کو یوں سمجھا لیا کہ اللہ تعالیٰ ناکاروں کو بھی بخش ہی دیں گے۔ اب اس امید مغفرت پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور چونکہ اس کی مقدار معتد بہ ہوگئی اس لیے ایک لقب بھی تجویز کیے دیتا ہوں، یعنی کلمة القوم فی حکمة الصوم.

کتبہٗ اشرف علی 25 شعبان 1352

ضمیمہ

یہ بھی محتمل ہے کہ امام غزالیؒ کے ارشاد کو اختلاف ذوقی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اپنے زمانہ کے قویٰ کو دیکھ کر بطور مجاہدہ اسی طریق کو تجویز فرمایا اور مجاہدہ زمانہ کے اختلاف سے بدل جاتا ہے۔ اب قویٰ ایسے ضعیف ہیں کہ اتنی تقلیل یقیناً طاعات مقصودہ میں مخل ہوجائے گی۔ باقی یہ کہ حضرت امام نے عنوان تاکید سے کیوں فرمایا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صوفیہ پر بعض حالات کا یا بعض اصطلاحات کا غلبہ ہوتا ہے اس میں اس قسم کا عنوان بیساختہ صادر ہوجاتا ہے اور اس مقام پر ایک اور نکتہ قابل سمجھنے کے ہے، گویا قواعد طریقت سے وہ روح ہے مسئلہ کی۔ وہ یہ کہ مقصود سالک کا حسب تصریح ائمہ تشبہ ہے ملائکہ کے ساتھ اور یہ تشبہ جس طرح شبع مفرط سے فوت ہوتا ہے اسی طرح جوع مشوش سے بھی کیونکہ ملائکہ دونوں سے منزہ ہیں اور یہ سب تحقیق اس تقدیر پر ضروری ہے کہ صوم میں حکمت کسر قوت شہویہ کو مان لیا جائے ورنہ اگر وہ امر تعبدی ہو جیسا کہ خود روزہ کا عدد کہ اس میں کوئی حکمت معلوم نہیں تو اس تمام تر سوال و جواب ہی کی گنجائش نہیں اور بعض الفاظ حدیث سے یہ احتمال تعبد کا ظاہر قوی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے من صام رمضان ایمانا

واحتسابا. رواه الشيخان حيث جعل الباعث عليه الايمان وطلب الثواب لاشيئا من الحكمة والمصلحة وهذا هو التعبد. فقط.

(61)

ترجمہ کا کام ابھی باضابطہ اور مسلسل شروع نہیں ہوا اور تفسیر کا تو ابھی خیال بھی پورا پورا نہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ ابتدائی مشقیں بے قاعدہ طور پر شروع ہوگئیں اور ضروری مطالعہ تو پوری طرح جاری ہوگیا۔ ایک بڑی دقت وقت اوّل اوّل یہ محسوس ہو رہی تھی کہ مذہبی خیالات کے اظہار کے لیے انگریزی میں الفاظ کہاں سے ملیں گے؟ اب تک انگریزی میں سارا مطالعہ علمی وادبی، غرض غیر مذہبی ہی رنگ کا تھا، اب پہلی بار انگریزی بائبل اور اس کے متعلقات کو پڑھنا شروع کیا تو آنکھیں کھل گئیں اور نظر آیا کہ چند مخصوص اسلامی اصطلاحات کو چھوڑ کر باقی عام طور پر مذہبی خیالات کی ترجمانی میں انگریزی زبان ہرگز تنگ نہیں۔ 21 دسمبر 1933 (مطابق 3 رمضان 1352) کا عریضہ اسی دَور کا ترجمان ہے:

م۔ ''انگریزی ترجمہ شروع کرنے کی ابھی نوبت نہیں آئی۔ ایک ہفتہ انشاء اللہ دوسرے مشاغل ختم کر کے اور یکسوئی کے ساتھ اس کے لیے وقت نکالوں گا۔

ا۔ بیحد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے کہ عموماً وخصوصاً نافع ہو۔

م۔ طریق کار ذہن میں یہ ہے کہ روز، بعد دعا اور اگر ہمت نے ساتھ دیا تو بعد دو رکعت نفل کے (1) ایک رکوع کا مفہوم پہلے بیان القرآن نیز ترجمہ شیخ الہند کی مدد سے سمجھ لیا کروں گا اور اس کے بعد اسی مفہوم کو انگریزی میں ادا کر دیا کروں گا(2)۔ دوسرے انگریزی ترجمے بھی سامنے ہوں گے ایک نظر ان پر بھی کر لیا کروں گا۔ عربی انگریزی لغات جو اہل یورپ تیار کر چکے ہیں ان میں سب سے بہتر اور مفصل مدالقاموس 8 ضخیم جلدوں میں ہے(3)۔ بیان القرآن ہی کی طرح انگریزی میں حتی الامکان پیرایہ ادا ایسا رکھوں گا کہ انشاء اللہ اشکالات وارد ہی نہ ہوں۔ کہیں کہیں حسب ضرورت توضیحی الفاظ قوسین کے اندر اور کہیں حاشیے بھی دینے پڑیں گے۔ اہل باطل کے

---

(1) ہمت نے چند ہی روز بعد جواب دے دیا۔ (2) ان التزامات سے بعد کو رجوع کرنا پڑا۔ (3) انگریزی میں پورا نام Arabic English dexccon lane کتاب گویا تاج العروس (زبیدی بلگرامی) کا ملخص ہے۔

جوابات انشاءاللہ اس سے ضمناً خود ہی نکلتے آئیں گے۔

ا۔طریق کار نہایت مفید ہے۔دوران کتاب میں حسب ضرورت مفید طریقے قلب پر وارد ہوتے رہیں گے۔انشاءاللہ تعالیٰ

میرے خیال میں اتنی اور ضرورت ہے کہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں نے قرآن مجید سے اپنے مسلک باطل پر استدلال کیا ہے، جیسے محمد علی لاہوری نے مرزا کے دعووں کی قرآن مجید سے تائید کی ہے جس کی تفصیل اس کی تفسیر دیکھنے سے (کہ اس کا نام بھی بیان القرآن رکھا ہے) معلوم ہوسکتی ہے۔اس کا مستقل طور پر جواب دیا جائے۔ان جوابوں میں مولوی شبیر احمد دیوبندی نے حضرت مولانا دیوبندی کے ترجمہ پر حال میں جو فوائد لکھے ہیں جو مطبع مدینہ بجنور میں عنقریب طبع ہونے والے ہیں ان سے بہت مدد ملے گی۔یہ مجھ کو ثقات کے ذریعہ ابھی معلوم ہوا۔ اوّل تو وہ انشاءاللہ تعالیٰ کافی ہوں گے وہ ذہین آدمی ہیں اور اگر پھر بھی کہیں ضرورت رہ جائے ہم سب خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ان فوائد کے بھیجنے کے لیے مطبع کو فرمائش لکھ دی جائے البتہ اگر یہ دیکھا جائے کہ انگریزی داں طبقہ اس مولویانہ بحث کو پسند نہیں کرے گا تو علاحدہ رسالہ کے طور پر ساتھ ساتھ لکھ دیا جائے جو شائق ہو وہ جداگانہ خرید لے گا لیکن یہ جز ہے ضروری کیونکہ یہ لوگ اس تفسیر سے بگڑ چکے ہیں۔

م۔ابھی تو ذرا انگریزی انجیل و توریت کا مطالعہ شروع کرتا ہوں۔اس کی زبان بڑی مستند اور ٹکسالی سمجھی جاتی ہے۔یہ اندازہ ہوجائے گا کہ آسمانی کتابوں کے لیے انگریزی زبان میں کیسے کیسے محاورات لائے جاتے ہیں۔

ا۔نہایت مستحسن ہے۔

م۔مولوی عیسیٰ صاحب کی انگریزی دانی کا علم اب تک نہ تھا، اب آپ کے فرمانے سے ہوا۔کام کے مشورے ایسا ہی شخص دے سکتا ہے۔ضرور انھیں تحریر فرمادیا جائے۔اس کے بعد خود بھی ان سے مراسلت کرتا رہوں گا۔

ا۔میں آج ہی لکھتا ہوں۔ان کا پتہ ہے، مولوی محمد عیسیٰ صاحب، محلّہ مختشم گنج، الہ آباد۔

م۔کبھی موقع ہوا تو الہ آباد ہو بھی آؤں گا۔

ا۔مگر آنے کے متعلق اوّل ان سے مشورہ لے لیا جائے۔

م۔کتابوں کے متعلق مالی امداد کا جو مشورہ ارشاد ہوا ہے اس پر کیا عرض کروں، نذر پیش کرنے کا منصب تو میرا تھا، نہ کہ الٹا اُدھر سے کوئی عطیہ نقد کی شکل میں قبول کروں، ادھر سے تو صرف دعاؤں کا محتاج اور برکتوں کا منتظر رہا کرتا ہوں۔بہرحال میرے جذبات ابھی تک تو اس ارشاد کی تعمیل میں دشواری ہی محسوس کر رہے ہیں۔

ا۔یاد نہیں کیا لکھ گیا ہوں گا۔اتنی ہمت و وسعت کہاں۔البتہ سود و سو کی ہمت کر کے اپنے کو اس بڑھیا کے حواشی میں ضرور شمار کر سکتا ہوں جو سوت کی انٹی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے آئی تھی۔اگر گرانی نہ ہو تو اس معروضہ کی مجھ کو اطلاع فرمائی جائے۔شاید کوئی اور بات ذہن میں آجائے۔

م۔وعظ تقلیل الطعام موصول ہوا۔انشاء اللہ عنقریب واپس کردوں گا۔سب سے بڑھ کر شکریہ اس مقالہ پر عرض کرتا ہوں، جو خاص اس مبحث پر تحریر فرما دیا گیا ہے، جامع و محققانہ، تمام اطراف بحث پر حاوی، اجازت ہو تو پورے مقالہ کو سچ میں شائع کردوں۔

ا۔اجازت چہ معنی، میرے لیے فخر ہے۔

اطلاع جدید۔ندوی مولوی صاحب کے مضمون حکمت صوم میں تصوف کے جس مرکز پر تعریض تھی ایک دوست کا گمان یہ ہے کہ یہ مولوی وارث حسن صاحب کی طرف اشارہ ہے(1) واللہ اعلم

ایک خط مولانا کا مع اپنے جواب کے ملاحظہ کے لیے بھیجتا ہوں۔لفافہ پر انگریزی لکھ کر ڈاک میں ڈلوا دیجئے۔ایک غایت ملاحظہ کرانے کی نادانوں کے اس خیال کا دفع کرنا ہے کہ مولانا کی سیاست مولویت پر غالب آگئی ہے(2)۔

---

(1) اور غالباً یہی صحیح تھا۔ملا شاہ وارث حسن صاحب اس وقت کے ایک مشہور شیخ طریقت تھے، جنھیں بڑی مرجعیت و مقبولیت حاصل تھی، خصوصاً انگریزی خواں طبقہ میں تعریض کے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہوں صفحہ 60 و 59۔

(2) مراد مولانا حسین احمد صاحبؒ ہیں، اب اس مراسلت کی پوری تفصیل تو ذہن میں نہیں، صرف اتنا خیال ہے کہ رنگون میں بعض اہل بدعت نے حضرت تھانویؒ کے خلاف بڑی یورش کر رکھی تھی۔مولانا حسین احمد صاحبؒ نے اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ مجھے آپ اپنا مختار و نمائندہ بننے کی اجازت مرحمت کریں۔میں آپ کی طرف سے دفاع و جواب کرلوں گا۔ حضرت نے اجازت بمسرت مرحمت کردی تھی۔

عین اسی زمانہ میں ایک بے ادب اخبار نویس نے "رحلت مصطفیؐ" کے سلسلہ میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے حضور انورؐ کے جسد اطہر کے متعلق ایک آدھ بات ایسی لکھ دی تھی جو علاوہ بدتمیزی کے سرتاسر خلاف واقعہ بھی تھی بیچ میں بحمد اللہ اس کی تردید تقدیس رسولؐ کے زیر عنوان ایک مفصل مضمون سے کردی گئی تھی، چندروز کے بعد جو رسالہ النور آیا، اس میں بھی ایک مضمون اسی مبحث پر تھا۔ خیال آیا کہ اس کے بعض حصے جو ذرا تشنہ رہ گئے، ان کی تکمیل بھی ہو جائے چنانچہ اسی عریضہ میں یہ بھی تھا۔

م۔ "النور بابت ربیع الاوّل تا جمادی الاولیٰ 53ھ میں فتاویٰ کے ذیل میں ایک مضمون محفوظیت جسم اطہر بعد وفات پر نکلا ہے۔ اس سلسلہ میں، جسد اطہر کے غسل کے موقع کی، عبارت ذیل سیرت ابن ہشام میں مل گئی۔ **ولم یری من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شئ مما یریٰ من المیت.** اب صراحت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی؟

اور پھر بلحاظ استناد سیرۃ ابن ہشام کا پایہ طبقات سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ طبقات تو دراصل صحابہؓ وتابعینؒ کی تاریخ ہے اور سوانح نبوی اس میں محض ضمناً آگئے ہیں۔ سیرت ابن ہشام خاص سیرت نبویؐ ہی پر تحقیق کر کے لکھی گئی ہے۔

اسی سیرۃ ابن ہشام میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ غسل دیتے جاتے تھے اور یہ الفاظ کہتے جاتے تھے۔ **وعلی یقول بابی انت وامی ما اطیبک حیا ومیتا.**

ایک روایت تو خود صحاح ہی میں موجود ہے۔ **عن علی ابن ابی طالب قال لما غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذھب یلتمس منہ ما یلتمس من المیت فلم یجدہ فقال بابی الطیب الطبت حیا وطبت میتا.**

غرض اب تو اس لغو روایت کی لغویت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مناسب ہو تو ان معروضات کو بھی بطور اس مضمون کے ضمیمہ کے النور میں درج فرما دیا جائے۔

ا۔ اسی وقت نقل لے کر انتظام کر دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب شائع ہو جائے گی۔ مہینہ نہیں بتلا سکتا یہ مدیر سے متعلق ہے"۔

اس کے بعد سے خط وکتابت کا بڑا حصہ قدرتاً تفسیر وترجمہ اور اس کے متعلقات ہی کی نذر

رہنے لگا۔ سال کا آخری خط انگریزی سال کے آخری دن 31 دسمبر مطابق 13 رمضان کا ہے۔ اس سے ضمناً میرے باقاعدہ کام شروع کرنے کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے پہلے عریضہ ملاحظہ ہو۔ پھر اس کا جواب:

''مولانا مدظلہٗ کی مراسلت ارسال فرمادینے کا نہایت درجہ شکر گزار ہوا۔ ایک تو میرے دونوں محبوب ومطاع بزرگوں کا باہمی اخلاص وارتباط اور پھر جناب والا کا میرے متعلق یہ خیال۔ سبحان اللہ، نور علیٰ نور (1)۔ ڈاک میں روانہ کردینے کے بعد خیال آیا کہ یہ دونوں مکتوبات تو نقل کرلینے کے قابل تھے (2)۔

ہدایات متعلق ترجمہ سے مستفید ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی پہلے سے ہی ذہن میں تھے مگر ابھی تو اصل مصحف زیر طبع ہے۔ صرف پارۂ عم شائع ہوا ہے۔ بجنور لکھ دیا ہے، کتاب پریس سے نکلتے ہی میرے پاس انشاء اللہ آجائے گی۔ مولوی محمد علی لاہوری کی انگریزی وار دو تفسیروں سے خوب واقف ہوں، ان میں قادیانیت یا مرزائیت تو بس کہیں کہیں ہے، البتہ نیچریت بڑی کثرت سے ہے۔ یعنی معجزات کی ایسی تاویل کہ معجزہ باقی ہی نہ رہے۔

فاضرب بعصاک الحجر کے معنی — اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف سفر کرو۔

فصرھن الیک کے معنی — پرندوں کو پال پرورش کر کے اپنے سے ہلالو۔

نتقنا الجبل فوقھم کے معنی — وہ لوگ دامن کوہ میں آباد تھے۔

آتش نمرود میں پڑنے کے معنی — گزند نمرود سے محفوظ رہنے کے۔ وقس علیٰ ہٰذا!

چنانچہ اسی عادت کی بنا پر ان لاہوری صاحب نے حضرت مسیحؑ کی معجزانہ ولادت سے بھی انکار کر دیا ہے حالانکہ خود مرزا غلام احمد اس کے قائل تھے بس اتنا غنیمت ہے کہ سرسید کی طرح فرشتوں کے وجود خارجی سے انکار نہیں کر دیا ہے۔ اپنے ترجمہ میں انشاء اللہ ان سب پہلوؤں پر نظر رکھوں گا بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ شیعہ تراجم پر بھی ایک نظر کرلوں لیکن طریقہ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب (1) کا سا مناظرانہ نہیں رکھوں گا۔ (جس کا انگریزی خوانوں پر الٹا اثر پڑتا ہے) بلکہ آپ کے بیان القرآن کی طرح محققانہ (یہ لفظ ظاہر ہے کہ اپنے لیے نہیں آپ کے لیے استعمال کر رہا

---

(1) چاند پوری مشہور مناظر اور دارالعلوم دیوبند کے استاد تھے (قاسمی)

ہوں) یعنی تقریر ترجمہ ایسی ہو کہ شبہات خود بخود ساقط ہوتے جائیں۔

کام بحمد اللہ پرسوں سے شروع کر دیا ہے۔ پرسوں سورۃ الفاتحہ اور کل پہلا رکوع بقرۃ کا ہو گیا مع مختصر حواشی کے۔ میں نے اپنے تجربہ میں ترجمہ کو تصنیف سے ہمیشہ مشکل تر پایا اور پھر یہ تو کلام الٰہی کا ترجمہ ہے۔ ایک ایک لفظ کے لیے گھنٹوں الجھا رہا۔ لفظ اللہ کا ترجمہ ممکن نہ تھا۔ اسے یونہی رہنے دیا۔ الرحمٰن الرحیم کے لیے جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مادہ ملے جس سے ترجمہ کے بھی دونوں لفظ مشتق ہوں، نہ ملا۔ پھر یوم الدین پر رُکا۔ بعض نے اس کا ترجمہ یوم الحساب سے کیا ہے۔ بعض نے یوم البعث سے اور بعض نے یوم الآخرۃ سے۔ میں چاہتا تھا، ٹھیک ٹھیک یوم الجزا کا مفہوم آجائے۔ بحمد اللہ ہو گیا۔ پھر المستقیم پر رُکا۔ اردو میں تو آپ حضرات کو مناسب لفظ ''سیدھا'' مل گیا۔ انگریزی میں اگر مستقیم کا لفظی ترجمہ لایا جائے تو اس کے معنی صرف 'سیدھے' یا غیر منحنی باصطلاح مساحت واقلیدس کے پیدا ہوتے ہیں، تشریعی مطلوبیت ومقصودیت کا پہلو نہیں نکلتا اور اگر مفہومی ترجمہ یعنی لفظ صحیح لایا جائے تو اصل عربی لفظ سے ذرا بعد ہوا جاتا ہے۔ بس اللہ ہی اپنے فضل خاص سے دستگیری فرمائے ورنہ ظاہراً تو کوئی صورت ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی نظر نہیں آتی، دعاؤں کا شدید حاجتمند ہوں(3)، مولوی عیسیٰ صاحب(1) کو تو جناب غالباً لکھ چکے ہوں(4)''۔

(1) ''اس سے مجھ کو سرور علیٰ سرور ہوا۔

(2) یہاں مولوی جلیل احمد صاحب نے نقل کر لی ہے۔ فرمائش کے وقت حاضر ہو سکتی ہے۔ نقل پر یاد آ گیا کہ تفسیر الفرقان(2) پر جو میں نے لکھا تھا بعض احباب اس کی نقل چاہتے ہیں اگر بسہولت آ سکے۔

(3) سب تفصیلات پڑھ کر آپ کے اس اہتمام پر بیحد دل خوش ہوا اور خوشی میں حاضرین کو سنا دیا جن میں علما بھی کافی تعداد میں تھے۔ سب بیحد مسرور ہوئے۔ اور دعا دی اور امید ظاہر کی کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب ہو جائے گا اور بہت اچھا ہو جائے گا۔

بعض نے یہ رائے دی کہ طرز تو مناظرانہ نہ ہو لیکن بعد تقریر کے جو شبہ رفع کیا گیا ہو اس کے رفع کی تصریح ہو جائے کہ اس تقریر سے فلاں شبہ رفع ہو گیا۔

---

(1) مرتب انفاس عیسیٰ (قاسمی) (2) وہی مولانا فراہی کی عربی تفسیر مراد ہے، جس کا ذکر او پر کئی بار آ چکا ہے۔

(4) لکھ بھی دیا، جواب بھی آ گیا۔ اظہار مسرت کے ساتھ ہر لائق خدمت کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے۔ یہ رائے بھی دی کہ انھوں نے بیان القرآن کے متعلق کچھ لکھا ہے شاید تلخیص کے طور پر وہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ لکھا ہے کہ اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہت سہولت ہوگی۔ آپ اگر دل چاہے اس کی تفصیل پوچھ لیجیے۔ باقی بجز دعا کے کیا عرض کروں۔ مالی وسعت ہوتی تو اور بھی کچھ کہتا اب تو یہی کہوں گا۔

لاخیل عندک تهدیها ولا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال"

(62)

اب مراسلت کیا ہوتی تھی، گویا حضرت کے ہاں سے تفسیر کے درس تحریری (Correspondence Coursesx) کا سلسلہ کھل گیا تھا اور ہر ہفتہ عشرہ ادھر سے استفادہ اور ادھر سے افادہ برابر شروع ہو گیا تھا۔ 30 شوال 54ھ (جو جنوری 34 کے 23، 24 کے مطابق ہوگی) کا عریضہ اپنا ترجمان آپ ہے۔

م۔ ''بحمد اللہ پارۂ اوّل کا ترجمہ ختم ہو گیا۔

ا۔ مبارک باد قبول ہو۔

م۔ نظر ثانی وحواشی کا کام بھی انشاء اللہ دو چار روز میں ختم ہو جائے گا(1)۔

آپ کی بیان القرآن کی پوری قدر رفتہ ہی رفتہ جا کر ہوتی ہے۔ جب شروع شروع اُسے کئی سال ہوئے میں نے دیکھا تھا تو ایک اوسط درجہ کی کتاب نظر آئی تھی۔ پھر جب بعض لوگوں کو میں نے ترجمۂ قرآن اس کی مدد سے پڑھانا شروع کیا تو اس کی قدر بڑھی، اور پوری قدر تو اب جا کر ہو رہی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفسر نے ایک ایک لفظ تول تول کر رکھا ہے۔

ا۔ میں تو اتنا بھی معتقد نہیں لیکن آپ کی قدردانی سے مسرت ہوئی بے تکلف یہ بھی اطلاع کرتا ہوں کہ اول منزل میں التزامات کم ہوئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ جوں جوں آگے بڑھے گا، زیادہ

---

(1) اپنی اس وقت کی سادہ دلی پر آج ہنسی آ رہی ہے۔ نظر ثانی، ترمیم واضافہ کا کام دنوں نہیں، مہینوں بھی نہیں، برسوں جاری رہا اور پھر بھی مسودہ کو مطبع میں دیتے وقت دل بہت ہی غیر مطمئن رہا۔

خوش ہو جائیے گا(1)۔

م۔ میرے پیش نظر تو عربی کی متعدد تفسیروں کے علاوہ شیخ الہندؒ کا اردو ترجمہ بھی تھا لیکن مدد سب سے زیادہ بیان القرآن ہی سے ملی۔ شیخ الہندؒ کا ترجمہ شاہ صاحب دہلویؒ کے ترجمہ کی طرح صرف پختہ مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہ کرامت آپ کی بیان القرآن ہی میں دیکھی کہ پختہ مسلمانوں کے لیے تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی بدمذہبوں اور مذبذبین سب کی رعایتیں موجود۔ آپ کے تفسیری مطالب کا بیشتر حصہ تلخیص کر کے اپنے حواشی میں لینا چاہتا ہوں۔

لیکن بایں ہمہ ابھی چار مقامات میں جناب کا اتباع نہیں کر سکا ہوں، ممکن ہے آگے چل کر سمجھ جاؤں وہ مقامات حسب ذیل ہیں:-

(1) بقرۃ کا ترجمہ میں نے 'بیل' سے نہیں 'گائے' سے کیا ہے، لغت سے جھکتا ہوا پلہ مجھے گائے ہی کا معلوم ہوا۔

(2) ملة ابراهیم حنیفا میں جمہور مفسرین کے اتباع میں میں نے حنیفا کو ابراہیم سے متعلق کیا ہے نہ کہ ملة سے۔

(3) ایک اور مقام، جو اس وقت بالکل یاد نہیں آتا، صرف اتنا یاد ہے کہ ایسا ہی کوئی لفظی اختلاف ہے۔

(4) چوتھا مقام معنوی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہاں میں آپ ہی کے نہیں اکثر مفسرین کے اتباع سے ہٹ گیا ہوں۔ ان الذین کفروا سواء علیهم الخ میں میں نے زمخشری وغیرہ کا اتباع کر کے متن ترجمہ میں سواء علیهم الخ کو حال قرار دیا ہے، یعنی ایسے کافر (معاند) کہ جن کے لیے انداز وعدم انداز سب برابر ہیں وہ ایمان نہیں لانے کے، البتہ حاشیہ یہ دے دیا ہے کہ جمہور اہل سنت کا ترجمہ اس کے برعکس یوں ہے۔

ا۔ ان مقامات کے متعلق اولاً اجمالاً لکھا تھا پھر قدرے بسط مناسب معلوم ہوا۔ اخیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ خواہ خود فیصلہ کر لیجیے یا دوسرے بزرگوں سے مشورہ فرما لیجیے۔

(1) لغت اور نقل میں تو دونوں برابر ہیں، اس لیے دونوں کا اختیار کرنا جائز ہے لیکن مجھ کو

---

(1) یہ ارشاد بالکل مطابق واقعہ نکلا۔

بیل کا ترجمہ اس لیے راجح معلوم ہوتا ہے کہ آگے آیت میں لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث اور ظاہر ہے کہ گائے میں یہ وصف عادی مثل فطرت کے ہے، تو اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی، بدوں نفی کے منفی تھا، بیل میں البتہ نفی قصدی کی ضرورت تھی اور بقرہ کا مذکر و مؤنث دونوں میں استعمال مصرح ہے لیکن اگر کسی ذہن میں دوسرے ترجمہ کو ترجیح ہو گنجائش ہے۔

(2) آپ کے مختار میں ایک ترجیح ہے کہ قرآن مجید میں ابراہیم علیہ السلام کو حنیف فرمایا ہے۔ یہ ترکیب اس کے موافق ہے اور میرے مختار میں ایک ترجیح ہے کہ ملۃ سے حال بے تکلف بنتا ہے اور ابراہیم سے بتکلف یعنی بواسطہ جواز قیام مضاف الیہ مقام مضاف کما صرحوا بہ۔

(3) جب یاد آ جائے اطلاع فرما دیجیے۔

(4) یہاں کشاف موجود نہیں، ورنہ اس کی عبارت اور وجہ اس کے اختیار کرنے کی دیکھتا۔ اب آپ کی تحریر سے جو سمجھا ہوں اس کی بنا پر عرض کرتا ہوں، حال ہونے کی تقریر تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ کفروا میں جو ضمیر فاعل کی ہے راجع موصول کی طرف وہ ذوالحال ہے اور جملہ سواء علیہم الخ اس کا حال ہے۔ اور ذوالحال اس حال سے مل کر فاعل ہے کفروا کا اور کفروا ہے موصول کا اور موصول اسم ہے انّ کا۔ اور لایومنون خبر ہے انّ کی۔ بعض دوسرے مفسرین نے بھی لایومنون کو انّ کی خبر کہا ہے مگر سواء علیہم الخ کو جملہ معترضہ یہاں علت کے لیے کہا ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں حال ہونے کی صورت میں آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیے کہ یقیناً جن لوگوں نے ایسی حالت میں کفر اختیار کیا ہے (غایت عناد کے سبب) کہ ان کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے (یعنی کسی حالت میں عناد سے باز نہ آئیں گے) ایسے لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ اس ترجمہ سے حال ہونا صراحتاً مفہوم ہوتا ہے۔ یہ تو ترکیب کی تقریر ہوئی۔ باقی وجہ اس کے اختیار کرنے کی ظاہراً ایک اشکال کا جواب دینا ہے۔ وہ اشکال یہ ہے کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہوئے وہ ایمان نہ لا لیں گے، حالانکہ نزول آیت کے بعد بھی بہت سے کافر ایمان لائے۔ تو آیت کے کیا معنی ہوئے۔ صاحب کشاف اس ترکیب میں جواب دیتے ہیں کہ یہ مطلق کفار کے حق میں نہیں بلکہ معاندین کے حق میں ہے، پس وہ اشکال نہ رہا لیکن ذرا غور کیا جائے تو اشکال باقی ہے کیونکہ نزول آیت کے وقت بہت سے معاندین بھی تھے اور بعد میں وہ ایمان لائے۔ اگر یہ جواب دیا جائے کہ جب عناد

نہ رہا تب ایمان لائے تو ایسا جواب تو بدوں اختیار قید عناد کے بھی اشکال مذکور کا ہوسکتا ہے یعنی کفار جب تک کفر پر رہیں گے ایمان نہ لائیں گے اور جب کفر سے باز آ گئے تو مومن ہو گئے۔ تو دفع اشکال میں اس ترکیب کو کوئی خاص دخل نہ ہوا۔ علاوہ اس کے جملہ معترضہ ماننے میں بھی کشاف کی ترکیب کا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ جملہ معترضہ میں علت کی طرف اشارہ مانا گیا ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ کفار ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ معاند ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت کفار معاندین کے حق میں ہے۔ تو ترکیب کشاف میں کیا ترجیح ہوئی۔ اس کے علاوہ جمہور نے اشکال کا اور جواب بھی دیا ہے وہ یہ کہ موصول عہد کے لیے ہے، یعنی خاص خاص کفار کی شان میں ہے جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہما، اس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ سواء علیہم خبر ہو اور لا یومنون اس کی تفسیر ہو۔ یا خبر بعد خبر ہو لیکن اگر باوجود اس کے دفع اشکال کسی کو ترکیب کشاف میں ذوقاً سہل معلوم ہوا اس کے اختیار کرنے کا مضائقہ نہیں لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جمہور کی تراکیب میں اشکال دفع نہ ہوگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود سب کا مشترک ہے یعنی دفع اشکال اور اسی دفع اشکال کا مبنیٰ کوئی مسئلہ مختلف فیہ اہل سنت و معتزلہ میں نہیں اس لیے حاشیہ میں اس اختلاف پر تنبیہ خصوص اہل سنت کے عنوان سے ناظرین کو غلل میں ڈالے گا۔ واللہ اعلم۔

م۔ اپنی کم استعدادی کی بنا پر ایک ایک لفظ پر الجھتا رہتا ہوں۔ بحمداللہ آپ حضرات کے فیض صحبت سے اپنی جہالت سے جاہل نہیں رہا ہوں۔ ''**مایود الذین کفروا من اھل الکتاب و المشرکین**'' پر جب پہنچا تو پہلی رو میں من کا عمل صرف **اھل الکتاب** پر سمجھا اور **المشرکین** کا عطف بجائے **اھل الکتاب** کے **الذین کفروا** پر کیا۔

ا۔ یہ تو محال ہے۔ کیونکہ **الذین کفروا** مرفوع ہے بوجہ فاعل ہونے کے اور **المشرکین** مرفوع نہیں، اگر اس پر عطف ہوتا تو **المشرکون** ہوتا۔

م۔ اردو کے بعض مترجمین کے علاوہ انگریزی کے کل مترجمین (بشمول مولوی محمد علی لاہوری) نے بھی کیا ہے۔

ا۔ حیرت ہے ایسی موٹی غلطی پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ دعویٰ تحقیق کا اور علما کو حقیر سمجھنے کا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اصلاح فرمائے۔

م۔ آپ کا اور شیخ الہندؒ کا ترجمہ اس کے برعکس دیکھا، اسے کافی نہ سمجھا، متعدد مفسرین ان تفسیروں کے حاشیے الٹ پلٹ ڈالے، مدارک کے ایک حاشیہ پر ترکیب نحوی درج پائی جب اپنے اوپر لاحول پڑھی اور آپ ہی حضرات کا اتباع کیا۔ یہ ایک نمونہ اپنی کم سوادی کا میں نے پیش کر دیا۔

ا۔ مگر اس تجربہ کے بعد تو سخت ضرورت ہے ایسے زلات سے بچنے کی تدبیر کی۔ میں بے تکلفی اور دلسوزی اور اپنی خیر خواہی سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے حفاظت کی صورت صرف واحد ہے کہ مولانا کے پاس یا اس ناکارہ کے پاس رہ کر ترجمہ کیا جائے اور اگر دشواری ہو تو ایسے مشتبہ مواقع میں خطوط سے احتیاطاً تحقیق فرمالی جائے لیکن شاید بعض دفعہ مشتبہ ہونے کی طرف بھی ذہن نہ جائے اس کا کیا انتظام ہوگا۔

م۔ بیان القرآن (پارۂ اوّل) میں دو مقامات مجھے بالکل بے نظیر نظر آئے۔ ایک تخلیق آدمؑ کے موقع پر فرشتوں کی گفتگو، دوسرے تعلیم سحر ہاروت و ماروت کی زبان سے۔ دونوں مقامات بڑی الجھن کے ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کے قلم سے انھیں ایسا سلجھا دیا کہ اب کوئی سوال ہی نہیں باقی رہ جاتا۔

ا۔ آپ کی خوشی سے مجھ کو خوشی ہوئی۔ یہ سب بزرگوں کی دعا کی برکت ہے۔

م۔ بحمد اللہ اب تک معمول یہ رہا ہے کہ تازہ وضو کے ساتھ دو رکعت نفل کے بعد پہلے حضرت موسیٰ کلیمؑ والی دعا رب اشرح لی صدری ویسر لی امری کسی قدر الحاح کے ساتھ کر لیتا ہوں، جب ترجمہ کا کام شروع کرتا ہوں (1)۔ دعاؤں میں اکثر حضرت امام بخاریؒ کا بھی واسطہ دے دیتا ہوں کہ اللہ اللہ عرب سے صدہا میل دور بخارا اور ترکستان کا ایک شخص، بودھ مت ماننے والوں کی اولاد، کہاں پڑا ہوا تھا اسے کہاں سے کھینچ کر کہاں پہنچا دیا گیا کہ آج کتاب اللہ کے بعد گویا اسی کی کتاب دین کی بنیاد ہے۔ اسی کریم سے دعا ہے کہ اس مخلص اور مقبول کے اخلاص کا ایک شمہ اس سیاہ باطن کے اندر بھی پیدا کر دے۔

ا۔ یہ دعا الہامی ہے جو مصداق ہے ہم دعا از تو ا لخ کا تو اس کے ساتھ ہی اجابت ہم ز تو کی کامل توقع ہے (2)۔

---

(1) یہ کوئی بھی معمولات اپنی بدہمتی کے باعث، کچھ روز سے زیادہ نہ چل سکے۔ (2) اشارہ ہے مثنوی کے اس شعر کی طرف (ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ÷ ایمنی از تو مہابت ہم ز تو)

م۔ زلزلہ ایک نمونہ قہر الٰہی تھا۔ صوبہ بہار میں تو گویا قامت بر پا ہوگئی(1)۔ بڑی فکر مجھے مولانا مناظر احسن کی لگی ہوئی ہے، تعطیل رمضان میں اپنے وطن آئے ہوئے تھے، خدا کرے بالکل محفوظ ہوں۔

ا۔ آمین۔ اگر خیریت کی خبر آئے، ایک کارڈ سے مجھے بھی مطمئن کیجیے۔

م۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ اسی ہفتہ عشرہ کے اندر سہارنپور اور وہاں سے چند گھنٹوں کے لیے تھانہ بھون حاضر ہو جاؤں۔ اطلاعی کارڈ لکھ دوں گا۔

ا۔ خدا تعالیٰ بخیریت ملا دے''۔

(63)

ارادہ یہ تھا کہ ان اوراق میں سب ہی کچھ لکھ دیا جائے گا اور آپ بیتی کے باب جتنے بھی ہوں گے سب بے تکلف کھول کر پیش کر دیے جائیں گے لیکن ارادہ پر عمل بلا استثنا کی صورت ممکن نہیں۔ مولی کی سرفرازیاں جس نا اہل سے نا اہل بندہ کی جو اور جس طریقہ پر ہو جائیں اسے سب کے سامنے بیان کر دینے کی کم ظرفی کیسے گوارا کر لی جائے۔ شیخ و مصلح کا تو مرتبہ ہی دوسرا ہوتا ہے لیکن پھر اتنا بیان کرنے کی بھی کیا ضرورت؟ ضرورت یہ کہ اس کے بغیر شیخ کی تعلیم و ہدایت درجۂ اجمال میں بھی کیا سمجھ میں آئے گی۔ بہر کیف، اسی ماہ مبارک کی ایک آخری تاریخ میں مسجد میں ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کا تعلق سورۂ زمر کی آیت ''اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ'' سے تھا۔ تفصیل حضرت کی خدمت میں، اسی 3 شوال والے عریضہ میں عرض کی۔ جواب حسب ذیل موصول ہوا:-

''بڑی دولت نصیب ہوئی۔ یہی بشارت ہے عطا اخلاص کی۔ غیر مخلص کو یہ تنبہ اور توجہ کہاں اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ اخلاص فعل اختیاری ہے۔ ذرا سی حرکت قلب میں پیدا کرنے سے اخلاص ہی اخلاص''

ترجمہ کا کام اب مستعدی و سرگرمی سے جاری تھا اور ترجمہ اب رفتہ رفتہ تفسیر بنتا جا رہا تھا۔

---

(1) یہ وہی جنوری 34 یا آخر رمضان 52 والا ہولناک زلزلہ ہے جس کی یاد خصوصاً صوبہ بہار میں اب تک بہتوں کے دلوں میں تازہ ہوگی۔

اور خطوط عموماً ان ہی مذاکروں سے لبریز رہتے تھے۔ دوسری مصروفیات بھی بہر حال کسی نہ کسی حد تک دامنگیر رہتی ہی تھیں اور خطوط بھی ان کے تذکروں سے خالی نہیں رہتے تھے۔ 4 فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔ ''والا نامہ کئی روز ہوئے مل گیا تھا۔ میں لکھنؤ میں ایک ترکی خلیفہ زادہ، یعنی سلطان عبدالعزیز خان کے پوتے اور سلطان عبدالحمید خان کے منہ بولے بیٹے کی خدمت میں ایسا لگا رہا کہ اور سارے کام بند رہے۔ بیچاروں کی حالت عبرت کے قابل تھی(1)۔

ا۔ آپ کو تو دیکھ کر کیا اثر ہوا ہوگا۔ سننے سے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

م۔ آیۂ کریمہ "اِنَّ الَّـذِیْنَ کَفَرُوْا" الخ کے متعلق ارشادات گرامی سے مستفید ہوا۔ اس کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے تو کیسا ہے۔

''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا (ضد وعناد سے) ان کے لیے آپ کا انداز و عدم انداز دونوں برابر ہیں'' قوسین کے اندر لفظ ''ضد وعناد سے'' بجائے متن کے حاشیہ پر دے دیے جائیں۔

ا۔ اس ترجمہ میں حال ہونا ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہی مشہور ترکیب معلوم ہوتی ہے کہ الَّـذِیْنَ کَفَرُوْا اسم ہے اِنَّ کا اور سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ خبر ہے اِنَّ کی۔ زمخشری کی ترکیب پر دلالت نہ ہوئی۔

م۔ اتنے عرصہ تک کام رکا۔ اب کل سے اسی پارۂ اوّل پر نظر ثانی شروع کی ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ آسان فرما دے۔

م۔ اس اثنا میں غالی قادیانیوں کا ترجمہ پارۂ اوّل ہاتھ آ گیا۔ اپنے عجائب کے لحاظ سے زعفران زار ہے وَبِالْآخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ الآخِرَةِ، مِنْ قَبْلِکَ کے مقابل ہے۔ یعنی اَلْـمُتَّقِیْنَ وہ لوگ ہیں جو وحی محمدیؐ سے قبل والی وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور وحی محمدیؐ کے بعد والی وحی پر بھی ایقان رکھتے ہیں۔ وغیر ذٰلک، مولوی محمد علی لاہوری کے ترجمہ میں اس درجہ کی لغویت کوئی نہیں۔ اصل عیب اس میں وہی نیچریت کا ہے۔

ا۔ ایک کانا، ایک اندھا، عیب دار سب ہیں۔

---

(1) یہ مفلوک الحال شہزادے ایک مختصر سے قافلہ کے ہمراہ آئے ہوئے تھے اور کلکتہ کے بعد لکھنؤ کو بھی مشرف کیا تھا۔ ان کی مہمانداری کے انتظامات زیادہ تر اس خاکسار ہی کے سپرد تھے۔

م۔ پہلے حواشی بہت کم اور مختصر لکھنے کا ارادہ تھا لیکن ایک انگریز پادری کے حواشی کو دیکھ کر غصہ نہ روک سکا۔ حضورؑ کے حق میں اس نے انتہائی گندہ دہنی سے کام لیا ہے۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ پر حاشیہ دیا ہے کہ (نعوذ باللہ)

''یہود نے کسی نبی کو بھی قتل نہیں کیا تھا۔ یہ پیمبر عرب کی غایت جہالت ہے''۔

اس پر تڑپ کر میں نے خود انجیل کا مطالعہ کیا تو اس جاہل کے علیٰ رغم انف اس میں خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے یہود پر لعنت آئی ہے کہ تم وہ لوگ ہو جو زکریاؑ نبی اور یحییٰؑ نبی اور دوسرے انبیا کو قتل کر چکے ہو۔

ا۔ واقعی اس فعل کی ضرورت ہے۔

م۔ ایک اور خوشخبری بھی اس سلسلہ میں ہے۔ اٹلی کے ایک بیرسٹر نے چند سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام تھا ''مقدمہ یسوع''۔ ہندوستان میں کہیں ملتی نہ تھی۔ بڑی تلاش سے لندن میں ملی۔ ابھی پرسوں میرے پاس آئی۔ سوا تین سو صفحہ کی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ یہود کے قانون، رومی حکومت کے قانون، حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری، فرد جرم، شہادت استغاثہ، فیصلہ وغیرہ سب پر مفصل معلومات یکجا کر دیے ہیں اور آخر میں خلاصہ یہ نکالا ہے کہ سزائے موت کسی معیار سے اور کسی قانون کے اعتبار سے بھی جائز نہ تھی۔ دراصل یہ قتل عمد تھا جسے صورت ایک عدالتی فیصلہ کی دے دی گئی تھی''۔ قرآن مجید نے جو بنی اسرائیل کے ہاتھوں قتل انبیا کو بغیر الحق بار بار کہا ہے اس کی یہ کتنی بہتر تفسیر نکل آئی۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

ا۔ اس توجیہ کے بعض الفاظ باوجود غور کے پڑھے نہیں گئے۔ اس لیے میں سمجھا نہیں۔

م۔ مولانا مدظلہ (1) کے ایک تازہ والا نامہ کا اقتباس بصد مسرت وانبساط درج ذیل کرتا ہوں:-

آنجناب کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ یہی ہے کہ یہ ناکارہ تو حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم واحترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی قابلیت اور ان کے کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفل دبستان کو افلاطون سے

(1) یعنی مولانا حسین احمد صاحبؒ۔

ہوسکتی ہے۔البتہ تحریک حاضرہ سے متعلق جو چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں اور وہاں کے متوسلین جو کچھ گاتے ہیں وہ نہایت دلخراش ہیں۔ میں مولانا کو اپنا مقتدا اور اپنے اکابرین میں سے سمجھتا ہوں"۔

فالحمد للہ ثم الحمد للہ

ا۔ میں تو اس قابل نہیں۔خود ان کی بزرگی ہے مگر بزرگی پر نظر کر کے یوں جی چاہتا ہے کہ میری سوانح عمری میں دوسروں کی اشاعت اور دلخراشی کا ذکر نہ فرمایا جائے۔اور اگر اس میں میں بھی حصہ لیتا ہوں، خواہ فعلاً یا رضاءً تو خود میری اصلاح فرمائی جائے اور میری ہی طرف منسوب فرمادیا جائے، کیونکہ متوسلین کے آثار متعدیہ دونوں طرف مشترک ہیں مگر میں اپنے جمود ذہن کے سبب ایسے آثار سے متاثر نہیں ہوتا۔ بہرحال میں خود کسی کا شاکی نہیں اور سب کی شکایات سر پر رکھتا ہوں اور باعث ان سطور کی تحریر کا محض انبساط اور ناز اور بے تکلفی ہے آپ کی خدمت میں بھی اور مولانا کی خدمت میں بھی حسب ضرب المثل اذا جاء ت الا لفة رفعت الکلفة نہ کہ شکایت یا حکایت یا روایت۔

م۔مولانا مناظر احسن صاحب کا خیریت نامہ آ گیا۔بحمد اللہ محفوظ رہے۔

ا۔بیحد مسرت ہوئی۔آپ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں"۔

اس کے بعد کا خط آٹھ ہی روز بعد 12 فروری کا ہے۔تفسیری مضمون تو اس میں ہوتا ہی اور ایک آدھ چیز اور اشتات و متفرقات کی قسم سے۔

م۔"سورۃ البقرہ (پ ا) آیت نمبر 61 کے اس جز ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ الخ پر ایک مسیحی مورخ کا اعتراض ابھی نظر سے گزرا کہ جس وقت کا یہ ذکر ہورہا ہے یعنی عہد موسوی، اس وقت تک یہود نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا تھا۔میں اس شبہ کے پیش نظر آیت پر حاشیہ یہ دے رہا ہوں کہ ذلت اور مسکنت اور مغضوبیت کا اور اسی طرح کفر بآیات اللہ اور قتل انبیا کا تعلق عہد موسوی کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں۔یہ قوم بنی اسرائیل کی عام شرارتوں اور ان کے نتائج کا بیان ہے۔جناب والا کے خیال میں یہ جواب صحیح اور کافی ہوگا؟

ا۔بالکل کافی ہے اور اگر دعویٰ اس عیسائی کا بابت عدم قتل تا عہد موسوی صحیح ہے تو جواب

متعین ہے۔شاید اس معترض کو اوپر کی متصل آیت وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَاسَأَلْتُمْ سے دھوکہ ہوا ہو اس بنا پر کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ کا کلام ہے مگر سلسلہ کے اتساق سے سب اجزا کے عہد کا اتحاد لازم نہیں۔ مَاسَأَلْتُمْ تک واقعہ ان کی شوخی کا بیان فرما کر مجموعہ واقعات کی پاداش کو بیان فرماتے ہیں۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ پر مجموعہ قوم کے ساتھ اس پاداش کا جو تعلق ہے اس کے بعض اسباب کو۔ گو ان اسباب کے وقوع کا زمانہ عہد موسوی سے متاخر ہو، بیان فرمایا ہے۔ یہ آپ کے جواب کی گویا شرح ہے جس کی حاجت معترض جیسے غبی کے لیے اس وجہ سے ہے کہ شاید وہ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسىٰ سے تمسک کرتا ہے۔

م۔حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری(1) حج پر روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ انشاء اللہ ان کا تیرہواں حج ہوگا۔

ا۔ماشاء اللہ تعالیٰ''۔

(94)

اس عریضہ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ایک شبہ جو خود حضرت کی ذات پر بحیثیت شیخ کے پیدا ہو رہا تھا، اس کو بھی حضرت کی خدمت میں نقل کر دیا گیا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نامہ سیاہ کے حدود حضرت کے عام مریدین، معتقدین، مسترشدین سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات ایسی چیزیں زبان پر لانا ہی (دوسروں کی نیابت وترجمانی میں بھی) سوء ادب میں داخل سمجھتے تھے۔ یہ عاجز ایک غیر معصوم بزرگ پر خود ایسے شبہات کے ایراد میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا، چہ جائیکہ دوسروں کی ترجمانی میں بہرحال مکتوب کا یہ جز اور اس کا جواب دونوں ہی ملاحظہ ہوں:

م۔''سچ میں جناب کا مقالہ الاعتدال فی متابعۃ الرجال پڑھ کر متعدد اشخاص نے مجھے زبانی بھی مبارکباد دی اور خطوط بھی آئے۔ایک صاحب کا خط ایک خاص قسم کا آیا۔وہ جواب کے طالب

---

(1) ان بزرگوں کا ذکر پیشتر کئی بار آچکا ہے۔ماشاء اللہ ان سطور کے پریس میں جانے کے وقت (اپریل 1950) تک لکھنؤ میں سلامت باکرامت ہیں۔(دریابادی) لیکن اب جاں بحق ہو چکے ہیں (قاسمی)

مجھ سے ہیں لیکن میں تو جناب والا کی رہنمائی کے بغیر انھیں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ''حل این نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد'' کے مصداق ان کے مکتوب کے بیشتر حصہ کی نقل خدمت والا میں کیے دیتا ہوں۔ وھوہٰذا۔

''حضرت مولانائے محترم کا مضمون نہایت شوق سے پڑھا۔ الحمدللہ۔ دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی عمر اور دل ودماغ میں بہت بہت وسعت اور برکت دین اور مسلمانوں کو ان کے ملفوظات وافادات سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت کو اللہ نے عجیب وغریب جامعیت عطا فرمائی ہے۔ برکف جام شریعت الخ یہ مولانا ہی کی شان ہے۔ شریعت اور طریقت دونوں کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور دونوں کے واجبی احترام میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے۔ اس معاملہ میں ناظرین سچ کی طرف سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں کہ آپ کے حسن سعی سے حضرت مولانا کے اس عالمانہ وحکیمانہ اور فنی تحقیق سے ہم سب مستفید ہوئے، کئی بار پڑھ چکا ہوں اور پھر پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔ لیکن حضرت ایک خلش ابھی باقی رہ گئی جو اگر دور ہوسکتی ہے تو آپ ہی کی وساطت اور توجہ سے۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ خود حضرت مولانا کا طرز عمل اپنی اس تعلیم سے مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ آپ کے علم ومشاہدہ میں متعدد واقعات ایسے ہوں گے کہ ادنیٰ سے اختلاف پر مولانا سخت ناخوش ہوگئے اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انقباض اور تکدر محض طبعی رہا بلکہ اس کا اثر تعلقات تربیت پر پڑا۔ ایک آدھ مثال میرے علم میں ایسی ہے کہ حضرت نے ایک صاحب علم وفضل اور غایت درجہ معتقد سے محض اتنی بات پر قطع تعلق فرمادیا کہ انھیں ایک اجتہادی فرعی مسئلہ بلکہ اس کے ایک جزیہ میں دیانتاً مولانا سے اختلاف تھا، ایسے واقعات کی کیا توجیہ کی جائے۔ اگر میری ہی سمجھ کا پھیر ہو تو از راہ شفقت وکرم آپ مجھے تفصیل سے سمجھا دیں''۔

تفصیلی جواب تو ان صاحب کو میں خود انشاء اللہ دے لوں گا میری امداد صرف اجمالی نکات سے فرمادی جائے۔

ا۔ اصل میں تو میرا مذاق ایسے سوالات کا جواب دینے کا نہیں کیونکہ اپنی ذات کے متعلق جواب دینا مرادف ہے کہ ہم اس نقص سے بری ہیں۔ سوایسا دعویٰ کرنا خود فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ

کے خلاف ہے اس لیے ان کو اتنا ہی جواب کافی ہے مگر آپ پر کشف واقعہ کی غرض سے اتنا جواب کافی اور دے سکتا ہوں کہ گول بات کا جواب ہو نہیں سکتا۔ نہ مجھ کو کوئی واقعہ ایسا یاد ہے۔ اگر ان سے اس صاحب علم وفضل کا نام اور اس اجتہادی فرعی مسئلہ کی تعیین اور نوعیت اختلاف کی تحقیق فرمالیجیے اور مجھ کو یاد بھی آ جائے تو بے تکلف عرض کر دوں گا خواہ ان کی غلطی ہو خواہ میری غلطی ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل اب کی ذرا پیچھے ہٹ لیجیے۔ کئی نمبر قبل تکفیر شیعہ کے باب میں حضرت سے مراسلت درج ہو چکی ہے۔ میرے حلق سے یہ تکفیر علی الاطلاق کسی طرح نہیں اتر رہی تھی۔ حضرت مولانا بھی کوئی کھلا ہوا فتویٰ کفر شیعہ کے حق میں نہیں دے رہے تھے۔ البتہ میرے شبہات کو رد فرما رہے تھے۔ مولانا کی یہ تحریریں رسالہ النور میں چھپ گئیں۔ رسالہ کی اشاعت بہت ہی محدود تھی۔ مخصوص اہل خانقاہ کے سوا کوئی اسے جانتا ہی نہ تھا۔ النجم (1) کو ایک نعمتؔ خداداد ہاتھ آ گئی۔ کئی کالم کی شاہ سرخی اور کئی کئی جلی سرخیاں دے کر مضمون کو خوب چمکایا اور گویا یہ ظاہر کیا کہ علامہ تھانوی جیسے محتاط محقق بھی تکفیر شیعہ ہی کے حق میں ہیں۔ صحافتی پروپیگنڈا کو اس سے کیا بحث تھی کہ مولانا خود اس کی تصریح فرما چکے تھے کہ ان کی وہ تحریریں مستقل فتویٰ کا حکم نہیں رکھتیں۔ صرف مسائل متشکک کے سوالات پر بطور منع کے ہیں۔ بہرحال آب وتاب سے وہ ''حکیم الامت کا فتویٰ'' نکلا اور جس نسبت سے اس کی اخباری اشاعت ہوئی، اسی نسبت سے اپنی ناگواری بڑھتی رہی۔ شخصاً بھی اور مفاد ملت کے لحاظ سے بھی جھنجھلاہٹ اس پر بھی کہ اگر اس بحث کو پبلک میں چھیڑنا خلاف مصلحت نہ ہوتا تو آخر بیچ ہی میں کیوں نہ چھیڑ دیتا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب 24 فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:-

م۔ ''تازہ النجم کا ایک ورق مرسل خدمت ہے۔ میں جناب والا کی خدمت میں جو معروضات پیش کرتا رہتا ہوں ان کی حیثیت بالکل خانگی ہوتی ہے جیسے مریض صرف طبیب ہی کے سامنے پوری طرح کھلتا ہے دوسروں کو سنانا اسے مقصود نہیں ہوتا۔

ا۔ اس کو معلوم کر کے میں خجل ہوا۔ مجھ کو عام طور پر اس کا احساس نہیں ہوا۔ میں آپ کی تحریرات کی دو قسمیں سمجھتا تھا، ایک تو وہی جو آپ نے تحریر فرمائی ہے۔ اس کے ساتھ تو یہی طرز عمل

---

(1) لکھنؤ کا اس زمانہ کا ایک ہفتہ روزہ جس کا مسلک ہی رد شیعہ تھا۔

تھا۔ دوسرے علمی مضامین اس کو عام سمجھتا تھا جیسے اتباع شیخ کا مضمون تھا۔ میں اس کو اسی قسم میں سے سمجھا۔ اب انشاء اللہ زیادہ احتیاط کروں گا۔

م۔ النجم نے جس صورت کے ساتھ اس کی اشاعت کی اس سے مجھے تکلیف ہی ہوئی۔

ا۔ میں نے دو روز قبل دیکھا تھا مجھ کو بھی گرانی ہوئی۔ اس کے بعد آپ کی تکلیف معلوم کر کے اور زیادہ گرانی ہوئی۔ یہ تو میری تکلیف میں کما زیادتی ہوئی کہ دو گرانی مجتمع ہوگئیں۔ ایک زیادتی کیفاً ہوئی کیونکہ آپ کی تو صرف یہی مصلحت فوت ہوئی کہ آپ پر یہ شبہ ہوگا کہ اپنے اکابر کی تحقیق میں تردد ہوا مگر یہ واقع میں نقص نہیں بلکہ کمال احتیاط اور غیر جانبداری ہے اور میری مصلحت بہت بڑی فوت ہوئی کہ عامہ ناظرین میرے مضمون کو جو کہ فتویٰ نہیں فتویٰ سمجھیں گے۔

م۔ یہاں تک مضائقہ نہ تھا کہ صرف جناب کا جواب یہ لکھ کر شائع کر دیتا کہ ایک سائل کے شبہات کے جواب میں یہ لکھا گیا لیکن موجودہ صورت کے ساتھ شائع کرنا تو خود النجم کے مقاصد کے لیے مضر ہوا۔ شیعہ جماعت کم از کم یہی کہہ کر فائدہ اٹھائے گی کہ خود اہل سنت اس باب میں مختلف ہیں اور مجھ عامی کا نام سند میں بطور عالم کے پیش کریں گے۔ اپنے خیال کی اشاعت ہی مجھے منظور ہوتی تو میں بیچ ہی میں کیوں نہ کرتا۔ اب تک تو میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جن مسائل میں میرا قلب اپنے اکابر کے مسلک سے پوری طرح متفق نہیں ان کا ذکر بھی بیچ میں نہیں کرتا بلکہ لوگ سوال کرتے ہیں جب بھی صاف جواب نہیں دیتا۔ بہرحال اب یہ تیر تو کمان سے نکل ہی چکا۔

ا۔ 'تیر جستہ باز گردا ندز راہ' کے متعلق بھی ایک مشورہ پشت پر مرقوم ہے۔

م۔ البتہ آئندہ کے لیے بہ ادب درخواست ہے کہ میری جتنی بھی گزارشیں ہوا کریں انھیں جناب والا اپنی ذات تک محدود کیا کریں ورنہ لوگ خدا معلوم کیا کیا معنی لیا کریں گے۔

ا۔ بسر و چشم لیکن اس عموم میں ایسے مضامین بھی آجائیں گے جن کی شان مضمون اتباع شیخ جیسی ہوگی اس کا کیا معیار ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو آپ خود فرما دیا کریں کہ یہ مضمون عام ہے یا میں پوچھ لیا کروں(1) جو طریقہ قلب پر خفیف ہو بے تکلف فرما دیں۔ ہاں ترجمۂ قرآن کے متعلق جو سوالات آئیں ان کو عام سمجھوں یا خاص۔

---

(1) کیا حد ہے اس اخلاق اور رواداری کی کہ خود اپنے اوپر یہ سارا بار لینا گوارا کر لیا۔

اضافہ بر جواب خط۔ میں نے اس خط کا اسی طرح اپنے جواب کا ایک حرف بھی کسی کو نہیں دکھلایا۔

مشورہ موعودۂ صفحہ اوّل۔ میں نے ایک مضمون بغرض تدارک احتمال غلط فہمی ناظرین اخبار النجم لکھا ہے۔ بعد ملاحظہ اگر مشورہ ہو شائع کر دیا جائے۔ پھر کہاں شائع ہو النجم میں بھیج دوں یا سچ میں یا النور میں۔ اس کی نقل بھی یہاں نہیں رکھی ہے۔ شاید کسی کی نظر پڑ جائے۔ اب تو میں ڈر گیا اور گزیدہ از ریسمان می ترسد"۔

اب اس کے آگے حضرت کا وہ مضمون موعود ملاحظہ ہو:-

تنبیہ ضروری

میں نے ایک مضمون جو ایک مفتی صاحب کے ایک فتویٰ بابت اسلام یا عدم اسلام اہل تشیع پر بعض شبہات کا جواب تھا 8 ذی قعدہ 52 مطابق 23 فروری 34 کے اخبار النجم میں دیکھا جو رسالہ النور سے نقل کیا گیا ہے۔ اشاعت کا تو میں مخالف نہیں کیونکہ رسالۂ مذکورہ میں اس سے پہلے میری مرضی سے شائع ہو چکا ہے لیکن اخبار میں اس کی اشاعت مجھ کو پسند نہیں آئی کیونکہ رسالہ کے اکثر ناظرین اہل علم و اہل فہم ہوتے ہیں اور اخبار کے اکثر ناظرین کم علم و کم فہم ہوتے ہیں، جن میں حدود سے تجاوز ہونے کا احتمال قریب ہوتا ہے۔ اس احتمال کے سبب احتیاطاً اس مضمون کی اور اسی مضمون کی اخیر سرخی سے نقل کرنا مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضمون میرا کوئی فتویٰ نہیں بلکہ اصل صاحب فتویٰ کے جواب پر جو شبہات تھے درجۂ منع میں ان کا جواب ہے، یعنی بر تقدیر ثبوت فنا۔

ایک طالب علمانہ بحث ہے۔ فتویٰ نہیں ہے۔ باقی اس فتویٰ کے اور بنا فتویٰ کے ذمہ دار خود صاحب فتویٰ ہیں۔ مجھ کو ان مباحث پر تبحر نہیں ہے۔ اسی طرح صاحب شبہات نے اس مسئلہ میں کوئی رائے نہیں قائم کی۔ صرف بعض ترددات فتویٰ کے متعلق ظاہر کیے ہیں۔ لہٰذا ناظرین کسی خاص خیال کو میری طرف یا صاحب شبہات کی طرف منسوب نہ فرمائیں۔ وہ نسبت غلط ہوگی۔

والسلام۔

11 ذی قعدہ 52۔ اشرف علی، تھانہ بھون"

(65)

اس چھوٹے سے بیان نے مولانا کی طرف سے تو بہترین صفائی پیش کر ہی دی۔ ساتھ ہی خود میری یعنی سائل کی حیثیت کی بھی کتنی اچھی ترجمانی کر دی اور حضرت نے النجم کے اس اقدام کو جس ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا وہ تو بالکل ظاہر ہے۔ سچ تو اس زمانہ میں بند تھا اور النجم نے بھلا اسے کیوں چھاپا ہوگا، یقین ہے کہ النور میں ضرور نکل گیا ہو۔ یہی میں نے اس وقت مشورہ دیا ہوگا مگر اب اتنی مدت ہوگئی، خوب خیال نہیں پڑ رہا ہے۔

عریضہ ابھی تمام نہیں ہوا۔ ایک جز باقی رہ گیا تھا، جواب ملاحظہ ہو:

م۔ ''بحمد اللہ پہلا پارہ تیار ہوگیا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

م۔ جی میں آتا ہے کہ اسے بجنسہ اردو میں منتقل کر کے جناب کے ملاحظہ کے لیے بھیج دوں گو اس میں وقت صرف ہوگا لیکن بہرحال نفع بھی اسی قدر رہو کر رہے گا۔

ا۔ جی تو میرا بھی چاہتا ہے اور مصلحت بھی ہے مگر کیا عرض کروں، قویٰ ضعیف ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں، مشاغل بڑھ گئے کس طرح کام کروں، اب تو پنشن کے دن ہیں مگر سرکاری خدمت کے وقت پنشن خوار بھی بلا لیے جاتے ہیں۔

م۔ آپ کی بیان القرآن تو قدم قدم پر پیش نظر ہی ہے۔ عربی تصانیف میں بڑی مدد اتقان (1) سے مل رہی ہے۔

ا۔ واقعی جامع کتاب ہے''۔

اس والا نامہ کا جواب اللہ جانے کیا لکھا۔ پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ واپس نہ آیا اور اب محفوظ نہیں۔ النجم کی ان پھڑکتی ہوئی سرخیوں کا اثر قدرتاً یہ نکلا کہ ادھر سے شیعوں نے جوابی مضمون لکھا اور اس میں خود حضرت کی تکفیر کی۔ ایک لطیفہ اس زمانہ میں یہ ہوا کہ وطن کے ایک صاحب بدعات میں غرق، محض اتفاق سے تھانہ بھون میرے ہمراہ چند گھنٹے کے لیے پہنچے اور

---

(1) یعنی الاتقان فی علوم القرآن از جلال الدین سیوطیؒ لیکن یہ خیال صرف اس وقت تک تھا بعد میں سب سے زیادہ مدد امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور پھر قرطبی کی تفسیر احکام القرآن سے ملی۔

حضرت کو تعویذ دیتے ہوئے دیکھا، وطن پہنچ کر اپنے مجمع میں فرمایا کہ ''مولوی اشرف علی کو خواہ مخواہ لوگ وہابی بتاتے ہیں۔ میں تو خود جا کر دیکھ آیا۔ وہ تو تعویذ دے رہے تھے اور مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے''۔ اس کا ذکر بھی میں نے اس عریضہ میں کر دیا تھا۔ بہرحال جواب حسب ذیل آیا:-

''رائے کا انتظار تھا، معلوم ہوگئی آپ کی پسند سے مسرت ہوئی۔

میرا ارادہ النجم کو بند کر دینے کا ہے۔ یعنی یہاں نہ آئے۔ اس سے دوسرے پرچہ میں اپنے متعلق شیعہ کی طرف سے تکفیر کا فتویٰ دیکھا، ان صاحبوں نے اپنے اغراض کے لیے میرا علمی مضمون شائع کر کے خواہ مخواہ گالیاں دلوائیں۔

ترجمہ اردو میں کر دیا بہت ہی اچھا کیا۔ اگر کوئی محقق ذی ہمت دیکھتا تو نفع بھی تھا۔ اب میرا دماغ متحمل نہیں رہا۔ خیر تعمیل حکم کروں گا۔ کہیں کہیں سے دیکھ کر اپنا خیال بھلا برا ظاہر کر دوں گا۔

دریاباد والے صاحب کا خوش جانا یہ ان کی دریادلی ہے ورنہ میرے اسباب بدنامی تو سب کے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے''۔

حضرت کی صحت، کیا جسمانی اور کیا دماغی، خدا کے فضل سے مدتوں بہت اچھی رہی۔ یہ اب 1934 (52) میں پہلی بار حضرت کے زبان و قلم پر اپنے قویٰ خصوصاً قوائے دماغی کے متعلق ایسے الفاظ آنے لگے جیسے کہ اس والا نامہ اور اس سے قبل والے میں تھے۔ ہم مسترشدین کے غم و حسرت میں اضافہ کے لیے یہی بہت تھا۔

اس کے بعد کا جو عریضہ ہے اسے بڑے حیص بیص، توقف و تذبذب کے بعد ہی درج کر رہا ہوں۔ میری آپ بیتی کا بیشک وہ ایک اہم باب ہے لیکن سوال دیر تک سامنے یہ رہا کہ آیا اسے اس کتاب کا بھی جز بنایا جائے؟ آخر اثبات کا پہلو نفی پر غالب آیا۔ اس اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے یا اس فیصلہ میں اگر نفس کی آمیزش ہے تو اللہ اسے معاف فرمائے۔ خط پر تاریخ 31 مارچ (15 ذی الحجہ 52) کی ہے اور خط کا مضمون ہر شرح و حاشیہ سے بے نیاز ہے:

م۔ ''والد ماجد مرحوم کا انتقال 1330 میں 14 ذی الحجہ کو عین بعد فراغ حج مکہ معظمہ میں 10-12 کو صبح ہوتے ہوئے منیٰ میں ہیضہ ہوا۔ مکہ لائے گئے، 14 کو اذان فجر سن کر جیسے نماز کی

نیت کرتے ہیں، ہاتھ باندھ لیے اور روح پرواز کر گئی۔

ا۔ سبحان اللہ

م۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے قطعہ تاریخ کہا تھا، آخری شعر یہ تھا۔

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے　　　شغل ہی میں نکلی تاریخ وفات
(یعنی 1330)

ا۔ عجیب۔

م۔ پرسوں جب 13 ذی الحجہ آئی تو دن بھر مجھے ان کا خیال لگا رہا۔ دعائیں بار بار کیں سوتے وقت بھی ان کا خیال غالب رہا۔ سویا تو ایک بڑا لمبا خواب دیکھا۔ تفصیل تو اب کچھ یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ اپنے کو بہت اچھی حالت میں ارواح ابرار و صالحین کی مجلس میں پایا، اتنے میں کسی حجاب سے فرشتہ کی آواز آئی کہ "آپ کے آنے میں بھی دیر نہیں۔ بس ایک ہفتہ کی مہلت ہے بآسانی بلا کسی وقت کے آجایئے گا"۔ الفاظ یاد نہیں رہے، مفہوم یہی تھا۔ اس آواز میں تخویف و تہدید کا شائبہ تک نہ تھا، تمام ترلینت و ملاطفت تھی، جیسے کسی کو بشارت دی جارہی ہو۔

آنکھ کھلی جب سے دل میں گوناگوں خیالات و جذبات پیدا ہیں۔ کبھی کہتا ہوں کہ خواب کا اعتبار ہی کیا۔ کبھی یہ آتا ہے کہ یہ تو بڑی بشارت مل گئی۔ ایسی آسانی سے یہ بیڑا پار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور ہو کیا سکتی ہے لیکن جب بیوی، بچیوں، والدہ ماجدہ وغیرہ کا خیال آتا ہے کہ ان پر کیا گزرے گی اور خود اپنے اعمال یاد پڑ جاتے ہیں تو طبیعت گھبرانے بھی بہت لگتی ہے۔ کبھی یہ بھی کہتا ہوں کہ اس موت سے یہی عرفی موت کیوں مراد لی جائے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ خواب کی لسان تمثیلی میں اس سے کیا مراد ہے۔

کل کا سارا دن اسی ردو بدل، ادھیڑبن میں گزرا۔ کسی سے ابھی تک بیان بھی نہیں کیا۔ بجز اس کے کہ جناب ہی کو لکھ بھیجوں، کوئی اور صورت تشفی کی ذہن میں نہیں آئی۔ گھر میں یا والدہ ماجدہ سے ذکر کردوں تو ابھی سے جزع فزع شروع ہو جائے۔ اتفاق سے وہ لوگ اس وقت یہاں ہیں بھی نہیں بالکل تنہا ہوں۔

میعاد میں ابھی 4-5 دن باقی ہیں، ڈر رہا ہوں کہ کہیں جمعرات کی شام سے خود میرے اوپر

یہ خیال نہ مسلط ہو جائے اور حرکت قلب اسی دہشت سے نہ بند ہو جائے۔

ا۔ مبارک خواب ہے، جو کچھ بھی مراد ہو اور پوری حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم کہ تحقیق ہے یا تاویل مگر دل کو یہی لگتا ہے کہ صورت مراد نہیں معنی مراد ہیں۔ باقی یہ کہ کون سے معنی اس میں بھی جی کو یہ لگتا ہے کہ خدمت قرآنیہ سے کوئی درجہ ملنے والا ہے۔ شاید اس کی تکمیل کے لیے یہ میعاد ہو اور کیا عجب کہ اس کی کوئی ضروری خدمت اس میعاد تک مکمل ہونے کو ہو اور اجرت کی تکمیل عمل کی تکمیل سے ہوتی ہے۔ پس موت سے مراد قرب الٰہی ہے اور قرآن مجید کی خدمت کی وجہ سے وہ قرب بھی قرب خاص ہوگا۔ آگے اللہ کو معلوم۔ کسی سے کہنا بالکل مناسب نہیں جب تک کہ وہ میعاد نہ گزر جائے، باقی دعائے خیر میں بھی کرتا ہوں۔ آپ کے انتظار کے خیال سے واپسی کی ڈاک میں عجلت کے ساتھ جواب دے رہا ہوں۔ میں بھی محتاج دعا ہوں"۔

جواب اس سے زیادہ حکیمانہ اور کیا آتا۔ توقع بھی حکیم الامت سے ایسے ہی جواب کی تھی، ہر پہلو کو جامع۔ میعاد جوں توں گزر گئی۔ طبی اور غیر طبی تدبیریں اور کیا کیا اختیار کیں اور اس درمیان میں ضغطۂ قلب کی قسم کی کیا کیا تکلیفیں پیش آتی رہیں، ان کے تذکرہ کو حکیم الامت کے اوراق سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال اس مدت کے ختم پر اور کچھ دوا علاج کر کے لکھنؤ سے میں دریاباد واپس آ گیا اور آتے ہی مختصر خیریت نامہ (جوابی کارڈ کی شکل میں) 10 یا 11 اپریل کو لکھ بھیجا، جواب حسب ذیل عنایت ہوا:-

"انقضا میعاد جو آپ کے خیال کے اعتبار سے حیات ثانیہ ہے اور میرے خیال کے اعتبار سے بقا ہدایت اولیٰ ہے، مبارک ہو، واقعی احتمال بعید بلکہ ابعد کی بنا پر دل تو لگا ہوا تھا، ذکر بھی کرتا تھا۔ میں ممنون ہوں کہ مطمئن فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعائے برکت فی العمر وفی العلم وفی العمل کی کرتا ہوں۔ یہ جھٹکا عجب نہیں اسی احتمال موہوم کے اثر سے ہوا۔ ایسے آثار کبھی مشغولی سے ہوتے ہیں کبھی فراغ سے۔ خدا کرے اب کوئی شکایت نہ رہی ہو۔ زیادہ مصلحت چند روز راحت و سکون اختیار کرنے میں تھی۔ دعائے حفاظت کرتا ہوں۔ اپنے لیے بھی دعا چاہتا ہوں"۔

(66)

علالت اتنی جلد اور ایسی آسانی سے جانے والی نہ تھی۔ ابھی قسمت میں حضرت سے اور تسلی

نامے وصول ہونے باقی تھے۔ مبارک ہے وہ بیمار جسے ایسے تیماردار نصیب ہوں۔

صحتیں لاکھوں ہوں اس بیماریٔ غم پر نثار
جس میں آئے بارہا ان کی عیادت کے مزے

اور خوش نصیب ہے وہ مریض جسے سابقہ ایسے طبیب سے پڑے، ع

خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم!

14 را پریل کو حسب ذیل عریضہ لکھا:۔

م۔ ''کل لکھنؤ سے دریاباد یہ سمجھ کر آ گیا تھا کہ اب طبیعت اچھی ہو گئی۔

ا۔ میری رائے تو جلد واپس ہونے کی نہ تھی مگر میں دریاباد کیسے اطلاع دیتا۔

م۔ لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ شب میں نیند بڑی مشکل سے آئی۔ بے چینی بھی رہی۔ قلب بعض وقت اس زور سے اچھلتا ہے کہ گویا سارا جسم اچھلنے لگتا ہے۔ غشی کی آمد کا دھڑکا ہر وقت رہتا ہے۔ ان میں کئی کئی بار یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت قلب اب رکا ہی چاہتی ہے۔

ا۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آثار پیش آتے ہیں اور نہایت آسانی سے زائل ہو جاتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد یہ شکایات زائل ہو جائیں گی۔

م۔ نماز میں حضوری پہلے ہی کب نصیب تھی اور اب تو بالکل ہی تشریف لے گئی۔

ا۔ یہ غیبت اور تشویش اس حضوری سے بھی انفع ہے۔ اصل طریق مجاہدہ ہے۔ یہ کیفیت مجاہدہ ہے اور جس حضوری کو اس پر ترجیح دی جاتی ہے وہ حظ نفسانی کے ساتھ مخلوط ہے۔ خدا تعالیٰ بندہ کو جو عطا فرماتے ہیں انفع واصلح ہی ہوتا ہے۔

م۔ کوئی ذرا بڑی سورت تو پڑھ ہی نہیں سکتا ہوں، خصوصاً نماز عشا میں۔ حد یہ ہے کہ بار بار نیت توڑ دینے کو جی چاہتا ہے، گو بحمد اللہ کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔

ا۔ یہ سن کر آپ کو تسلی ہوگی کہ آج کل ایک شکایت بدنی کے سبب میرے معمولات کا بھی یہی رنگ ہے مگر میں خوش ہوں کہ طبیب اگر بدمزا دوا تجویز کرے وہی مصلحت ہے۔

م۔ خدا جانے کیا انجام ہونے والا ہے۔

ا۔ بالکل اچھا ہونے والا ہے، بہت جلد ظاہر ہوئے گا۔

م۔ آج لکھنؤ پھر واپس جار ہا ہوں۔ آج بہشتی زیور (1) میں دیکھ کر اختلاج کا تعویذ اپنے ہاتھ سے نقل کر کے پہن لیا ہے لیکن جناب والا کے ہاتھ کی برکت ہی کچھ اور ہوتی۔

ا۔ ملفوف ہے۔ خدا تعالیٰ نافع فرمائے۔

م۔ اس تعویذ کے علاوہ بھی دعا یا جو تدبیر خیال مبارک میں آئے اس کا اس وقت شدید محتاج ہوں۔

ا۔ 1۔ مفرحات قلب و مقویات قلب کا استعمال۔

2۔ کتاب الرجا کا مطالعہ بلکہ استماع خواہ احیاء سے یا کیمیائے سعادت سے یا اربعین غزالی سے۔

3۔ ہر وقت ایسے شخص کو پاس رکھنا جس سے انس ہو اور وہ دانشمندی سے آپ کو دل خوش کن مقالات میں مشغول رکھ سکے۔

4۔ کسی وقت طبیعت حاضر ہو تو اپنے قلب پر چاند کا تصور اور یہ خیال کرنا کہ قلب پر باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے۔

5۔ جب آسانی سے ممکن ہو درود شریف پڑھ کر قلب پر دم کرنا۔

یہ سب تدابیر اکسیر اعظم ہیں اور اگر کسی خادم سے فرما دیا جائے تو وہ تیسرے چوتھے روز حالات سے مجھ کو مطلع کرتا رہے، میں انشاء اللہ تعالیٰ بالالتزام دعا کرتا رہوں گا۔ ؎

من غم تو می خورم تو غم مخور

م۔ بعض اوقات بالکل یاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ا۔ اس میں بھی حکمت ہے کہ نعمت امید کی قدر ہو"۔

حضرت کو جو غیر معمولی شفقت اپنے اس ناکارہ نیاز مند کے ساتھ تھی وہ اوپر کے صفحات میں تکرار و صراحت کے ساتھ خوب اچھی طرح واضح ہو چکی۔ اس کا قدرتی اقتضا یہی تھا کہ حضرت کا دل برابر خیریت نامہ کے انتظار میں لگا رہتا۔ آخر 24، 25 راپریل کو اپنی خیریت اور بقیہ سلسلۂ علالت دونوں کا ذکر ایک کارڈ میں کیا اس کے جواب میں ذیل کا شفقت نامہ موصول ہوا:۔

"مجھ کو کئی روز سے دریافت خیریت کا سخت انتظار تھا حتیٰ کہ مولانا حسین احمد صاحب جو

---

(1) مولانا کی مشہور اور بہت مقبول کتاب۔

یہاں بسلسلۂ ترمیم وقف بل مع دیگر حضرات دیوبند وسہارنپور تشریف لائے تھے، میں نے ان سے آپ کے خط آنے کے متعلق پوچھا بھی تھا مگر مفصل حال معلوم نہ ہوسکا، الحمد للہ آج مژدۂ صحت سنا۔ اللہ تعالیٰ بقیہ اعتلال واضمحلال بھی دفع فرمائے۔ آپ پر اور گھر میں جو اثر ہوا یہ سب ناشی ہے محبت سے (1) اللہ تعالیٰ دونوں صاحبوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ واقعی میرے پاس کچھ بھی نہیں مگر انا عند ظن عبدی کے چشمہ سے محبین کے پاس کچھ پہنچ جاتا ہے۔

مولانا کی تشریف آوری کے وقت آپ ایک خاص حیثیت سے بہت یاد آئے کہ ہمارے مجمع کا اختلاط وارتباط وانبساط ورعایات مراتب ومناصب دیکھ کر آپ کو خاص مسرت ہوتی جیسا مجھ کو معلوم ہے''۔

یہ آخری سطریں جس شرافت نوازی کی مظہر ہیں اس کا ظہور ایسے ہی قلب وقلم سے ممکن ہے جو خود سرچشمۂ شرافت ہو۔

حکیم مطلق کا ایک ایک فعل کتنی حکمتوں کا جامع ہوتا ہے، علالت کے سلسلہ میں خوب خوب حکمتوں کا مشاہدہ ہوا اور لطیفہ یہ ہوا کہ علالت شروع جس طرح ایک خواب سے ہوئی تھی، ختم بھی اسی طرح ایک خواب ہی پر ہوئی۔ یکم مئی کا لکھا ہوا عریضہ ان ساری کیفیات کا شارح وترجمان ہے:

م۔ ''شدائد مرض تو آپ کے تعویذ کی برکت سے بحمد اللہ اسی وقت جاتے رہے تھے لیکن طبیعت فی الجملہ صاف نہ تھی۔ کبھی سر میں تیز چکر، کبھی دل کی تیز دھڑکن، یہ کیفیات پرسوں شام تک رہیں۔ کام کاج بالکل چھوٹا ہوا۔ بعد عشا اپنی صحت کے لیے ذرا الحاح کے ساتھ دعا کی۔ دعائیں تو پہلے بھی بارہا کی تھیں مگر اس وقت کچھ دل لگ سا گیا۔ عرض یہ کرتا رہا کہ بری بھلی جو کچھ بھی خدمت تیرے دین کی بن پڑ رہی ہے، اس کے لیے صحت وعافیت نصیب کر دے۔ دعا کرتے وقت یہ معلوم ہوا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں، قشعریرہ سا محسوس ہونے لگا اور یہ بارہا کا ذاتی تجربہ ہے کہ عموماً یہ علامتیں قبولیت دعا کی ہیں۔ سو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گنوار قسم کے ہندو مسلمانوں پر حملہ آور ہیں اور مجھ پر خصوصاً۔ باقی تو غائب ہو گئے، ایک حملہ آور میری طرف بڑھا،

---

(1) یقیناً میں نے اپنے عریضہ میں کوئی مضمون اس قسم کا لکھا ہوگا کہ ''جناب کے اس درجہ تعلق خاطر اور نیز شفقت تاثر سے ہم دونوں بہت ہی زائد متاثر ہوئے''۔

میں تنہا ہوں لیکن خائف وہراساں ذرا سا بھی نہیں۔البتہ بجائے اس سے مقابلہ کے معاً دعا میں مشغول ہو جاتا ہوں کہ یا الٰہی کیا تو اس کافر کو میرے اوپر عذاب کر کے اپنے ہی دین کی رسوائی اور اپنے ہی ماننے والوں کی مغلوبیت کا سامان کر دے گا؟ یہ دعا کرتے ہی آناً فاناً وہ مشرک اس طرح معدوم ہو جاتا ہے کہ جیسے نمک پگھل گیا یا پانی بخار بن کر اڑ گیا۔معاً آنکھ کھل جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ تعبیر بھی جزم کے ساتھ گویا ذہن میں القا ہو جاتی ہے کہ مرض گیا اور خدمت دین کے لیے مجھے مہلت مل گئی۔ چنانچہ صبح سویرے ہی میں نے گھر میں کہہ دیا کہ اب انشاءاللہ بالکل اچھا رہوں گا اور بحمداللہ اس وقت سے یعنی کل صبح سے آج اس وقت تک ہوں بھی بالکل صحیح اور طبیعت حسب سابق چاق اور بشاش ہے۔

میرے لیے یہ ماجرا عجیب وغریب سا ہوا۔اس لیے جناب والا کی خدمت میں من وعن عرض کر رہا ہوں۔

ا۔واقعی ظاہراً عجیب ہے اور اگر حق تعالیٰ اور بندہ کے تعلقات پر نظر کی جائے تو عجیب بھی نہیں بلکہ ایسا نہ ہونا عجیب ہے جس کا سبب ہماری کوتاہی ہوتی ہے ادھر سے کوئی کمی نہیں۔ ؎

آنچہ ہست از قامت کوتاہ ونا موزون ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ایک صحت بدنی دوسری صحت روحانی کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق میسر ہوا۔

لطیفہ:۔خواب ہی سے مرض شروع ہوا تھا خواب ہی پر ختم ہوا۔ع

درد از یار ست ودرمان نیز ہم

اطلاع:۔میں نے النجم بھیجنے کو منع کر دیا،اب نہیں آتا،جی برا ہو گیا۔

م۔بھائی صاحب کا تبادلہ سہارنپور سے سیتا پور ہو گیا۔گو وطن کے قریب آ گئے لیکن تھانہ بھون گویا چھوٹ گیا۔بس اسی کا افسوس ہے،خود میرے لیے بھی حاضری میں جتنی سہولتیں اب تھیں،ان میں فی الجملہ کمی آ گئی۔

ا۔مجھ کو بھی طبعاً افسوس ہوا اور مجھ کو کیا گھر میں بھی مگر دوسرے عنوان سے کہ اب آپ کے گھر

میں ملنا مشکل ہوگا اور خود ڈپٹی صاحب کے اخلاق کو بھی یاد کیا کہ محبت سے آتے تھے اور اس قدر رعایت کرتے تھے کہ کھانا ساتھ لاتے تھے، مگر خود ممدوح کی توقع راحت سے عقلاً مسرت ہوئی۔ ایک قرب وطن سے دوسرے غالباً سیتاپور کی آب وہوا بہ نسبت سہارنپور کے مزاج کے موافق آ جائے اور شکایت لاحقہ میں کمی ہو جائے، باقی جو روحانی علاقہ ان سے ہے اس میں قرب وبعد متفاوت نہیں۔ والسلام۔

مکتوب گرامی کے جزو اوّل کا حکیمانہ ہونا بالکل ظاہر ہے اور حکیم الامت کے معیار کے بالکل مطابق لیکن جز اخیر جو ایک نج کے اور خانگی معاملہ سے متعلق ہے، وہ بھی شریفانہ ہونے میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ حکیم الامت کے قریب رہ کر دوسروں نے ذکر وشغل وغیرہ عناصر ''بزرگی'' کی جو بھی تعلیم کی ہو، اس عامی کو تو سب سے بڑا سبق حضرت کی ہمہ وقتی زندگی سے آدمیت، انسانیت، حسن معاشرت وکمال اخلاق ہی کا ملا۔ آخرت تو ملتی ہی، دنیوی زندگی بھی ''طریق اشرف'' ہی پر چلنے سے بہترین اور خوشگوار ترین بسر ہو سکتی ہے۔

(67)

خط ختم ہو گیا۔ خط کا حاشیہ رہا جاتا ہے۔ حاشیہ خود مولانا کا نہیں، ان کے عاشق صادق اور مرید باصفا خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب کے قلم سے ہے۔ اپنے جذبۂ عشق کے لحاظ سے اپنے مرشد ہی میں گم اور من تو شدم تو من شدی کے مصداق!

''حاضر الوقت احقر عزیز الحسن بعد سلام مسنون صحت پر دل سے مبارکباد عرض کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ سلامت باکرامت رکھے۔ آمین۔ دیوان حافظ سے دیکھ کر اس شعر کو جو حضرت نے آپ کو پشت پر تحریر فرمایا ہے لیکن پہلا مصرع حضرت کو صحیح یاد نہ آیا تھا میں مکرر لکھتا ہوں۔ ؏

ہرچہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست

حضرت اکثر آپ کو یاد فرماتے رہتے ہیں اور ذکر خیر کرتے رہتے ہیں''

علالت قلب کا وہ سلسلہ تو خیر خدا خدا کر کے ختم ہو گیا اور میں اس بیماری کے دوران مثنوی کا یہ مصرع اکثر گنگناتا رہا تھا۔ ؏

نیست بیماری چو بیماریٔ دل(1)

لیکن کوئی نہ کوئی علالت جاری ہی رہی، کبھی نزلہ کبھی بخار وغیرہا۔ بہت جی چاہا کہ ایک مرتبہ ایک ہی دن کے لیے سہی، اس درمیان میں تھانہ بھون حاضری دے آؤں۔ کوئی صورت نہ بن پڑی، 5 یا 6 رمئی کو پر حسرت کارڈ لکھا۔ جواب میں حسب معمول تشفی نامہ موصول ہوا:

''حضرت مرشدیؒ سے سنا ہے کہ کبھی لطف بصورت قہر ہوتا ہے۔ اس کے افراد میں سے آپ کی علالتیں ہیں کہ طرق قرب ہیں۔ یہ بھی حضرت سے سنا ہے کہ جس طرح عمل طریق قرب ہے اسی طرح مرض دوسرا طریق قرب ہے(2)۔ عبدیت وتفویض یہ ہے کہ جو خاص مدت شروع کی تھی اس میں تعجیل کو ذہن سے نکال دیجیے اور مفوض بحق کیجیے۔ ان کی حکمت میں جب مصلحت ہوگی اس میں لگا دیں گے۔ باقی دعا وتدبیر میں مشغول رہیے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں۔ علیٰ ہذا ملاقات کو بھی حوالہ بخدا کیجیے۔

کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف ست

مجھ کو خشک مزاج کہنے والے ایسے معذور ہیں جیسے غریق شناور کو خشک کہے یعنی نسبتاً! اور اصل تو یہ ہے کہ جو شخص ان لوگوں کا تابع نہ ہو وہ خشک و بد خلق ہے(3)۔

گھر میں سچ کہتی ہیں لیکن جتنی دیر میں مستورات باہم ملیں گی اتنی ہی مسرت کامل ہوگی یہ بھی حکمت ہے(4)۔ اب مکرر دعائے صحت پر ختم کرتا ہوں''۔

تفویض وتسلیم کی کیفیت (جو عین تقاضائے عبدیت ہے) اگر دل میں راسخ ہوجائے تو یہی دنیا میں نمونۂ جنت بن سکتی ہے۔ خوب کہا ہے محمد علی جوہر نے۔

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ	دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

---

(1) صاحب مثنوی معنوی کا پورا شعر اور ظاہر ہے کہ بالکل دوسرے سیاق میں، یوں ہے۔

عاشقی پیدا است از زاریٔ دل	نیست بیماری چو بیماریٔ دل

(2) کتنی حکیمانہ و جامع تعلیم چند مختصر لفظوں کے اندر ارشاد فرمادی گئی ہے، سبحان اللہ!

(3) حضرت کی ذاتی شفقتوں اور عنایتوں کی تازہ مثالوں سے متاثر ہو کر میں نے لکھا تھا کہ کیسے ظالم اور بیدرد وہ لوگ ہیں جو ایک سرچشمۂ لینت کو خشک مزاج بتاتے ہیں۔

(4) گھر میں یہ کہا تھا کہ اب پیرانی صاحبہ سے جلد جلد ملاقات کی کیا صورت ہے کہیں مدتوں میں شاید نوبت آسکے۔

صحت بحمداللہ درست ہوئی لیکن رفتہ ہی رفتہ اور ہمت وحوصلہ کے مطابق قوت اب بھی نہ لوٹی۔ بہرحال یہ غنیمت ہوا کہ کام کا ٹوٹا ہوا سلسلہ کسی حد تک از سرنو شروع ہوگیا۔ تھانہ بھون کی حاضری کی حسرت ہی بدستور قائم رہی۔ 24 مئی کا عریضہ تمام وکمال پڑھنے کے قابل ہے:

م۔ ''اب بحمداللہ کئی دن سے اچھا ہوں۔

ا۔ الحمدللہ۔

م۔ اور کچھ کام بھی کرنے لگا ہوں۔

ا۔ زیادہ نہ کیجیے۔ کہیں پھر خدانخواستہ کوئی مجبوری نہ ہو جائے۔

م۔ گو جتنی محنت کا دل چاہتا ہے اس کی نصف بھی ابھی نہیں کرتا۔

ا۔ دل کے چاہنے پر عمل نہ کیا جائے۔ عقل کے فتویٰ پر عمل کیا جائے۔

م۔ دن میں سونے کا کبھی پابند نہ تھا۔ اب لازمی سا ہوگیا ہے۔ اطبا نے بھی بتایا ہے اور خود تجربہ سے بھی نافع ثابت ہوا۔

ا۔ بلکہ ضروری۔

م۔ تھانہ بھون حاضری کی کیا عرض کروں۔ اس درمیان میں کیسی کیسی کوششیں کیں۔ پختہ ارادہ تھا کہ بھائی صاحب جس روز سہارنپور سے روانہ ہو رہے ہوں، اس کے دو روز قبل گھر میں ساتھ لے کر وہاں پہنچ جاؤں اور ایک شب و روز کے لیے تھانہ بھون حاضری دے لوں۔ جناب والا کو زحمت انتظام سے بچانے کے خیال سے یہ سوچ لیا تھا کہ شب کو گھر میں خواجہ صاحب(1) یا جلیل احمد خان صاحب(2) کے ہاں آجاؤں گا اور دونوں حضرات اسے یقیناً بمسرت منظور فرما لیتے۔

ا۔ میں ان حضرات کی سی مسرت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر خدمت لینے میں میری مسرت بھی کچھ زیادہ کم نہ ہوتی اور خدمت نہ لینے میں اسی طرح حسرت میں بھی کمی نہ ہوتی۔

م۔ یہ ساری تجویزیں دھری رہ گئیں۔ عین وقت پر تیز بخار آگیا۔ سارے منصوبے غارت ہوگئے اور دل تڑپ کر رہ گیا۔

---

(1) جو آج کل تھانہ بھون میں مع گھربار کے مقیم تھے اور اشرف السوانح کی تسوید و ترتیب میں مشغول۔

(2) حافظ جلیل احمد خان شیروانی علی گڑھی، جو مہاجر کی حیثیت سے یہیں آباد ہوگئے تھے۔

ا۔ مجاہدہ کا اجر مشاہدہ سے زائد ہے۔

م۔ انگریزی کے کام کو سردست روک کر پارۂ اوّل کو اردو میں لا رہا ہوں اور اسے صاف بھی کراتا جا رہا ہوں۔ اب کوئی مانع نہ پیش آیا تو انشاء اللہ اسے آئندہ ہفتہ خدمت والا میں پیش کردوں گا۔

ا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مگر دیکھنے کے متعلق مشورہ دیجیے۔ کل دیکھنے کی اور غائر نظر سے دیکھنے کی تو ہمت نہیں رہی، پھر کس صورت سے دیکھوں۔

م۔ تاریخ، جغرافیہ اور کتب یہود و نصاریٰ وغیرہم کا مطالعہ کثرت سے کرنا پڑ رہا ہے اور لکھنے سے کہیں زیادہ وقت پڑھنے ہی میں صرف ہو رہا ہے۔ یوم السبت کے سلسلہ میں مسخ یہود کے جس واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے، مفسرین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایلہ میں پیش آیا لیکن یہ نام موجودہ نقشہ میں کہیں نہیں ملتا۔ کئی دن اس میں حیرانی رہی۔ آخر توریت میں اس کا ذکر محض ضمناً ملا۔ وہاں مقام کا نام ایلات درج تھا۔ اب تلاش ایلات کی ہوئی۔ بالآخر پتہ یہ چلا کہ اس کا نام بار بار بدل چکا ہے اور جدید جغرافیہ میں اس کا نام عقبہ ہے، جو شام کے جنوب میں اور عرب کے شمال ومغرب میں، لب ساحل، بحر قلزم پر واقع ہے اور وہاں کا سمندر خلیج عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ زمانہ کا بھی اجمالاً تعین ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وقت کا واقعہ ہے۔

یہ ایک مثال عرض کی گئی۔ دل چاہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ اقوام غیر کے جتنے بھی واقعات وعقائد قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں سب کی سندیں خود ان ہی کی کتابوں سے مہیا ہو جائیں۔ البتہ اس کے لیے بڑے وقت کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی فراہمی انبار کتب کے لیے بڑے سرمایہ کی۔

ا۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائے مگر لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا.

م۔ حضرت دعا فرماتے رہیں۔

ا۔ دل و جان سے۔

م۔ سنا تھا پچھلے دنوں خود جناب والا کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی تھی۔

ا۔ زیادہ تو نہ ہوئی تھی۔ نکسیر جاری ہوگئی تھی۔ کئی گھنٹہ کے بعد رُکی۔ ایک روز قدرے ضعف

بھی رہا۔ پھر وہی بے حیائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اطمینان فرمائیں۔

م۔ خدا کرے اب بالکل صحیح ہو گئے ہوں۔ خیر و عافیت سے ضرور مطلع فرمائیں۔

ا۔ الحمدللہ بالکل خیریت سے ہوں''۔

بیچ بیچ میں جو لطیف و حکیمانہ ٹکڑے عقائد صحیح کے استحضار اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ ساتھ آتے گئے ہیں، ان پر اگر توجہ دلائی جاتی رہے تو کتاب کی ضخامت دگنی ہو کر رہے لیکن ان نکتوں اور چٹکلوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہی کیا۔ کتاب کے پڑھنے والوں میں کونسا ایسا غبی ہوگا جس پر وہ از خود عیاں نہ ہوں۔

مراسلت اب عموماً تفسیر قرآن ہی پر رہا کرتی لیکن کبھی کبھی خواب وغیرہ بھی موضوع مراسلت بن جاتے۔ خواب تنہا اپنے ہی نہیں، بیوی کے بھی، جنھیں شاید رویائے صالحہ سے کوئی خاص مناسبت سی کم از کم اس زمانہ میں تو تھی۔ 3/ر جون کا لمبا نیاز نامہ بیوی ہی کے لیے اور بڑے ہی دل خوش کن خواب سے بھرا ہوا ہے۔ اصل خواب کا ان اوراق میں نقل کرنا تو کچھ زیادہ بامحل نہ ہوگا۔ البتہ حضرت کے جواب کو چھوڑتے نہیں بنتا، صرف وہی ملاحظہ ہو:۔

''تعبیر تفصیلی سے تو مجھ کو مناسبت نہیں، اجمالاً اتنا جی کو لگتا ہے کہ آپ کی خدمت قرآنیہ کی طرف خاص ارواح کو توجہ ہے۔ وہی ارواح خاص ان قالبوں کی صورت میں متمثل نظر آئیں اور مستقل قیام کے معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ ابھی وہ توجہ مستمر رہے گی تکمیل خدمت تک واللہ اعلم''۔

اور میری اس حسرت کے جواب میں کہ ''کاش اس خواب کا کوئی جز بیداری میں بھی نصیب ہوتا'' یہ ارشاد ہوا کہ

''انشاء اللہ تعالیٰ سب نصیب ہوگا اگرچہ بالمعنی سہی''۔

(68)

اصلاً اب مستقل موضوع تفسیر قرآن ہی تھی۔ 23/ر جون کے نیاز نامہ میں تو سوا اس کے کوئی اور مضمون ہی نہیں اور اس سلسلہ میں یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ادھر کے معروضات اور اُدھر کے ارشادات تمام تر عام فہم اور عامۃ الناس کی دلچسپی ہی کے ہوں۔ کوئی حصہ آخر طالبان علم کے لیے بھی تو مخصوص رہنا چاہیے۔ سورۂ بقرہ (پ 2) آیت 129 میں بسلسلۂ قتال ارشاد ہے۔ ''فَاِنِ

انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"۔ "اگر وہ لوگ باز آجائیں تو اللہ بھی بڑا مغفرت کرنے والا ہے، بڑا مہربان ہے"۔ سوال یہ ہے کہ کافر کس چیز سے باز آجائیں؟ قتال سے یا عقائد کفریہ سے؟ سوال ایک معرکۃ الآرا سوال ہے۔ ذیل میں سوال اور بہت مفصل جواب دونوں ملاحظہ ہوں:

فَاِنِ انْتَھَوْا کی تفسیر میں نے تو آپ حضرات کے اتباع میں عَنِ الْکُفْرِ سے کی ہے لیکن ایک گروہ کا اصرار ہے کہ محض عن القتال سے کرنا چاہیے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم ملا ہی اس لیے تھا کہ ابتدا اُدھر سے کر دی گئی تھی، اب جب وہ لوگ خود ہی لڑنا بھڑنا ختم کرتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی رُک جانا چاہیے۔

اس کے آگے وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ کی تفسیر میں یہ گروہ کہتا ہے کہ اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ لوگوں کو اسلام لانے اور اس پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو جائے۔ نہ یہ کہ ملک میں صرف اسلام ہی اسلام رہ جائے اور یہ گروہ دلائل ذیل پیش کرتا ہے:۔

(1) قرآن مجید کی دوسری آیات اسی مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مثلاً وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وغیرہ۔

(2) تعامل نبویؐ بھی اسی کی تائید میں ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے حدیبیہ میں کافروں سے ان ہی کی شرائط پر صلح کر لی۔ فتح مکہ کے وقت اہل مکہ کو ان کے عقائد کفر کے باوجود معاف کر دیا اور پھر آخر زمانۂ حیات نبویؐ تک مشرکین کے وفود آتے رہے اور یہود ونصاریٰ تو عرب میں وفات شریف کیا اس کے بعد تک بھی باقی رہے۔

اگر جناب والا کے اوقات پر بار نہ پڑے تو گزارش ہے کہ مختصر اشارات سے رہنمائی فرمائی جائے"۔

رہنمائی فرمائی گئی لیکن شاید میری عبارت پر نظر کر کے مختصر ارشادات سے نہیں بلکہ مفصل ومدلل تصریحات سے اور گویا ایک پورا مقالہ ہی اس بحث پر سپرد قلم فرما دیا گیا:

"الجواب:۔ غالباً اس گروہ اہل اصرار کو ائمۂ مجتہدین کا مذہب معلوم نہیں۔ انتھوا کی تفسیر عن الکفر دیکھ کر غلط سمجھ گئے کہ شاید اہل حق بدون اسلام کے ترک قتال کے قائل نہیں، حالانکہ ائمۂ اسلام کا یہ مذہب نہیں، وہ قتال کی غایت اور حد دو چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ ایک اسلام ایک

استسلام یعنی انقیاد بقبول الجزیہ اوران کاان انتھوا کی تفسیر میں عن الکفر کہنا اس بنا پر نہیں کہ بدون اسلام کے ترک قتال نہ کریں گے کہ یہ توان کے مذہب کے خلاف ہے جیسا ابھی گزرا بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ آیات خاص ایک جماعت عرب کے باب میں ہیں جن سے معاہدہ ترک قتال کا ہو گیا تھا اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے نقض عہد کا اندیشہ تھا۔ تو خاص ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ معاہدین سے تم خود تو ابتدا بہ قتال مت کرو لیکن اگر وہ نقض عہد کر کے ابتدا کریں تو قتال کی اجازت ہے لیکن اگر وہ کفار بعد نقض عہد وابتدا بہ قتال کے اسلام قبول کر لیں جس کے لوازم سے ہے ترک قتال تو اللہ تعالیٰ ان کو بخش دیں گے اور تم بھی قتال سے رُک جاؤ اور غفور رحیم کہنا اس تفسیر کا مرجح ہے کیونکہ محض انتہاء عن القتال موجب مغفرت نہیں مگر اس تفسیر کے اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ بدون انتہاء عن الکفر کے قتال جاری رکھا جائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ اس جگہ یہ تفسیر مناسب ہے۔ باقی اگر انتہاء عن الکفر نہ ہوا مگر انتہاء عن القتال ہو گیا تو اس تفسیر پر یہ صورت اس آیت میں مسکوت عنہ ہے۔ اس کا حکم اپنے موقع پر دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ وہ یہ کہ انتہاء عن القتال اگر اسلام کے طور پر ہوا ہے تو قتال سے رک جائیں گے اور اگر بقاعلی الکفر وبقاعلی التمرد کے ساتھ ہوا ہے تو قتال کے جاری رکھنے کی اجازت ہے اور اس کے بعد جو قتال کی غایت حتیٰ لاتکون فتنة فرمائی ہے چونکہ سبب نزول ان آیات کا خاص عرب تھے جیسا کہ روایات میں ہے، وہی مذکورۃ فی بیان القرآن اس لیے امام صاحب کے مذہب پر فتنہ کی تفسیر کفر کے ساتھ صحیح ہے کیونکہ ان کے نزدیک کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا بلکہ امام الاسلام وامام السیف۔ باقی مطلق کفار کے لیے امام صاحب حکم نہیں فرماتے اور دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتنہ کی تفسیر قوت مقاتلہ ہے، جس کی نفی کی ایک صورت قبول جزیہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف ترک قتال کفار وجوب ترک قتال مسلمین کے لیے کافی نہیں جیسا کہ اس گروہ مصرین کی رائے معلوم ہوتی ہے جو بوجہ مخالفت نصوص ومخالفت اجماع کے باطل ہے اور اسی رائے باطل پر یکون الدین للہ کی تفسیر کو متفرع کیا ہے، جو بناء الفاسد عن الفاسد ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ آزادی جس کو وہ بھی ضروری مانتے ہیں محض ترک قتال سے حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کی قوت زائل نہ کر دی جائے ورنہ ہر وقت اندیشہ لگا رہے گا اپنی قوت سے کام لینے کا اور سلب آزادی اہل اسلام کا اور آیت وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ سے جو شبہ کیا

ہے، اگر یہ امر وجوب کے لیے ہے تو آیت منسوخ ہے اور اگر منسوخ نہ کہا جائے تو اباحت کے لیے ہے اور مقید ہے رویت مصلحت کے ساتھ اور تعامل سے جو استدلال کیا جاتا ہے امام صاحب کے مذہب پر تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ ان کے نزدیک بدون توطن واستیلا کے کفار کا جزیرۂ عرب میں داخل ہونا جائز ہے اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ کی وصیت "اخراج الکفار عن جزیرۃ العرب" اس تعامل کی ناسخ ہے۔ بہر حال اس پر اجماع ہے کہ اہل اسلام کی قدرت اور مصلحت ہوتے ہوئے بدون اسلام یعنی قبول جزیہ کے کف عن القتال نہ واجب نہ جائز۔ تو اس گروہ کا مدعا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور اس گروہ کے نزدیک جب ائمۂ دین کی تحقیق کافی نہیں تو ان کی اپنی تحقیق کے کافی ہونے کے دعوئی کا کیا حق ہے۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ آیت فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں اگر انتہوا کی تفسیر عن الکفر کے ساتھ اس بنا پر کہ کف عن القتال موقوف ہے اسلام پر تو صحیح نہیں کیونکہ اسلام کے مثل قبول جزیہ بھی اسباب کف عن القتال سے ہے اور اگر اس بنا پر ہے کہ اسلام بھی من جملہ اسباب کف عن القتال کے ہے تو سب ائمہ کے نزدیک صحیح ہے اور اگر اس بنا پر ہے کہ گو علی الاطلاق کف عن القتال اسلام پر موقوف نہیں لیکن آیت جس جماعت کے باب میں ہے خاص ان کے باب میں یہ کف عن القتال موقوف ہے ان کے اسلام پر تو صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح ہے کیونکہ ان کے نزدیک کفار عرب سے جزیہ قبول نہیں۔ یہ تو تفصیل ہے انتہوا کی تفسیر عن الکفر میں اور اگر عن القتال کی جائے تو اگر اس بنا پر ہے کہ صرف ترک قتال بدون قبول جزیہ پر کف عن القتال واجب ہوگا تو بوجہ مخالفت نصوص واجماع صحیح نہیں اور اگر اس بنا پر ہے کہ ترک قتال بقید قبول جزیہ کف عن القتال واجب ہے تو صحیح ہے۔ حاصل یہ کہ جو مسائل نصوص واجماع بسیط یا مرکب سے ثابت ہیں ان کے محفوظ رہتے ہوئے دونوں تفسیروں کی گنجائش ہے اور ان کی نفی میں کوئی تفسیر صحیح نہیں"۔

وقت کے اہم فتنوں میں سے ایک فتنہ بھی بہت پھیلا ہوا ہے کہ مسلمان عورت شوہر کی بدسلوکیوں سے تنگ آ کر اس سے مخلصی حاصل کرنا چاہتی ہے مگر حکومت اپنی نہیں، خلع ہو کیسے۔ یہ سوچ کر وہ مرتد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اس کے نکاح سے از خود خارج ہو جاتی ہے۔ آزادی حاصل کر لینے کے بعد پھر وہ دوبارہ بیشک قبول اسلام کر سکتی ہے لیکن یہ راہ جتنی خطرناک ہے بالکل

ظاہر ہے۔ ارتداد کسی وجہ سے بھی ہو، ایک مسلمان کے لیے اس کا تصور ہی ہولناک ہے اور پھر ارتداد کے بعد دوبارہ واپس آنے میں خدا معلوم کیسے کیسے مانع پیش آ جائیں۔ مولانا کی نظر دین اور دینی ضروریات کے ایک ایک گوشہ پر رہتی تھی۔ ایک مستقل رسالہ بڑی تلاش و تفحص کے بعد خاص اس مبحث پر تصنیف فرمادیا، حالانکہ اب تصنیف و تالیف کے کام سے دست بردار ہو چکے تھے۔ ایسے موقع پر عورت ظالم یا ناقابل شوہر سے مخلصی کیونکر حاصل کرے، اس کے فقہی طریقے اس میں تفصیل سے درج کیے۔ رسالہ میرے پاس بھی ارسال ہوا اس فرمائش کے ساتھ کہ ممکن ہو تو اس پر تصدیقی دستخط علمائے ندوہ سے کرادوں۔ افسوس ہے کہ یہ والا نامہ ضائع ہو گیا۔ ورنہ یہ چیز بھی دیکھنے کے قابل تھی کہ حضرت اپنے ایک نیاز مند سے اس قسم کی تحریک کن الفاظ میں کرتے ہیں۔

28/جون کا طویل نیاز نامہ شروع یوں ہوتا ہے:۔

م۔ ''کتاب الحیلۃ الناجزہ موصول ہوگئی۔ آج اپنے پاس اور رکھ کر کل انشاء اللہ اسے اپنے خط کے ساتھ لکھنؤ روانہ کردوں گا۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ علٰی ھٰذہ العنایۃ۔

م۔ ندوہ میں دو صاحبوں کا شمار ممتاز علما میں ہے۔ ایک صدر دارالعلوم مولانا مفتی حیدر حسن خان ٹونکی، دوسرے فقیہ اوّل مولانا محمد شبلی۔ یہ دونوں تو انشاء اللہ تصدیق کر ہی دیں گے ممکن ہے اور مدرسین بھی دستخط کردیں۔

ا۔ مگر کسی پر زور نہ دیا جائے۔ تصدیقات کا خیال صرف اطمینان عوام کے لیے ہے ورنہ اصل مقصود اس پر موقوف نہیں یعنی اطلاع احکام۔

م۔ البتہ آج کل مدرسہ میں تعطیل ہے اور مدرسین اپنے اپنے وطن میں ہیں، اس لیے تاخیر ناگزیر ہے۔

ا۔ اس کا مضائقہ نہیں۔

م۔ ایسی خدمات اپنے لیے باعث فخر وسعادت سمجھتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ بے تکلف اس خدمت کے لیے مجھے ارشاد فرمادیا گیا۔

ا۔اس محبت پر دعائے خیر کرتا ہوں۔

م۔کتاب سرسری نظر سے دیکھ گیا۔مسائل پر رائے تو مجھ سا عامی کیا دے سکتا ہے لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ کتاب وقت کی بڑی اہم ضرورت پر لکھی گئی اور تلاش وتفحص کی جانفشانی کا تو کیا ہی کہنا۔اللہ ہی آپ کو جزائے خیر دے کہ دینی ضروریات کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر آپ کی نظر رہتی ہے۔

ا۔نظر پہنچنا تو خاص انعام خداوندی ہے مگر کام کی تکمیل میرے بس سے باہر تھی۔ایک جماعت نے مدد دی جن کا نام نامی اس رسالہ میں متفرق جگہ متفرق عنوان سے مذکور ہے۔

(69)

مراسلت کا اصل موضوع تو اب تفسیر وترجمہ ہی رہتے تھے۔خط کا باقی حصہ ان ہی کے متعلق ہے:۔

م۔''ترجمہ پارۂ اوّل کا مسودہ اب کہیں صاف ہو کر ملا ہے،فوراً حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

ا۔بہت ہی حسین لکھا ہے۔صورت دیکھ کر باقاعدہ دیکھنے کی طرف دل کو کشش ہوتی ہے۔

م۔میری اصلی خوشی تو یہی تھی کہ اسے اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرما لیا جاتا۔

ا۔یہ پارہ تو جس طرح بن پڑا حرفاً حرفاً ہی دیکھوں گا اس کے بعد ہمت نہیں۔

م۔مجھے اطمینان جبھی ہوتا، اس لیے کہ جن جن باریکیوں پر آپ کی نظر پہنچ جاتی ہے دوسرے حضرات کے خیال میں بھی وہ باتیں نہیں آتیں۔ بسیار خوبان دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

ا۔اس خیال کا منشا تو محض محبت ہے جس میں زیادہ واقعیت لازم نہیں لیکن خود محبت کی برکت سے بعض اوقات کوئی چیز کام کی مل جاتی ہے۔

م۔لیکن جناب والا کی مشغولی اور کثرت کار کا بھی علم رکھتا ہوں،اس لیے اپنی اس گزارش پر اصرار ہرگز ہرگز نہیں۔

ا۔اس وقت اپنی تفسیر پر نظر ثانی کرا رہا ہوں جو قریب ختم ہے۔انشاء اللہ تعالیٰ آغاز ربیع الثانی سے اس کا سلسلہ شروع کروں گا۔

م۔ بس جس قدر حصہ اور جتنے روز میں بھی بسہولت و بلا زحمت ممکن ہو اسی کو کافی سمجھوں گا اور اس پر راضی ہو جاؤں گا۔ سادہ کاغذ اظہار رائے عالی کے لیے الگ ملفوف ہے۔

ا۔ یہ آپ کی رعایت ہے مگر میرے نزدیک اس کی ضرورت ضرور ہے کہ کوئی محقق اوّل سے آخر تک پورے قرآن کا ترجمہ دیکھے۔ سرسری نظر سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

م۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ سردست اسے جناب والا ہی کے ملاحظہ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

ا۔ میں ابھی کسی کو ہوا بھی نہ لگاؤں گا۔ جب بھی آپ کی اجازت ہوگی دیکھا جائے گا۔

م۔ جو امور میرے پیش نظر رہے ہیں، انھیں بھی عرض کیے دیتا ہوں۔

(1) جہاں تک مسائل شرعی کا تعلق ہے، خواہ وہ عقائد ہوں یا اعمال و احکام، اپنے نزدیک میں نے تمام تر آپ ہی کا اتباع کیا ہے اور بیان القرآن کی ایک ایک سطر سے مقابلہ کرتا گیا ہوں بلکہ ترجمہ میں تو متعدد ٹکڑے لفظاً لفظاً آپ کے ہاں سے نقل کر لیے ہیں۔ اس پر بھی اگر کہیں سہواً یا بلاقصد اس سے انحراف ہو گیا ہو تو تنبیہ ہوتے ہی اسے انشاء اللہ درست کر دوں گا اور اپنے ترجمہ کو مسلک اہل سنت کا ترجمان اسی اعتبار سے کہہ سکتا ہوں۔

(2) لغت اور نحو میں بھی بالعموم اور اکثر آپ ہی کا اتباع کیا ہے۔ کہیں کہیں حاشیہ شیخ الہندؒ یا دوسرے اکابر سے موافقت کی ہے، وہاں بھی آپ کے اختیار کردہ پہلو کو حاشیہ میں ظاہر کر دیا ہے، مثلاً لفظ "بقرۃ" کے ترجمہ میں یا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا کی ترکیب میں۔

ا۔ بہت مناسب مسلک ہے۔ اس لیے میں اس پر زیادہ نظر نہ کروں گا کیونکہ آپ پر اعتماد ہے۔

م۔ اپنے ذاتی مطالعہ پر بھروسہ صرف ایک چیز میں کرنا پڑا ہے اور وہ اس لیے کہ اس کے لیے کوئی دلیل راہ موجود نہیں۔ یعنی تاریخ، جغرافیہ اور عقائد غیر کے مباحث میں۔ کتاب کو اصلاً یہود و نصاریٰ، ملاحدہ ہی کے سامنے جانا ہے، جب تک ان کے مسلمات سے استدلال نہ ہوگا کتاب بے اثر رہے گی۔

ا۔ بالکل صحیح ہے، ایسا ہی کرنا ضرور تھا۔ اب تفصیلی مطالعہ کے وقت ان التزامات کو پیش نظر رکھوں گا، کہیں شبہ ہوگا صحیفہ اظہار رائے میں ظاہر کر دوں گا۔

م۔منکرین کے صرف ایک اعتراض کا جواب مجھے اب تک نہیں ملا ہے۔ تلاش برابر جاری ہے۔ آج کل کے یہود یہ کہتے ہیں کہ ہم عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہی نہیں، یہ ہماری توحید پرستی پر اتہام ہے۔ اس کا جواب مجھے ان ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر نکالنا ہے۔

ا۔ خدا کرے نکل آئے۔ تفسیر حقانی خبر نہیں پیش نظر ہے یا نہیں۔ اس میں ایسے امور سے بکثرت تعرض ہے۔ اگر کہیں نہ ملے تو سہل جواب یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت کوئی جماعت ایسی رہی ہوگی جس کے خلاف کی کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں''۔

حضرت کا یہ جواب تو مجھے اس وقت بھی دل کو نہ لگا اور اب بھی اس کو ناکافی سمجھتا ہوں۔ اپنی تفسیر میں میں نے یہ عرض کر دیا ہے کہ ابن اللہ کا مفہوم ولد اللہ سے الگ ہے اور محاورۂ قرآنی میں ابن و ولد مرادف نہیں۔ ولد سے مراد صلبی بیٹا ہی ہوتا ہے، بخلاف اس کے ابن عام ہے، ہر چہیتے ولاڈلے کو ابن کہہ سکتے ہیں، جیسے قرآن کی اس آیت میں نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰہِ وَاَحِبَّآءُہٗ یہاں ظاہر ہے کہ ''ابناء'' سے مراد صلبی بیٹے نہیں بلکہ صرف چہیتے اور لاڈلے مراد ہیں۔ مسیحیوں کا شرک دوہرے قسم کا تھا۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا ولد اور ابن دونوں سمجھنے لگے تھے۔ یہود کا شرک وہاں تک نہیں پہنچا، وہ عزیر کے ہر لفظ کو وحی الٰہی کا آخری لفظ قرار دینے لگے اور توریت کی گمشدگی کے بعد جب حضرت عزیر کے نوشتے انھیں ہاتھ آگئے تو اب بعد کے کسی ہادی ورسول کی ہدایت سے اپنے کو مستغنی سمجھنے لگے اور یہی معنی ہیں ان کے عزیر کو ابن اللہ ماننے کے۔

14 رجولائی کا نیاز نامہ گویا اسی مکتوب بالا سے بالکل متصل ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد پڑھنے کے قابل ہے:-

م۔''اس ارشاد سے کہ پورے پارہ پر اوّل سے آخر تک نظر فرمالی جائے گی۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ مجھے اتباع، اطاعت، تقلید وغیرہ کا دعویٰ تو خاک نہیں لیکن اتنا بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ آپ کی تنقید وتغلیط تک دوسروں کی تائید وتصویب سے میرے دل کو کہیں عزیز تر اور میری نظر میں کہیں وقیع تر ہے۔

ا۔ یہ محبت ہے جیسا خلوف فم صائم عند اللہ مسک سے اطیب ہے اور جیسا ماں کو اپنے بچہ کا پیشاب دوسروں کے گلاب وکیوڑہ سے زیادہ محبوب ہے۔

م۔ جن ارشادات کے قبول کرنے میں اپنے میں شرح صدر نہیں پاتا، سچ عرض کرتا ہوں کہ ان کے بھی سننے اور پڑھنے میں لطف اور نفع دونوں ہی حاصل کرتا ہوں۔

ا۔ بچہ کی فرمائش کو پوری نہ کی جائے مگر پھر بھی فرمائش میں لذت ہوتی ہے اور یہ سب آثار اسی ستمگر محبت کے ہیں۔

م۔ واپسی میں عجلت کے خیال سے جناب کے اوقات عزیز پر بار ہرگز کسی طرح کا نہ ڈالا جائے۔ جب کبھی بھی باطمینان ممکن ہو واپس فرمایا جائے۔

ا۔ انتظار تو اسی کا تھا مگر اس سے یاس تھا اس لیے اس کا پاس نہیں کیا۔

م۔ جناب نے تحریر فرمایا کہ سارے کلام مجید میں کسی محقق سے استفادہ کرو، یہ تو میں خدا سے چاہتا ہوں لیکن آپ کے سوا کوئی اور لاؤں کہاں سے؟

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

ان تین چیزوں کی جامعیت جو آپ میں ہے، وہ کسی اور میں نہیں ملتی۔ یعنی ایک طرف تدین اور دوسری طرف عمق نظر، تیسری طرف ضروریات وقت پر نظر۔ میرے بے تکلف کرم فرما مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ ان دونوں پر جناب کے معیار سے محقق کا اطلاق غالباً صحیح نہ ہو۔ پھر آخر کن صاحب سے استفادہ کروں۔

ا۔ اگر یہ مقدمات تسلیم کر لیے جائیں تو اس صورت میں دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو آپ جن بزرگ کو محقق سمجھیں ان کو منتخب فرمالیں گو وہ دوسروں کی رائے میں محقق نہ ہوں کیونکہ ہر رائے کا قبول کرنا تو واجب نہیں اور یا آپ یہاں قیام فرمائیں اور جو تردد ہو ساتھ ساتھ فیصل ہوتا رہے تو بدون خاص وقت صرف کیے ہوئے اس خدمت کو بجالا سکتا ہوں۔

م۔ کسی قدر ذہن مولانا...... صاحب کی طرف بھی جاتا ہے، گو ان سے رسم برائے نام ہی ہے۔

ا۔ اس کا تو تدارک سہل تھا مگر میں آپ کے لیے ان کا ممنون ہونا طبعاً پسند نہیں کرتا، نیز ان میں استقلال بھی نہیں۔

م۔ تفسیر حقانی میں بیشک (1) ایک حد تک میرے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں لیکن مجھے

---

(1) مطبوعہ دہلی، از مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی۔

ضرورت اس سے بہت زائد کی ہے۔

ا۔ صحیح، مگر جو بھی مل جائے۔

م۔ موجودہ ملاحدہ نے معقولات وفلسفہ کا قدیم مورچہ تو بڑی حد تک چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا اصلی حملہ تاریخ وغیرہ علوم نقلی کے رخ سے ہو رہا ہے۔ مثلاً کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم پر پہنچ کر جھٹ سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ قدیم مذاہب میں تو روزہ فرض نہ تھا۔ اب اس کے جواب میں ضرورت کسی عقلی بحث کی نہیں بلکہ صرف اس کی ہے کہ یہود، مجوس وغیرہ کی مذہبی کتابوں سے اس کے حوالے نکال کر دکھا دیے جائیں۔

ا۔ بیشک یہی چاہیے۔ میری رائے میں اگر آپ صرف یہی کام اپنے ذمہ رکھیں کہ معترضین کا جواب اضافہ فرمائیں خواہ وہ عقلی اصول پر اعتراض ہو خواہ نقلی اصول پر۔ باقی میں احقر اور حضرت مولانا کا ترجمہ اور تفسیر بعینہٖ نقل فرمادیں خواہ زبان درست فرمادیں تو غالباً آپ کا کام بھی آسان ہو جائے اور دیکھنے والے کا کام بھی۔ پھر آپ کے نقل مکانی کی بھی ضرورت نہیں اور آپ کو تعب بھی کم ہوگا۔

م۔ علیٰ ہٰذا واقعات فرعون کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ تاریخ مصر سے اس کا ثبوت نہیں ملتا صرف تاریخ اسرائیل میں ذکر ملتا ہے، وہ ثبوت کے لیے کافی نہیں۔ ممکن ہے اسرائیلیوں نے اپنے دشمنوں کے بدنام کرنے کو یہ گڑھ لیا ہو۔ اب اس کے لیے ضرورت ہے کہ مصر قدیم کی تاریخ پر گہری نظر ہو اور قدیم کتبات وغیرہ جو حال میں برآمد ہوئے ہیں ان سب سے واقفیت ہو۔

ا۔ اس کی بھی واقعی سخت ضرورت ہے اور یہ کام ایسا ہوگا کہ قیامت تک امت آپ کی منت کش اور یہ کوشش آپ کے لیے جنت کش ہوگی"۔

(70)

پارۂ اوّل چند ہی روز میں واپس آ گیا۔ پورا تو نہیں، البتہ اس کا ایک معقول ومعتد بہ حصہ مولانا کا دیکھا ہوا اور جو سادہ کاغذ اس غرض سے بھیج دیا گیا تھا۔ اس پر مفصل تنقید لکھی ہوئی۔ تنقید کا کچھ حصہ بجنسہٖ آگے آئے گا۔ ابھی اس کے ساتھ کا والانامہ ملاحظہ ہو۔ تاریخ اس پر درج نہیں، اندازہ یہ کہ 14/15 رجولائی کا ہوگا:۔

زدست کوشہ خود زیر بارم　　　　　کہ از بالا بلنداں شرمسارم

جو خدمت آپ نے سپرد فرمائی تھی وہ پورے طور سے انجام نہ پا سکی، نیت تو تھی پورا سیپارہ دیکھوں مگر کام زیادہ تھا، لغت کو دیکھنا، تفاسیر کو دیکھنا، غور و خوض کرنا اور قوی جواب دے رہے ہیں اس لیے بمشکل آدھا سیپارہ دیکھ سکا جس کی یادداشت ملفوف ہے۔ چونکہ طرز معلوم ہونے کے لیے یہ مقدار کافی تھی اس لیے بھی زیادہ کا اہتمام نہیں کیا۔ خیال تو تھا ربیع الاوّل ختم ہونے کے بعد دیکھتا مگر طبیعت پر تقاضا ہوا، دوسرے کاموں کو موخر کر دیا۔ مفصل رائے اس یادداشت کے مفصل مطالعہ سے ظاہر ہوگی۔ میرے نزدیک اگر یہی طرز رہا تو دیکھنے والے پر زیادہ تعب ہوگا جس کا شاید کوئی تحمل نہ کر سکے، بعض کم فرصتی کے سبب بعض کم ہمتی کے سبب اور بدون دیکھے ترجمہ لوگوں کے نزدیک بھی مستند نہ ہوگا اور فی نفسہٖ بھی اس میں خدشات رہ جائیں گے۔ اس لیے مشورتاً عرض کرتا ہوں کہ آپ ترجمہ تو صرف مولانا (1) کا اور احقر کا لیں اور توضیح کے لیے احقر کے فوائد سے بڑھائیں اب صرف ایک چیز رہ جائے گی۔ وہ یہ کہ اگر توریت و انجیل کا کوئی مضمون موید ہوا بڑھا دیجیے اگر کوئی خلاف ہو اس سے تعرض کر کے تطبیق یا ترجیح قرآن کو دے دیجیے اور کوئی شبہ ملحدین کا یا عیسائیوں کا یا اہل سائنس کا ہو اس کو دفع کر دیجیے اور صرف یہ حصہ کسی کو دکھلا دیا جائے۔ کام بہت ہلکا ہو جائے گا آپ کو بھی اور دیکھنے والے کو بھی۔ آئندہ جیسی رائے ہو۔ باقی دعا کرتا ہوں والسلام"

اس والا نامہ کے جواب میں 19 جولائی کو جو کچھ عرض کیا، وہ مع جوابات ملاحظہ ہو۔ درس تفسیر القرآن اب تحریراً تو گویا جاری ہی ہے:

م۔ "دونوں والا نامے موصول ہوئے اور ترجمہ بھی واپس مل گیا۔ جو زحمت مطالعہ اور تنقید میں برداشت فرمائی گئی اللہ ہی اس کی جزائے خیر دے گا۔ میں تو صرف چند سطروں کے ملاحظہ فرما لینے پر قانع ہو گیا تھا، چہ جائیکہ آپ نے تو معتد بہ حصہ ملاحظہ فرما لیا۔

ا۔ اپنی قدرت میں جو خدمت ہو اس کو عام مسلمانوں کا اپنے ذمہ حق سمجھتا ہوں چہ جائے خواص۔

م۔ ارشادات گرامی حسب توقع مبصرانہ و ماہرانہ ہیں، مستفید ہوا، بیشتر حصہ بسر و چشم قبول

---

(1) مراد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ ہے۔

کیے لیتا ہوں اور مناسب ترمیم بھی کیے دیتا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ البتہ صرف دو چار مقامات پر کچھ عرض کرنے کی بھی جرات کرتا ہوں، سہولت کے لیے اسی کاغذ پر حاشیہ دے کر۔

ا۔ میں نے بھی سادگی سے مکرر عرض کر دیا ہے، بس بے تکلفی سے دل خوش ہوتا ہے۔

م۔ اس ارشاد والا نے تو میری راہ میں بڑی آسانی پیدا کر دی کہ ترجمہ اور عام تفسیری حصہ بیان القرآن اور ترجمہ شیخ الہند ہی سے لیا جائے۔ ایک بڑی حد تک تو اس پر عمل شروع ہی سے تھا، اور جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہوں، خود بخود بیان القرآن کا سہارا زیادہ پکڑتا جاتا ہوں، چنانچہ پارۂ اوّل سے کہیں زیادہ پارۂ دوم میں اس کا پابند رہا ہوں۔ اب ارشاد گرامی کے بعد انشاء اللہ اور زیادہ اہتمام رکھوں گا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ رشد و خیر کا القا فرمائے۔

م۔ اس وقت پارۂ سوم زیر ترجمہ ہے۔ ایک طرف بیان القرآن برابر کھلی ہوئی رہتی ہے اور دوسری طرف انگریزی کے بعض تراجم۔ الفاظ عموماً ایک نومسلم انگریز کے ترجمہ سے لیتا ہوں(1) اور مطالب تقریباً تمام تر بیان القرآن سے کہیں بجنسہٖ اور کہیں ملخصاً۔

ا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ جزاکم اللہ تعالیٰ کہ آپ مجھ کو بھی اجر میں شریک فرماتے ہیں۔

م۔ البتہ ایک اصولی سوال استفادتاً عرض کرتا ہوں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ترجمہ و تفسیر اہل سنت ہی کے مسلک پر ہونا چاہیے۔ اس کا شروع سے پابند ہوں اور انشاء اللہ آخر تک رہوں گا لیکن خود اکابر اہل سنت کے اندر بھی تو اچھے خاصے اختلافات موجود ہیں۔ ابن جریرؒ ایک ایک آیت کی تفسیریں، بعض اوقات آٹھ آٹھ بالکل مختلف اقوال، سب صحابہ و تابعین ہی کے نقل کر دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ترجموں میں، اسی طرح شیخ الہند اور جناب والا کے ترجموں میں باہم اچھا خاصا اختلاف موجود ہے۔ ایسی صورت میں حصر و تعیین کے ساتھ کسی ایک ہی بزرگ کا اتباع کیونکر ممکن ہے؟ اور اس میں آخر کیا ضرر ہے کہ مثلاً لفظ ''کرسی'' کے ترجمہ میں شاہ عبدالقادرؒ کا لفظ چھوڑ

---

(1) مراد مارماڈیوک پکتھال مرحوم کے ترجمہ سے تھی۔ آگے چل کر یہ قید باقی نہ رہی۔

کہ شاہ ولی اللہؒ کا لفظ ''بادشاہی'' اختیار کر لیا جائے؟

ا۔ جیسا اختلاف نقل فرمایا ہے، یہ مضر نہیں۔ اس میں جس کا قول چاہے لے لیا جائے مگر ماخذ کی تصریح لازم ہے۔ مثلاً کرسی کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا قول لیا جائے تو ایسی عبارت بین القوسین بڑھا دی جائے (کذا قال الشاہ ولی اللہؒ) کیونکہ ناظرین کو ماخذ ہر وقت محفوظ نہ رہنے سے بعض اوقات شبہ تفرد یا اختراع کا ہوتا ہے۔ اختلاف وہ مضر ہے جس کا اثر عقائد پر پڑتا ہو۔ سو اوّل تو اہل حق میں ایسا اختلاف نہیں اور اگر کسی سے لغزش ہوگئی ہو تو جمہور کا قول معتبر ہوگا اور تفرد کے قول کو ماول کہیں گے یا باطل کہیں گے۔

م۔ یا کم از کم حاشیہ پر ہی ضمناً اس کا ذکر کر دیا جائے۔ کیا بس اتنی احتیاط کافی نہیں کہ معانی اپنے دل سے گڑھ کر نہ لکھے جائیں اور اقوال کسی ایسے ویسے غیر ثقہ کے نہ نقل کر دیے جائیں۔

ا۔ بالکل کافی ہے مگر ایسے مقام پر ماخذ کا حاشیہ میں ذکر کر دینا کافی ہے۔

م۔ قدیم مفسرین کا تو بالعموم طرز یہ ہے کہ مختلف بلکہ متضاد اقوال نقل کر دیتے ہیں اور کبھی محض نقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں، ترجیح بھی نہیں دیتے۔ بظاہر تو یہی طریقہ دیانت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ اسی تفصیل کے ساتھ جو اوپر عرض کی گئی۔

م۔ آپ کی شفقت و کرم نے ہر طرح کے سوالات میں دلیر و بیباک بنا رکھا ہے۔

ا۔ مجھ کو تو ملاحظہ ہوتا ہے اور بدوں اتنی بیباکی کے بحث کی بیباقی نہیں ہوتی۔

م۔ اس لیے ایسی باتیں بے محابا پوچھ ڈالتا ہوں اور جواب سے ہمیشہ نئی نئی بصیرتیں حاصل کرتا ہوں۔

ا۔ خود مجھ کو ضروری باتوں کی طرف متوجہ ہونے سے نفع ہوتا ہے جس کے باعث آپ ہوتے ہیں''۔

زبان کی اجنبیت اور محاورہ کی مغائرت عجب عجب مغالطے پیدا کر دیتی ہے، جو کبھی افسوسناک ہوتے ہیں اور کبھی مضحک لیکن بہرحال ترجمہ در ترجمہ سے مغالطے پیدا ہونا ناگزیر ہی ہیں میرا اصل ترجمہ ظاہر ہے کہ عربی سے انگریزی میں تھا۔ اب انگریزی سے جب اسے اردو میں

منتقل کیا تو غلطی ہوئی کہ ترجمہ ہی کیا، عربی کے مطالب کو مستقلاً اردو میں نہ لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو حاشیے انگریزی لفظ پر تھے، وہ بھی اردو لفظ سے متعلق سمجھ لیے گئے۔ اپنی اس غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب مولانا کی تنقید پڑھ لی۔ اگر براہ راست عربی سے اردو میں مطالب لے لیے گئے ہوتے تو متعدد مقامات پر مولانا کے ایرادات ان عبارتوں پر واقع ہی نہ ہوتے۔

مولانا کی اصلاحوں کا بیشتر حصہ تو میں نے قبول ہی کر لیا اور ان کے مطابق ترمیم بھی کر دی البتہ چار پانچ مقامات پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھیں پیش کر دیا اور مولانا کے ہاں سے ان کا جواب بھی آیا۔ یہ سارے سوال جواب اگلے نمبر میں آرہے ہیں۔ باقی حصے حضرت کی تنقید کے لیے چھوڑ دیے گئے۔

حضرت کی زبان سے یہ دو کلمے بڑے ہی کام کے نکلے، جو ابھی اوپر درج ہو چکے ہیں یعنی یہی کہ نفس اختلاف مضر نہیں، مضر صرف وہ اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر پڑتا ہے۔ قدیم طرز کے علما جن کے ہاں بالعموم تحقیق کے معنی صرف تقلید سلف کے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ حق منحصر و محصور ہو کر رہ گیا ہے صرف اقوال متقدمین کے اندر، وہ اگر متاخرین کو اتنی بھی آزادی دے دیں تو بہت غنیمت ہے۔ کیا مصیبت ہے! ''وسعت نظر'' جب آتی ہے تو بے قیدی کے مرادف ہو کر اور احتیاط کا عزم جب پیدا ہوتا ہے، جمود و تنگ نظری کا جامہ پہن کر! کوئی صاحب کیسے ہی بڑے فاضل محقق اور امام عصر سہی، بہر حال یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مطالب قرآن سے متعلق آخری حرف صرف ان ہی کے دماغ سے نکل سکیں اور ان کے بعد کے آنے والے محض اس جرم میں کہ وہ ان سے متاخر ہیں قرآن پر لکھنے لکھانے کے حق سے محروم کر دیے جائیں۔

(71)

اصل حاشیہ رب العلمین۔ لفظ رب کا بھی صحیح ترجمہ مشکل ہی ہے۔

ا۔ کیا لفظ مربی اس کے مفہوم کے ادا کرنے کے لیے کافی نہیں؟

م۔ حاشیہ اردو لفظ پر نہیں۔ انگریزی لفظ ''لارڈ'' پر تھا، جس کا مفہوم رب کے مقابلہ میں بہت تنگ اور پست ہے۔

ا۔ تو لفظ ترجمہ کے ساتھ انگریزی بھی بڑھا دیا جائے۔

اصل حاشیہ۔ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ. یہ سزائے دردناک ان کے نفاق پر ہوگی نہ کہ مطلقاً کفر یا تکذیب رسولؐ پر جیسا کہ ایک مشہور انگریز مترجم نے سمجھا ہے۔

ا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کفر یا تکذیب رسولؐ پر سزائے دردناک کا استحقاق نہیں۔ حالانکہ بہت آیتوں میں مطلق کفر و تکذیب رسولؐ پر وعیدیں وارد ہیں اور اجماعی مسئلہ ہے کہ ایسی سزا نفاق کے ساتھ مخصوص نہیں۔ معلوم نہیں اس انگریز نے کیا اعتراض کیا ہے اور یہ اس کا جواب کس طرح ہوا۔

م۔ تکذیب رسولؐ پر سزائے دردناک کا ہونا تو ایک کھلا ہوا اور مسلم مسئلہ ہے۔ اس میں مجھے کیا اشتباہ ہوسکتا تھا۔ انگریز مترجم نے يَكْذِبُوْنَ کو يُكَذِّبُوْنَ پڑھ کر آیت کا ترجمہ یہ کیا تھا کہ ''سزائے دردناک اس پر ہے کہ وہ رسول کو جھٹلاتے تھے''۔

ا۔ بعد توضیح کے دیکھا جائے تو کچھ کہا جاسکتا ہے۔ غالباً اس عنوان سے لکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک انگریز مترجم نے اس کو يُكَذِّبُوْنَ باب تفعیل سے پڑھا جو بالکل غلط ہے۔

اصل حاشیہ۔ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ...... بعض کا قول ہے کہ یہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا۔ صوری نہ تھا۔

ا۔ اس قول کو تمام اہل حق نے غلط کہا ہے کیونکہ بنا اس کی انکار خوارق ہے۔ بس یا تو اس قول کو حذف کیا جائے اور یا اس کا غیر مقبول ہونا ظاہر کیا جائے۔

م۔ یہ قول تو حضرت مجاہدؒ کا ہے اور ان کا شمار آپ ہی حضرات سے سنا ہے کہ ممتاز مفسرین تابعین میں ہے اور اس قول کو ابن جریر طبری سے لے کر حافظ ابن کثیر بلکہ قاضی شوکانی تک اکثر ثقات نے نقل کیا ہے۔ اب انشاء اللہ یہ بڑھا دوں گا کہ یہ قول غیر مقبول و غیر معتمد و خلاف جمہور ہے۔

ا۔ کافی ہے(1)۔

اصل حاشیہ۔ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ...... بقول بعض صوفیہ و محدثین ایک مدت طویل کے بعد

---

(1) حضرت کے اس جواب کو اب پڑھتا ہوں تو حیرت ہی ہوتی ہے۔ یہ قول ایسا ہی غیر مقبول و غیر معتمد تھا تو ان سب حضرات کو آخر اس کے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر نقل بھی بلا تردید و تغلیط!

بالآخر اہل جہنم کو بھی نجات ہو جائے گی اور جہنم کو فنا کر دیا جائے گا۔

ا۔ یہ قول کس مستند صوفی یا محدث کا ہے۔ البتہ بعض اہل باطل فنائے نار کے قائل ہیں۔ پھر خلود کے معنی مطلق پڑے رہنے کے نہیں ہیں۔

اصل حاشیہ۔ خلود کی تعبیر غیر منقطع مدت اور ہمیشگی سے حسب مسلک جمہور ہے۔

ا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کے خلاف جس نے کہا ہے وہ اختلاف بھی معتد بہ ہے۔

م۔ بعض محدثین سے میری مراد حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے تھی۔ ابن قیمؒ کی کتاب شفاء العلیل (مطبوعہ مصر) دار المصنفین اعظم گڑھ میں عرصہ ہوا میری نظر سے گزری تھی۔ اس میں حافظ نے کتاب، سنت و آثار سے کوئی 25 دلیلیں فنائے جہنم پر قائم کی ہیں اور زور و شور سے دعویٰ کیا ہے کہ گنہگار جوں جوں پاک وصاف ہوتے جائیں گے نکل نکل کر جنت میں آتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جہنم فنا ہو جائے گی۔ کتاب میرے پاس موجود نہیں۔ ارشاد ہو تو اعظم گڑھ سے منگا کر حاضر خدمت کر دوں۔ اس میں ابن تیمیہؒ کا بھی یہی مسلک درج تھا۔

ا۔ کتاب بھیجنے کی ضرورت نہیں البتہ وہ عبارت مع سیاق وسباق اس عبارت کے جس میں ان بزرگوں نے اس کو اپنا مسلک بتایا ہے اگر نقل ہو کر آ جائے تو میں نقل کی اجرت حاضر کر دوں گا اور اگر کتاب کا زیادہ محصول نہ ہو اور مجھ سے قبول کر لیا جائے تو وہ کتاب بھی بھجوا دیجیے پھر میں اس کے درج کرنے نہ کرنے اور اس کی صورت وطریق کے متعلق عرض کروں گا۔

بعد تحریر سطور ہذا اسی پر رائے قائم ہوئی کہ وہ کتاب ہر حالت میں بھجوا دیجیے اگر چہ کتنا ہی محصول ہو میں ادا کر دوں گا۔

م۔ صوفیہ میں یہ مسلک شیخ محی الدین بن العربیؒ کا مختلف کتابوں میں منقول دیکھا اور سب سے زیادہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبان سے سنا۔ مولانا نے گھنٹوں اس موضوع پر مذاکرہ کیا ہے۔ وہ شیخ ہی کے اتباع میں اپنا یہ مسلک بیان کرتے ہیں کہ جن کے لیے خلود نار کا حکم ہے وہ بھی بالآخر جہنم میں رہتے رہتے اسی میں راحت محسوس کرنے لگیں گے۔

ا۔ اس جز کی تو کوئی دلیل ہی نہیں، اگر مولانا کے علم میں ہو تو مجھ کو بھی مستفید فرمائیں۔

م۔ اس کے علاوہ تفسیر ابن جریر (سورۂ ہود۔ زیر آیت اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ) میں حضرت

عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے، **لیاتین علٰی جھنم زمان تخفق ابوابھا لیس فیھا احد وذلک بعد ما یلبثون فیھا احقابا.** ابن جریر وابن کثیر وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوامامہ باہلیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ وغیرہ صحابہ، نیز ابن زید، شعبی وغیرہ تابعین کے اقوال اسی کی تائید میں نظر سے گزرے ہیں۔

خَالِدِیْنَ فِیْھَا میں خلود کے معنی یہ گروہ صرف دوام عرفی یا مکث طویل کے لیتا ہے اور ابداً کی بھی تاویل کر لیتا ہے، میں حق پر اس مسلک کو نہیں بلکہ اسی مسلک جمہور ہی کو سمجھتا ہوں لیکن اگر حاشیہ پر ضمناً ایک مذہب یہ بھی درج ہو جائے کہ بعض اہل حق ادھر بھی گئے ہیں تو اس کا ضرر مجھ پر واضح نہیں۔

ا۔ کیا ان بزرگوں تک سند پہنچانے کی ضرورت نہیں (1) ضرور ہے۔ تو اسماء الرجال کو دیکھیے شاید ایک روایت بھی ثابت نہ ہو (2)۔ پھر ظاہر قرآن کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے (2)۔ بیان القرآن سورۂ ہود بھی ملاحظہ فرمائی جائے۔

اطلاع:- (لفافہ پر) خط بند کرنے کے بعد یکذبون کے متعلق خیال ہوا کہ شاید کسی کی قرات تفصیل سے ہو۔ کتب قرات میں دیکھنے سے ثابت ہوا کہ ابن کثیر ونافع وابن عامر وابی عمرو کی قرات ہے۔ اس اس حاشیہ کو بالکل کاٹ دیا جائے۔ نیز جہاں میں نے دوسرے مفسرین کے قول کے لینے کی اجازت دی ہے یہ شرط بھی بڑھا دی جائے کہ قرات میں خلط نہ ہو اور احکام فقہیہ میں تلفیق نہ ہو۔ اس سے شرائط مکمل ہو جائیں گی۔ اگر مثالوں کی ضرورت ہو بے تکلف فرمائش کر دیجیے، پیش کر دوں گا تلفیق کی بھی اور اختلاف قرات سے خلط کی بھی۔

حضرت کے بعض ارشادات پر جرح تو اب دل میں پیدا ہو رہی ہے لیکن اس وقت ذہن میں بجائے کسی جرح کے اسلئے شکر گزاری ہی کے جذبات موجزن ہوئے اور عریضہ تمام تر شکریہ ہی کا لکھا۔ خط کی تاریخ 28 جولائی ہے:

---

(1) لیکن یہی سوال تو ابن جریر، ابن کثیر اور دوسرے مفسرین سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ (م)

(2) محدثین کے معیار پر کتنی تفسیری روایتیں پوری اتریں گی۔ (م)

(3) ظاہر قرآن کو چھوڑا تو ان لوگوں نے بھی نہیں، البتہ اس کی ایک نئی تاویل کر لی۔ (م)

م۔ "والا نامہ مل گیا۔ دل بہت بہت شکر گزار ہوا۔

ا۔ اور میں آپ کی شکر گزاری کا شکر گزار ہوں کیونکہ آپ ایسے شخص کے شکر گزار ہوئے جو قابل شکر گزاری نہیں کیونکہ میں نے ایسا کام ہی کون کیا۔

م۔ آپ تو اس قدر سہولت پیدا کر دیتے ہیں اور دوسروں کے نقطۂ نظر کا لحاظ کر کے ایسی رعایتیں ان کے مصالح کی کر دیتے ہیں کہ تجربہ کیے بغیر اس کا یقین آنا مشکل ہے۔ لوگ آپ کو "سخت" مشہور کیے ہوئے ہیں۔

ا۔ وہ بھی جھوٹے نہیں۔ منکر نکیر میں بھی اختلاف ہے کہ نرم ہیں یا سخت اور دونوں روایتیں سچی۔ باقی سہولت پسندی یہ میرا امر فطری ہے۔ اگر سبب اس کا سلامت فطرت ہوتا تو عین اتباع سنت تھا۔ کمافی جمع الفوائد۔ **عن مالک والشیخین وابی داؤد عن عائشةؓ ماخیر رسول الله صلی الله علیه وسلم بین امرین قط الا اخذ ایسرهما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منه الحدیث**۔ لیکن مجھ کو اپنے متعلق یہ شبہ ہے کہ شاید اس کا سبب کم ہمتی ہے، مشقت کا تحمل نہیں، اس لیے یہ قاعدہ **المرء یقیس علی نفسه** دوسروں کے لیے بھی غیر شاق کو تجویز کرتا ہوں۔ دعا کیجیے یہ مبدل ہو جائے اتباع سنت کے ساتھ۔

م۔ میں کہتا ہوں کہ یہ الٹی بات ہے۔ آپ کی نرمی، میانہ روی اور رعایت شعاری کی نظیر تو طبقہ علما میں ڈھونڈے سے بھی مشکل سے ملے گی۔ سختی جو کچھ ہے وہ مخصوص حالات میں اور مخصوص اشخاص کے لیے ہے۔

ا۔ میں تو قابل مدح کے نہیں مگر آپ کی ہر رائے سے فرحت ہوتی ہے۔

م۔ شفاء العلیل کے لیے میں نے اعظم گڑھ خط لکھ دیا ہے۔ انشاء اللہ براہِ راست وہیں پہنچے گی۔ غالباً حادی الارواح بھی پہنچے۔ وہ بھی ابن قیمؒ ہی کی ہے اور اعلام الموقعین کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔ عدم ابدیت جہنم کی بحث اس میں بھی ہے۔

ا۔ بیحد اشتیاق ہے، خدا کرے دونوں کتابیں آ جائیں، محصول دونوں طرف کا میں دے دوں گا۔ وہ حضرات اگر قبول فرما لیں میں ممنون ہوں گا"۔

(72)

5 راگست کا عریضہ خاصا طویل ہے اور دلچسپیوں کا ایک کشکول۔ 14 برس کے بعد آج بھی پڑھنے میں ایک نیا لطف آیا:

م۔ ''کتابیں اعظم گڑھ سے بھجوانے میں دقت معلوم ہوئی۔ اس لیے ندوہ سے وہ کتابیں بھجوادی ہیں۔ مہتمم کتب خانہ کا خط تو میرے پاس آیا لیکن بجائے میرے نام کے خط کے جناب کے نام والا خط میرے لفافہ میں رکھ گئے۔ بہرحال اس سے یہ پتہ نہ چلا کہ پارسل ریل سے گیا یا ڈاک سے۔

ا۔ اسی ڈاک سے خط ملا جس میں بلٹی بھی ہے مگر خط تو آپ کے نام کا اور بلٹی سہارنپور اسٹیشن کی۔ اس وقت سہارنپور بلٹی بھیجی ہے، دیکھیے کتاب کب دیکھنا ملے۔ معلوم ہوا کہ ملاّ نے صرف ہم ہی بدانتظام نہیں، ندوہ کے حضرات بھی اس دولت سے مشرف ہیں۔ خیر ہماری تو خوشی کی بات ہے۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔

م۔ محصول آمدورفت سے متعلق عرض ہے کہ یہ کام نہ جناب کا ذاتی ہے نہ ندوہ کا۔ اصلاً میرا کام ہے۔ اس لیے یہ خدمت بھی میرے ہی ذمہ رہے گی۔ ندوہ والوں کو تو لکھ دیا ہے، اب جناب سے بھی عرض کیے دیتا ہوں۔

ا۔ میں استخارہ کرتا ہوں، اگر میری تائید میں آ گیا امید ہے کہ آپ بھی اس کو قبول فرمالیں گے۔ اب استفسار کرتا ہوں کہ فارغ ہوجانے کے بعد کتابیں آپ کی خدمت میں واپس کردوں پھر آپ کسی کے ہاتھ لکھنؤ بھیج دیں گے کیونکہ ڈاک کا صرف مکرر بیکار ہے یا لکھنؤ بھیج دوں تو کس پتہ سے۔

م۔ خیر اصل مسئلہ کی تحقیق تو ہوتی رہے گی البتہ بعد غور میں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ ان فقروں کو اپنے حاشیہ سے نکال ہی دوں۔ جب میرا خود بھی وہ عقیدہ نہیں اور آپ جیسے بزرگ کو بھی پسند خاطر نہیں، تو خواہ مخواہ ایسے الجھاوے میں پڑوں کیوں اور پھر اختلافی اقوال تو صدہا مسائل میں نکلیں گے، سب کو بلاضرورت کہاں تک نقل کرتا رہوں گا، پڑھنے والوں کے خیالات میں انتشار الگ پیدا ہوجاتا ہے۔

ا۔ بیحد مسرت ہوئی، واقعی امت کی خیر خواہی اس کو کہتے ہیں۔

م۔ ایک اپنا ذاتی تجربہ بھی اسی لپیٹ میں آج عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے جب کبھی کسی مسئلہ پر ٹوکا ہے تو بارہا یہ ہوا ہے کہ اس وقت مجھے اپنی ہی رائے صائب معلوم ہوئی لیکن کچھ روز بعد عموماً اس رائے سے ہٹ ہی گیا ہوں اور آپ ہی کی فرمائی ہوئی بات دل میں اتر کر رہی۔ کوئی ایک آدھ مثال ہو تو اسے اتفاق پر محمول کروں لیکن جب کثرت سے یہی تجربہ ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا نام رکھوں۔

ا۔ میرے نزدیک تو اتفاق۔ اتفاق کثرت سے بھی ہو سکتا ہے۔ عقلی مسئلہ ہے، بہت حکما اس کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک اس کا نام تناسب طبائع ہے جس کی تائید الارواح جنود مجندہ سے ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ کوئی صاحب غلو یا صاحب علو یہ رائے قائم کریں کہ محبت کی وجہ سے مجھ کو موافقت کی خواہش ہوتی ہے، آپ کے قلب پر اثر ہو جاتا ہے، اب ہر شخص کو ایک رائے قائم کرنے کا اختیار ہے''۔

طویل خط کا باقی حصہ پڑھنے سے قبل ایک چھوٹی سی تمہید ضروری ہے۔ النجم ہفتہ وار لکھنؤ سے نکل رہا ہے اور رد شیعہ میں خاص شہرت حاصل کیے ہوئے ہے۔ 30 راگست کی اشاعت میں ایک لمبا مضمون مسئلہ متعہ پر شائع ہوا۔ حیدر آباد سے کسی صاحب نے حرمت متعہ کے خلاف چند شبہات لکھ کر بھیجے اور اسی سلسلہ میں مسلم و بخاری کی بھی بعض حدیثوں سے جواز متعہ پر استدلال کیا۔ النجم نے اپنے جوابی مقالہ میں جہاں اور پہلو اختیار کیے۔ وہاں ان احادیث کے بعض راویوں کو بھی خوب مجروح کر ڈالا۔ یہ شے مجھے بہت گراں گزری۔ اب آگے اصل ملاحظہ ہو:

م۔ ''النجم کا ایک تازہ مضمون ملفوف ہے۔ نفس مسئلہ میں مجھے کلام نہیں۔ متعہ کو میں بھی مطلقاً ناجائز تسلیم کرتا ہوں لیکن مضمون میں جہاں بخاری و مسلم کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے اس سے دل کو تکلیف ہوئی۔ اگر صحیحین کے رجال بھی مطرود و مردود قرار پا جائیں گے تو پھر حدیث میں ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا۔ یہ تو منکرین حدیث کے ہاتھ میں ایک بڑا حربہ دے دینا ہوا۔ یحییٰ بن معین ہوں یا حافظ ذہبی، کس کے ذوق کو امام بخاریؒ کے ذوق کے مقابل لایا جائے؟ میں تو جس طرح فقہ میں سب سے بڑی حجت یہی سمجھتا ہوں کہ فلاں قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے، اسی طرح حدیث کی

بھی سب سے بڑی سند یہی خیال کرتا ہوں کہ امام بخاریؒ کے ذوق نے اسے قبول کرلیا۔ اسماء الرجال کے ائمہ کیا کوئی صاحب وحی تھے؟ لے دے کے بس وہی مہارت فن۔ تو مہارت فن میں امام بخاریؒ کو کس سے کمتر سمجھا جائے۔

ا۔ سب ٹھیک ہے۔ دوسرے جارحین تو رواۃ کا حال بیان کررہے ہیں، ان کی روایت کا تو حال بیان نہیں کرتے۔ اگر ان کی کوئی روایت کثرت طرق سے یا تلقی امت سے قوی ہو جائے تو اس کا تو ان کو انکار نہیں۔ چنانچہ یہ روایت ایسی ہی ہے۔ چنانچہ کثرت طرق ظاہر ہے اور تلقی امت بھی ظاہر ہے کیونکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ پہلے حلال تھا۔ اس کا انکار اکابر امت کی تجہیل وتقلیل ہے اور بلا ضرورت کیونکہ جب دلائل حرمت موبدہ کے موجود ہیں تو نسخ سے مدعا حاصل ہے۔

ان ہی تشددات کے سبب میں نے اس رسالہ کو یہاں بھیجنے سے روک دیا ہے۔ ان حضرات کی نظر ایک پہلو پر چلی جاتی ہے، دوسرے پہلو نظر سے غائب کردیے جاتے ہیں"۔

حضرت کی تصدیق وتصویب سے تو یوں بھی ہر دینی مسئلہ میں خوشی ہوا کرتی تھی۔ اس خاص مسئلہ میں اتفاق رائے حاصل ہو جانے سے بہت زیادہ اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔

بیان القرآن اب جو دیدہ ریزی سے دیکھنی شروع کی تو چھوٹی چھوٹی بہت سی چیزیں اس میں نظر ثانی کی محتاج نظر آئیں۔ بے تکلف سب مولانا کی خدمت میں عرض کرنے لگا۔ پہلی قسط اسی خط سے شروع ہو گئی:

م۔ بیان القرآن جلد اوّل، صفحہ 161، س 1۔ الی اجلہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔ یہ سہواً رہ گیا، یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

ا۔ چھوٹا ہو یا بڑا ہو جو اپنی میعاد تک مقرر ہے الخ۔ اس میں کئی بار کاٹ چھانٹ اس لیے ہوئی کہ ترجمہ ترکیب کے موافق نہ بنتا تھا۔ مختلف تراجم دیکھے سب میں یہی کمی تھی۔ ڈپٹی صاحب(1) کا ترجمہ البتہ اس سے منزہ تھا مگر وہ ترجمہ ہی نہ رہا تھا، صرف حاصل رہ گیا تھا۔ کئی بار کے بعد ترجمہ موجودہ پر رائے قرار پائی۔

---

(1) یعنی شمس العلما مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی۔

م۔ صفحہ 51 پر مِن ربکم کا ترجمہ بھی مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اس امر کو کہ تم کو تمھارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری الخ۔

اطلاع:- آج کل مولوی شبیر علی بیان القرآن کی کاپی لکھوار ہے ہیں۔ ان دونوں مقاموں کو کاپی میں بنانے کو کہہ دیا ہے۔ یادداشت لکھوادی ہے۔

م۔ ص 42-43 پر آیت ''وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا '' کی تفسیر ''بواسطہ حضرت موسیٰ وتوراۃ'' سے کی گئی ہے۔ میری فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ اگر اس میں ذرا اور توسع سے کام لے کر بواسطہ انبیائے بنی اسرائیل وصحف بنی اسرائیل کر دیا جائے تو تاریخ یہود سے زیادہ مطابقت پیدا ہو جائے۔

ا۔ مگر اس میں ایک خلجان رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا یہود کا قول ہے تو مَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا سے وہی مراد ہوسکتا ہے جس پر ایمان لانے کے وہ مدعی تھے اور انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اور وہ ان کی کتاب کا انکار کرتے تھے تو اس عموم کو ان کی طرف منسوب کرنا معارض ہوگا''۔

5 راگست کا عریضہ اب جا کر ختم ہوا۔ بیان القرآن کے متعلق عرض معروض کرنے کا سلسلہ جو اس عریضہ سے شروع ہوا، خیال بھی نہ تھا کہ یہ بہت زیادہ پھیلتا جائے گا اور مہینوں کیا معنی برسوں تک جاری رہے گا۔ اللہ بالکل اس پر قادر ہے کہ جس چھوٹے سے چھوٹے بندہ سے چاہے، کوئی کام چھوٹا یا بڑا لے لے۔

(73)

مولانا تو انتظام مجسم تھے، زندگی کے ہر ہر جزئیہ میں دوسروں کی بھی راحت وانتظام کی فکر واہتمام رکھتے اور اپنے لیے بھی راحت وانتظام کے متوقع رہتے۔ ندوہ سے کتابوں کے پارسل کے جانے میں جو بدانتظامی ہوئی، قدرتاً خیال ہوا کہ حضرت کو اس سے اچھی خاصی اذیت ہوئی ہوگی اور اس سے اپنے کو بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ جوابی کارڈ میں اپنی اس ندامت کا اظہار کر دیا۔

اور یہ ندامت تو خیر تھی ہی، بڑی فکر اس کی لگی ہوئی تھی کہ ابن قیمؒ وغیرہ کے جو حوالے اپنی

پچھلی تحریروں میں عدم خلود نار کے متعلق لکھ کر بھیجے تھے، دیکھا چاہیے کہ حضرت کے تحقیقی مطالعہ میں وہ صحیح بھی ثابت ہوتے ہیں یا نہیں! نفس مسئلہ پر حضرت کی رائے اب بھی جو کچھ رہے، یہ تو نہ ہو کہ میرے دیے ہوئے حوالے ہی غلط نکلیں۔ اس کا ذکر خط میں تو خیر کیا کرتا لیکن دل اندر ہی اندر اس سے ڈرے جارہا تھا۔ بارے دو ہی ایک دن بعد حضرت کا پوسٹ کارڈ خوب مفصل موصول ہو گیا۔ ڈاکخانہ کی مہر اس پر تھانہ بھون سے چلنے کی 12 راگست کی ہے، ملاحظہ ہو:

''جمعہ کے روز کتابیں صحیح وسالم پہنچ گئیں۔ ان حضرات کے لیے کہ محسن ہیں اور آپ کے لیے کہ واسطۂ احسان ہیں دل سے دعا کرتا ہوں(1)۔ ان کے احسان کے اثر سے اس خفیف سی بے ترتیبی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا(2)۔ خصوصاً جب پارسل پر تھانہ بھون ضلع سہارنپور لکھا ہوا ملا تو شکایت بالکل منعدم ہو گئی۔ سہارنپور کا لفظ زائد لکھا گیا، معلوم ہوتا ہے جلدی میں اس پر نظر پڑی اور بلٹی میں وہی لکھ دیا۔ میں اعتراض کر کے خود نادم ہوں اور آپ کی ندامت کی خبر سے اس اطلاع پر نادم ہوں۔ بہر حال میری راحت کے غلبہ نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے دیا، آپ بالکل مطمئن رہیے۔

میں نے دونوں کتابوں میں دیکھا(3)، حیرت ہوئی کہ جو بزرگ اوروں پر ظواہر نصوص سے عدول کا الزام سختی سے لگاتے ہیں انھوں نے ظواہر کو کیسے چھوڑ دیا۔ بہت غور کیا۔ آخر میں اس پر شرح صدر ہوا کہ ان کے جیسے اور اقوال بدعیہ ہیں جیسے طلقات ثلٹ کے مسئلہ میں یا شد رحال وتوسل میں ایسا ہی یہ ایک قول بدعت ہے۔ کسی نے آج تک کسی اہل حق کا یہ قول نقل نہیں کیا بلکہ ایسے اقوال اہل بدعت سے نقل کر کے ان کو رد کیا جاتا ہے اور خود انھوں نے جو بعض سلف سے نقل کیا ہے وہ موقوف ہے صحت سند پر۔ علاوہ اس کے بتقدیر ثبوت ضعیف کو قوی کی طرف راجع کیا جاتا ہے۔ پھر اجماع متاخر رافع ہوتا ہے خلاف مقدم کا اور جن آیات سے تمسک کیا گیا ہے وہ دلالت میں نہ نص ہیں نہ محکم۔ غرض کسی پہلو سے اس قول میں جان نہیں۔

رہے صوفیہ تو اول تو ان مباحث میں ان کا قول کوئی وزن نہیں رکھتا۔ دوسرے محققین نے

---

(1) کیسی تعلیم حضرت کے معمولی معمولی فقروں سے بھی نکلتی رہتی ہے۔ (2) ایضاً۔ (3) مولانا کام کے حق میں حریص تھے۔ آج کا کام کل پر اٹھا رکھنا تو جانتے ہی نہ تھے، کام کا تقاضا گویا حضرت پر سوار رہتا۔ کتابیں پہنچتے ہی انھیں دیکھ ڈالا۔

تصریح کی ہے کہ یہ شیخ اکبر پر افترا ہے اور ان کے کلام سے اس کے خلاف تصریحات نقل کی ہیں۔ الیواقیت والجواہر میں اس کی تصریح ہے۔ یہ تو مسئلہ کی حقیقت ہے۔ اب خاصیت کے متعلق کچھ عرض ہے کہ مثل مضر او دیہ کے اس میں ایک ضرر بھی ہے اور ایک نفع بھی۔ ضرر تو یہ ہے کہ اس عقیدہ کے بعد عقاب سے وہ خوف نہیں رہتا جو اس کے خلاف میں ہے۔ بےفکری سی ہو جاتی ہے کہ اگر کفر تک بھی نوبت پہنچ گئی اس سے بھی ایک مخلصی ہے اور ایک نفع بھی ہے کہ اگر شق معروف میں کسی کو وساوس کا ہجوم ہو جس سے اندیشۂ تکذیب یا اعتراض کا ہو اس کے لیے یہ بدعت وقایہ ہے کفر کا۔ جیسا بعض علمائے امت نے اس سے کام بھی لیا ہے۔ باقی میں اس مضمون کو نقل کرا کر کتاب جلد واپس کر دوں گا۔ پھر اطمینان سے کچھ لکھنے یا لکھوانے کا خیال ہے۔

مولانا مناظر احسن صاحب تشریف لائے۔ بعد خوش تشریف لے گئے"۔ ظاہر ہے کہ اس والا نامہ کے آجانے سے بڑی تسکین ہوگئی۔

خطوط یاد کر لیجیے کہ اب عموماً تفسیر قرآن مجید ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ 14/اگست کا نیاز نامہ مع جواب ملاحظہ ہو:-

م۔ بیان القرآن، جلد 2 صفحہ 58 خٰلِدِیْنَ فِیْھَا کا ترجمہ چھپنے سے رہ گیا ہے۔

ا۔ اسی وقت بڑھا دیا، مطبوع میں بھی اور کاپی میں بھی جو کہ لکھی جا رہی ہے۔

م۔ فرنگی محققین کا سرتاج نونولڈیکی جرمن سمجھا جاتا ہے۔ اس کی عربیت کی دھوم مچی ہوئی۔ اس کا ایک ضخیم مقالہ قرآن مجید پر حال میں نظر سے گزرا(1)۔ اس ظالم بیدرد نے اعتراضات تو متعدد کیے ہیں۔ ایک اعتراض نیا دکھلائی دیا، جو اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا تھا۔ خلاصہ حسب ذیل ہے:

"بیرون عرب سے متعلق محمدؐ کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ملک مصر کی سرسبزی کو قرآن میں بارش کا نتیجہ بتایا ہے، حالانکہ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ مصر کو بارش سے کوئی واسطہ نہیں، وہاں کی شادابی تو تمام تر طغیانی نیل کے اثر سے ہوتی ہے"۔

اعتراض سورۂ یوسف کی آیت "عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاس" پر ہے۔

---

(1) یہ مقالہ "قرآن" کے عنوان سے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع یازدہم) جلد 13 میں موجود ہے۔

میں اپنے حواشی میں جواب دے رہا ہوں کہ

(1) اوّل تو یغاث کے معنی لازمی طور پر بارش ہی قرار دینا صحیح نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بجائے غیث کے غوث سے ہو اور معنی یہ ہوں کہ لوگوں کی فریادرسی ہو، مصیبت سے نجات ملے۔ چنانچہ متعدد اہل لغت اور اہل تفسیر اس طرف بھی گئے ہیں اور راغب کے مشہور لغت مفردات القرآن میں دونوں معنوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ قوله وان یستغیثوا فانه یصح ان یکون من الغیث ویصح ان یکون من الغوث و کذا یغاثوا یصح فیه المعنیان.

(2) دوسرے یہ کہ تصریح اہل مصر کی نہیں، عام خلقت یا الناس کی ہے۔ قحط صرف مصر میں نہیں اطراف وجوانب کے تمام ممالک میں پڑا تھا۔ یہ تاریخ سے بھی ثابت ہے اور قرآن بھی آخر شام وفلسطین کے قحط کا ذکر کرتا ہی ہے پس اگر بارش دوسرے ملکوں میں بھی ہوجائے تو مفہوم قرآنی کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔

(3) تیسرے، ملک مصر سے نفی بارش کا بالکلیہ دعویٰ بھی صحیح نہیں۔ ان ہی فرنگی جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مصر کے فلاں علاقہ میں بکثرت بارش ہوتی ہے، فلاں علاقہ میں کمتر اور فلاں یعنی ریگستانی علاقہ میں بالکل نہیں اور یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاں فراعنۂ مصر کی حکومت تھی، وہ وہی اول الذکر یا بارش والا خطہ تھا۔

یہ جوابات کافی نہ ہوں تو کچھ اور ارشاد فرمادیا جائے۔

ا۔ ماشاءاللہ نہایت کافی جواب ہیں۔ اوّل جواب میں اس قدر اور عرض ہے کہ روایات میں غیث ہی سے لیا گیا ہے۔ غوث کے قول کو کسی نے سلف سے نقل نہیں کیا۔ صرف روح المعانی میں قبل صیغۂ تمریض سے ذکر کیا ہے لیکن جواب کے لیے احتمال بھی کافی ہے۔ اگر جی کو لگے ایک جواب اور بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید سے عادۃ مستمرہ تو معلوم نہیں ہوتی کہ مشاہدہ کا متصادم ہو۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس سال بارش ہی سے پیداوار ہوئی ہو یا بارش سے نیل میں طغیانی ہوئی ہو۔ اگر یہ اصول طبعیہ کے خلاف نہ ہو اس کو بھی بڑھادیا جائے ورنہ حذف کردیا جائے''۔

کیا زمانہ تھا! تفسیر قرآن پر مذاکرے تو کہنا چاہیے کہ ہر ہفتہ بلاتکلف جاری ہی رہتے تھے۔ ان کے علاوہ جس دینی، علمی موضوع پر جی چاہتا تھا، بے دھڑک لکھ ڈالتا تھا اور جوابات سے خوب

خوب مستفید ہوتا۔ گویا ایک شفیق و ماہر فن استاد دور بیٹھا ہوا برابر تحریر کے ذریعہ درس دے رہا ہے۔

25 /اگست کا معروضہ آج بھی پڑھتا ہوں تو دنگ سا رہ جاتا ہوں کہ اس وقت یہ باتیں کیسے سوجھ گئی تھیں اور شکر بھیجتا ہوں کہ اللہ نے حل اشکالات کے لیے کیسے کیسے موقع دے دیے تھے۔

ختم نبوت کے مسئلہ پر گفتگو ایک نئے پہلو سے اپنے اسی معروضہ میں نظر آئی۔ حیرت ہوئی کہ اللہ اپنے جس ناکارہ بندہ سے جو کام چاہے لے لے، عریضہ کے آخر میں ایک خواب کا بھی ذکر ہے اور ایسے خوابوں کی اس زمانہ میں کثرت تھی۔ بہر حال پورا عریضہ مع جواب آئندہ نمبر میں نذر ہو رہا ہے۔

(74)

م۔ ''بیان القرآن جلد 2 صفحہ 53 سے لے کر دور تک قصہ احد چلا گیا ہے اور جا بجا منافقین کا ذکر آتا گیا ہے۔ صفحہ 53 پر تفسیر کی پہلی ہی سطر میں یہ مضمون ہے کہ سرغنہ منافقین مع اپنے تین سو ساتھیوں کے میدان جنگ سے واپس چلا گیا، اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ اب لشکر میں کوئی منافق نہ تھا محض مومنین مخلصین ہی تھے لیکن آگے چل کر بار بار منافقین کا ذکر خاص میدان جنگ ہی کے سلسلہ میں آتا ہے۔ مثلاً صفحہ 61 سطر اوّل، صفحہ 62 پر مکرر، نیز صفحہ 64''۔

ا۔ منافقین کا تین سو ہی میں منحصر ہونا نہایت مستبعد ہے۔ یہ منافقین اکثر یہود تھے اور مدینہ میں ان کی کثرت معلوم ہے۔ تو تین سو کا جدا ہو جانا مستلزم اس کو نہیں کہ کوئی منافق باقی نہ رہا ہو، چنانچہ قطع نظر روایات کے خود قرآن مجید کی بعض آیات سے ان کی شرکت معلوم ہوتی ہے۔ کقولہ تعالیٰ ''اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَائِفَةً مِّنْكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ الآية''۔ باقی یہ کہ لوگ جدا کیوں نہیں ہوئے یا تو ان کو اتفاقاً موقع نہ ملا یا عمداً اس مصلحت سے رہ گئے ہوں کہ مسلمانوں کو موقع موقع برے مشورہ میں یا ان کے اسرار اپنی جماعت کو پہنچائیں جیسا دوسری آیتوں میں ان کی معیت بھی اور معیت کی یہ مصلحت بھی مصرح ہے۔ قال تعالیٰ فی سورۃ النساء ''اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ'' الآية وقال تعالیٰ فی سورۃ التوبۃ ''وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ''۔ اس لیے اجزائے قصہ میں کوئی تعارض نہیں۔

م۔ ''صفحہ 63 متن کی سطر آخر "ثُمَّ صَرَفَكُمْ" کے قبل ''اس لیے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے اپنی نصرت کو بند کرلیا''۔ یہ پورا فقرہ شرح وتفسیر کے اعتبار سے تو بیشک ضروری اور ہر طرح بالکل ہے لیکن اس کا جزو ترجمہ ہونا صفحہ 64 کے حاشیہ کے باوجود، پوری طرح دلنشین نہ ہوا۔ جو مقصد آنجناب کا ہے وہ تو شاید اُسے محض تفسیر رکھنے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

ا۔ میں نے مکرر غور کیا۔ اوّل وہلہ میں جزئیت کی ضرورت اس بنا پر معلوم ہوئی کہ ترجمہ سے حذف کر دینے کے بعد ترجمہ سے مطلب واضح نہ ہوگا مگر پھر یہ رائے ہوئی کہ اکابر دہلی کا ترجمہ دیکھ کر اس کا اتباع کیا جائے۔ سوان سب حضرات نے یہ مقدر نہیں نکالا، لہٰذا میں نے اپنے ترجمہ کے مسودہ میں بھی اور موجودہ کاپی میں بھی اس عبارت کو بجائے ترجمہ کے تفسیر بنادیا اور اوپر کے حصۂ ترجمہ سے اس کو کاٹ دیا اور عربی حاشیہ میں سے بنائے توجیہ کو کاٹ دیا اور آپ کو دعا دی۔

م۔ یہ عریضہ اصلاً ایک خاص غرض سے لکھ رہا ہوں۔ ختم نبوت پر عقلی حیثیت سے لکھنے کی بڑی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس ہو رہی ہے۔ متعدد انگریزی خوان ہندوؤں اور نیم ملحد مسلمانوں نے بیان کیا کہ اسلام کی خوبیوں کے ہم معتقد اور رسولؐ کی صداقت کے بھی قائل لیکن دل اسے قبول نہیں کرتا کہ ان کے بعد کبھی کوئی پیمبر نہ آئے اور سلسلہ ہدایت ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ درآنحالیکہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی ضرورتیں روز پیدا ہوتی رہتی ہیں اور اب تو دنیا کی گمراہی اُسی حد تک پہنچ چکی ہے جو آغاز اسلام کے وقت تھی۔ اب تو بدرجہ اولیٰ ضرورت ایک نئے پیغمبر کے ظہور کی ہے۔ یہ لب لباب ہے اس گروہ کے خیالات کا۔ ضرورت ہے کہ اس گروہ کی ہدایت کے لیے سلیس، عام فہم زبان میں کوئی رسالہ شائع کیا جائے۔ اگر جناب والا کی کسی تحریر میں اس جانب کچھ اشارہ ہو اور وہ یاد بھی پڑ جائے تو ازراہ کرم مطلع فرمایا جائے۔

ا۔ یاد نہیں آیا۔ اگر بعد میں خیال آ گیا اطلاع دے دوں گا۔

م۔ ضابطہ کا جواب کھلا ہوا تو یہی ہے کہ جب رسولؐ کو صادق مان لیا تو ان کے دعویٰ ختم نبوت کی تصدیق بھی لازمی ہے لیکن اتنے سے ان لوگوں کی تشفی نہ ہوگی۔ میری فہم ناقص میں دلائل ذیل آتے ہیں:-

(1) نبی کی حیثیتیں دو ہیں۔ ایک شخصی اور ایک تعلیمی یا تبلیغی شخصی یا ذاتی حیثیت سے تو آپؐ

63 سال کی عمر میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ تعلیمی یا تبلیغی حیثیت سے آپ بدستور زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اس لیے اب کسی جدید تعلیم وارشاد کی حاجت ہی نہیں۔

(2) اتمام نعمت اور اکمال دین کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس دین کے مستقبل کی جملہ ضروریات کی کفالت ہوگئی اور احکام وقواعد قیامت تک کے لیے مدون ہو گئے۔ اب جو بھی نیا مسئلہ پیش ہوگا اس کا حل اسی سے نکل آئے گا خواہ صراحتاً خواہ استنباطاً۔

ا۔ (چنانچہ حوادث جدیدہ پر علما کے فیصلوں سے یہ امر مشاہد ہے) یہ عبارت آپ کی اعانت کے لیے بڑھائی۔ جز عبارت بنانے کی خواہش مقصود نہیں۔

م۔ (3) اگلے انبیا کی تعلیم۔

ا۔ (خداوندی خاص حکمتوں کے سبب) ایضاً مثل بالا۔

م۔ ایک تو جامع نہیں ہوتی تھی، مخصوص اقوام وممالک تک محدود رہتی تھی۔ دوسرے اس کی محفوظیت کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ اب جب ایک ایسی کتاب موجود ہوگئی جس کی جامعیت ومحفوظیت دونوں مسلم ہیں تو پھر کسی جدید ہدایت کے کوئی معنی نہیں۔

(4)۔ علم الٰہی میں اس کا اندازہ ہوگا کہ اب دنیا کی اصل کسی زندہ شخصیت کے ذریعہ نہیں بلکہ محض تعلیم کے ذریعہ ہو سکے گی اور وہ تعلیم جوں کی توں اور برقرار ہے۔

ا۔ (جیسے قانون ساز حکما کی کوئی جماعت کسی مصلحت جامعہ سے کوئی قانون استمراری تجویز کر دیتی ہے جو بقائے سلطنت تک منسوخ نہ ہوگا، جیسے بنگال وپنجاب کے متعلق بعض قانون زمینداری کہ باوجودیکہ حالات میں کسی قدر تغیر وتبدل ضرور ہوتا ہے مگر بمقابلہ مصلحت کلیہ کے ایسے تغیرات کو معتد بہ دموثر نہیں سمجھا گیا)

حاشیہ مثل بالا۔

م۔ ان کے علاوہ اور جو امور مفید وضروری ہوں ان سے بھی رہنمائی فرمائی جائے۔

ا۔ ماشاء اللہ نہایت شافی وکافی تقریر ہے، جب اعتراض پڑھا تھا یہی جواب ذہن میں آیا تھا مگر عنوان ایسا عام فہم نہ تھا جو آپ کی تقریر میں ہے۔

م۔ یہاں ایک صاحب نے خواب میں دیکھا کہ آپ دریاباد تشریف لائے ہیں اور میرے

ہاں بیٹھے ہوئے میرے کسی ضخیم مسودہ کو غایت غور وانہاک سے ملاحظہ فرما رہے ہیں اور میں نے اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص آس پاس بھی نہ آنے پائے تا کہ یکسوئی میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو اور گھر میں تو عرصہ ہوا خواب دیکھ چکی ہیں کہ جناب نے دریاباد میں مستقل قیام فرمالیا ہے۔

ا۔آپ کی مجھ پر جو عنایت خاص ہے یہ سب خواب اس کی صورت مثالی ہیں۔اللہ تعالیٰ اس عنایت کا آپ کو صلہ عطا فرمائے۔

بوجہ ہجوم مشاغل جواب میں ایک روز کے انتظار کی آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی''۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے ورود تھانہ بھون کا ذکر ابھی پچھلے ہی نمبر میں حضرت کے قلم سے گزر چکا ہے۔اب ادھر سے اپنے حسب معمول الیلیے انداز میں میرے خط میں جو کچھ لکھ کر آیا ناممکن تھا کہ اسے میں حضرت کی خدمت میں نہ پیش کر دیتا۔خط بیکار تو کوئی بھی نہیں لیکن میرا یہ یکم ستمبر کا عریضہ کچھ امتیازی سی حیثیت رکھتا ہے۔واردات قلب کا تذکرہ موثر واثر انگیز کب نہیں ہوتا، بعض مرتبہ اور زیادہ ہی ہوتا ہے اور پھر وارد جب وقت نزع سے متعلق ہو تو اس کی اثر انگیزی کا کہنا ہی کیا!

اسی خط میں ایک فقہی جزئیہ کا بھی ذکر ملے گا اور کتابوں کے پارسل سے متعلق ایک جزئی سے بات پر حضرت کی سیرت عالی پر ایک کلی روشنی پڑ جاتی ہے۔ پھر میرے سفر ماہ ستمبر سے متعلق ایک لفظی لطیفہ! مولانا تو لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور مزاج لطیف کے بادشاہ تھے۔افسوس کہ ایک دنیا نے اپنے اندھے پن سے ایسے لطیف المزاج کو خشک مزاج وخشن قرار دیا۔

اس مفصل عریضہ سے دو ہی چار دن قبل اب خدا معلوم کس ضرورت سے ایک کارڈ بھی خدمت والا میں بھیجا تھا۔اس کارڈ کا اور مضمون کیا تھا،اس کے علم کا تو اب کوئی ذریعہ نہیں۔البتہ اس کی آخری سطر یہ تھی''۔مصارف پارسل کے باب میں خدا کرے استخارہ میرے موافق آیا ہو(1)۔اس پر حسب ذیل جواب لکھ کر اس کارڈ کا تراشہ میرے مفصل عریضہ کے ساتھ لفافہ کے اندر رکھا ہوا موصول ہوا:۔

(1) ملاحظہ ہو نمبر 73

''موافق ہی آیا مگر بواسطہ اس طرح سے کہ میں اور آپ ایک ہیں۔ جب میرے موافق آیا تو آپ ہی کے موافق آیا۔ یہ نکتہ ہے جس کا منشا محبت ہے۔ دوسری وجہ جو واقعات پر مبنی ہے، خط میں آیا ہے''۔

(75)

م۔''مولانا مناظر احسن صاحب کے تازہ عنایت نامہ کا ایک حصہ اس قابل نظر آیا کہ بے اختیار اس کی نقل خدمت والا میں بھیج دینے کو جی چاہا۔

ا۔اے وقت تو خوش کہ وقت ناخوش کردی۔

م۔وہو ہذا۔

''دیوبند اور تھانہ بھون میں حاضری دی...... تھانہ بھون کا حال کیا عرض کروں رات کو 11 بجے پہنچا۔ ایک دوسری مسجد میں اترا۔ صبح بعد نماز اس پیر محبوب کے آگے آیا۔ جو باین شیخوخت اپنے ہر ہر انداز میں صرف مظہر جمال تھا۔ عنایتوں کا عجیب وغریب سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ بڑی بڑی مہربانیاں، بڑی بڑی سرفرازیاں رہیں۔ کچھ علمی و قرآنی معاملات بھی پیش پڑے۔ فرط ادب نے حافظہ خراب کر دیا۔ بولنا چاہتا تھا مگر نہ بولا گیا۔ پھر بھی بہت کچھ تو پوچھ ہی لیا''۔

مولانا نے یہ سارے الفاظ گویا میری زبان سے چھین لیے۔

ا۔وہ ایک بات لکھنا بھول گئے وہ سب سے زیادہ مزیدار ہے۔ وہ یہ کہ میں نے ان سے چلتے وقت تعریضاً عرض کیا تھا کہ اب تو امید ہے کہ بھوت کا ڈر نکل گیا ہوگا۔ یہ اشارہ ہے ان کے اس والہانہ ارشاد کی طرف کہ جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے''۔

م۔حاضری کو بہت زمانہ ہوگیا۔ انشاء اللہ اس ماہ کے اندر مختصر حاضری کا قصد رکھتا ہوں۔

ا۔خدا تعالیٰ بخیریت ملا دے۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو حتی الامکان اس مصرع کو پیش نظر رکھیے۔

ع ستمبر(1) ضعیفان مسکین مکن

م۔آج اپنی ایک اندرونی کیفیت عرض کردوں، مدت سے سوچا کرتا تھا کہ بعد موت ہزار عیش وراحت سہی لیکن خود انفکاک روح کی گھڑی کس قدر سخت ہوگی۔ نفس یہ احساس کہ اب جان

---

(1) ستمبر کا مہینہ عموماً شدید بارشوں اور سیلابوں کا زمانہ ہوتا ہے۔

نکل رہی ہے بجائے خود کس قدر مولم ہوگا اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ مدتوں سے یہ خیال غالب تھا۔ ابھی دو چار دن کی بات ہے کہ حالت نوم میں ایک غیبی آواز یہ سنائی دی کہ ”کیا ہم اس پر قادر نہیں کہ احساس موت سے قبل ہی وقوع موت طاری کردیں اور جس وقت کے احساس سے گھبرا رہے ہو قبل اس کے کہ اس کا احساس ہو وہ وقت ہی گزر جائے“ خواب ہی میں بیحد مسرت ہوئی اور ہنستے مسکراتے ہوئے آنکھ کھل گئی۔

ا۔ بالکل اصول شرعیہ کے موافق جواب ہے اور بالکل باصواب ہے۔ مبارک ہو(1)۔

م۔ اب یہ بات موٹی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قبل اس کے کبھی ذہن میں نہیں آئی تھی۔ یوروپین ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ بجلی سے موت اس سرعت سے واقع ہوتی ہے کہ جسم کے جو اعصاب اذیت کا احساس دماغ تک پہنچاتے ہیں وہ ابھی اپنا کام کرنے بھی نہیں پاتے کہ احساس اذیت کا مادہ یعنی خود حیات ہی ختم ہوجاتی ہے۔ خیر ان لوگوں کی بات کا کیا اعتبار(2)۔

وہ کتابیں تو اب غالبًا ناظم ندوہ کے نام واپس جاچکی ہوں۔ واپسی کے محصول کی بابت میں منتظر ہی رہا۔

ا۔ واپسی میں دیر اس لیے ہوئی کہ میں نے وہ مضمون نقل کرالیا۔ ناقل نے دیر کی مگر الحمدللہ اب کتابیں واپس ہوگئیں۔ محصول کچھ زیادہ نہ تھا۔ دونوں طرف کا میں نے ہی ادا کردیا۔ یہاں سے تو پیڈ پارسل گیا اور وہاں جو محصول دیا گیا تھا خط میں اس کی اطلاع تھی کہ ایک روپیہ ساڑھے سات آنہ خرچ ہوا۔ میں نے بلٹی کے ساتھ ایک روپیہ آٹھ آنہ کے ٹکٹ بھیج دیے۔ واقعی یہ خرچ اس نفع کے مقابلہ میں ہیچ تھا جو اس مضمون سے ہوا یعنی انھوں نے اپنے مدعا کے لیے جن مقدمات سے کام لیا ہے ان مقدمات سے وہ مدعا تو ثابت نہیں ہوسکا بلکہ میں نے جا بجا بطور نوٹ کے اس کا جواب بھی مجملاً لکھ دیا ہے جس کی تفصیل خواہ میں کردوں یا کسی اور سے کرادوں لیکن خود مقدمات کے مضامین اس قدر نافع ہیں کہ ان سے رحمت کا استحضار، تطہیر اعمال کا اہتمام بجائے ہیبت وقبض

---

(1) اور اب یہ شعر اکبرالہ آبادی کا، عاشقانہ وعارفانہ رنگ کا، یاد آتا ہے ؎

احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد وفغاں میں کیا کرتا　　آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے جس وقت تہ خنجر تھا گلا

(2) یہ سارا ٹکڑا بغیر جواب کے رہا۔

کے انس وسط ایسا نصیب ہوا کہ واقعی ان کے مقابلہ میں لاکھ روپیہ بھی کم ہیں۔ میں آپ کا اور حضرات ندوہ کا دل سے شکر گزار ہوں۔

م۔ایک جوان عمر عزیز کا کان بچپن میں چھدا تھا۔غسل کرتے وقت وہ سوراخ میں بھیگی ہوئی سینک ڈال لیا کرتے تھے۔اب اس قصد سے کہ سوراخ رفتہ رفتہ بند ہوجائے، انھوں نے وہ سینک ڈالنا چھوڑ دی ہے۔البتہ پانی کی دھار اہتمام سے ڈال لیتے ہیں۔وہ دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ کافی ہے۔

ا۔فی الدرالمختار ولو لم یکن بثقب اذنه قرط فدخل الماء فیه ای الثقب عقد مروره علی اذنه اجزاه کسرة واذن دخلهما الماء ولا یدخل ادخله ولو باصبعه ولا یکلف بخشب وغیره المعتبر غلبة ظنه بالوصول. فی رد المختار قوله ولایتکلف ای بعد الامرار کما رواه عن شرح المنیة ۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ دھار ڈال لینا کافی ہے اور اگر دھار ڈالتے وقت انگلی سے بھی ذرا مل لیا کریں زیادہ احتیاط ہے۔ زیادہ وہم نہ کریں"۔

14 ستمبر کا عریضہ اصلاً تفسیر قرآن ہی سے متعلق ہے:-

م۔"بیان القرآن، جلد اوّل، صفحہ 129، لَاتُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا. سِرًّا کا ترجمہ مجھے ترجمہ وتفسیر دونوں میں نہیں ملا۔

ا۔سراً کا ترجمہ نکاح سے کیا گیا ہے اور یہ ترجمہ وتفسیر دونوں میں ہے اور ماخذ اس کا عربی حاشیہ میں بیضاوی سے نقل کیا ہے۔سرا نکاحا فانه عبر به اولا عن الوطی لانه یسر ثمه عن العقد لانه سبب فیه.

م۔صفحہ 13۔مَتِّعُوْهُنَّ اور مَتَاعاً کا ترجمہ "جوڑا دینے" اور "جوڑا" سے میری فہم ناقص میں نہ آیا۔حواشی میں تو بیشک تصریحات فقہا کا اتباع ہونا چاہیے۔لیکن سوال اس کے جز ترجمہ بنانے کا ہے۔متاع کا لفظ لغت میں عام ہے۔راغب کے مفردات القرآن میں ہے۔ المتاع والمتعة ما یعطی المطلقة لتنتفع به مدة عدتها.

اکابر مترجمین اردو نے بھی اسے عام ہی رکھا ہے۔

بہرہ دہند............بہرہ دادن		حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی
فائدہ دو...........فائدہ دینا		حضرت شاہ رفیع الدینؒ
خرچ دو........... خرچ		حضرت شاہ عبدالقادرؒ
ایضاً		حضرت شیخ الہندؒ

ا۔میں نے مراد کے ساتھ ترجمہ کر دیا ہے اس میں بھی گنجائش ہے۔جیسا خرچ سے ترجمہ بھی حاصل ہے ترجمہ سے۔خرچ اس کے لغوی معنی نہیں۔ترجمہ بالحاصل ہی ہے لیکن لغوی ترجمہ اولیٰ ہے۔اب یوں بدل دینے کا ارادہ ہے۔

''اور ان کے ساتھ (ایک خاص طور کا) کچھ سلوک کر دو (مراد ایک جوڑا دینا ہے) صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے۔(ایسا) سلوک کرنا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر''۔

اسی کے موافق تفسیر میں بنا دیا گیا اور تفسیر میں فائدہ کے مسئلہ دوم کے اخیر میں بعد ''خود واجب ہوتا ہے'' کے عبارت ذیل بڑھادی گئی۔قال الزیلعی فی نصب الرایۃ اخرجہ البیھقی عن ابن عباس۔

م۔ارادہ ہے کہ انشاءاللہ اب کی............(1) تھانہ بھون 11 بجے شب کو پہنچوں۔شب اسٹیشن ہی پر مسافر خانہ میں گزار دوں(2)۔ڈھائی دن حاضر خدمت رہ کر دوشنبہ کے سہ پہر کو اجازت چاہوں۔

ا۔بہت مسرت ہوئی۔تشریف آوری کے وقت یاد رہنے کے لیے یہ پرچہ جدا کر کے پاس رکھ لیا۔بدوں اس کے بھول جانے کا قوی احتمال تھا۔حافظہ قوی نہیں رہا۔دعا کیجیے یہ ضعف اس کام میں آئے کہ غیر مقصود کو بھول جاؤں(3)۔

حکایت لطیفہ۔ناظم صاحب ندوہ نے ایک روپیہ ساڑھے آٹھ آنہ کے ٹکٹ واپس فرمائے

---

(1) یہ سطر جس میں دن تاریخ وقت سفر درج تھا، حضرت نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لی۔(2) یہ نیا مسافر خانہ حضرت ہی کا تعمیر کرایا ہوا تھا۔(3) سبحان اللہ! کیسی وجد آفریں یہ حکیمانہ دعا رفانہ دعا ہے۔

اور لکھا کہ مولانا عبدالماجد صاحب یہ مصارف پہلے ہی ادا کر چکے ہیں۔ حکایت تو ہو چکی اور لطیف
اس لیے ہے کہ میری طرح ناظم صاحب بھی باوجود شباب کے ضعیف الحافظہ ہیں کہ جب کتاب کی
رسید کارڈ پر لکھی اس وقت ٹکٹوں کا ذکر لکھنا یاد نہیں رہا حالانکہ بلٹی ہی کے لفافہ میں ٹکٹ گئے تھے۔
خیر مجھ کو اپنے ضعف حافظہ کا افسوس نہیں رہا یا یہ آپ کی کرامت ہو۔ جو بھی ہو میرا ایک روپیہ
ساڑھے آٹھ آنہ کا فائدہ ہو گیا، جو دو بزرگوں کا عطیہ ہونے سے متبرک بن گیا۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست''

(76)

اب چودہ برس کے بعد 48 میں یہ خیال تو کہاں، کہ روانگی کس تاریخ کو ہوئی اور واپسی
کب، بہر حال ستمبر کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ میں مختصر حاضری حسب ارادہ جا کر دے آیا(1) اور نہ
اب ملفوظات کا کوئی سا بھی جز حافظہ میں ہے۔ لے دے کے خط 29 ستمبر کا ہے۔ مدت سے خیال
یہ تھا اور توریت وانجیل کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بہت قوی ہو گیا کہ توریت کی ابتدائی پانچ
کتابوں میں تو خیر لیکن عہد عتیق کا باقی حصہ اور عہد جدید تمام تر، یقیناً تنزیل لفظی نہیں، صرف معنوی
حیثیت سے انھیں منزل من اللہ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی طرح ان کی لفظی تنزیل کا عقیدہ خدا
معلوم مسلمانوں میں کیسے پیدا ہو گیا۔ شاید قرآن ہی پر قیاس کر کے سمجھ لیا ہو۔ بہر حال حضرت کی
خدمت میں اسی خط میں ڈرتے ڈرتے اپنے اس خیال کو بھی پیش کر دیا، علمائے امت کے جمود پر
نظر کر کے اس سے زیادہ کھل کر لکھنے کی اس وقت ہمت نہ ہوئی۔ بہر حال عریضہ حسب ذیل ہے:-

م۔''بارہا کا تجربہ ہے کہ آدھ گھنٹہ کی بھی حاضری میں سارے سفر کی محنت وصول ہو جاتی
ہے۔ یہی معاملہ اب کی بھی رہا اور یوں سیری تو مہینوں کے قیام سے بھی نہیں ہوتی۔

ا۔ میری بھی یہی حالت ہے۔

م۔ عام طور سے مسلمانوں میں یہ جو عقیدہ شائع ہے کہ توریت وانجیل وغیرہ میں قرآن مجید
ہی کی طرح کلام الٰہی ہیں۔ آخر اس کی شرعی بنیاد کیا ہے؟ ان کے نفس منزل من اللہ ہونے میں

---

(1) صرف اتنا یاد ہے کہ پہنچنے پر شب کو قیام اسٹیشن پر نہیں ہوا تھا۔ حضرت کے ایک خادم آ گئے تھے اور ان کی رہنمائی
میں قیام جا کر حضرت ہی کے ایک مکان میں ہوا تھا۔

گفتگو نہیں۔ گفتگو صرف یہ ہے کہ مثل قرآن کے ان کے بھی لفظ بلفظ منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ قرآن یا حدیث میں کہاں کیا گیا ہے؟ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ ان کا نزول صرف اجمالی حیثیت سے ہوا، یعنی بلحاظ معانی و مطالب، بجز توریت کے ان احکام کے جن کے بصورت الواح نازل ہونے کی صراحت قرآن مجید میں آچکی ہے۔ تفصیلی یعنی لفظی وحرفی تنزیل صرف قرآن مجید کی ہوئی ہے۔ میں نے یہ رائے مستقلاً قائم نہیں کر لی ہے لیکن ان کتب سابقہ کی شدید ترین کمزوریاں دیکھ دیکھ کر خیال یہی پیدا ہو رہا ہے اور استفادتاً یہ سوال خدمت والا میں پیش کر رہا ہوں۔

توریت وغیرہ تو پھر غنیمت ہیں، سب سے زیادہ کمزور اور بے سند تو مجھے انجیل نظر آتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں دہریت و مادیت کا زور اتنا کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسے بودے اور کمزور مذہب سے بغاوت تو لازمی تھی اور افسوس ان بیچاروں پر ہوتا ہے کہ یہ مسیحیت کو نفس مذہب کا نمائندہ سمجھ کر اور قرآن کو انجیل پر قیاس کر کے تحقیق اسلام کی طرف سے بے فکر ہو گئے ہیں۔

ا۔ اسی سوچ میں جواب میں بھی کئی روز کی تاخیر ہو گئی۔ آیات کو بہت سوچا، کوئی آیت ذہن میں نہیں آئی جو اس بات میں اثباتاً یا نفیاً نص ہو۔ تو جس طرح اثبات کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، اسی طرح نفی کا دعویٰ بھی نہیں ہو سکتا۔ دونوں احتمال برابر ہیں۔ ممکن ہے کہ الفاظ نازل ہوئے ہوں اور ممکن ہے کہ معانی نازل ہوئے ہوں اور الفاظ موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کے ہوں گو وہ محفوظ نہ رہے ہوں تو اس باب میں ان کا درجہ حدیث کا سا ہوگا اور اس کی بھی کہیں تصریح نہیں کہ الواح غیر ہیں تورات کے، بلکہ ظاہراً الواح (1) میں تورات ہی تھی۔ اگر اس ظاہر کو کافی سمجھا جائے تو توراۃ کی تو لفظی تنزیل ایک درجہ میں ثابت ہو جائے گی۔ اگر کسی وقت اس سے زیادہ کوئی بات ذہن میں آئے گی، عرض کر دوں گا''۔

بیسویں صدی عیسوی کے مفسر قرآن کو بعض ایسی دشواریاں پیش آنے لگی ہیں جن کا اندازہ

---

(1) وبه الظهور سياق الروايات التي اوردها في الدر المنثور باسانيد مختلفة في تفسير قوله وكتبنا له في الالواح من كل شي موعظة وتفصيلا لكل شي يفهم منها اتحاد التوراة والالواح اخرجها ما اخرجه عن ابن ابي حاتم عن ابن عباس قال اعطى موسى التوراة في سبعة الواح من زبرجد فيها بيان كل شي وموعظة الخ

بھی قدیم مفسر حضرات کو نہیں ہوسکتا تھا۔ پہلے کلامی حیثیت سے ایک میدان فلسفہ یا معقولات کا تھا اور اس سے مراد فلسفہ یونان ہوتا تھا۔ توحید، صفات باری، حشر ونشر، خرق عادت کی قسم کے مسائل اسی معیار سے زیر بحث رہا کرتے تھے۔ اب زمانہ نے نئے نئے معیار تاریخ وجغرافیہ کے بھی پیدا کردیے۔ اب مفسر کو اگر کلامی حیثیت سے کامیاب ہونا ہے تو تاریخ اور جغرافیہ دونوں پر اس کی نظر کا وسیع اور گہرا ہونا لازمی ہے۔ 9/ اکتوبر کے نیاز نامہ میں ایک تاریخی اشکال پر خاص طور پر توجہ دلانا تھا۔ نیز توریت وانجیل کی نوعیت تنزیل پر بھی مزید معروضات پیش کرنے تھے اور بعض دوسرے موضوع ان کے علاوہ۔ اب مکتوب ملاحظہ ہو:-

م۔ ''بیان القرآن جلد 3، ص 14 سطر 2۔ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ میں سوف کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ واقعی رہ گیا، اب بنادیا ہے۔ ترجمہ میں تو بعد لفظ اور کے عنقریب بڑھادیا ہے اور تفسیر میں اور کے بعد عنقریب اور آخرت میں کے بعد یہ عبارت کہ وہ بھی قریب ہی ہے۔ بین القوسین بڑھا دیا ہے اور چونکہ اس جلد کی کاپی چھپنے گئی ہے اس کو خاص یادداشت میں لکھوادیا ہے۔ اخیر میں بحوالہ مقام لکھوادیا جائے گا۔

م۔ صفحہ 20، سطر 3 میں یہ عبارت ملی:-

''تم کو صاحب ملک بنادیا چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہوچکے ہو''۔ اس پر یورپ کا اعتراض ہے کہ قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بنی اسرائیل کو بادشاہ (ملوکا) کہلا دیا، حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ بادشاہت انھیں اس وقت نہیں، بہت بعد کو ملی تھی۔

میری فہم ناقص میں جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کی تفسیر اگر آزاد وخودمختار ہوجانے سے کی جائے تو یہ اعتراض از خود ساقط ہوجاتا ہے۔ مصر پر اسرائیلیوں کا فی الفور قبضہ تاریخ سے بالکل ثابت نہیں ہوتا بلکہ فرعونیوں کی غرقابی کے بعد انھوں نے اپنا سفر مشرق کی جانب بدستور جاری رکھا اور بجائے مصر کی طرف واپس ہونے کے وادئ سینا ہی کی طرف بڑھتے گئے۔

ابن جریر میں کئی روایتوں کی تائید سے جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کی تفسیر میں لکھا ہے۔ سخر لکم من غیر کم خدماً یخدمونکم۔ اور میرے دل کو سب سے زیادہ یہ روایت لگی، عن سفیان

بن وکیع قال کانت بنو اسرائیل اذا کان للرجل منهم بیت و امراۃ وخادم عد ملکا۔اس تفسیر پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔کشاف میں بھی ملک کے کئی معنی، علاوہ اصطلاحی بادشاہی کے دیے ہیں۔مثلاً من لہ مال لایحتاج معہ الی تکلف الاعمال وتحمل المشاق۔فارغ البالی وآسودہ حالی کی یہ نعمت بیشک مصر سے نکلتے ہی حاصل ہوگئی تھی۔

ا۔ان حضرات مفسرین نے جو تفسیر لکھی ہے وہ بھی بجائے خود صحیح ہے مگر عند التحقیق یہ سب معانی مجازی ہی ہیں کما صرح بہ صاحب روح المعانی بعد نقل ہٰذہ الاقوال۔اور میں نے جو تفسیر اختیار کی ہے وہ حقیقت ہے اور بدوں تعذر کے حقیقت کو نہیں چھوڑا جاتا اور یہاں کوئی تعذر نہیں کیونکہ آیت میں یا تفسیر میں یہ کہیں نہیں کہ غرق فرعون کے بعد متصل ہی اس پر قابض ہوگئے تھے اس لیے تعارض تاریخی کا اشکال واقع نہیں ہوتا۔اگر لفظ ابھی سے شبہ ہو تو ابھی زمانہ قریب کے لیے آتا ہے اور قرب وبعد کا مدار عرف پر ہے۔شام پر جہاد کا حکم ہونے سے پہلے قبضہ ہوجانا باعتبار فتح شام کے قریب کہا جاسکتا ہے اور مصر پر قبضہ خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کما یدل علیہ قولہ تعالٰی بنی اسرائیل فاراد (فرعون) ان یستفزھم من الارض (وھی ارض مصر قطعا) فاغرقناہ ومن معہ جمیعا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض (المذکور)(1)

بس ترتیب واقعات کی بلاغبار یوں ہوسکتی ہے کہ غرق فرعون کے بعد فوراً مصر کو واپس نہیں ہوئے، آگے بڑھتے چلے گئے۔عطائے توریت وغیرہ کے بعد مصر پر قابض ہوئے لایتین المذکورتین انفاً۔پھر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کا آبائی وطن ملک شام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اوّل ہجرت فرما کر آرہے تھے ان کو دیں اس وقت وہاں عمالقہ کی حکومت تھی الخ۔یہ آیتیں جن میں جعلکم ملوکاً آیا ہے اس موقع کی ہیں جب وہ مامور بجہاد العمالقہ ہوئے اور اس سے پہلے مصر پر قابض ہوگئے۔بس میرا یہ کہنا تفسیر میں صحیح ہوا کہ ملک فرعون پر ابھی قابض ہوچکے ہو یعنی جس وقت اس جہاد کا حکم ہورہا ہے اس سے قبل زمانہ قرب میں الخ۔بس اب کوئی

---

(1) قریباً من القطع وقولہ تعالٰی فی الشعراء بعد قولہ فاخرجناھم واورثناھم بنی اسرائیل فھو نص فی استیلاء بنی اسرائیل علٰی ملک فرعون، نیز سوال میں بھی بہت بعد سلطنت ملنا تسلیم کرلیا گیا ہے۔

اشکال نہیں رہا۔ یہ سب صحت تاریخ کی تسلیم کے بعد ہے ورنہ قصہ اور بھی سہل ہے۔ واللہ اعلم۔ اگر اب بھی کوئی شبہ ہو بے تکلف ظاہر فرمایا جائے۔ میں نے مدت ہوئی یہی ترتیب کئی سال پہلے اپنے رسالہ الترتیب اللطیف میں لکھ دی ہے"۔

اب اس پر میں یہ کیا عرض کرتا کہ اس ترتیب واقعات کا ساتھ تو تاریخ کسی حد تک بھی نہیں دے رہی ہے۔ جہاد شام کا حکم تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلتے ہی اور آزاد و خود مختار ہوتے ہی وادیٔ سینا میں مل گیا تھا اور مصر پر قبضہ تو کئی صدیوں بعد جا کر حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوا ہے۔

(77)

مکتوب ابھی ختم نہیں ہوا آگے چلا جا رہا ہے۔ پچھلے نمبر سے ملا کر پڑھیے۔

"تتمہ جواب سابق متعلق اتحاد توریت والواح۔ اس کی تائید ایک آیت سے بھی ہوئی۔ **قال تعالٰی و کتبنا علیھم فیھا (ای فی التوراة) ان النفس بالنفس الخ** ۔ یہاں سے توریت کا مکتوب ہونا ثابت ہوتا ہے اور پہلی آیت سے الواح کا مکتوب ہونا بس ظاہر یہی ہے کہ دونوں متحد ہیں۔ واللہ اعلم۔

م۔ نصاریٰ و یہود کی کتاب مقدس (بائبل) کی فہرست صحائف کا نقشہ ارسال خدمت ہے(1)

توریت کا اطلاع عہد عتیق کے زیادہ سے زیادہ ابتدائی صحائف خمسہ پر ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا انجیل کا اطلاق بہت کھینچ تان کے بعد عہد جدید کے ابتدائی صحائف اربعہ پر۔ کھینچ تان میں نے یوں کہا کہ خود ان اناجیل اربعہ میں ایک جگہ بھی اپنے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ نہیں۔ نہ تنزیل معنوی کا نہ تنزیل لفظی کا۔ یہ اناجیل اربعہ (اور یہی اناجیل کثیرہ میں سے مستند ترین ہیں) بھی حضرت مسیحؑ کا کلام نہیں بلکہ آپ کے متعلق روایات اور آپ کے کچھ ملفوظات کا مجموعہ ہیں، جو آپ کے بعد آپ کے دو صحابیوں اور دو تابعین نے اپنے اپنے طور پر مرتب کر دیے ہیں، ان کتابوں کا دعویٰ اپنے متعلق صرف اسی قدر ہے۔ مسلمان مناظر کے لیے بڑی مشکل کا مقام ہے، اسے ان کتابوں کا وہ احترام و تقدس ملحوظ رکھنا ہوتا ہے جس کے مدعی خود عیسائی بھی ہرگز نہیں۔ رہی محفوظیت تو اس بارہ

---

(1) ملاحظہ ہو نمبر 76۔

میں ان کتابوں کو قرآن مجید سے دور کی بھی نسبت نہیں۔

ا۔ یہ حقیقت میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئی۔ آپ خود سمجھ کر فوائد میں لکھ دیجیے۔ البتہ اگر وہ اشکال صاف بتلایا جائے جو مسلمان مناظر کو کسی دلیل صحیحہ کے تعارض سے پیش آتا ہے تو میں اس میں مکرر غور کر کے کچھ عرض کر سکوں۔

م۔ گھر میں خواب یہ دیکھا کہ جیسے حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا ہے۔ خواب کا کوئی جز بھی تفصیلاً یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد رہ گیا کہ جیسے اللہ میاں کو دیکھ لیا تھا۔

ا۔ مبارک ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے جس کی حقیقت غامض ہے۔ اگر کوئی سوال ہوتا تو غالباً کچھ عرض کر سکتا۔

فرصت کی کمی سے جواب میں دیر ہوئی''۔

تفسیر کے ان دونوں اشکالات یعنی ایک تو وہی تاریخی اشکال بنی اسرائیل کی حکومت مصر سے متعلق، دوسرا کلامی اشکال توریت وانجیل کے درجۂ تنزیل سے متعلق، بار بار کہنا اور کھل کر کہنا سوءِ ادب کا پہلو رکھتا تھا۔ پھر بھی ایک بار ادر ذرا بسط وتفصیل سے عرض کرنے کی ہمت کر لی۔ یہ 24 اکتوبر کا نیاز نامہ مع جواب ضخامت کے لحاظ سے مکتوب نہیں ایک رسالچہ ہے:

م۔ ''پچھلے والا نامہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مصر پر قبضۂ بنی اسرائیل خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے۔ **فی الشعراء بعد قوله فاخرجناهم واورثناها بنی اسرائیل فهو نص استيلاء بنی اسرائیل علٰی ملک فرعون.**

بہ ادب گزارش ہے کہ اس بارہ میں اس کا نص ہونا ہی تو محل گفتگو ہے۔ اورثناها میں ها کی تفسیر یہ بھی تو ممکن ہے کہ جنات وعیون وکنوز مطلق صورت میں مراد لیے جائیں نہ کہ خاص فرعونیوں ہی کے جنات وعیون وکنوز۔ چنانچہ شام میں یہ سب چیزیں مل کر رہیں۔ پہلی تفسیر پر تاریخی حیثیت سے سخت اشکال وارد ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کی بادشاہت اور حکومت ملک فرعون پر، صدیوں بعد تک، تاریخ سے بدرجۂ ضعیف بھی ثابت نہیں۔ تفسیر حقانی کی ایک عبارت سے میرے مفہوم کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔ اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:

''اس مقام پر اکثر لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے کہ اورثناها بنی اسرائیل میں ها کی ضمیر کو فرعونیوں

کے خاص جنات وعیون و کنوز ومقام کریم کی طرف پھرایا ہے اور اس کی تفسیر میں کہہ دیا ہے کہ فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد ان کے باغوں اور عمدہ مقامات کے بنی اسرائیل پھر لوٹ کر مالک ہو گئے تھے، حالانکہ یہ بات نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ تمام اہل تاریخ اس پر متفق ہیں کہ دریائے قلزم کو عبور کر کے بنی اسرائیل چالیس برس تک تیہ میں ٹکراتے پھرے۔ مصر میں واپس نہ آئے اور نیز اس فرعون کے بعد دوسرا فرعون تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کی سلطنت کا خاتمہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھ سے سیکڑوں برس بعد ہوا۔ صحیح توجیہ جیسا کہ بیضاوی فرماتے ہیں یہ ہے، کذالک اومثل ذالک المقام الذی کان لهم علی انه صفة مقام۔ اس تقدیر پر یہ معنی صاف ہو گئے کہ ایسے مقامات کا ہم نے بنی اسرائیل کو وارث یعنی مالک کر دیا۔ یعنی ملک شام و فلسطین میں ہم نے ان کو بھی ایسے ہی عمدہ مقامات اور باغ اور چشمے اور خزانے عطا کیے جیسا کہ فرعون کے پاس تھے۔ خلاصہ یہ کہ ان عمدہ مقامات سے ان کو نکالا اور ایسے عمدہ مقامات بنی اسرائیل کو عطا کیے"۔

یہ عبارت متن حقانی کی تھی۔ ایک طویل حاشیہ میں اسی مضمون کی اور زیادہ صراحت کی ہے۔

ا۔الجواب فی روح المعانی قوله فی البقرة اهبطوا مصرًا. حکی عن اشهب انه قال لی مالک هی مصر مسکن فرعون فیه اذا علم واسماء المواضع قد تغیر من حیث المکانیة فتذکر وقد تغیر من حیث الارضیة فونثت فهو ان جعل علما باما باعتبار کونه بلدة فانصرف مع العلمیة والتانیث بسکون الوسط واما باعتبار کونه بلداً فانصرف علی بابه اذا الفرعیة الواحدیة لاتکفی فی متعدد یوبه ما قاله الامام مالکؒ فی مصحف ابن مسعود ومصر بلا الف بعد الراء (وفیه) قوله تعالیٰ فی بنی اسرائیل فاراد ان یستفزهم من الارض ای ارض مصر التی هم فیها او من جمیع الارض ویلزمهم اخراجهم من ذلک قتلهم واستیصالهم الی قوله تعالیٰ اسکنوا الارض الّتی اراد ان یستفزهم منها وهی ارض مصر وهذا ظاهر ان لبت انهم دخلوها بعد ان خرجوا منها واتبعهم فرعون وجنوده فاغرقوا وان لم یثبت فالمراد من بنی اسرائیل ذریة اولٰئک

الـذيـن اراد فرعون استفزاء هم واختار غير واحد ان المراد من الارض الارض المـقـدسة وهـى ارض شـام (وفيـه) سـورة الشعراء قوله تعالىٰ واورثناها بنى اسـرائيـل قـال الـواحـدى ان الـلـه تعالى رد بنى اسرائيل الىٰ مصـر بعد ما اغرق فـرعـون وقـومـه فـاعـطـاهـم جـمـيـع مـا كـان لقوم فرعون من الاموال والعقار والـمسـاكن الىٰ ان قال وما ذكر عن الواحدى من ان الله تعالىٰ رد بنى اسرائيل الىٰ مـصـر بـعـد ما اغرق فرعون وقومه ظاهره وقو ع ذٰلک بعد الغرق من غير تـطـاول مدة واظهر منه فى هٰذا ماروى عن الحسن قال كما عبروا البحر رجعوا وورثـوا امـوال الـقـبـط وذهب الباقون موسٰى عليه السلام الىٰ ارض الشام وقيل انهـم بـعـد مـا جـاوزواالبحر ذهبوا الى الشام ولم يدخلوا مصـر فى حيٰوة موسىٰ عـليـه الـسـلام ومـلـكـوها زمن سليمان عليه السلام والمذكور فى التوراة التى بـايـدى اليهـود الـيـوم صـريـح فى انهم بعد ان جاوزوا البحر توجهوا الىٰ ارض الشـام وقد فصلت قصة ذهابهم اليها واكثر التواريخ علىٰ هٰذا وظواهر كثير من الأيـات تـقـتـضـى مـا ذكـره الـواحـدى والله اعلم (قلت ومع الواحدى الحسن وبـعـض الكتب (وفيه) سورة الدخان قوله تعالىٰ واورثناها قوما آخرين والمراد بالقوم الأخرين بنو اسرائيل وهم مغائرون للقبط جنسـا ودينا ويفسر ذٰلک قوله تـعـالىٰ فى سورة شعراء كذالک اورثناها وهو ظاهر فى ان بنى اسـرائـيل رجعوا الىٰ مـصـر بـعد هلاک فرعون وملكوها وبه قال الحسن وقيل المراد بهم غير بـنـى اسـرائيل ممن ملک مصر بعد هلاک القبط واليه ذهب قتادة قال لم يرو فى مشـهور الـتـواريخ ان بنى اسـرائيل رجعوا الىٰ مصر ولا انهم ملكوها قط واول مـا فـى سـورة الشعراء بانه من باب و ما يعمر من معمر الا ينقص من عمره وقـولـک عـنـدى درهـم ونـصـفه فليس المراد خصوص ماتركوه بل نوعه ولم يشبهـه ولايراث الاعطاء وقيل المراد من ايراثها ايام تـمكينهم من التصـرف فيها ولا يتـوقف ذٰلک عـلـٰى رجـوعـهـم الىٰ مصر كما كانوا فيها اولاً واخذ جمع

يقول الحسن وقالوا لا اعتبار بالتواريخ ولذٰلک الكتب التی بيد اليهود اليوم لها ان الكذب وفيها كثير وحسبنا كتاب الله تعالٰى وهو سبحانه اصدق القائلين وكتابه جل وعلا مامون من تحريف المحرفين.

ان عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس باب میں اقوال مختلف ہیں اور ان کے راجح ومرجوح ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ میری تفسیر بعض اقوال پر مبنی ہے جس میں امام مالک اور واحدی اور حسن بھی متفق ہیں اور صاحب روح نے ظاہر الفاظ آیات کا مدلول اسی کو قرار دیا ہے اور تاریخ یہود کی حجیت کا انکار کیا ہے مگر ظاہر کا نص ہونا لازم نہیں۔ اس لیے دوسرے قول کی بھی گنجائش ہے۔ اگر دوسرے قول کو لیا جائے تو جعلکم ملوکا کا حمل مجاز پر ضروری ہے۔ میرے نزدیک فیصلہ یہ ہے کہ اپنے لیے تو مالک اور حسن کا قول لینا احسن ہے اور مخالفین کے لیے قتادہ کا قول لینا مناسب ہے۔ اب دونوں راہیں کشادہ ہیں۔ میں نے سابق جواب مجمل طور پر آیات کو دیکھ کر لکھ دیا تھا ان کو ظاہر پر محمول کر کے اور اس وقت تفاسیر کو دیکھ کر کسی قدر مفصل لکھا گیا۔ واللہ اعلم"۔

(78)

طویل عریضہ اب بھی ختم نہیں ہوا۔ کئی اہم مسئلے باقی رہ گئے۔ وہ سب اس نمبر میں ملاحظہ ہوں:

م۔ "وحی قرآنی اور دوسری کتب آسمانی سے متعلق پچھلے عریضہ میں جو کچھ عرض کیا تھا اس سلسلہ میں ایک بات اور ذہن میں آئی۔ آیات قرآنی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآنی کے لیے قرآن مجید میں مصدر تنزیل آیا ہے اور دوسری کتابوں کے لیے عموماً انزال یا اتیان۔ اگر کہیں لغت سے اس کی سند مل جائے کہ انزال عام ہے جو ہر القا کے لیے۔ اور تنزیل مخصوص ہے وحی لفظی کے لیے تو مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جائے۔

ا۔ شاید تلاش سے مل جائے باقی مشہور فرق تو یہ ہے کہ تفصیل تدریج کے لیے ہے اور افعال عام ہے۔ قرآن مجید چونکہ تدریجاً نازل ہوا اس لیے اس کے لیے باب تنزیل وارد کیا گیا بخلاف دیگر کتب کے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی پر مبنی ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذَالِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلاً ۔ دوسرے انزال

جب دونوں کو عام ہے تو اس سے وحی لفظی کا جیسے اثبات نہیں ہوتا اس کی نفی بھی نہیں ہوتی اور خط سابق میں کَتَبْنَا کا الواح و تورات ہر دو میں آنا لکھ چکا ہوں۔ واللہ اعلم۔

م۔ شملہ میں کچھ انگریزی داں مسلمانوں نے مجلس قرآنی کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے بظاہر خوش عقیدہ اہل سنت معلوم ہوتے ہیں۔ ہمت کر کے انگریزی میں ترجمہ کلام پاک مع حواشی پارہ اوّل شائع کر دیا ہے۔ خبر سے تو بڑی خوشی ہوئی تھی مگر پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ حسن نیت کا اجر جتنا بھی کما لیں، باقی کام کام کی حیثیت سے بہت پست ہوا ہے۔ ایک تو انگریزی غلط سلط، دوسرے خود قرآن کے سمجھنے میں ترکیب نحوی نہ سمجھنے سے بڑی غلطیاں کی ہیں، تیسرے حواشی میں مخاطبین کے مذاق کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ افراط عقیدت سے کام لے کر رطب و یابس سب ہی کچھ نقل کر دیا ہے۔ مولوی محمد علی لاہوری کے بالکل برعکس (یہ سرسید سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر ہیں کہ مسئلہ بجائے خود کیسا ہی کمزور ہو لیکن بیان اس انداز سے کریں گے کہ انگریزی خوانوں کے دل میں اتر جائے) یہ مترجم حضرات قصص الانبیا کی روایتیں نقل کرتے چلے گئے ہیں۔

ا۔ افسوس ہوا۔ اگر نرم شفقت کے لہجہ میں ان کو ایک خط لکھ دیا جائے تو شاید اصلاح ہو جائے۔

م۔ ایک انگریز کا یہ اعتراض ابھی علم میں آیا کہ سورۃ الفتح میں بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ میں ضمیرۃ کا اعراب بالضم غلط ہے، بالکسر ہونا چاہیے۔ مسلمان نحوی محض قرآن کے احترام میں خاموش ہیں۔ سرسری جواب میرے ذہن میں یہ آیا ہے کہ قرأت جمہور پر تو یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ تفسیر شوکانی میں ہے قرأ الجمهور عليه بكسر الهاء وقرأ حفص ازهری بضمها۔ لیکن ضرورت اس سے شافی تر جواب کی ہے اور قواعد نحوی میں میری نگاہ نہایت قاصر ہے۔

ا۔ میری بھی نحو میں زیادہ نظر نہیں مگر کسی نحوی ماہر سے مراجعت ضروری ہے۔ اس وقت سرسری طور پر روح المعانی سے مختصراً نقل کیے دیتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ کافی تو ہے۔ وھو ہذا۔

قرأ الجمهور عليه بكسرا لهاء كما هو الشائع وضمها حفص هنا. قيل وجه الضم انها ها وهو وهي مضمومة فاه تحصب ذلک كما في له وضربه ووجهه الكسر رعاية الياء وكذا في اليه وفيه وكذا في ما اذا كان قبلها كسرة

نحوية و مررت بغلامه لثقل الانتقال من الكسر الى الضم وحسن الضم فى الآية التوصل به الى تفخيم لفظ الجلالة الملائم لتفخيم امر العهد المشعر به الكلام وايضاً ابقاء ما كان على ما كان ملائم للوفاء بالعهد وعدم نقضه الخ. قلت قوله الملائم لتفخيم امر بالعهد الخ لطيفه محضه لادخل لها فى التوجيه.

اور قرات سب متواتر ہیں۔ حفص کا تفرد اس میں قادح نہیں اور متواتر کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اور بیچارہ انگریز نحو وادب اہل لسان کے مقابلہ میں کیا جانے اور وہ سرسری جواب اس لیے کافی نہیں کہ اس سے حفص کی تغلیط نقل لازم آتی ہے جس میں تواتر کا انکار ہے نیز علیہم میں دوسرے قرّا نے جو جمہور میں داخل ہیں بضم ہا پڑھا ہے تو کیا وہاں ان کی تغلیط کریں گے۔ سب قرّا متواتر کے راوی ہیں۔ محض اجتہاد سے نہیں پڑھتے۔

م۔ پچھلے خط میں میں نے عرض کیا تھا کہ گھر میں خواب میں دیکھا کہ جیسے حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوئی۔ جاگنے پر تفصیل یاد نہ رہی۔ اس پر ارشاد ہوا تھا کہ ''مبارک ہو۔ ایسا ممکن ہے جس کی حقیقت غامض ہے۔ اگر کوئی سوال ہوتا تو غالبًا کچھ عرض کر سکتا''۔ سوال اب عرض کرتا ہوں، اگر یہ طویل عریضہ بار خاطر نہ ہو چکا ہو تو مختصراً اس خواب کی حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے۔

ا۔ یہ تجلی مثالی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو بصورت نار ہوئی اور جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں احسن صورت میں ہوئی۔ غیر محقق صوفی اس میں اتحاد یا حلول کے قائل ہو گئے اور محققین اس کو تجلی وظہور اور اس صورت کو مظہر کہتے ہیں جس کی حقیقت **ظهور شئ فى شئ متناسب له فى صفة مع بقاء ه على حقيقته و صفته الاصلية**۔ اس سے زیادہ زبانی عرض کر سکتا ہوں تحریر کافی نہیں۔

اطلاع متعلق ترجمہ آیت **وجعلكم ملوكاً**۔

میں نے اس کے متعلق ایک حاشیہ لکھ دیا ہے جو اس موقع پر تو نہیں چھپ سکتا کیونکہ وہ جلد چھپنے گئی ہے۔ اس کے یا مجموعہ تفسیر کے اخیر میں بقید حوالہ چھپ جائے گا۔ وہو ہٰذا:۔

یہ ترجمہ صاحب ملک اس صورت میں ہے جس فتح شام سے پہلے مصر پر ان کا قبضہ ثابت ہو جائے اور دوسرے قول میں اس ترجمہ کے اوّل میں لفظ جیسے جو تشبیہ کے لیے ہے بڑھا دیا جائے

اور بین القوسین عبارت ذیل بڑھادی جائے۔

(یعنی کسی کی رعیت ہونے سے آزاد)

تتمۃ الجواب:- بعد تحریر جواب بالا ایک دوست نے اعراب القرآن(1) کی طرف رجوع کیا جو مسائل نحو میں مسلّم صحت ہے اس میں اس کے متعلق ایک مستقل فصل ملی جس میں سے بقدر ضرورت ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ اس سے مسئلہ صاف ہوگیا کہ اس موقع پر ضمہ ہی اصل ہے اور کسرہ خلاف اصل ہے۔ حتیٰ کہ جہاں ضمہ متعین ہے وہاں کسرہ جائز نہیں۔ جیسے لہٗ میں مثلاً اور جہاں کسرہ مستعمل ہے وہاں ضمہ بھی جائز ہے جیسے بِہٖ میں مثلاً۔ تو کسرہ میں تو ایسے سوال کا احتمال ہے اگر چہ مرفوع ہے اور ضمہ میں اس کا احتمال ہی نہیں۔ والعبارۃ ہٰذا:-

الاصل فی هذه الهاء الضم لانها تضم بعد الفتحة و الضمة و السكون نحو انه ولـه وغلامه ويسمعه ومنه وانما يجوز الكسر بعد الهاء نحو عليهم وايديهم وبعد الكسرة نحو بـه وبداره وضمها فى الوضعين جائز لانه الاصل وانما كسرت لتجانس ما قبلها من الياء والكسرة وبكل قد قرئ (وقال بعده باسطر) ومن ضم الهاء قال ان الهاء فى عليه حقها ان تكون الفا كما تثبت الالف مع المظهر وليست الياء اصل الالف فكما ان الهاء تضم بعد الالف فكذالك تضم بعد الياء المبدلة منها ومن كسر الهاء اعتبر اللفظ (اعراب القرآن قبيل سورة البقرة فى فصل مستقل)

اب کی بار خلاف معمول ذرا اور یہ ہوئی۔ کتاب دیکھنے کی فرصت نہ ملی تھی۔ باقی خیریت ہے۔ دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں"۔

جس تاخیر کی معذرت فرمائی گئی ہے وہ کچھ ایسی تاخیر بھی نہ تھی۔ 24 اکتوبر کو خط دریاباد سے روانہ ہوا تھا اور 30 اکتوبر کو یہ لمبا چوڑا جواب رسالہ نما موصول ہوگیا تھا۔ جتنی عربی عبارتیں اس میں درج تھیں، صرف ان کی نقل ہی میں کتنی دیر لگی ہوگی، مجھے تو اس نقل کی نقل کرنی پڑی، لو ہے لگ گئے اور محض نقل ہی کا کام ایک دن میں نہ ہو پایا۔ پھر کتابوں کی تلاش اور مطالعہ میں جو وقت

---

(1) کتاب اور مصنف کا پورا نام:- اعراب القرآن۔ از ابوالبقا عبداللہ بن حسن العکبری۔

صرف ہوا ہوگا، کوئی اس کا حساب تو لگائے اور پھر جب حضرت کا سن وسال اور سارے اشغال بھی ذہن میں رہیں۔ ایک طرف قلب اس جذبۂ تشکر سے لبریز لیکن دوسری طرف حضرت کا یہ اشارہ دل میں ذرا بھی نہ اترا کہ مسئلہ مصر و بنی اسرائیل میں حسن تابعی و مالک فقیہ و محدث کا قول جو تاریخ کے تمام تر خلاف ہے، قابل استناد و احتجاج ہے۔ اب کی خط جو لکھا اس میں باوجود کمال ممنونیت و شکر گزاری کے اپنے اس شبہ کو بھی پیش کر دیا اور اس خط پر تاریخ 7 نومبر کی ہے۔

(79)

م۔ "پچھلا مفصل گرامی نامہ کئی روز ہوئے سرفراز کر چکا، اس کے بعد اس کا ضمیمہ بشکل کارڈ بھی موصول ہوا (1)۔ یہ عریضہ اظہار تشکر کے لیے ہے۔ اتنے مفصل جوابات، خصوصاً اتنی طویل عبارات کی نقل میں جیسی کچھ مشقت جناب کو اٹھانی پڑی ہوگی، بالکل ظاہر ہے۔ رہ رہ کر ندامت ہوتی ہے کہ کیوں بار بار اس قدر بار ڈالنے کا سبب بنتا ہوں۔

ا۔ میں خود ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ کو ثواب دلوایا۔ پھر خود میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ میری تفسیر کا مقام درست ہو گیا۔ اس میں لطف ہے کہ میں آپ کا ممنون ہوں اور آپ میرے لیے دعا فرمایئے۔

م۔ اتنا تعب وہی شخص برداشت کر سکتا ہے جو من وتو کے جھگڑے کو مٹا چکا ہو اور کام کو اللہ ہی کا کام سمجھ کر کرتا ہو ورنہ عام تجربہ تو یہ ہے کہ لوگ دوسرے کے کام میں معمولی امداد دینے سے بھی پہلوتہی کرتے ہیں چہ جائیکہ اتنی محنت شاقہ برداشت کرنا۔ جزائے خیر وہی دے گا جس کا کام آپ نے کیا ہے۔

ا۔ یہ سب آپ کا حسن ظن ہے ورنہ مجھ کو خود اپنی نیت میں شبہ ہے کہ ماجد کا ارضا مقصود ہے یا عبد الماجد کا۔

م۔ اب ایک سوال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پچھلے گرامی نامہ کا حاصل یہ ہے کہ مصر پر بنی اسرائیل کا قبضہ گو تاریخ سے ثابت نہ ہو لیکن حسنؒ اور مالکؒ وغیرہما کے اقوال اس جانب بھی ہیں، اس لیے جمع بین القولین کرنا چاہیے، بس اسی اصل کو ذرا سمجھنا چاہتا ہوں حسنؒ اور مالکؒ

(1) سخت افسوس ہے کہ یہ کارڈ بڑی تلاش پر بھی نہ ملا۔

یقیناً اکابر امت میں سے ہیں اور ان سے بدعقیدگی میں عین اپنی محرومی سمجھتا ہوں لیکن گزارش یہ ہے کہ علوم دین کے دائرہ سے باہر ان حضرات کے قول کو اتنی وقعت ہی کیوں دی جائے۔ کسی طبی مسئلہ میں ایک طرف اگر جالینوس و بقراط کی رائے ہو جو کھلے ہوئے مشرک تھے اور دوسری طرف انہی اولیائے امت کی تو ان اطباء ماہرین کی رائے کو اختیار کرنا اور ان مقبولین کی رائے کو ترک کر دینا بے ادبی کیسے قرار پائے گا۔

ایک اور مثال عرض کردوں جو میرے علم میں حال ہی میں آئی ہے۔ موضح قرآن میں شاہ صاحب(1) نے لاقرب من هذا رشداً کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ قصۂ اصحاب کہف توریت میں درج ہے۔ حالانکہ تاریخ کو مسلم ہے کہ یہ واقعہ عہد موسوی تو کجا عہد عیسوی سے بھی بعد کا ہے۔ اس وقت کے رومی بادشاہ کا نام اوقیانوس تھا جو مشرک تھا اور جس کا زمانہ تقریباً 150 کا ہوا ہے۔ تو حضرت شاہ صاحب کا علم و فضل اور مرتبۂ ولایت بالکل تسلیم لیکن ان کے اس قول سے یکسر انکار کر دینا کیسے ان کے کمالات کا قادح ہوسکتا ہے۔

آنکھ بند کر کے بے چون و چرا مان لینے والی عظمت، مجھ نا سمجھ کی سمجھ میں بس یا تو نص قرآنی کی ہوسکتی ہے اور یا پھر مستند قول رسول کی۔ باقی اکابر امت میں سے تو بڑے سے بڑے محقق کے لیے بھی خطا و لغزش کا امکان لگا ہوا ہے خصوصاً ان علوم و فنون میں جو دینیات سے باہر ہیں۔

ا۔ میں حرفاً حرفاً آپ کے اس خیال سے متفق ہوں اور آج سے نہیں سالہا سال پہلے سے، میں اپنی تقریرات میں بارہا اس کا اظہار بلا خوف لومۃ لائم کر چکا ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میرا وہ جواب اس تحقیق کے معارض ہے، میں تو بالکل اس کے ساتھ متفق پاتا ہوں۔ مکرر نظر فرمائیں۔ اس میں تصریح ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ میری تفسیر ایک قول پر مبنی ہے اور یہ قول ظاہر الفاظ قرآنیہ کے قریب ہے۔ گو نص نہیں مگر ظاہر کی نفی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اس قول کی بھی گنجائش ہے اور اس قول والوں کو تاریخ یہود کی حجیت کا انکار ہے اور دوسرا قول ہے جس میں تاریخ کی صحت کی تسلیم پر ترجمہ بدل دیا ہے تو دونوں قول میں گنجائش کی تصریح ہوگئی۔ البتہ ترجیح کا حکم میں نے نہیں کیا کیونکہ تاریخ مذکور ایسی حجت نہیں۔ باقی جمع بین القولین کا تو میرے کلام میں پتہ بھی

(1) یعنی مترجم قرآن حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ

نہیں۔ شاید سہل فیصلہ کے عنوان سے جو عبارت میں نے لکھی ہے اس سے شبہ ہوا ہو مگر وہ جمع قولین نہیں ہے بلکہ ایک ہی قول کو لینے کا مشورہ دیا لیکن اس طرح کہ اگر اپنا نفس تاریخ کے غلط ہونے کو تسلیم کر سکے تو مالکؒ کا قول لیا جائے اور جو مخاطب اس کو تسلیم نہ کرے تو قتادہؒ کا قول لے لیا جائے۔ اس کو جمع بین القولین نہیں کہا جا سکتا۔

جدید اطلاع۔ ایک بار میں نے آپ کو ایک مجمل مسودہ یہاں آنے والوں کے متعلق ایک نئے دستور العمل کا سنایا تھا، آپ نے اس کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے اس کو کچھ دستی پریس میں چھپوالیا اور پانسو سے زیادہ دہلی چھاپنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کے لیے ملفوف ہے۔ آنے سے پہلے عازمین کو اس کی اطلاع کر دیا کروں گا تاکہ اوّل سے آخر تک سب مراتب کا احاطہ کر کے بصیرت کے ساتھ آئیں، حیرت اور پریشانی نہ ہو۔ یہ تمام عبارت بلا قصد مقفّی ہو گئی'۔

''اطلاع برائے عازمین تھانہ بھون'' اس عنوان سے ایک چھوٹا سا پرچہ جامع ومانع حضرت لے آنے والوں اور اپنی دونوں کی سہولت وراحت کے خیال سے اس وقت چھپوالیا تھا۔ اتفاق سے اس کی عبارت مقفّی ہو گئی تھی۔ والا نامہ کی آخری سطر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت کو ڈاک کا بڑا اہتمام رہتا تھا لیکن ڈاک خانہ اور ریل کے انتظامات بھی بہرحال بشری ہی انتظامات ہیں، کبھی کبھی گڑبڑ ہو جانا ناگزیر ہے۔ 7 نومبر کے مذکورۂ بالا عریضہ کے بعد، نومبر ہی میں ایک اور مفصل خط لکھا۔ جواب راستہ ہی میں ضائع ہو گیا۔ دو ہفتہ کے انتظار کے بعد دوسرا خط 12 دسمبر (مطابق 4 رمضان 54) کو لکھا۔ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ الہندؒ کے ترجمۃ القرآن پر استاذ العلما مولانا شبیر احمد عثانی کے حواشی مدینہ پریس (بجنور) سے چھپ کر ابھی ابھی آ چکے تھے۔

م۔ ''دو ہفتے ہوئے عریضہ روانہ کیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جواب عنایت نہ ہو۔ لامحالہ یہی ہوا کہ ڈاک والوں نے ڈاکہ ڈالا ادھر سے یا ادھر سے بہرحال آج پھر ان ہی معروضات کو چند جدید اضافوں کے ساتھ دہراتا ہوں۔

ا۔ خط آیا تھا اور اگلے ہی روز جواب روانہ ہو گیا تھا۔ حیرت ہے کہاں ضائع ہوا۔

م۔ مولوی عبدالکریم صاحبؒ کا مضمون مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے جواب میں قابل داد

ہے (1)۔ جوابی مضمون میں اتنی متانت قائم رکھنا خاص آستان اشرفی کا فیض ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔

ا۔ یہ سب بزرگوں کی برکت ہے۔ میں کیا میرا اثر کیا۔

م۔ اشاعت البتہ ایک غلط اخبار (الامان) میں ہوئی۔

ا۔ اس میں مولوی عبدالکریم کا دخل نہیں۔ انھوں نے تو دیوبند والوں کے سپرد کر دیا تھا۔ آگے کچھ خبر نہیں۔ یہ خود ان کا بیان ہے۔

م۔ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے حواشی تفسیری شائع ہو گئے۔ میری فہم ناقص میں تو بہت اچھے ہیں۔ میرے کام کے ہیں۔ اب تک اردو تفسیروں اور ترجموں میں معتد بہ مدد صرف بیان القرآن سے مل رہی تھی۔ اب اس کے بعد ان حواشی کا بھی نمبر رہے گا۔ اہل باطل کے اشتباہات ومغالطات کو خوب پیش نظر رکھا ہے۔

ا۔ جی خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے نافع بنا دے۔ آپ سے یہ معلوم کر کے میری رائے زیادہ نرم ہو گئی۔ وہ یہاں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ بہت سے ذرائع سے کام لے رہے ہیں۔ اس ایک ذریعہ کا اور اضافہ ہوا۔ (2)

م۔ یہود عقیدۂ عزیر ابن اللہ سے اپنی بالکل تبری کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے اوپر خواہ مخواہ تھوپ دیا گیا ہے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ خالص مسیحی قسم کا ہے۔ ہمیں اس سے مس نہیں۔ میرے ذہن ناقص میں یہ جواب آیا ہے کہ ولد اور ابن دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ لغوی حیثیت سے بھی اور محاورۂ قرآن وتوریت میں بھی۔ ولد کا اردو ترجمہ بیٹا ہے یعنی صلبی اولاد۔ جیسا کہ مسیحی

---

(1) یہ مولوی عبدالکریم صاحب علاقہ پنجاب کے رہنے والے حضرت کے خاص مسترشدین میں تھے۔ ایک عالم کی حیثیت سے خانقاہ تھانہ بھون میں اکثر مقیم رہتے اور کبھی تبلیغ کا، کبھی فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہتے۔ اب یہ بالکل یاد نہیں پڑتا کہ وہ مضمون کون سا تھا جس کا یہاں ذکر ہے۔

(2) مولانا عثمانی حضرت کے خلیفۂ خاص تھے مگر تحریک خلافت وغیرہ کے سلسلہ میں آپس میں کشیدگی ہو گئی تھی اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا کے لیے مراسلت ومجالست وغیرہ کی ممانعت حضرت کی طرف سے ہو گئی تھی۔ الحمدللہ کہ اس کے کچھ ہی روز بعد دین کے ان دو بڑے خادموں کے درمیان از سر نو لطف قائم ہو گیا۔ ع

درمیان جان وجاناں ماجرائے رفت رفت

حضرت مسیحؑ کو ولد اللہ کہتے ہیں۔ ابن کے معنی اس سے وسیع تر ہیں، جو فرزند معنوی ومجازی کو بھی شامل ہے۔ جیسے اردو میں لاڈلا یا چہیتا۔ چنانچہ یہود ونصاریٰ دونوں اپنے کو ابناء اللہ اسی معنی میں کہتے تھے، یعنی ہمیں حضرت حق کے ساتھ وہ قرب خاصہ حاصل ہے جو اور کسی مخلوق کو نہیں، قرآن مجید نے ضلالت تو عقیدۂ ولدیت وعقیدۂ ابنیت دونوں کو بتایا ہے لیکن ولدیت کو بالکل بجا طور پر مسیحیوں کے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔

یہود کے ہاں حضرت عزیرؑ کے متعلق عقیدت کا غلو ضرور ملتا ہے، کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ سے عملاً ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا، ان کے لائے ہوئے نوشتے جل کر برباد ہوگئے۔ اب توریت وغیرہ جو کچھ موجود ہے، سب حضرت عزیرؑ کی مرتب کی ہوئی ہے، عملاً ہمارا تعلق بس ان ہی سے ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں کے غالی اور جاہل مشائخ عملاً اپنا تعلق فلاں چشتی اور فلاں قادری بزرگ پر ختم کر دیتے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ نصاریٰ(1) کہتے ہوں گے کہ ہم مسیحؑ کے سوا اور کسی کو نہیں جانتے اور یہود کہتے ہیں کہ ہم عزیرؑ کے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ آیت قرآنی میں کیا عجب کہ یہی مفہوم ادا فرمایا گیا ہو۔

ا۔ میں نے جواب میں اس توجیہ کی پسندیدگی عرض کی تھی اور اس توجیہ کے خلاصہ کی جو خط کشیدہ عبارت میں ادا کیا گیا ہے۔ تائید اسی آیت سے لکھی تھی "وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَیْءٍ" اور یہ سب جب ہے کہ یہود کو اس تبری میں سچا سمجھا جائے ورنہ ان کا کیا اعتبار اور ممکن ہے کہ کوئی خاص فرقہ اس کا بھی قائل ہو پھر اس کا سلسلہ قطع ہو گیا ہو"۔

(80)

خط کے بعض ذاتی اجزا باقی رہ گئے۔ وہ اب درج ہوتے ہیں:

م۔ ''وہ فقہی مسئلے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک اپنے لیے، ایک والدۂ ماجدہ کے لیے۔ اپنے لیے تو یہ کہ سردی میں پیر بہت پھٹ جاتے ہیں۔ وضو کے لیے بار بار پیر دھونے میں اچھی خاصی تکلیف ہوتی ہے۔ چری موزوں کا تجربہ کیا وہ بھی کچھ زیادہ آرام دہ نہ ثابت ہوئے۔

(1) حضرت نے میری اس عبارت ''نصاریٰ کہتے...................'' نہیں مانتے کو زیر خط کر دیا تھا۔

اونی یا سوتی پاتابہ پر مسح کر لینے کی کیا کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی؟

ا۔ ان کے تلے میں اور پنجہ پر چمڑا لگوا لیا جائے، گو اس میں بھی بعض قیود و شروط کے اعتبار سے کچھ کلام ہو گیا ہے لیکن کم از کم مس قرآن کے لیے تو گنجائش ہو سکتی ہے۔ نماز کے لیے پاؤں دھو لیے جائیں۔

م۔ والدہ ماجدہ خدا کے فضل سے بڑی پختہ دیندار ہیں۔ اس ضعیفی میں بھی فرض روزے کیا محرم، شعبان، ذی الحجہ وغیرہ کے بھی نہیں چھوٹنے پاتے لیکن رضاعت کے سلسلہ میں 5 سال کے روزے ان کے چھوٹے ہوئے ہیں۔ ان کا فدیہ تو اسی زمانہ میں دے چکی ہیں لیکن دل میں یہ آتا ہے کہ جب خود قضا رکھنے پر قدرت تھی، تو قضا ہی کیوں نہ رکھ لیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اب جتنے نفلی روزے رکھتی ہیں ان ہی کے لیے یہ نیت کر لیں کہ وہ قضا میں محسوب کر لیے جائیں۔

ا۔ ماضی کے متعلق تو یہ نیت بے اثر ہے۔ مستقبل میں ایسا بھی کر سکتی ہیں۔

ہاں خط سابق میں جناب بھائی صاحب کی مزاج پرسی بھی کی تھی"۔

سال کا آخری خط 31 دسمبر کا عریضہ ہے، متفرق مسائل پر شامل اور جوابات حسب معمول نفع سے لبریز:

م۔ "الٰہ آباد سے منشی عبدالحمید صاحب تحصیلدار (1) کے فرزند میاں حبیب الرحمٰن نے اپنی طویل داستان مصائب لکھی ہے۔ جناب کی خدمت میں بھی ضرور بھیجی ہو گی۔

ا۔ جی ہاں۔

م۔ خطائیں جیسی بھی ہوں، بیچارہ اب ہے قابل رحم۔ میرے تو جی میں ہے کہ ان کے والد ماجد کی خدمت میں صرف یہ مصرع لکھ بھیجوں۔

براو منگر بہ کرم خویش نگر

لیکن میری تحریر کا اثر ہی کیا۔

ا۔ اثر کیوں نہ ہوتا مگر بعض محل پر جرم زیادہ موثر ہوتا ہے شفاعت سے۔ اس تازہ واقعہ کی تو

---

(1) حضرت کے بڑے مخلص مسترشدین میں تھے۔ اب زمانہ پنشن قریب تھا۔ ان کے فرزند دوسرے رنگ کے تھے۔ داستان مصائب کا تعلق ان کی خانگی زندگی سے تھا۔

خبر نہیں لیکن اس کے قبل کا حال معلوم ہے کہ ایسا ہی تھا مگر انھوں نے کرم کو غالب کر کے معاف کر دیا مگر اس بندۂ خدا نے اس کی قدر نہ کی۔ اب شاید بوڑھا زیادہ قابل رحم ہو۔

م۔ والا نامہ میں مولانا شبیر احمد صاحبؒ کے متعلق الفاظ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ پوری مسرت اس وقت ہو گی جب انھیں لطف و انبساط کے ساتھ تھانہ بھون میں حاضر دیکھ لوں۔

ا۔ اب جتنی دیر ہو گی ادھر سے ہو گی، میں نے اپنی اصلی شرط کو چھوڑ دیا، اس کا بدل تجویز کر دیا مگر بدل کا بدل نہیں ہوتا ورنہ اصول سب پامال ہو جائیں گے۔

م۔ البتہ ایک سوال اس ضمن میں استفادتاً کرنا چاہتا ہوں۔ تعلق بیعت کی حد تک تو حاضری کے قیود و شرائط بالکل بجا لیکن اس تعلق خصوصی سے جب قطع نظر ہی کر لی جائے اور محض یہ صورت رہے کہ ایک خادم دین اپنے سے ایک بڑے خادم دین سے ملنے آ رہا ہے تو اس میں کیا مضائقہ اور اتنے کے لیے قیود و شرائط کیوں؟

ا۔ جدید شرط قید نہیں بلکہ رفع مانع ہے جو ضروری ہے۔ میں نے اس حیثیت کے قیود کو بالکل اٹھا دیا اب اسی دوسری حیثیت سے ملوں گا مگر اس میں یہ شرط ضروری ہے کہ اس پہلی حیثیت کی کوئی جھلک نہ ہو، حتیٰ کہ نہ میری تعظیم کریں، نہ مجھ سے استفادتاً کوئی سوال کریں، مساوی ہو کر آئیں ملیں۔

م۔ بھائی صاحب کو تین چار دن سے تکلیف شروع ہو گئی ہے، رات کا بیشتر حصہ بیٹھے ہی بیٹھے گزرتا ہے ضرور دعا فرمائیں(1)۔

ا۔ دل دکھا۔ دل سے دعا ہے۔

م۔ ابھی چند روز ہوئے امریکہ سے انگریزی میں ایک کتاب عقائد، علوم و تاریخ یہود پر 12 ضخیم جلدوں میں تقریباً دو سو میں آئی ہے(2)۔ حال کے بیسیوں علمائے یہود نے مل کر لکھی ہے۔ کام کی بہت سی باتیں اس میں مل گئیں۔ بعض وقت بڑی حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہمارے علما نے بھی یہود و نصاریٰ کے دفاتر و اشعار کا مطالعہ کر لیا ہوتا۔ خدا جانے کتنے موتی اس سمندر سے نکال لاتے۔

---

(1) ضیق النفس کے شدید دورے سردی کے موسم میں پڑتے تھے۔ (2) مراد جیوش انسائیکلوپیڈیا سے ہے۔

ا۔مگر بعض کے ڈوب جانے کا بھی ڈر تھا اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو میں بھی متفق ہوں مگر اس کا انتظام کیا ہو۔ اگر کوئی سہل صورت ممکن ہو تحریک مناسب ہے۔

م۔کیا عرض کروں مسیحیت کی مشرکانہ حیثیت روز بروز واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے ان ''مسیحیوں'' کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ تحریف و تلبیس تو یہود کے ہاں بھی بہت ہے لیکن اس کے باوجود نفس توحید وہاں صحیح و سالم ملتی ہے اور عقیدۂ رسالت بھی ناقص شکل میں موجود ہے، بخلاف اس کے موجودہ مسیحیت تو تمام تر لوپوس کا گڑھا ہوا ایک مذہب ہے۔ تمام تر رومی اور یونانی مشرک فلاسفہ سے متاثر۔ توحید و رسالت دونوں کی جڑ ہی یہاں کٹی ہوئی ہے۔

ا۔ایسے ایسے جملے مع کسی قدر مثالوں کے تفسیر میں لکھنے سے ایک درجہ میں فائدہ ہوگا اس کا ضرور خیال کیجیے۔ جس کی سہل صورت یہ ہے کہ تفسیر کا ایک مقدمہ لکھیے اس میں ایسے ایسے مضامین ہوں، آئندہ جو رائے ہو''۔

34 ختم ہوگیا۔ حضرت سے اصل تعلقات جولائی 28 سے شروع ہوئے تھے۔ اب اس مدت پر نظر کرتا ہوں تو قدرت خدا نظر آتی ہے! پہلی حاضری جب ہوئی ہے تو کیسے ڈرتے ڈرتے اور پہلا عریضہ جب لکھا ہے تو کیسا سنبھل سنبھل کر! رفتہ رفتہ کیسا مانوس بلکہ کیسا گستاخ ہوتا گیا۔ علمی اور روحانی عظمت اب بھی قائم ہے بلکہ احترام تو شاید کچھ بڑھ ہی گیا ہے لیکن ہیبت کی جگہ اب انس کی حکومت۔

(81)

جنوری 1935 کی کوئی 8 تاریخ تھی کہ سال کا پہلا خط لکھا۔ اس کا جواب بھی ڈاکخانہ کی عنایت سے راستہ میں گم ہوگیا۔ انتظار کر کے 23 جنوری کو حسب ذیل عریضہ روانہ کیا:

م۔''خدا جانے کون میرا ایسا دشمن پیدا ہوگیا ہے جو جناب کے والا ناموں پر ڈاکہ ڈالنے لگا ہے۔ ایک والا نامہ ابھی چند ہی ہفتے ہوئے سیتاپور میں غائب ہو چکا تھا(1)۔ دوسری نوبت یہ ہے۔ کوئی دو ہفتے ہوئے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے خط کا اقتباس تھا اپنا ایک خواب شب قدر سے متعلق درج کیا تھا اور مضامین تھے، خدا جانے وہ عریضہ راہ

(1) ملاحظہ ہو نمبر 79۔

سے غائب ہوا یا اس کا جواب۔

ا۔ وہ تو پہنچا تھا، جواب ہی غائب ہوا۔

م۔ اب اس کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا بجز اس کے کہ آئندہ ہر خط رجسٹری بھیجا کروں۔ مصارف میں زیادتی سہی لیکن اذیت قلب سے تو حفاظت رہے گی۔

ا۔ ایک دو بار اور دیکھ لیا جائے۔ ذرا ڈاک والوں کو بھی کہہ دیا جائے۔ پھر جو مصلحت ہوگی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ لفافہ جوابی پر تین پیسہ کا ٹکٹ لگایا جائے (1) کہ دو پیسہ بیرنگ ہو کر پہنچے۔

م۔ اس وقت تو صرف بیان القرآن کے تین مقامات پر توجہ عالی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جلد 3 صفحہ 65 لِشَهَادَتِنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا ۔ یہاں شہادۃ کا ترجمہ قسم سے فرمایا گیا ہے اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔ صراح اور قاموس میں تصریح ہے کہ اشہد کے معنی احلف ہیں اور روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی یمین کے نقل کیے ہیں۔

م۔ جلد 3 صفحہ 97۔ حنیفا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ تفسیر میں یہ غلطی ہوئی کہ اس کے ترجمہ کو بین القوسین کر دیا۔ ناقل نے بین القوسین دیکھ کر ترجمہ سے خارج کر دیا۔ اس کی یہ عبارت ہے۔ میں سب طریقوں سے یکسو ہو کر اپنا رخ الخ یہ حنیفا کا ترجمہ ہے دونوں طرف کے قوسین کاٹ دینا چاہیے۔ بس ترجمہ متن میں رہ جائے گا۔

م۔ جلد 3 ص 80 بل بدالھم ما کانو یخفون من قبل ۔ اس پر آپ ہی کے قلم کا عربی حاشیہ ہے عبر بالاخفاء اشارة الی ان قلوبھم کانت تصدق الخ۔ میرے دل کو تو یہی مضمون بہت لگا لیکن ترجمہ اور تقریر ترجمہ کو پڑھ کر کسی کا ذہن اس طرف نہ جائے گا۔ میری فہم ناقص میں یہ حاشیہ والا مضمون متن میں آنا چاہیے تھا۔

ا۔ اس کا طریقہ ذہن میں نہیں آیا۔ آپ پوری عبارت بنا کر بتلا دیجیے تا کہ غور کر سکوں۔ س ش کے متعلق مضمون مسرت و مقرون و حرف مشحون۔

(1) مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعتاً تشریف لے آئے۔ میں مکان پر تھا، سنتے ہی

---

(1) اس وقت لفافہ کا ٹکٹ ارکا تھا۔

حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا حصہ طویل عریض تھا۔ ملا تو معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا۔ پھر ملاقات و مکالمت سے ان کی تواضع و سادگی و رعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا۔ گیارہ بجے تشریف لائے۔ تین بجے واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا۔ س سے یہی مراد ہے۔

(2) مولوی شبیر احمد صاحب نے ہمت کی کہ اعلان تجویز شدہ کو خود لطیف بنا کر مجھ سے موافقت حاصل کر کے شائع کرا دیا۔ خود بھی آئے تھے مگر اعلان کے قبل۔ ملنے بھی آئے تھے۔ میں اکرام و احترام سے ملا۔ باتیں بھی کیں مگر کہلا بھیجا کہ ابھی بشاشت کا انتظار ہے جو اعلان پر موقوف ہے۔ جب اعلان آیا، وہ موجود نہ تھے ورنہ بلا کر خود ملتا۔ اب آئیں گے تو بشاشت بھی ہو گی۔ البتہ یہ کہہ دوں گا کہ اب ملنا پہلی حیثیت سے نہیں۔ اس لیے اب میرے ساتھ تعظیم یا استفادہ کا برتاؤ نہ کیا جائے، مساویانہ یارانہ برتاؤ رکھا جائے اور ان کو بھی چاہیے کہ اس کو قبول کر لیں۔ اور ایک درخواست یہ کروں گا کہ اپنے کسی خادم یا معتقد کو ساتھ نہ لایا کریں۔ ش سے یہ مراد ہے''۔

مکتوب گرامی کے اس آخری مضمون ''س، ش'' سے ظاہر ہے کہ حضرت کی کس درجہ عنایت وشفقت اور بے تکلفی اس نامہ سیاہ کے ساتھ تھی۔

اس کے بعد کا جو عریضہ 30 جنوری کا لکھا ہوا ہے، اسے پڑھ پڑھ کر آج بھی لطف آ رہا ہے اور اپنی جسارتوں پر کسی قدر حیرت بھی ہو رہی ہے۔ بلا انتظار ملاحظہ ہو:

م۔ ''س، ش دونوں کی حاضری سے دلی مسرت ہوئی۔ اللہ سب کو مبارک کرے، حسرت صرف اس کی رہی کہ بطور خبر کے صرف سنا، بطور مشاہدہ کے خود نہ دیکھا۔

ا۔ واقعی آپ بہت مسرور ہوتے۔ خدا تعالیٰ پھر کوئی موقع عطا فرمائیں گے۔ معلوم ہوا کہ مولوی شبیر احمد صاحب آپ سے ملے ہی نہیں مگر مشتاق بہت ہیں(1)۔

م۔ پچھلے خط کا مضمون اوّل تو تمام کمال یاد نہیں رہتا اور پھر اسے دہرا کر لکھنا جب خود اپنی

(1) عجب اتفاق ہے کہ مولانا سے ملاقات کی نوبت آج (اگست 48) تک نہ آئی اور اب اپنی اور ان کی زندگی میں توقع بھی کیا ہو سکتی ہے خصوصاً جب کہ وہ باشندہ بھی اب ایک دوسرے ملک کے ہو چکے ہیں خیر انشاء اللہ جی بھر کے ملاقات اب جنت ہی میں ہو گی۔ اس دنیا میں صرف ایک بار (غالباً 1924 میں) دہلی میں دفتر جمعیۃ العلما میں ان سے ملنا یاد پڑتا ہے۔

طبیعت پر گراں پاتا ہوں تو جناب والا سے جوابات کے اعادہ کی جرات کس طرح کر سکتا ہوں۔

ا۔ اچھی طرح ۔ مجھ کو گرانی نہیں ہوتی، گو پورا اعادہ غالبًا نہ ہو سکتا ہو۔

م۔ ورنہ دل تو یہ جاننے کو بہت مشتاق ہے کہ جناب نے گم شدہ مکتوب میں میرے ان دو معروضات پر خدا معلوم کیا لکھا تھا۔ ایک تو شب 29 رمضان میں طلوع فجر سے ذرا قبل مسجد میں بیٹھے بیٹھے غنودگی کی حالت میں نہایت تیز روشنی بجلی کی سی سارے آسمان میں دیکھا۔

ا۔ اس کے متعلق اتنا لکھنا یاد ہے کہ ایسے واقعات میں متعدد احتمالات ہوتے ہیں۔ ملکوتی ہونے کا بھی کہ عالم غیب کی چیزوں کا انکشاف ہو گیا ہو اور ناسوتی ہونے کا بھی کہ متخیلہ کا تصرف یا اخلاط میں کچھ اشتعال ہو گیا ہو۔ امر اول نہ کوئی کمال ہے ہاں فضل ہے اور امر ثانی نہ کوئی نقص ہے کیونکہ حکمت پر مشتمل ہے، وہ حکمت قلب کا انشراح ہے جس سے طاعت میں نشاط ہو۔ اب اس کا فیصلہ صاحب واقعہ کے ذوق پر ہے۔

م۔ دوسری میری شاعرانہ تخئیل حضرت والا اور مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہٗ اور مولانا حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری کے متعلق میدان حشر میں۔

(اصل عبارت اس گم شدہ خط میں اس موقع پر غالبًا یہ تھی۔

اپنے کو جو خصوصی عقیدت جناب والا کے جن دو بزرگوں یعنی مولانا دیوبندی مدظلہٗ اور حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بجنوری کے ساتھ ہے، اس پر اور پھر ان تینوں بزرگوں کے درمیان اختلاف طبائع پر غور کرتے کرتے ایک شاعرانہ خیال یہ پیدا ہوا کہ اور اسے بکمال جسارت عرض خدمت کیے دیتا ہوں کہ جیسے عرصۂ حشر برپا ہے اور مولانا دیوبندیؒ سر بسجود ہیں کہ جب تک میرے سارے رفیقوں اور متوسلین کو بھی میری معیت کا حکم نہ ہوگا میں خود بھی جنت میں قدم نہ رکھوں گا۔ عرض معا قبول ہوگی اور مولانا اپنے ایک ایک رفیق و متوسل کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ساتھ لیں گے ادھر حاجی صاحب کی شان یہ ہوگی کہ جنت کی طرف خراماں خراماں چل رہے ہوں گے کہ لوگ راستہ میں گھیرنا اور تقاضا کرنا شروع کریں گے کہ واہ حاجی صاحب، آپ بغیر ہمارے چلے جا رہے ہیں اور وہ فرماتے جاتے جائیں گے کہ اچھا بھائی تم بھی آؤ۔ حضرت کی روش ان سب سے جدا ہوگی آپ بڑے اطمینان کے ساتھ تنہا جنت کو جا رہے ہوں گے۔ لوگ آپ سے عرض کریں گے کہ حضرت

آپ اپنے متوسلین کی فکر نہیں کرتے۔آپ جواب دیں گے کہ کیا میں حق تعالیٰ سے بڑھ کر شفیق ورحیم ہوں۔اس نے خود ہی اپنی رحمت سے سب کو وہاں پہنچادیا ہوگا، چنانچہ آپ جنت میں جب قدم رکھیں گے تو واقعتاً وہ سب کے سب موجود ہوں گے اور آپ کے استقبال کو یہ کہتے ہوئے بڑھیں گے کہ حضرت ہمیں تو آپ کی تربیت نے ایسا پاک صاف کر دیا تھا کہ ہمیں کسی کی سعی سفارش اٹھانی ہی نہ پڑی، بس سیدھے جنت ہی آگئے"۔)

ا۔اس میں یہ لکھنا یاد ہے کہ اس تخیل میں ایک کسر رہ گئی وہ بھی شامل کرلی جائے۔وہ یہ کہ اگر میری نجات ہوگئی اور میں نے ایسی بے مروتی اختیار کی تو آپ میرے آگے آگے ہوں گے اور جب میرا جواب سنیں گے تو پیچھے لوٹ کر مجھ کو میرے اس فیصلہ سے ہٹا دیں گے اور مجھ کو ہٹنا پڑے گا تو انجام یہاں بھی وہی ہوگا جو دوسرے بزرگوں کی عنایت کا ہوا۔باقی حقیقت کس کو معلوم کہ انجام کس کا کیا ہو۔

دل کے بہلانے کو ماجد یہ خیال اچھا ہے

واللہ اعلم۔

م۔اب کی جوابی لفافہ تین ہی پیسہ کا بھیجتا ہوں۔یہ مشورہ گرامی بہت صائب رہا۔میں تو کہا کرتا ہوں کہ دوسرے آپ کو حکیم صرف امور دین میں سمجھتے ہیں لیکن میں نے تو اپنے تجربہ میں چھوٹے اور بڑے دنیوی معاملات میں بھی آپ سے زیادہ صائب اور حکیمانہ وعاقلانہ مشورہ کسی کا نہیں پایا۔ذالک فضل اللہ الخ

ا۔ایک فضل یہ بھی ہے کہ عقلا کے (یہ جملہ اصل خط میں یوں ہی نا تمام رہ گیا ہے)

(82)

مکتوب طویل ابھی ختم نہیں ہوا۔تفسیری موضوع رہ ہی گیا تھا،اب ملاحظہ ہو:

م۔"بیان القرآن کے بعض مقامات پر اب کی پھر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جلد 3 صفحہ 130۔حصہ تفسیر میں انا اوّل المسلمین پر آیت کا نمبر غلط ہوگیا ہے بجائے 165 کے 164 چاہیے۔

ا۔یہ غلطی واقعی غلطی ہے جو کاتبین نے کی ہے۔

م۔جلد 3 صفحہ 73۔سطر 1۔شروع سورۃ میں شمار آیات میں بجائے مـائة وخـمـس وسـتون کے مائة وست وسـتون ہونا چاہیے۔

ا۔یہ غلطی غلطی نہیں۔اقوال کا اختلاف ہے،دونوں قول ہیں خمس وستون اور ست وستون۔ بیضاوی نے قول اوّل کو اختیار کیا ہے۔

م۔جلد 3 صفحہ 128 سطر 1۔اویاتی ربک کا ترجمہ ''یا ان کے پاس آپ کا رب آئے'' درج ہے۔اس میں ''ان کے پاس'' کی عبارت محض تفسیری معلوم ہوتی ہے۔

ا۔واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

م۔جلد 3 صفحہ 127۔ کذب بایٰت اللہ کا ترجمہ ''ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلا دیا'' درج ہے۔آیات اللہ کا ترجمہ تو بظاہر صرف ''اللہ کی آیتوں'' ہوتا ہے۔

ا۔واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

م۔جلد 3 صفحہ 127۔بینہ کا ترجمہ ''ایک کتاب واضح'' سے فرمایا گیا ہے۔یہ تفسیر تو بیشک صحیح ہے لیکن ترجمہ تو شاید ''نشان واضح'' یا ''دلیل واضح'' ہوتا ہے۔

ا۔لغت کا مقتضا تو یہ ہے کہ بینہ کا ترجمہ صرف واضح ہے۔باقی اس کے ساتھ مع موصوف نکالا جائے خواہ نشان یا دلیل یہ سب ترجمہ سے زائد ہے،جز وترجمہ نہیں۔تو اس میں سب الفاظ برابر ہیں۔بعض نے ایسا توسع کیا ہے کہ موصوف ہی کو ترجمہ کا قائم مقام کر دیا جیسا حضرات شاہان دہلی نے کیا ہے(1) سب میں گنجائش ہے۔

م۔جلد 3 صفحہ 125،سطر 3۔یـرزقـکـم وایاھم۔ ''ہم ان کو اور تم کو رزق دیں گے'' اس عبارت ترجمہ میں ترتیب ضمائر میں کہیں قلب تو نہیں ہو گیا ہے؟

ا۔یقیناً قلب ہوا جو واجب الاصلاح ہے۔

م۔جلد 3 صفحہ 123 سطر 1۔ذی ظفر کا ترجمہ ''ناخن والے جانور'' سے فرمایا گیا ہے۔یہ لفظ بھی ذرا کھٹکا۔ناخن تو سب ہی جانوروں کے ہوتے ہیں۔صاحب حقانی نے ''کھر والے

---

(1) شاہ ولی اللہؒ،شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ مترجمین قرآن کو مولانا اپنی پرلطف زبان میں ''شاہان دہلی'' سے تعبیر کرتے تھے۔

جانور" سے ترجمہ کیا ہے اور توریت میں اس موقع پر "چرے ہوئے کھر" ہے۔

ا۔ حضرات شاہان دہلی نے ناخن ہی سے فرمایا ہے۔ میں نے تفسیر میں اس کی مراد بھی لکھ دی ہے۔ باقی محاورہ بدل گیا ہے یا ان حضرات نے بھی محاورہ کی پروانہ کی ہو۔ اس کا مجھ کو علم نہیں۔

ا۔ جلد 3 صفحہ 129۔ س 1۔ قتل اولادھم ۔ ترجمہ "اپنی اولاد کے قتل کرنے" میں "اپنی" سے التباس معبودوں کی اولاد کا ہوتا ہے۔ "ان کی" ہونا تو صاف تھا۔

ا۔ یہ محاورہ کی عدم مہارت کے سبب واقع ہوا۔ ذہن میں دوسری عبارت سے خلط ہوا جو اس کا حاصل ہے۔ وہ دوسری عبارت یہ ہے کہ ان شرکا نے ان کے خیال میں اس امر کو مستحسن بنادیا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کردیں۔ اس عبارت میں لفظ "ان" شاید موزوں نہ ہوگا۔ ذہن میں اس سے خلط ہوگیا لیکن محاورہ کی صحت مرجح ہے جس لفظ میں ہو۔

م۔ جلد 3 صفحہ 121۔ س 4۔ لیضل الناس بغیر علم ۔ "بلا دلیل جھوٹ تہمت لگائے تا کہ لوگوں کو گمراہ کرے" اس ترجمہ میں بغیر علم کا تعلق "افترا" سے معلوم ہوتا ہے۔ اکثر حضرات نے بغیر علم کو "اضلال" سے متعلق کیا ہے۔

ا۔ توجیہیں دونوں صحیح ہیں۔ یاد نہیں اس وقت اس کی ترجیح ذہن میں کس بنا پر آئی۔ اس وقت روح المعانی کو دیکھا۔ دونوں احتمال لکھ کر اوّل کو ترجیح دی ہے۔ شاید وجہ ترجیح کی یہ ہوسکے کہ ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید بغیر علم کلام کی تاکید کے لیے بڑھائی گئی۔ مو افترا کی تو ماہیت سے دلیل کا انتفا مفہوم ہوتا ہے جو حاصل ہے بغیر علم کا۔ اس لیے اس کے لیے تاکید ہونا واضح ہے اور اضلال کی ماہیت سے دلیل کا انتفا مفہوم نہیں ہوتا گو دلیل خارجی سے اس انتفا کا لزوم ثابت ہو تو اس کا اس کے لیے تاکید ہونا واضح نہیں۔ واللہ اعلم۔ باقی یہ سب تنبیہات میں درج کردیا جائے گا۔ ناظرین کو ترجیح کا اختیار ہے۔

اطلاع:- آپ کی تنبیہات ماضیہ و مستقبلہ متعلقہ تفسیر کو ایک جگہ جمع کر کے اس کا ایک نام بھی رکھ دیا ہے۔ موقع پر اس کو شائع کردیا جائے گا"۔

ان آخری سطروں میں تو حضرت نے عزت افزائی کی انتہا کردی۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، مراسلت کا اصل موضوع تفسیر قرآن ہوتا اور بڑھتا گیا۔ بعض خط

تو گویا اوّل سے آخر تک قرآنیات ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔12 فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔''مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے میری طلب پر ''شکر نعمت'' مجھے بھی ارسال فرمایا لیکن میں اس کی عبارت پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا۔ اب کی خط لکھوں گا تو اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ کو اس سے بڑی نعمت ملی ہے اور اس کے شکر میں ہی آپ زیادہ اہتمام فرمائیں گے۔(1)

ا۔ میرے ذہن میں وہ عبارت نہیں کیونکہ میں نے وہ اعلان صرف ایک بار سرسری نظر سے دیکھا اور اپنے پاس نہیں رکھا اور ذہن بھی منتقل نہیں ہوا اور پوچھنا کاوش ہے جو عادت کے خلاف ہے ورنہ آپ کو کچھ مشورہ دیتا۔ بہر حال بدوں کسر قلب کے جو مناسب ہو لکھا جائے۔

م۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی مختصر سوانح عمری ایک یہودی عالم کے قلم سے نکلی ہوئی حال میں نظر سے گزری(2)۔ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پرورش شاہی محل کے اندر ہوئی اور ہارونؑ کی آزاد اہل بادیہ کے درمیان، جو اہل بادیہ عرب کی طرح قوت تقریر وخطابت میں ممتاز تھے۔ اس لیے آپ نے بھی بڑے ہو کر بحیثیت خطیب و مقرر شہرت حاصل کی۔ اس بیان سے **ان شاء الله هو افصح منی** (3) کی تفسیر میں کام لوں گا۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی کام کی چیزیں کتب یہود میں مل رہی ہیں۔

ا۔ مناسب۔ لیکن عنوان ایسا ہو کہ تفسیر کا موقوف علیہ نہ سمجھا جائے کیونکہ محتمل الکذب کو مدار کیسے بنایا جائے۔ تائید کا مضائقہ نہیں۔

م۔ بیان القرآن کے چند مقامات پر آج پھر کچھ عرض کرنا ہے۔

جلد 4، ص 34۔ متن۔ س 4۔ لَمَّا جَاءَ تْنَا۔ اس کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ متن وتفسیر دونوں میں بڑھا دیا اس عبارت سے ''جب وہ احکام ہمارے پاس پہنچے''۔

م۔ ص 48۔ تفسیر۔ س 2۔ ''کثرت بارش کا طوفان''۔ طوفان کی تفسیر میں تو متعدد اقوال

---

(1) اب کچھ یاد نہیں پڑتا کہ مولانا کے اس اعلان ''شکر نعمت'' میں کون سی بات اس وقت کھٹکی تھی۔

(2) جیوش انسائیکلو پیڈیا میں۔

(3) اشارہ ہے آیات قرآنی کی جانب جہاں حضرت موسیٰؑ اپنے کو الکن اور حضرت ہارونؑ کو فصیح بتا رہے ہیں۔

آئے ہیں، اگر یہاں بھی کسی قدر مبہم وغیر متعین ہی رکھا جائے تو تاریخ سے قریب تر رہے۔

ا۔میں نے زیادت شہرت کو مرجح سمجھا۔زیادت شہرت کی روح المعانی میں تصریح ہے۔یہ احسن ہے کہ ترجمہ مبہم رہے اور اس پر یہ حاشیہ ہو جائے کہ اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں، زیادہ مشہور طوفان آب ہے۔

م۔ص50 ترجمہ۔س1 ''دریائے شور''۔بحر کا ترجمہ اگر مطلق دریا یا سمندر سے کیا جائے تو جغرافیہ سے اقرب ہو جائے، گو کوئی خاص اعتراض اب بھی وارد نہیں ہوتا۔

ا۔یہاں بھی اسی زیادت شہرت کو مرجح سمجھا گیا اور شہرت مشہور ہے۔یہاں بھی احسن ہے کہ ترجمہ مطلق رہے اور حاشیہ یہ ہو جائے کہ مطلق دریا بھی مراد ہو سکتا ہے اور زیادہ اطلاق دریائے شور پر آتا ہے، تاریخ سے تحقیق کر لی جائے۔

م۔ص50 متن۔س4۔بما کانو یفسقون۔اس کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔کاتب نے اس کے ترجمہ کو تفسیر میں بین القوسین کر دیا، وہ ترجمہ یہ ہے۔''ان کی اس عدول حکمی کے سبب'' اور تماشہ یہ ہے کہ لفظ ''ان کی'' قوسین سے خارج لکھا حالانکہ مجرد اس کلمہ کے کوئی معنی نہیں۔

م۔ص55۔س3 ''اس حال'' القصص کے ترجمہ میں صیغۂ واحد کو کیوں اختیار فرمایا گیا۔

ا۔یہ لفظ اصل میں واحد ہی ہے چنانچہ اسی صفحہ کے عربی حاشیہ میں اس کو بیان کیا گیا، ایک بڑا عمدہ قصہ اور سورۂ یوسف کے آخر میں جو قصصہم سے شبہ جمع کا ہو سکتا تھا اس شبہ کو عربی حاشیہ میں اس عبارت سے دفع کیا گیا، **اشارة الی کونه مصدراً بمعنی المخصوص اے جنسه الشامل للجمیع.**

م۔ص59۔ترجمہ۔س2۔''بشارت دینے والا اور ڈرانے والا'' اس عبارت میں قلب تو نہیں ہو گیا؟

ا۔یقیناً قلب ہو گیا۔یادداشت میں تنبیہ کر دی گئی۔

م۔ص69۔تفسیر۔س3۔''اس کا ظہور''۔لفظ ''اس'' کا مشارٌ الیہ صاف نہیں کھلتا۔اگر لفظ ''مصلحت'' یا ''جہاد'' یا ''معرکۂ قتال'' قوسین میں بڑھا دیا جائے تو مطلب واضح ہو جائے۔

ا۔ چونکہ اس کے قریب ہی لفظ ''حق'' بمعنی مصلحت مذکور ہے اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس ضمیر کا مرجع بن سکے اس لیے اس ترجمہ کو کافی سمجھا گیا۔ اب زیادہ توضیح کے لیے لفظ مصلحت بین القوسین بڑھادیا۔

تعجب و شکریہ۔ میں نے جلدی میں تفسیر پر نظر ثانی کی نہیں، اس لیے ایسی فروگزاشتیں عجیب نہیں لیکن دوسروں نے نظر کی ہے۔ بعض کو اجرت دے کر اصلاح کی نیت سے نظر ثانی کرنے کی فرمائش کی گئی۔ پھر بھی ایسے مقام رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس تنبیہ پر جزائے خیر بخشے۔ اس مجموعہ کو بشکل رسالہ تتمیم کے بعد انشاء اللہ شائع کر دیا جائے گا''۔

حضرت شرافت و عالی ظرفی کے تو پتلے تھے، کوئی ادنیٰ سی بھی خدمت کر دیتا تو آپ اس کے آگے بچھ جاتے۔ مکتوب کی یہ آخری سطریں اسی دعویٰ پر شاہد عادل ہیں۔

(83)

قرآنیات کا سلسلہ بحمد اللہ زوروں پر جاری ہے اور بعض مکتوبات میں تو بجز اس کے اور کوئی ذکر مذکور ہی نہیں۔ 9/مارچ کا عریضہ ملاحظہ ہو:-

م۔ ''بحمد اللہ نفس ترجمہ دس پارہ تک پہنچ گیا(1)

ا۔ مبارک، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

م۔ اب ترجمہ روک کر تحشیہ پارۂ دوم سے شروع کر رہا ہوں، دشوار تر منزل یہی تحشیہ کی ہے۔ وقت بھی اس میں بہت زائد لگتا ہے اور دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ دعا فرمائیں جن کا کام ہے وہی اس مشکل کو بھی آسان فرمائیں۔

ا۔ دل سے دعا ہے۔

تتمہ۔ اگر تحشیہ میں حضرت دیوبندی کے ترجمہ میں فوائد محررہ مولوی شبیر احمد صاحب اور ترجمہ مولوی حبیب احمد موسومہ حل القرآن جو محمد عثمان دہلوی رسالہ الہادی میں سورۂ ابراہیم کے ختم تک چھاپ چکے ہیں سامنے رہے تو اعانت کی امید ہے۔ پورا رسالہ لینا ضروری نہیں۔ امید ہے کہ مستقل بھی مل سکے گا۔ مولوی حبیب گو محقق نہیں مگر ذہین ہیں۔ فوائد میں کام کی باتیں لکھ جاتے

---

(1) مراد کلام پاک کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اردو ترجمہ کا اس وقت تک خیال بھی نہ تھا۔

ہیں۔ آئندہ جو مشورہ ہو۔

م۔ بیان القرآن کے دو چار مقامات سے متعلق آج بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

جلد 4۔ اِنّ اور انّ کا ترجمہ اکثر مقامات پر رہ گیا ہے۔ مثلاً صفحہ 120۔ س 1 انھم لمنکم کا ترجمہ یوں درج ہے "کہ وہ تم میں کے ہیں"۔ اس میں اگر "کہ" اور "وہ" کے درمیان کوئی لفظ "یقیناً" یا "ضرور" یا "بیشک" بڑھا دیا جائے تو شاید متن سے اقرب ہو جائے۔ اسی طرح صفحہ 13 پر متن کی آخری سطر میں انکم رضیتم میں اِنّ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ یادداشت میں لکھ لیا گیا ہے۔ غالباً بیشک کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔

م۔ تفسیر میں "کیونکہ" قوسین کے اندر ہے۔ کہیں یہ ناقل یا کاتب کی فروگزاشت تو نہیں؟

ا۔ قوس سے باہر تو ظاہراً نہیں ہو سکتا۔ کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو سکے۔

م۔ ص 13 متن۔ س 5۔ فاستاذنوک میں ک کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ لفظ "آپ سے" لکھ دیا گیا۔

م۔ ص 119۔ س 1۔ ان یقتل منھم میں منھم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے بھی نہیں لیا۔ اس کی یہ عبارت ہے "اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر اسی پر کہ وہ منکر ہوئے"۔ حضرت مولانا دیوبندیؒ نے بھی نہیں لیا (1)۔ غالباً محاورہ کی رعایت کو تحت اللفظ ترجمہ پر ترجیح دی ہے۔ تحت اللفظ سے سلامت نہیں رہتی۔ اس سے گنجائش تو معلوم ہو گئی لیکن اگر سلاست کے ساتھ آ جائے تو احوط ہے۔ سوچوں گا۔

م۔ ص 114۔ متن۔ س 3۔ فی الآخرۃ کے معنی عنوان البلاغۃ کے تحت میں تو فی جنب الآخرۃ بالکل درست و مناسب درج ہیں لیکن ترجمہ میں کوئی لفظ نہ ملا۔

ا۔ یہ عبارت ترجمہ و تفسیر دونوں میں بڑھا دی گئی۔ "آخرت کے مقابلہ میں"۔

م۔ ص 114۔ اِنَّمَا یَسْتَاذِنُکَ الَّذِیْنَ میں الَّذِیْنَ کا ترجمہ اگر بجائے "وہ لوگ" کے

---

(1) اس کتاب کے پڑھنے والوں کو اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے قرآن مجید کا کوئی مستقل ترجمہ نہیں کیا ہے۔ صرف شاہ صاحبؒ کے بعض الفاظ کی تسہیل و ترمیم کر دی ہے اور ایسے مقامات کو بالکل بدستور رہنے دیا ہے۔

''وہی لوگ'' کیا جائے تو کیسا ہے؟

ا۔ بہت مناسب ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے بھی کیا ہے۔

م۔ جناب والا نے حیرت ظاہر فرمائی ہے کہ نظر ثانی کے وقت دوسرے حضرات کی نظر بہت سی چیزوں پر نہ پڑی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو قدم قدم پر ہدایت واستفادہ مقصود تھا، اس لیے لفظ لفظ، حرف حرف، غور وتامل کے ساتھ پڑھا اور عبارت قرآنی سے نیز دوسرے تراجم وتفاسیر سے ملا ملا کر پڑھا۔ اس طرح نہ پڑھتا تو قیامت تک مجھے بھی نہ سوجھتا۔

ا۔ خیر۔ میرا تو کام بن گیا۔ تصحیح ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سب کام سنوارے۔

م۔ ایک بات اور بھی گستاخانہ عرض کردوں۔ اس کام میں جتنا گہرا اترتا گیا ہوں، بخدا اسی قدر آپ کی تفسیر کی عظمت ووقعت دل میں عقیدت مندی کی بنا پر نہیں علیٰ وجہ البصیرۃ بڑھتی گئی۔

ا۔ ایک درجہ عقیدت مندی کا یہ بھی ہے کہ عقیدت مندی کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

م۔ اور بعض اکابر حضرات کی قدر اس حیثیت سے کم ہی ہوتی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ حضرات آپ سے متقدم ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ استفادہ جناب کو بھی براہ راست یا بالواسطہ ان ہی حضرات سے ہوا ہو۔

ا۔ غلبۂ محبت نے اس طرف نظر نہیں جانے دی کہ اصول ان حضرات اکابر ہی کے ہیں جن سے تفریع کی ہمت ہوگئی۔ زمانہ کے اور طبائع کے اختلاف سے عنوان میں تفاوت ہوگیا۔ احسان ان ہی کا ہے۔ اصل کمال کپڑا بنانے والے کا ہے ورنہ پھول کاہے پر نکال لیے جاتے۔

م۔ میرے حق میں تو آپ کی تفسیر ایک نعمتِ عظیم ہے، بڑے بڑے اشکالات بات کی بات میں حل ہوجاتے ہیں۔

ا۔ طبائع میں فطری تناسب اس کا مدار ہے۔ بعض باورچیوں کے ہاتھ کی دال بعض کو قورمہ سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے۔

بعض اطلاعات ضروریہ

(1) آپ کے ایک سابق (1) کے جواب میں "لِیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ" کے متعلق کچھ لکھا تھا مگر لکھنے کے بعد بھی ذہن اس سے خالی نہیں ہوا۔ 16 ذی قعدہ کو قرآن مجید کا ایک دوسرا مقام یاد آ گیا۔ جہاں بغیر علم یقیناً لیضلونھم کے متعلق ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ "لِیَحْمِلُوْا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ" (سورۃ النحل خاتمہ رکوع ۳) اس بنا پر روح المعانی کی ترجیح مذکور اور میری توجیہ مذکور مخدوش ہو گئی۔

(2) غالباً اسی خط میں آیت "فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمُ الطُّوْفَانَ" الخ کے معانی متعددہ میں سے طوفان آب کی ترجیح کی بنا میں نے اس معنی کی زیادت شہرت کو لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک وجہ مرجح اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ لفظ اسی معنی میں وارد ہوا ہے۔ "فَاَخَذَھُمُ الطُّوْفَانُ" (عنکبوت۔ شروع رکوع 2)

اول میں اپنی رائے کی ترمیم ہے، ثانی میں تائید ہے۔

میں نے ان دونوں مضمونوں کو اس رسالہ میں لکھ دیا ہے جو جامع ہے آپ کے مکاتبات متعلقہ تفسیر کا۔ آپ کے شوق تحقیق پر نظر کر کے اطلاع دے دی"۔

کبھی کبھی یہ تفسیری مذاکرے ہلکے علمی مناظرے کا سا رنگ اختیار کر لیتے تھے۔ پھر ادھر کثرت سے جو یہود اور مسیحیوں اور مشرکوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، اس سے بھی قلب میں ایک عجیب طرح کی طمانیت محسوس ہونے لگی تھی اسے بھی حضرت کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری تھا۔

4/اپریل کا عریضہ ان رنگوں کا پورا مظہر ملے گا:۔

م۔ "بیان القرآن جلد اوّل ص 89۔ "لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ

(1) ملاحظہ ہو نمبر 82۔

وَالْمَغْرِبِ". اس کے تحت میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بر (نیکی) کو سارئ کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ خیال مبارک میں غالباً یہ رہی کہ جہت کا اہتمام کسی درجہ میں شریعت اسلامی کو بھی مطلوب ہے۔(1)

عرض یہ ہے کہ یہاں خطاب ان گمراہ قوموں سے ہو رہا ہے جن میں سے بعض جہت پرست تھیں یعنی ان کے نزدیک کوئی خاص جہت (خصوصاً مشرق) بجائے خود مقدس تھی۔ قرآن مجید تردید اسی گمراہی کی کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ تقدس فلاں اور فلاں جہت میں کہاں سے آیا، جہات تو سب اللہ ہی کی ہیں (للہ المشرق والمغرب) یہ نیکی کا انحصار تو فلاں اور فلاں عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ پر ہے۔

اسلام تو کسی جہت کی تقدیس کا ذرا بھی قائل نہیں۔ نماز تو ایک متعین مکان یعنی کعبہ کی جانب ہونا چاہیے، اب خواہ وہ کسی جہت میں بھی واقع ہو جائے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ کہیں سے کسی جہت میں پڑتا ہے اور کہیں سے کسی میں۔ بخلاف عیسائیوں کے جن کے ہاں جہت مشرق بجائے خود مقدس ہے ان کے گرجا ہمیشہ مشرق رویہ ہوتے ہیں خواہ پشت ہی بیت المقدس کی طرف کرنا پڑے۔ بیت المقدس قبلہ یہود کا ہے۔ رومی مشرکین چڑھتے ہوئے سورج دیوتا کی ڈنڈوت کے لیے مشرق کا رخ کرتے تھے۔ وہیں سے جہت مشرق کی تقدیس عیسائیوں نے بھی لے لی۔ قرآن مجید اس عقیدۂ جہت پرستی کی تردید کر رہا ہے جیسا کہ آگے چل کر "لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا" میں ایک دوسرے عقیدۂ فاسد کی تردید ہے۔ یہود کا اعتراض الگ تھا، اس کا جواب قرآن مجید دوسرے عنوانات سے دے چکا۔ باقی یہ نفی جو بار بار کسی خاص جہت کے تقدس کی ہو رہی ہے، اس کی مخاطب میری فہم ناقص میں یہی جہت پرست قومیں ہیں۔

(اگر یہ خطاب خاص جہت پرستوں کو بھی ہو تب بھی اس نفی کی بنا یہ نہیں ہو سکتی کہ جہت کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں۔ خاص شرائع میں خاص جہات کا قبلہ ہونا یہ خود اس کی مطلوبیت من وجہ کو بتلا رہا ہے بلکہ مطلق مطلوبیت بالذات کی قید لگائی جائے گی۔ سو میری تقریر اور آپ کی تقریر دونوں اس میں متماثل ہوئیں کہ مطلق بر کی نفی تو کسی توجیہ پر بھی مراد نہیں جیسا لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ

(1) بیان القرآن میں یہ تھا کہ ساری نیکی یہی نہیں ہے کہ تم لوگ اپنا رخ مشرق الخ

تَـاْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا میں مراد ہے کیونکہ وہ کسی درجہ میں بھی طاعت نہیں اور برمقید کی نفی دونوں توجیہوں پر مراد ہے۔ جیسے "لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" میں برمقید مراد ہے کیونکہ نفس بر مطلق اتفاق سے بھی حاصل ہے۔ صرف فرق دونوں توجیہوں میں یہ ہوا کہ آیت "لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ" میں آپ کی تقریر پر اس کی مطلوبیت میں بالذات کی قید لگائی جائے گی اور میری تقریر پر اس کی مطلوبیت میں کافی کی قید لگائی جائے گی۔ سو دونوں صحیح ہیں اور دونوں کا ایک ہی حاصل ہے۔ صرف عنوان اور عبارت کا فرق ہے اور ان دونوں توجیہوں پر خطاب عام بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اس حکم میں اہل کتاب اور اہل اسلام برابر ہیں کہ اپنی اپنی مشروعیت کے زمانہ میں سب کے قبلے طاعات مقصودہ بالغیر ہوتے ہیں اور طاعات مقصودہ بالذات نہ ہونے میں مشترک ہیں۔ البتہ جن کے قبلے پر کوئی دلیل صحیح قائم نہ ہوا گر وہ جہت مقدس بھی نہ ہوتب بھی اس سے بریت منفی ہوتی گو اعتقاد تقدس کا واجب ہوتا۔ مگر وہ محل بحث نہیں۔ اسی طرح جن جہات کا قبلہ ہونا ثابت ہے خواہ جہت کی خصوصیت کی بنا پر یا کسی بقعہ کی فضیلت کی بنا پر اگر اس جہت یا اس بقعہ کو کوئی مقصود بالذات سمجھنے لگے گا تب بھی بریت کی نفی کی جائے گی خواہ یہ اعتقاد کسی کتابی کا ہو خواہ مسلم کا، بہرحال حکم مذکور فی الحمل میں کسی قوم کی تخصیص نہیں، سب کے لیے عام ہے۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ کہ جہت کا کسی درجہ میں مطلوب ہونا اگر چہ وہ جہت کعبہ ہی ہو بوجہ مامور بہ ہونے کے آپ کی تقریر میں بھی منفی نہیں اور مقصود بہ بالذات کے درجہ میں مطلوب ہونا میری تقریر پر بھی لازم نہیں"۔

(84)

وہی خط ابھی چل رہا ہے:-

م۔ "مسئلہ تفسیری سے متعلق معروضہ ختم ہو چکا۔ اب ایک معاملہ اپنے قلب کا عرض کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں کتب تصوف، خصوصاً مثنوی، شرح مثنوی یا احیاء علوم الدین کا مطالعہ زیادہ رہتا ہے قلب میں ایک انشراح محسوس ہوتا رہتا ہے اور طبیعت پر رقت، حیثیت اور لینت کا غلبہ پاتا ہوں، خواب بھی اس زمانہ میں بڑے بڑے پاکیزہ نظر آتے ہیں لیکن اب ایک عرصہ سے یہ

کیفیات گویا بالکل بند ہیں اور گو جناب ہی کی زبان سے سن سن کر فقدان کیفیات پر زیادہ تشویش تو نہیں کرتا، تاہم کچھ نہ کچھ افسوس تو ضرور ہی رہتا ہے۔ اب مدت سے مثنوی وغیرہ کا مطالعہ ترک ہے اور بجائے اس کے ہزار ہا ہزار صفحات ملحدین، مشرکین و معاندین اسلام کے پڑھ رہا ہوں، یہ ظلمت و قساوت قلب کہیں اسی کا نتیجہ تو نہیں؟

ا۔ اس تفاوت کا یہی سبب ہے مگر اس کی حقیقت قساوت یا ظلمت نہیں کیونکہ حقیقی قساوت یا ظلمت ہمیشہ اعتقادی ہوتی ہے اور یہ کیفیت اور اثر طبعی ہے۔ جیسا ایک انقباض اور تکدر غلاظت کھانے سے ہو۔ یہ مشابہ ہے حقیقی قساوت و ظلمت کے اور ایک انقباض ہاتھ یا پاؤں میں نجاست لگ جانے سے۔ یہ مشابہ ہے اس کیفیت و اثر زیر بحث کے اور ظاہر ہے کہ غلاظت کا کھانا بوجہ معصیت ہونے کے مضر باطن ہوتا ہے اور نجاست بدن کو لگ جانا مضر باطن نہیں ہوتا بلکہ اگر بقصد تطہیر اپنے جسد کے یا غیر کے جسد کے ہاتھ لگانا پڑے تو بوجہ طاعت ہونے کے باطن کو زیادہ نافع ہوگا اور اس میں جو طبعی کدورت و کلفت ہوتی ہے وہ بہ وجہ مجاہدہ ہونے کے موجب اجر و قرب ہوگا اور اس کے بعد جو مٹی سے صابن سے رگڑ کر ہاتھ دھویا جائے گا پہلے سے زیادہ پاک ہو جائے گا۔ سو آپ ماشاء اللہ تطہیر میں مشغول ہیں، آپ کی طہارت اور نورانیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ البتہ ساتھ کے ساتھ صابن بھی استعمال میں رہے یعنی کسی قدر مطالعہ تصوف و ذکر اللہ۔

م۔ مسائل اسلام پر اعتراضات تو خیر ہیں ہی، باقی حضورؐ کی ذات گرامی کو ظالموں نے ایسا مسخ کر کر کے پیش کیا ہے اور نفرت پیدا کر دینے اور تمسخر دونوں کی غرض سے ایسے ایسے گندے اعتراضات تراشے ہیں کہ برداشت کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ یونانی فلسفہ کا تصادم صرف عقائد اسلام سے ہوا تھا، معاندین حال کا سارا زور حضورؐ کی شخصیت کے (خاکم بدہن) مٹانے پر ہے قالوا ساحر او مجنون، رجلا مسحوراً وغیرہ کی تفسیر گویا بر أی العین دیکھ رہا ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس مصارعت سے روح میں ایسی قوت پیدا کرنے کا سامان فرما دیا جس سے سب شیاطین الانس والجن کا قلب سے نکل جائے گا اور سب پر غالب آ جانے کی عادت کا مشاہدہ اور اطمینان ہو جائے گا۔

م۔ اہل یورپ کی ایک اور زبان یعنی فرانسیسی بغیر استاد کے حال میں پڑھنا شروع کیا ہے۔

خیال ہے کہ اس کے اندر بھی بہت کچھ مل جائے گا(1)۔ان ظالموں نے اسلام اور ذات رسولؐ پر حملے عجب عجب راہوں اور راستوں سے کیے ہیں۔دوسروں کا تو ذہن بھی ادھر نہیں پہنچ سکتا۔تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری اور حد یہ ہے کہ ان کی طب بھی اس زہر سے خالی نہیں۔طب کی کتابوں میں امراض دماغی کے تحت میں صرع کا بیان لکھتے لکھتے لکھ جاتے ہیں کہ (خاکم بدہن) عرب کے فلاں مشہور شخص کو بھی صرع کے دورے پڑا کرتے تھے۔

ا۔ قاتلھم انّٰی یوفکون. اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔جہاد اکبر اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا ہے مبارک ہو۔انشاء اللہ تعالیٰ سب پر غالب آئے گا''

حضرت سے مراسلت عموماً تو لفافہ ہی میں کرتا تھا لیکن بعض دفعہ پوسٹ کارڈ سے بھی کام چلا لیتا تھا۔کاش لفافہ ہمیشہ ہی لکھتا رہتا اس وقت ان کا یہ کیا خیال تھا۔لفافوں کی قدر تو اب ہو رہی ہے۔مولانا کے جو کارڈ جواب میں آئے ہوئے ہیں، اکثر ان سے اب کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ادھر کیا لکھ کر گیا تھا، جس کا یہ جواب ہے۔نقصان کتنا بڑا نقصان ہے لیکن پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ چار و ناچار بہرحال کام تو اب ان ہی کارڈوں سے لینا ہے۔کارڈ جس پر تھانہ بھون کی مہر 14اپریل کی ہے حسب ذیل ہے:

''مولوی شبیر علی نے رسالہ کے متعلق جواب لکھ دیا ہے، جو رائے ہو تحریر فرما دیجیے۔تفسیر کے دونوں مقامات درست کر دیے۔اوّل موقع پر نفی کا لفظ اس طرح دیا۔''صفات نقص کی نفی'' اور دوسرے موقع پر اس طرح لکھ دیا''اور جو کچھ خیرات تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو''۔شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے خیرات کا لفظ لکھا ہے اور دوسرے شاہ صاحبوں نے مال لکھا ہے، دونوں لفظ اچھے ہیں''۔

ظاہر ہے دونوں مقام بیان القرآن ہی سے متعلق ہوں گے۔پہلی آیت کا تو بالکل خیال نہیں آتا۔دوسری آیت وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ ہوگی۔

جس تحریر کا شروع مکتوب میں ذکر ہے وہ یقیناً حضرت ہی کا کوئی مقالہ مطبوعہ النور ہوگا؟

---

(1) اس زمانہ میں فرنچ بطور خود پڑھنی شروع کی تھی مگر زیادہ دن تک نہ چل سکی، کئی سال بعد جرمنی کا خیال ہوا اور اس کی کئی ابتدائی ریڈریں پڑھ ڈالیں۔مزید ترقی اس میں بھی نہ ہو سکی۔اصل سوال وقت ہی کا رہا۔

پشت کارڈ پر مولوی شبیر علی صاحب ایڈیٹر النور کی طرف سے حسب ذیل عبارت ہے:-

''مخدومی زاد لطفکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

وہ تحریر رسالہ النور میں طبع ہوئی تھی ۔ چار رسالوں میں ہے مگر وہ رسالے جلد سے علاحدہ نہیں ہیں ۔ اگر ارشاد ہو وہ جلد پوری ارسال کردوں ۔ یہ رسالے النور جلد 9 میں ہیں ۔ پوری جلد کی قیمت مع محصول خرچ رجسٹری 3 کل ہوں گے ۔ ''اور نقل میں تو بہت خرچ ہوگا'' ۔ (یہ فقرہ خاص مولانا کے قلم سے ہے)

اس کے بعد بھی بدقسمتی سے کارڈ ہی ہے ۔ اگرچہ خوش قسمتی سے اس کا مضمون محض خانگی قسم کا ہے، کسی علمی و دینی تحقیق سے متعلق نہیں ۔ اس پر تھانہ بھون کی مہر 21 مئی کی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے میری کوئی بچی اس وقت سخت علیل ہوگئی تھی ۔

''السلام علیکم ۔ بھلا ماں باپ کو تو کیوں نہ صدمہ ہوتا، خود میرے قلب پر عجب اثر ہے ۔ اس اثر سے مضطر ہو کر دعا کی اور کروں گا کہ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عاجل عطا فرمائے ۔ مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب خصوصیت سے ان امراض کے علاج میں مہارت رکھتے ہیں ۔ صبح و شام میں حج سے لوٹنے والے ہیں ۔ امید ہے کہ مجھ سے بھی ملنے آئیں گے ۔ اگر مفصل حال لکھ کر بھیجئے، ان سے مشورہ کرلوں گا ۔

تفسیر کی پسندیدگی سے دل خوش ہوا، قادیان سے تو انصاف کی کیا امید ہوتی ۔ اس وقت تو قاضیان سے بھی اس کی امید نہیں ۔ آپ کو پتہ لکھنؤ کا یاد نہیں رہا ۔ اب انکل پچو لکھ دیا ۔ خدا کرے پہنچ جائے'' ۔

یقیناً یہ کارڈ ایسا ہوگا جس کے جواب کی مجھے توقع ہی نہ ہوگی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں جوابی کارڈ کا پتہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھ بھیجتا ۔ میرے خط میں ذکر ہوگا کہ مریضہ کو لکھنؤ لیے جا رہا ہوں ۔ حضرت نے لکھنؤ ہی دفتر سچ کے پتہ پر کارڈ لکھا ۔ تفسیر اور قادیان کی تلمیحیں اب میرے لیے بھی بالکل چیستاں ہیں ۔

11 رجون کے مفصل عریضہ میں ایک حصہ تو وہی بیان القرآن سے متعلق ہے:-

م ۔ بیان القرآن جلد 6، صفحہ 17، آخری سطر میں یومئذ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا ۔

ا۔ یہ انتخاب کرنے والوں کی کوتاہی ہے۔ تفسیر میں یومئذ کا ترجمہ موجود ہے "اس روز" غلطی یہ کی کہ اس لفظ کو بین القوسین کر دیا۔ ممکن ہے میں نے جلدی میں کر دیا ہو مگر انتخاب کرنے والے ادنیٰ توجہ سے اس کو درست کر سکتے تھے۔ اب اس عبارت کو میں نے قوسین سے خارج کر دیا اور صرف لفظ "اے مخاطب" کو بین القوسین رہنے دیا۔

م۔ صفحہ 21 متن۔ سطر 3۔ كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ کا ترجمہ اگر بجائے "استہزا نہ کیا ہو" کے میں "استہزا نہ کرتے رہے ہوں" رکھوں تو کیسا ہے؟

ا۔ نہایت مناسب ہے۔ میں نے بھی ترجمہ وتفسیر دونوں میں یہی بنا دیا۔

م۔ صفحہ 38 سطر اوّل بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۔ غلام کا ترجمہ اگر بجائے "فرزند" کے میں "لڑکے" سے کروں تو کیا مضائقہ ہے۔ لغت میں تو غلام عام ہے۔ بیٹے کے معنی محض سیاق سے پیدا ہوئے ہیں۔

ا۔ بہت مناسب ہے میں نے یہی بنا دیا"۔

تفسیر والا حصہ تو ختم ہو گیا۔ باقی اس مکتوب میں کئی دوسرے اہم مسئلے بھی تھے۔

(85)

حضرت کے تعلقات مولانا سید حسین احمد صاحب سے ایک مدت تک بڑے مخلصانہ اور محبانہ رہے۔ 28 میں ان کے باہمی لطف وارتباط کی تفصیل ان ہی صفحات میں گزر چکی ہے۔ 33 بلکہ اس کے بعد تک بھی جوں توں نباہ ہوتا رہا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ شگفتگی رفتہ رفتہ انقباض میں اور بشاشت روز بروز گرانی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ چرچے خدام با اخلاص کی زبانوں پر بے تکلف آنے لگے۔ اب اس سے بڑی کشمکش ان لوگوں کو پیش آ گئی جو دونوں آستانوں کے نیاز مند تھے۔ بہرحال اس مکتوب میں ہمت کر کے ذرا اس کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا:

م۔ "النور کے ایک پچھلے پرچہ سے یہ معلوم کر کے بڑی ہی مسرت ہوئی کہ خواجہ صاحب جناب کی سوانح عمری مرتب کر رہے ہیں۔ (1)

---

(1) یہ خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب کی وہی سوانح عمری ہے جو اشرف السوانح کے نام سے تین جلدوں میں حضرت کی حیات ہی میں شائع ہو گئی تھی اور چوتھی جلد خاتمۃ السوانح کے نام سے حضرت کے بعد نکلی۔

ا۔صحیح خبر ہے جس میں مجھ سے شدید مجاہدہ کرایا گیا ہے، کئی طرح پر۔اوّل یہ کہ میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے وصایا میں اس کی سخت ممانعت کی ہے مگر دوسرے اس لیے کہ مجھ کو تصحیح کی غرض سے دکھلایا جاتا ہے جس سے بہت ضیق ہوتی ہے۔اس ضیق کا علاج میں نے ایک شعر سے کیا ہے جو تمہید میں لکھ دیا ہے۔

منش کردہ ام رستم داستان　　　　وگر نہ یلے بود در سیستان

م۔خدا ایسا کرتا کہ جلد سے جلد شائع ہو جاتی۔

ا۔کوشش جامع کی بھی یہی ہے مگر مزاج میں ان کے کاوش اور تطویل ہے جس کو میں بہت شدت سے روک رہا ہوں جس سے غالب امید ہے کہ زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔

م۔جی تو یہ چاہتا تھا کہ اشاعت سے قبل ہی اس سے مشرف ہو جاتا لیکن خیر یہ کہاں نصیب

ا۔اگر مسودہ یہاں ہوتا تو دکھلانا بہت آسان تھا۔تیار حصہ لکھنؤ چلا گیا، کاتب سے لکھوانے کے لیے۔

م۔فتنۂ قادیان کے سلسلہ میں ایک مسئلہ محض اپنی تشفی قلب کے لیے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر جو الزام اجرا نبوت کا عائد کیا گیا ہے تو اجرا نبوت کے تو اہل سنت بھی قائل ہیں، یعنی ظہور مسیح آخرالزماں کو مانتے ہی ہیں۔اب گفتگو تعیین شخص میں رہ جاتی ہے یعنی علامات و آثار مسیحیت کا مصداق آیا فلاں شخص ہے یا نہیں۔تو اس میں اجتہاد کی بڑی گنجائش ہے۔ اس پر مختصراً کچھ ارشاد فرما دیا جائے۔

ا۔اس کا دعویٰ صرف مسیح ہی کے ساتھ خاص نہیں جس میں شبہ مذکورہ فی السوال کی گنجائش ہو۔وہ تو مسیح غیر مسیح سب کے لیے نبوۃ کو ممکن کہتا ہے اس کے رسائل میں اس کی تصریح ہے۔پھر مسیح میں بھی بقائے نبوت سابقہ (جو کہ موصوف کا کمال ذاتی ہے جو بعد عطا کے سلب نہیں ہوتا بدوں ظہور آثار خاصہ تشریع وغیرہ جیسا خود عالم برزخ میں یہ کمال سب حضرات کے ذوات میں باقی ہے) عطائے نبوۃ کو مستلزم نہیں اور معانی ختم نبوۃ کے عطائے نبوۃ ہے جس کا وہ اپنی ذات کے لیے مدعی ہے کیونکہ یہ پہلے موجود نہ تھا تا کہ اس نبوۃ کو نبوۃ سابقہ کہا جا سکے۔نہ کہ بقا بشان مذکور اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

م۔ دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے، خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف کو دیکھ کر صحابۂ کرامؓ کے اختلافات تسکین وتشفی کے لیے سامنے نہ ہوتے تو دل بالکل ہی مایوس ہو کر رہتا۔

ا۔ واقعی سچی محبت اور خیر خواہی یہی ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اب میں بھی صدق وخلوص سے حقیقت عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حقیقت اس تحقیق کی میری بھی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ بالکل مبہم ہے، میرے ذہن کو مبہم سمجھنے کی عادت نہیں، ضرورت ہے کہ حسب ذیل نقشہ پر کر کے مجھ کو عطا فرمایا جائے تا کہ مجھ کو موقع ملے نظر کرنے کا اور نظر کرانے کا۔

اختلاف کا واقعہ جو اشرف علی کے متعلق معلوم ہوا	معلوم ہونے کا ذریعہ	مشورہ جس پر اشرف علی کو کار بند ہونا مناسب ہے

آخری ہفتہ جولائی میں دو بچیاں سخت قسم کے ٹائیفائیڈ بخار میں مبتلا ہوئیں۔ حسب دستور حضرت کے نام جوابی کارڈ دعا کے لیے لکھا۔ جواب 28 جولائی کا چلا ہوا حسب ذیل عنایت ہوا:

''بچیوں کی علالت سے دل دکھا بالخصوص ان کی پریشانی سے۔ دل سے دعا کرتا ہوں کہ بچیوں کو صحت کاملہ عاجلہ عطا ہو اور ان کی والدہ کو جمعیت وسکون۔ اگر بعد نماز فجر چینی کی تشتری پر سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ اور یہ دعا باوضو لکھ کر آب طاہر یا زمزم سے دھو کر سب کو پلا دیا جایا کرے تو امید نفع کی ہے۔ دعا یہ ہے، یا حی حین لاحی فی دیموتہ ملکہ وبقائہ یا حی''۔

معلوم ہوتا ہے زمانہ قریب ہی میں کچھ اور علالتیں بھی پیش آ گئی تھیں۔ 22 راگست کے کارڈ کا مضمون حسب ذیل ہے:۔

''صاحبزادی کی صحت سے بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ اب دوسرے صاحبوں کی علالت سے تعلق خاطر ہے۔ دل سے دعائے صحت عاجلہ کاملہ کرتا ہوں، واقعی بدنی ومالی کلفت دونوں موجب کلفت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی جمعیت

ظاہری و باطنی عطا فرمائے۔ بزرگان سلسلہ سے یہ دعا منقول ہے یا حی حین لا حی فی دیمومۃ ملکہ وبقائہ یا حی۔ بعد نماز فجر مع دعائے بالا چینی کی تشتری پر باوضو لکھ کر دھو کر پلایا جائے''۔

عجب اتفاق کہ اس طرف برابر پوسٹ کارڈ ہی اسی قسم کے خانگی مضامین کے آتے جاتے رہے۔ اکتوبر میں ارادہ تھانہ بھون کی حاضری کا کیا اور حسب معمول اطلاعی کارڈ لکھ دیا۔ 6/ اکتوبر کا جوابی کارڈ ملاحظہ ہو:

''الحمد للہ برخورداری کو صحت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ضعف بھی رفع فرمائے۔ مژدۂ تشریف آوری سے مسرت ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملادے۔ گو اس وقت آپ کے سفر سے قلب پر ایک گونہ خجلت کا اثر ہوتا ہے جو پہلے بھائی صاحب کے تشریف رکھنے سے کم ہوتا تھا لیکن مسرت کو بتکلف خجلت پر غالب کرنے کی کوشش کروں گا۔ دعا کا محتاج۔ اشرف علیؒ''۔

اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے رعایت جذبات کا! فرماتے ہیں کہ آپ مجھ سے ملنے سفر کر کے آرہے ہیں اس سے خجل ہوا جارہا ہوں۔ پہلے آپ کے بھائی صاحب سہارنپور میں تھے اور اب تو یہ سفر تمام تر میرے ہی لیے ہوگا۔ پھر بھی آپ کے آنے کی مسرت اتنی ہے کہ اس مسرت کو کوشش کر کے اپنی خجلت پر غالب کروں گا۔

دیوبند سے افسوسناک اختلافات روز بروز بڑھ ہی رہے تھے۔ حضرت مدت دراز سے مدرسہ دیوبند کے سرپرست اعلیٰ چلے آرہے تھے۔ اب حضرت کی نیک نفسی نے یہ گوارا نہ کیا کہ اختلاف کے باوجود بھی یہ سرپرستی قائم رکھی جائے۔ استعفیٰ تو حضرت اس سے قبل دے چکے تھے، اسے ارکان نے منظور نہیں کیا تھا۔ ایسی بزرگ عدیم المثال ہستی کی سرپرستی سے محرومی مخالفین تک کی نظر میں کوئی آسان اور معمولی بات نہ تھی۔ اب حضرت نے اپنی علاحدگی بالکل ہی طے فرمالی اور سنت حسنی کے اتباع میں اپنے کو اس منصب سے معزول فرمادیا۔ ارکان مدرسہ اس معزولی کو بھی کب گوارا کرنے والے تھے۔ اس لیے حضرت کو قرین مصلحت یہی معلوم ہوا کہ اس واقعہ خود معزولی کو بطور خود شائع و مشتہر کردیا جائے۔ اس خدمت کے لیے انتخاب اس خاکسار کا ہوا اور حضرت نے اپنے معمول عام کے خلاف مکاتبت میں ابتدا کر کے میرے نام حسب ذیل والا نامہ

ارسال فرمایا۔ ڈاکخانہ کی مہر اس لفافے پر 18 اکتوبر کی ہے:۔

(86)

''از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی جناب مولوی عبدالماجد صاحب سلمہٗ۔ السلام علیکم

ایک ناگوار تکلیف بادل نخواستہ خلاف عادت دے رہا ہوں۔ آپ کی عنایت سے امید ہے کہ گوارا فرمائیں گے۔ یہ ایک مسودہ دارالعلوم کی باضابطہ خدمت سے یکسوئی کا ہے۔ جس کو مدرسہ میں بھی بھیج چکا ہوں مگر وہ شاید شائع نہ فرمائیں یا جلدی شائع نہ فرمائیں اور خیرخواہان مدرسہ کے سکون کے لیے ضرورت ہے جلدی اشاعت کی۔ اس لیے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ جس پرچہ میں مصلحت سمجھیں شائع فرمادیں خواہ الصدق میں یا کسی اور میں (1) میرا تعارف مدیران جرائد سے خاص طور پر نہیں۔ اس لیے شاید میرے لکھنے سے شائع نہ کریں۔ آپ کے ایسے صاحبوں سے تعلقات ہیں۔ یہ بھی اختیار ہے خواہ اپنی رائے کے ساتھ شائع فرمائیں یا بدوں رائے کے اور رائے میں بھی بالکل آزاد ہیں۔ بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو کوئی گزند نہ پہنچے بلکہ اگر کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو تو مصلحت ہے ورنہ نہ نفع ہو نہ ضرر۔ والسلام

اگر ایک پرچہ میں بھی دیکھ سکوں تو دل چاہتا ہے گو عاریت سہی۔

میں نے خط کو حفاظت کے لیے قصداً آدھ آنہ کا بیرنگ کر دیا ہے۔ اگر ڈاک والے آدھ آنہ لیں تو ٹکٹ حاضر ہیں اور اگر ذہول سے نہ لیں تو ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجیے۔ اگر چاک کرنے کو دل گوارا نہ کرے کسی خط میں (جو خاص اس غرض سے نہ بھیجا جائے) مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں خرید کر کے چاک کر دوں گا''۔

حضرت عالی ظرفی اور شرافت نفس کے بادشاہ تھے۔ خود تنگ ہو کر مدرسہ سے الگ ہو رہے ہیں مگر یہ گوارا نہیں کہ مدرسہ کو کسی طرح بھی ضرر پہنچے بلکہ کوشش اسی کی ہے کہ ہو سکے تو نفع ہی پہنچ جائے! یہ شرافت نفس حصہ تھی مولانا کا اور پھر آخر خط میں ٹکٹوں کے بارہ میں احتیاط کا کمال۔ سچ یہ ہے کہ تقویٰ و تدین کا اب تک نام ہی سنا تھا۔ عملی نمونہ حضرت ہی کا دیکھا۔

---

(1) سچ پہلے ملتوی اور پھر بند ہو چکا ہے اور اب اس کی جگہ مئی 35 سے صدق نکل رہا ہے مگر اس وقت تک بجائے ہفت روزہ کے دہ روزہ۔

یہ تو مکتوب تھا۔ اب اصل اعلان برائے اشاعت ملاحظہ ہو:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. "انما المومنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم" الأية. حامداً ومصليا. احقر اشرف علی آیت کی بنا پر عرض رسا ہے۔ چونکہ آج کل مدرسۃ العلوم دیوبند کے ارکان نیز بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بنابر حسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا احوط ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت کا مسئلہ بھی ہے، جو میری آزادی پسند طبیعت پر سب سے زیادہ گراں بھی ہے اور آئندہ ناگوار آثار کے ترتب کا بھی احتمال ہے۔ اس لیے احتیاطاً واخذاً بالعزیمہ حضرت سیدنا حسنؓ کی سنت کے اتباع میں نفس سرپرستی ہی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں۔ جو حقیقت میں تجدید اعادہ استعفٰی سابق ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد بقیہ مسائل جلد ہی سہولت سے حل ہو جائیں گے لیکن مدرسہ کی ہر خدمت مقدورہ سے انشاءاللہ تعالیٰ تقاعد نہ ہوگا۔ واللہ الموفق۔ فقط مقام تھانہ بھون 4 رجب جمعہ 1354۔

اضافہ۔ البتہ جن صاحبوں نے اس معاملہ میں حدود شریعت وتہذیب سے متجاوز ہو کر میرا دل دکھایا ہے، ان سے خاص تعلقات رکھنے سے معذور ہوں گا جب تک اس دلآزاری کا تدارک نہ کریں۔ گو عام اسلامی تعلقات باقی رہیں گے۔ اشرف علی۔ 8 رجب 54

ایسی خدمت کی تعمیل میں ظاہر ہے کہ ادھر سے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ خدمت کے ایسے موقع کو تو اپنی سعادت سمجھا اور پہلی ڈاک سے 11 اکتوبر کو یہ جواب عرض کر دیا:-

م۔ "نامہ مبارک کل موصول ہوا، ایسے وقت کہ ڈاک کا وقت نکل ہی رہا تھا۔ ایک اخبار کو تو تحریر گرامی میں نے اسی وقت روانہ کر دی۔ باقی دو تین اخبارات کو نقول آج روانہ کر رہا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ خدام والا کی جو ادنٰی سی ادنٰی خدمت مجھ سے بن پڑے میرے لیے باعث سعادت ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ جزیلہ عنایت فرمائے۔

م۔ واقعہ علاحدگی سے گو مجھے صدمہ تو بہت ہوا۔

ا۔ یہ اقتضائے طبعی ہے جس کا منشا محبت طبعی ہے۔

م۔ لیکن پھر دوسرے پہلوؤں پر نظر کر کے خوشی ہوئی۔

ا۔ یہ اقتضائے عقلی ہے جس کا منشا حب عقلی ہے اور یہ دونوں محبتیں ایک دوسرے پر جزئی تفاضل رکھتی ہیں لیکن کلی طور پر حبِ عقلی افضل و اکمل و انفع ہے مگر تجربہ سے اس میں ایک قید بھی ہے کہ وہ کسی قدر حب طبعی سے منسوب بھی ہو۔

م۔ صدق کی اشاعت میں ابھی ایک عشرہ کا وقت ہے۔

ا۔ مجھے جلدی نہیں۔ مرکز پر جلدی اطلاع کرنا تھی سو کر چکا اور دونوں جماعتوں کو اور اخباری اطلاع صرف مصالح مدرسہ کے لیے ہے سو اس میں اس سے زیادہ توقف بھی مضر نہیں۔

م۔ اس میں انشاء اللہ اس واقعہ کو ''ایثار کا ایک نمونہ'' کی سرخی کے تحت میں درج کروں گا اور لکھوں گا کہ اس نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔ دوسرے اخبارات کو بھی یہی مشورہ دے رہا ہوں۔

ا۔ یہ محض آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میرے نزدیک اس کی حقیقت واقعیہ یہ ہے کہ۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں　　　کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

م۔ اس طرف کچھ خانگی حالات ایسے پیش آ گئے کہ حاضری کی توقع عنقریب نہ رہی۔

ا۔ طبیعت کے خلاف اس سے مجھ کو بھی مسرت عقلی ہوئی کہ اس وقت تک تشویشناک خبروں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

م۔ ڈاک والوں نے آدھ آنہ بیرنگ کے لیے اس لیے ٹکٹوں کے چاک کرنے کا سوال ہی نہ رہا۔

ا۔ اطمینان ہو گیا''۔

خیر یہ سب مضامین تو خطوط میں اتفاقی اور عارضی ضروریات کے تحت میں آ جاتے تھے۔ باقی مستقل موضوع مراسلت تو وہی تفسیر القرآن چل رہا تھا۔ 11 دسمبر 35 (14 رمضان المبارک 1354) کا عریضہ اسی رنگ میں ہے:

م۔ ''بیان القرآن جلد 2 ص 171۔ سطر متن 2۔ لَفِیْ شَکٍّ مِنۂ. مِنۂ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اب بنادیا اس طرح وہ ان کی طرف سے غلط خیال میں الخ

م۔جلد 1 ص 40۔سطر متن 3۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا . وَلَقَدْ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اب بنادیا اس طرح ''اور یہ تحقیق ہم نے الخ

م۔جلد 1۔ص 44۔سطر متن 1۔عنداللہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اب ترجمہ وتفسیر دونوں میں اس طرح بنادیا ''عالم آخرت اللہ کے نزدیک محض الخ

م۔جلد 2۔ص 176۔وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ۔تفسیر میں یہ عبارت درج ہے ''اور نہ مقرب فرشتے کبھی عار کریں گے جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں جن کو الٰہ کا ایک جز مانتے ہیں'' اس پر عرض یہ ہے کہ عیسائی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے جز تثلیث ہونے کے مطلق قائل نہیں۔یہ التباس غالباً لفظ روح القدس سے پیدا ہوا۔روح اللہ تو صرف ہماری اصطلاح میں جبرئیلؑ کے مرادف ہیں ورنہ عیسائیوں کے ہاں تو بالکل الگ ایک ہستی ہیں، جن کا جبرئیلؑ یا کسی فرشتہ سے کوئی تعلق نہیں۔

البتہ عیسائیوں کا سواد اعظم کل ملائکہ، مقربین خصوصاً حضرت میکائیلؑ کو خدائی میں کسی حد تک دخیل وشریک سمجھتا ہے اور ان سے روزانہ اپنی دعاؤں میں استعانت واستمداد کرتا رہتا ہے، جیسے ہمارے ہاں کے غالی اہل بدعت بزرگوں اور پیروں کے ساتھ معاملہ کرتے رہتے ہیں۔میری فہم ناقص میں یہ قرآنی اشارہ اسی عقیدۂ فاسد کی جانب ہے، جیسے دوسری جگہ ملائکہ کا وصف عبادالرحمٰن کہہ کر یہ بتادیا گیا ہے کہ انھیں خدائی میں کچھ دخل نہیں وہ تو محض بندے ہیں۔مذاہب غیر کی کتابیں جتنی زیادہ پڑھتا جاتا ہوں، اتنا ہی قرآن پاک کا اعجاز دل میں اور زیادہ اترتا جاتا ہے۔ قوموں کی قومیں ایسی گزر چکی ہیں جنھوں نے آسمان کو دیوتا مانا ہے، زمین کو دیوی سمجھ کر پوجا ہے۔ ہوا، بارش، رعد، برق، رات ودن، شجر، حجر، حیوانات سب کی پوجا کی ہے۔قرآن مجید جو بار باران سب کو مختلف پیرایوں میں محض مخلوق بتاتا ہے، اس کی حکمتیں اب کھلتی جاتی ہیں ورنہ اب تک تو کبھی کبھی یہ شبہ پیدا ہوجاتا تھا کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقتوں کو بار بار بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ا۔ مجھ کو اس کی تحقیق نہ تھی۔ واقعی روح القدس کے متعلق یہی خیال تھا کہ جیسے ہم اتباعاً للقرآن روح القدس کا مصداق حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہتے ہیں اسی طرح عیسائی بھی کہتے

ہیں۔اب معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک دونوں کے مفہوم میں تغائر ہے مگر یہ پتہ نہیں کہ اس روح القدس کی حقیقت کیا ہے۔آیا کوئی فرشتہ ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے تب تو تفسیر کی عبارت میں بجائے لفظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے روح القدس کا لفظ بدل دینا کافی ہے اور اس صورت میں اس کا تعلق مسئلہ تثلیث سے رہے گا جس کا اوپر سے ذکر ہے اور اگر وہ ان کے نزدیک فرشتہ نہیں تو عبارت تفسیر کی اس طرح بدلنا مناسب ہوگا'' نہ مقرب فرشتے (کبھی عار کریں گے جن کو بعضے شرک شریک الوہیت مانتے ہیں خود ان سے کوئی پوچھ دیکھے) تو اس تقدیر پر اس کا تعلق خاص مسئلہ تثلیث سے نہ ہوگا مطلق شرک سے ہوگا جس کو اوپر تقریر ربط میں عام رکھا ہے۔

م۔خدام والا خدا کرے ہر طرح بخیریت ہوں۔

ا۔بحمد اللہ تعالیٰ مدت سے بالکل بعافیت ہوں، اس کے قبل دو مرتبہ پیچش میں مبتلا ہو گیا تھا، جس کا اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ کوئی اثر نہیں۔آپ کی خیریت مع متعلقین مطلوب ہے''۔

(87)

خط میں زیادہ دیر تو عموماً ہونے ہی نہیں پاتی تھی، اب میرے ذخیرۂ خطوط میں جہاں کہیں لمبا وقفہ نظر آتا ہے، تو اس کا سبب یا تو یہی ہوگا کہ اس درمیان میں میں خود تھانہ بھون حاضر ہو گیا ہوں گا اور یا پھر بدقسمتی سے اس درمیان کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔بہرحال اس 11 دسمبر والے خط کے بعد عریضہ 8 فروری 36 کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے۔حسب دستور تفسیر قرآنی کا ایک درس:-

م۔''تفسیر بیان القرآن جلد 3 ملاحظہ میں رکھ لی جائے۔

صفحہ 92 س 1 فی حدیث غیرہ۔ترجمہ'' کوئی اور بات'' درج فرمایا گیا ہے۔مفہوم تو بیشک اس سے ادا ہو گیا لیکن یہ صاف نہ ہوا کہ ضمیر مذکر واحد غائب کس لفظ کی جانب ہے۔اسم اس کے قریب تو صرف آیات آیا ہے۔

ا۔آیات ہی طرف ہے، یہ تاویل حدیث یا قرآن کذا فی روح المعانی۔اب اس طرح ترجمہ کر دیا'' یہاں تک کہ وہ اس بات (یعنی قرآن) کے علاوہ''۔

م۔ص 97۔س 3 متن۔ حنیفا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔تفسیر میں ہے ''یکسو ہو کر'' جو غلطی سے قوسین کے اندر لکھ دیا، اس لیے ترجمہ میں نہیں لیا گیا۔اب قوسین سے باہر کر دیا گیا۔

م۔ص99۔س1 - حکیم علیم کا ترجمہ ''بڑا علم والا، بڑا حکمت والا'' درج ہے۔یہ قلب ترتیب قصداً فرمایا گیا ہے یا محض سہو کتابت ہے؟

ا۔سہو ہے اور سہو بھی میرا۔

م۔ص101وصفحہ102۔وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ الخ۔ اس پوری آیت کی تفسیر خوب دلنشین نہ ہوئی۔دوسری تفاسیر سے مراجعہ کے بعد بھی شرح صدر خاطر خواہ نہ ہوا۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ یہ قول تو بظاہر مشرکین کا معلوم ہوتا ہے کہ وہی سرے سے سلسلۂ وحی کے منکر تھے۔یہود اس سے یکسر انکار کیسے کر سکتے تھے۔شان نزول کی روایات تو چنداں قوی ہوتی نہیں، البتہ اعتراض کا جو جواب قرآن مجید نے دیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ قول یہود کا تھا۔

ایک خیال یہ آیا کہ مشرکین ہی کا ہوگا اور جواب الزامی بھی ان ہی کے مقابلہ میں ہے۔اس لیے کہ یہود کے صاحب کتاب ہونے کے وہ بھی قائل تھے لیکن تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ اور تُبْدُوْنَهَا اور تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کی سہ گونہ تصریح نے اس خیال کو بھی جمنے نہ دیا۔اس لیے کہ یہ تینوں اعمال تو یقیناً یہود ہی کے تھے۔بہر حال ابھی تک حیص بیص میں پڑا ہوں۔

ا۔اس اشکال کا احساس مجھ کو بھی ہوا مگر میں نے تفسیر میں اسی کو ترجیح دی کہ یہ یہود کا قول ہے۔اس پر دو اشکال واقع ہوئے ایک یہ کہ سورۃ مکی ہے اور یہود سے مناظرہ مدینہ میں، عربی حاشیہ میں یہ دیا گیا۔ اجیب باستثناء هذه الأيات من المكية كما اخرجه ابو الشيخ الخ وفي تفسير الخازن عن ابن عباس نزلت سورة الانعام بمكة الاست آيات منها قوله وما قدروا الله حق قدره فانها نزل بالمدينة دوسرا اشکال یہ کہ یہود ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔اس کا جواب تمہید میں دیا گیا بقول ''جوش میں آکر''۔اور عربی حاشیہ میں اس کی مزید تفصیل کی گئی في المعالم في القصة ان مالك بن الصيف لما سمعت اليهود منه تلك المقالة عتبوا عليه وقالوا اليس الله انزل التورٰة علٰى موسٰى

فلم قلت ما انزل الله علیٰ بشر من شئ قال فقال مالک بن الصیف اغضبنی محمد فقلت ذالک فقالوا له وانت اذا غضبت تقول علی الله غیر الحق فتنفرعوہ من الحبریة وجعلوا مکانه کعب بن الاشرف ۔اس سے اقرب کوئی توجیہ ذہن میں نہیں آئی اور اس میں کچھ بعد بھی نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کی ایک نظیر یہود سے منقول ہے۔ من قولہ تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا سَبِیْلاً۔

اس تحریر کے بعد ایک اور توجیہ بہت اقرب ذہن میں آئی جس میں نیشاپوری سے کچھ مدد ملی روایات میں ہے کہ جس یہودی نے یہ بیہودہ بات کہی تھی اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا انشدک بالذی انزل التورٰۃ علیٰ موسیٰ اما تجد فی التوراۃ ان الله یبغض الحبر السمین وکان حبراً سمیناً فقال والله ما انزل علیٰ بشر من شئ الخ رواہ ابن جریر بسندہ عن سعید بن جبیر ۔اس پر نیشاپوری نے ایک قول نقل کیا ہے وقیل اللفظ وان کان مطلقاً بحسب اللغة الا انه مقید بتلک الواقعة فکانه قال ما انزل الله علیٰ بشر من شئ فی انه یبغض الحبر السمین الخ اب تو اس میں یہ بعد نہ رہا کہ یہود ایسی بات کیونکر کہہ سکتے تھے۔ البتہ ایک اور اشکال واقع ہوتا ہے جس میں نیشاپوری نے بلا جواب نقل کیا ہے بقوله ویرد علیٰ ھذہ التوجیه ان قوله من انزل الکتاب الذی جاء به موسیٰ لایکون مبطلا بکلام الخصم ۔مگر الحمد للہ میرے ذہن میں اس کا جواب آ گیا۔ وہ یہ کہ گو نیت قائل کی تقیید کی ہو لیکن لفظ میں اطلاق جو دال ہے عموم پر خود خلاف دین ہے اور صیغتاً مستلزم ہے مطلقاً انزال کی نفی کو اور تنبیہ ہے اس کلام مطلق کی شناخت پر۔ اس کی نظیر یہود کا وہ قول ہے اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ، کہ انھوں نے یہ قول بطور الزام کہا تھا مگر یہ قول بلفظه دلالت علی الالزام میں کافی نہیں بلکہ دال ہے دعویٰ پر اس لیے اس پر تشنیع کی گئی ذکرته فی رسالتی الخطاب الملیح.

م۔ کلام پاک کے دقائق و نکات تو خیر الگ رہے، میں تو اب یہ کہتا ہوں کہ سادہ عبارت کے لحاظ سے بھی اس کا پوری طرح سمجھ لینا اور پھر اسے دوسری زبان میں ادا کر دینا انتہائی دشوار کام ہے۔

ا۔واقعی دشوار ہے۔مگر اللہ تعالیٰ سہل فرمادیتے ہیں۔(1)

م۔ضمائر میں بہت الجھتا رہتا ہوں۔نیز اس قسم کی ترکیبوں میں ولیکون۔کلام ماسبق سے ربط ملانے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے۔

ا۔ضرور دقت ہے لیکن یہاں بھی وہی استثنا ہے۔

م۔اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کا ترجمہ جیسا کہ اس کا حق ہے،اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔"جن پر تیرا غضب نازل ہوا" یہ محض مفہوم ہے،ترجمہ نہیں،ایک تو ضمیر تیرا کا اضافہ کرنا پڑا دوسرے صیغہ کو معروف سے مجہول بنانا پڑا۔میرا دل تو اس قسم کی ترکیب ڈھونڈتا ہے جو"مغضوب ہیں" یا"جن پر غضب کیا گیا ہے"۔

ا۔میں نے اپنا ترجمہ دیکھا،اس کے یہ الفاظ ہیں"ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا" اس میں اگر لفظ(آپ کا) کو خطوط وحدانیہ میں ہو تو غالباً سب رعایتیں محفوظ ہو جائیں۔

م۔لوگ اپنی عام عقیدت کی بنا پر حضرت شاہ صاحبؒ کے(2) ترجمہ کو بہترین کہتے ہیں، لیکن میں تو اب اپنے تجربہ وبصیرت کی بنا پر حلف لینے کو تیار ہوں کہ جو جو رعایتیں بیان القرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان کا شاہ صاحبؒ کے ہاں پتہ بھی نہیں۔ہاں شرف اولیت بیشک ان ہی کو حاصل ہے۔

ا۔اس پر بجز اس کے اور کیا عرض کروں کہ رائی اور مرئی کا تناسب شرط رویت ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر اور ترجمہ کے دقائق غامض ہیں،ان پر حضرت والا دیوبندیؒ کی نظر پڑی اسی لیے انھوں نے کلام اللہ کی خدمت کے لیے ان کے ترجمہ کو منتخب فرمایا۔مقدمہ میں اس ترجمہ کے کچھ غوامض ورعایات کی توضیح بھی فرمائی ہے۔ایک بڑے نے دوسرے بڑے کا ادراک فرمایا اور میں چھوٹا تھا۔میرے التزامات ورعایات چھوٹے درجہ کے ہیں جو زیادہ غامض نہیں۔آپ بھی حضرت مولاناؒ سے چھوٹے تھے ان کا ادراک آپ کو ہوا(3)۔مصرع انہی تناسب کے متعلق مشہور ہے۔

خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو

---

(1) اس مختصر سے جواب کی جامعیت لاجواب ہے۔

(2) یعنی شاہ عبدالقادر دہلویؒ (3) اس جواب کی لطافت،بلاغت،حلاوت وجد آفریں ہے۔

میں نے اس سے دو مصرع حسب مقام بنائے ہیں۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دو باطن بیں

اور

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دو ظاہر بیں

معذرت۔ مجھ کو مضمون بڑھنے کا گمان نہ تھا ورنہ اوّل جدا کاغذ سے شروع کرتا۔ مطالعہ کی پریشانی معاف کیجئے''۔

حضرت کا جواب علاوہ میرے اصل خط کے کاغذ کے دو الگ پرچوں پر آیا تھا۔ یہ معذرت اسی کے متعلق ہے۔ اللہ اکبر، کسی دوسرے کو ایسی معمولی اور خفیف چیزوں کی طرف خیال ہی کیوں جانے لگا تھا؟

(88)

حضرت کی اصل اور سب سے بڑی حیثیت معالج نفس ہی کی تھی اور ادھر اپنے میں تفسیر نویسی کی برکتوں کے باوجود یہ نہیں ہوا تھا کہ نفس خبیث اپنی شرارتوں اور خباثتوں سے باز آ گیا ہو اور علاج و مسلسل علاج کی ضرورت جاتی رہی ہو۔ وقتاً فوقتاً حضرت کی خدمت میں برابر امراض نفس کے لیے چارہ جوئی جاری رہی۔ 30 مارچ کا عریضہ تمام تر اسی کے نذر کرنا پڑا۔ امراض، پوشیدہ و ظاہر، تو خدا معلوم تعداد میں کتنے تھے لیکن غصہ کا مرض سب سے زیادہ مستمر، بے پناہ اور لاعلاج سا نظر آیا۔ ڈیڑھ صفحہ کا عریضہ اپنے بیجا غصہ کا کچا چٹھا ہے، خصوصاً ملازم پر اور بالکل تنگ آ کر حضرت سے استدعا کی ہے۔ پورے خط کی نقل بے نتیجہ ہوگی۔ صرف آخر کا حصہ درج ہے:۔

''......چند ہی منٹ بعد جو سکون ہو جاتا ہے تو اپنے اوپر خوب ملامت کرتا ہوں، طرح طرح کی غیرت دلاتا ہوں کہ نفس کی اس فربہی کے ساتھ اور اسی ظرف پر مفسر قرآن بننے کے حوصلے ہیں، بزرگوں کے بھلا یہی طریقے رہے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے نفس کے لیے انتقام لینا جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے خادموں کے ساتھ حضورؐ کا کیا برتاؤ تھا۔ غلاموں پر سختی کے لیے کیا وعیدیں آئی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں یاد آتی ہیں مگر سب بعد از وقت۔ عین وقت پر جب جنون سا سوار ہوتا ہے ان میں سے کسی شے کا بھی استحضار نہیں رہتا۔

کچھ روز سے ہر نماز فرض کے بعد بالالتزام اس کے لیے بھی دعا کرتا رہتا ہوں لیکن ابھی تک وہ بھی غیر موثر رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک لمبا وقفہ جب ہو جاتا ہے تو کچھ امید بندھنے لگتی ہے کہ بس ایکبارگی پھر دریا کا بند جیسے ٹوٹ جاتا ہے اور کی کرائی کوشش رائگاں جاتی ہے۔ اب للہ جناب ہی کوئی علاج تجویز فرمائیں''۔

حضرت کے ہاں سے جواب وہی مرحمت ہوا جس کی توقع ہی حکیم الامت سے کی جاسکتی تھی:

بیماری کا علاج بیمار کیا کرے۔ میں خود اس بلا میں مبتلا ہوں لیکن اگر ایک بیمار کو کوئی نسخہ یاد ہو خواہ خود استعمال نہ کرے تو دوسرے کو بتلا دینے کا مضائقہ بھی نہیں۔ اس حیثیت سے کچھ عرض کرتا ہوں کہ یہ حالت یا واقعہ دو سبب سے مسبب ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ غصہ کے وقت اس کے میقات یاد نہ رہیں، دوسرا یہ کہ باوجود یاد رہنے کے قوت وہمت ضبط کی نہ ہو۔ اگر اول سبب ہے تو اس کی یہ تدبیر ہے کہ ایک پرچہ غصہ مفرطہ کی ابجدون کا لکھ کر کلائی پر باندھ لیا جائے، اس پر نظر پڑتے ہی یاد پڑ جائے گا اور اگر دوسرا سبب ہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ فوراً وہاں سے خود علاحدہ ہو جائیں یا مغضوب علیہ کو جدا کر دیں۔ جب ہیجان بالکل فرو ہو جائے اس وقت اطمینان سے سوچا جائے بلکہ کسی عاقل سے مشورہ لیا جائے کہ اس جرم کی کیا سزا مناسب ہے، بعد تامل یا مشورہ جو طے ہو اس کو بلا کر اس سزا کو جاری کر دیا جائے مگر ہر حال میں اتنی ہمت کی ضرور ضرورت ہے کہ تدبیر کو اختیار کر لیا جائے، اگر کسی میں اتنی بھی ہمت نہیں تو پھر بجز خرق عادت کے کوئی علاج نہیں اور وہ کسی کے قبضہ میں نہیں''۔

غزالیؒ وغیرہ نے جو علاج غصہ کے بتائے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر اچھے خاصے ہیں لیکن اس غزالیٔ وقت کے تجویز کیے ہوئے علاجوں کی شان ہی کچھ اور ہے۔

موضع پھریا ضلع اعظم گڑھ کے ایک فاضل بزرگ مولانا حمید الدین تھے۔ مولانا شبلی کے عزیز قریب، ادبیات عربی کے ماہر اور قرآن کے بڑے گہرے طالب علم۔ انگریزی میں بھی گریجویٹ۔ جو کچھ لکھتے عموماً عربی ہی میں لکھتے۔ تفسیر قرآنی ایک خاص فلسفیانہ اسلوب پر کرتے اور متعدد تفسیری رسالوں کے مصنف تھے۔ ایک مدرسہ بھی ان کے خاص انداز پر چلایا ہوا مدرسۃ الاصلاح کے نام سے سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں قائم تھا۔ ان کی تفسیر نظام الفرقان کا تذکرہ ان

اوراق میں 29 کے واقعات کے ذیل میں آ چکا ہے۔ 30 میں وفات پائی۔ چند سال بعد ان کے بعض ناتمام قلمی مسودے بجنسہ اسی صورت میں شائع کرائے گئے۔ ان میں یقیناً بعض الفاظ دینی حیثیت سے بیجا اور قابل گرفت موجود تھے (نظر ثانی کے وقت مولانا خود ان کی اصلاح کر دیتے) مولوی صاحبان تو ایسے موقع کی تاک ہی میں لگے رہتے ہیں اور یہاں تو پھر ایک مدرسہ بھی اس مدرسہ کے مقابل تھا، زور شور سے تکفیر ہونے لگی اور مکفرین میں مولانا کے بعض شاگردوں کے ساتھ ساتھ خود حضرت مولانا کا نام بھی آنے لگا۔ یہ سب تمہید ذہن میں رکھ کر اب میرا معروضہ 26 جون کا ملاحظہ ہو:

م۔ ''مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ایک کارکن اور رسالہ الاصلاح کے مدیر کا (1) ایک خط میرے نام پیشتر بھی آیا تھا۔ اب کل پھر آیا ہے۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''مولانا تھانوی کا فتویٰ شائع ہو گیا۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کافر ہیں (1) اور چونکہ مدرسہ ان ہی دونوں کا مشن ہے، اس لیے مدرسۃ الاصلاح مدرسۂ کفر و زندقہ ہے اور اس کے تمام متعلقین کافر و زندیق ہیں، یہاں تک کہ جو علما اس مدرسہ کے جلسوں میں شرکت کریں وہ بھی ملحد و بے دین ہیں...... افسوس کہ اصل فتویٰ نہ مل سکا۔ مل جاتا تو اصل یا نقل آپ کی خدمت میں بھیج دیتا (2)...... عام مولویوں کی شکایت فضول ہے۔ ان سے توقع ہی کسے تھی۔ البتہ بڑی مایوسی مولانا تھانوی سے ہوئی (3)...... جن دو عبارتوں پر مولانا حمید الدین کی تکفیر کی گئی ہے ہر چند کہ میرے نزدیک وہ بالکل واضح ہیں تاہم آپ کی ہدایت کی تعمیل میں ان دونوں کی تشریح جون کے پرچہ الاصلاح میں چھپ گئی ہے''۔

ا۔ (1) اس کا جواب میری تحریر کلی میں معروض ہے۔

(2) وہ میرے پاس بھی نہیں مگر بعض اجزا جو فتویٰ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں غالباً غیظ اس نسبت کا سبب ہے۔ امید ہے کہ وہ اجزا اس فتویٰ میں نہ ملیں گے۔ شاید روایت بالمعنیٰ کو کذب سے بچنے کے لیے کافی سمجھا گیا ہو گا مگر ہر روایت بالمعنیٰ کو اس شان کا سمجھنا غلط ہے۔

(3) اس کا عذر تحریر کلی میں مرقوم ہے۔

---

(1) یعنی مولوی امین احسن صاحب اصلاحی

م۔مولانا حمید الدین مرحوم کی خدمت میں مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا ہے۔اپنے علم میں اتنی دینداری اور حیثیت میں نے بہت کم لوگوں میں پائی ہے۔دین پر ادنی اعتراض سن کر جوش سے بھر جاتے تھے۔میں نے خود اپنے دور الحاد میں (1) بارہا ان کی ڈانٹ کھائی ہے۔ایک دن خود مولوی شبلی صاحب نے (جو آخر میں خود بھی بہت درست ہو گئے تھے) قرآن مجید کے متعلق شوخی سے گفتگو کی تھی۔مولانا حمید الدین کو گویا بخار چڑھ آیا اور جب تک مفصل تردید نہ کر لی چین سے نہ بیٹھے۔نماز کے عاشق تھے،تہجد گزار تھے،وقس علیٰ ہذا اور یہ مشاہدات تنہا میرے نہیں،مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بھی انشاءاللہ پوری شہادت دیں گے۔

ا۔میں تو شہادت کا بھی محتاج نہیں اور شہادت کے بعد تو کوئی حق بھی نہیں ان واقعات میں شبہ کرنے کا لیکن ان سب کے ساتھ یہ مقدمہ بھی جائز الذہول نہیں کہ یہ سب اعمال واحوال ہیں۔عقائد ان سے جداگانہ چیز ہیں۔صحت عقائد کے ساتھ فساد اعمال واحوال اور فساد عقائد کے ساتھ صحت اعمال واحوال جمع ہو سکتا ہے۔

م۔ایک طرف یہ سب کچھ ہے،دوسری طرف یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ جناب والا آسانی سے کسی کلمہ گو کی تکفیر کرنے والے نہیں،خدا معلوم کیا صورت واقعات پیش آئی جو یہ نوبت آ کر رہی

ا۔تحریر طویل میں معروض ہے۔

م۔لفظ ''غیر انسب (2) '' اور اسماء سوء والی عبارت یہ دونوں مجھے بھی کھٹکے تھے لیکن دل نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یا تو یہ الفاظ مولانا کے ہیں ہی نہیں،کاتبوں نے خدا معلوم کیا سے کیا کر دیا اور یا اگر ان ہی کے ہیں تو یقیناً بے خیالی میں قلم سے نکل گئے اور ان کا وہ مطلب تو ان کے ذہن میں ہو بھی نہیں سکتا جو بظاہر ان سے متبادر ہوتا ہے۔

ا۔مجھ سے یہ دونوں لفظ پڑھے نہیں گئے۔نہ کچھ یاد آیا۔نہ وہ عبارتیں سامنے ہیں کہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔

م۔اور مولانا کی وہ تحریر تو چھپنے کے لیے تھی بھی نہیں۔خود اپنے لیے بطور یادداشت لکھی تھی

---

(1) یہ دور کالج کی طالب علمی کے زمانہ 1908 سے لے کر 10،11 سال تک قائم رہا۔
(2) کا استعمال بعض الفاظ قرآنی کے متعلق۔

معتقدین نے خواہ مخواہ بلاترمیم واصلاح بجنسہٖ شائع کردی۔

ا۔مگر کسی محقق متقیظ عالم سے مشورہ کرلیا جاتا۔

م۔مجھے اپنی جگہ پر تو یقین ہے کہ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو بلا تامل ایسی عبارتوں کو بدل دیتے۔

ا۔ان جذبات پر فضل کیا بعید ہے۔

م۔خدمت والا میں چونکہ بہت گستاخ ہوں۔اس لیے بلا تکلف یہ سب عرض کر ڈالا۔

ا۔ایسی گستاخی و بے تکلفی کا تو بھوکا ہوں مگر دوسرے لوگ نفرت وغصہ سے کہتے ہیں،اس لیے بشر بن جاتا ہوں اور بشر بھی وہ جس میں باجارہ ہے اور شر مجرور۔

م۔خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس قدر بے چین ہو رہا ہوں۔

ا۔مسلمان کا تو یہ تمغہ ہے۔

چو از محنت دیگران بے غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی

م۔مدرسہ کی حمایت میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے جیسی آزادی آج کل سب کہیں ہے،مدرسہ میں بھی ہوگی۔مجھے تو جو کچھ عرض کرنا تھا،وہ صرف مولانا مرحوم کی ذات سے متعلق ہے۔

ا۔اس انصاف وغیر جانبداری پر دعا بلکہ دعائیں نکلتی ہیں۔

میں رسائل کا منتظر ہوں(1)

م۔ابھی یہ معروضہ بالکل خانگی حیثیت رکھتا ہے۔صرف جناب والا کے ملاحظہ کے لیے۔

ا۔انشاءاللہ تعالیٰ اسی پر عمل ہوگا۔البتہ میری تحریر کلی میں بعض چیزیں طالب علموں(2) کے لیے مفید ہیں۔ان کو یادداشت میں رکھنے کے لیے ایسے عنوان سے نقل کرالوں گا کہ کسی کو نہ واقعہ معلوم ہو نہ اصحاب واقعہ کا نہ آپ کے خطاب کا پتہ چلے۔اسی لیے رسالہ الاصلاح کا نام کاٹ دیا ہے اور اس کو ابھی شائع نہ کیا جائے گا بلکہ بعد غور کے جب کہ اس میں نہ خود کوئی در د محظور و معلوم ہو نہ کسی دوست کی تنبیہ سے۔چنانچہ نقل کی تمہید کی یہ عبارت ہے:

''احقر نے ایک ایسے فتویٰ پر دستخط کر دیے جو بعض صاحبان کی بعض عبارت کے متعلق تھا۔

---

(1) یعنی وہ رسالے جو مولانا شبلی اور مولانا فراہی کی صفائی میں لکھے گئے تھے۔

(2) حضرت کی اصلاح میں اس سے مراد علما ہوتے تھے۔

ایک مخلص دوست کی اطلاع پر بعض نقول میں تردد ہوگیا، اس کے متعلق ذیل کا جواب لکھا گیا۔

اب اس کے آگے حضرت کی وہ مفصل اور کلی تحریر ہے جس کا حوالہ مکتوب بالا میں بار بار آیا ہے۔

(89)

''از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی دام لطفہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

پرسوں رسالہ اور کل الطاف نامہ پہنچا، رسالہ کے بعد خط کا انتظار تھا کیونکہ رسالہ بھیجنے کی غایت معلوم نہ ہوئی تھی، خط سے سب معلوم ہوگیا۔

اس خیر خواہی و رہنمائی کا شکر گزار ہوں، آپ سے بوجہ آپ کے خلوص کے کچھ تکلف نہیں اور میں تو کسی سے بھی تکلف و تلبیس نہیں کرتا، اس لیے بے تکلف عرض کرتا ہوں، سب سے پہلے بعض مقدمات عرض کرتا ہوں، پھر مقصود عرض کروں گا اور سب مختصر ہوگا۔

(1) مفتی کا منصب قانون داں وکیل کا ہوتا ہے قاضی کا نہیں ہوتا، یعنی قاضی کا حکم فیصلہ ہوتا ہے اس لیے اس پر واجب ہے کہ واقعات کی تنقیح کرے، مفتی کے ذمہ یہ نہیں، اس کے قول کا حاصل محض قانون بتلانا ہوتا ہے، وہ بھی پوچھنے پر، تمام بار سائل پر ہوتا ہے بلفظ دیگر اس کا قول قضیہ شرطیہ ہوتا ہے، یعنی اگر یہ واقعہ اس طرح ہے تو اس کا قانونی حکم یہ ہے، حدیث صحیح میں تصریح ہے کہ ہند نے اپنے شوہر ابوسفیانؓ کی تنگی خرچ کی شکایت کرکے استفتا کیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدوں تنقیح واقعہ کے ارشاد فرمایا خذی (ھلا اذنہ کما ھو مصرح فی سوالھا) ما یکفیک وولدک وبالمعروف اگر مفتی باوجود کسی قسم کی ذمہ داری نہ ہونے کے کوئی احتیاط کرے وہ تبرع ہے جو لازم نہیں۔

(2) کبھی وہ اس تبرع یعنی احتیاط کو اختیار کرتا ہے جہاں دوسرا پہلو یعنی عدم تبرع کا قوی نہ ہو اور کبھی وہ اس کو اختیار نہیں کرتا جہاں خاص احتیاط کرنے میں کوئی قوی مفسدہ ہو اور مفسدہ کا قوی وضعیف ہونا اس کے اجتہاد پر ہے اور نیک و بد ہونے کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

(3) انشا اور موافقت میں بھی فرق ہوتا ہے، یعنی ایک تو خود کسی قول کا دعویٰ کرنا، دوسرے کسی دوسرے کے قول کے ساتھ موافقت کرنا، اوّل میں زیادہ تحقیق کرنا ہے، ثانی میں تھوڑی بھی

گنجائش ہوتی ہے اس میں مخالفت نہیں کرتا۔

ان مقدمات ثلثہ کے بعد واقعہ عرض کرتا ہوں، مستفتی نے میرے سامنے واقعات پیش کر کے جواب چاہا، میرے قویٰ بھی مضمحل ہو گئے، مشاغل کا بھی ہجوم ہو گیا، میں نے جواب لکھنے سے عذر کر دیا کہ اور صاحبوں سے لکھوا لیا جائے، انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر میرے سامنے جواب پیش کیا، واقعات مسئول عنہا کی تحقیق کو میں نے اپنے نزدیک ضروری نہیں سمجھا دو وجہ سے، ایک تو مقدمہ اوّل کی وجہ سے، دوسرے مستفتی کے علم و تدوین کی وجہ سے، جواب چونکہ سوال کے مطابق تھا میں نے موافقت پر دستخط کر دیے، یہ ضرور ہے کہ اگر میں خود جواب لکھتا اسی میں عنوانات و معنونات دونوں میں زیادہ رعایت کرتا مگر چونکہ موافقت میں توسع ہوتا ہے مقدمہ ثالثہ کی وجہ سے اس لیے میں نے اس میں تنگی نہیں کی۔

(4) چونکہ مجھ سے یہ ظاہر کیا گیا جس کی تکذیب کی کوئی دلیل بھی میرے پاس نہ تھی کہ بہت سے لوگ نئے خیال کے اس مدرسہ سے بگڑ رہے ہیں اور بہت لوگ پرانے خیال کے بگڑنے کو ہیں اور اکثر لوگ متردد ہیں اور حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں اس لیے اس فتویٰ کی سخت حاجت ہے۔ ان حالات کو سن کر تبرع و احتیاط کے پہلو پر انتظام کا پہلو غالب آیا اور احتیاط معتاد کو لازم نہیں سمجھا بنا بر مقدمۂ ثانیہ، اتنا پھر بھی کیا کہ مستفتی کو سوال میں کسی کا نام لکھنے سے نہایت تاکید کے ساتھ روک دیا تا کہ فتویٰ کا محل کسی کی ذلت نہ ہو، محض وہ عقائد ہوں پھر مجھ کو معلوم نہیں انھوں نے کس مصلحت یا ضرورت یا کس کے مشورہ سے طباعت کے وقت بین القوسین غالبًا نام بھی لکھ دیے، غالبًا انھوں نے اس ہیئت کو عرف کے سبب سوال سے خارج ہونے کے لیے کافی سمجھا جس میں میں موافق نہیں۔ سوال میں خاص رسالہ سے جو مضمون نقل کیا گیا ظاہر ہے کہ اس کو جس شخص کے سامنے پیش کیا جائے گا وہ وہی جواب دے گا جو اس سوال پر لکھا گیا۔ اب دوسرا رسالہ آنے سے ضرور تردد ہو گیا کہ آیا منقول عنہ سابق میں اسی طرح ہے جو سوال میں نقل کیا گیا ہے یا اُس طرح ہے جو دوسرے رسالہ میں لکھا گیا ہے، اس لیے میں آج خط لکھ کر مستفتی صاحب سے منقول عنہ منگاتا ہوں پھر تطابق و عدم تطابق کو دیکھوں گا اور اس کے بعد اس کے متعلق کچھ عرض کر سکوں گا، اگر انھوں نے کسی عذر سے یا کسی خاص مقتضا سے رسالہ نہ بھیجا تو آپ سے درخواست کروں گا کہ

کسی سے مستعار بھجوا دیجیے، میں نے سب واقعہ بدوں افراط وتفریط کے لکھ دیا، اب حالت موجودہ میں آپ سے بھی مستفیدانہ مشورہ طلب کرتا ہوں کہ مجھ کو مختلف حالات میں کیا کرنا مناسب ہے کہ کسی خاص کو بھی ضرر نہ ہو اور عوام کو بھی ضرر نہ ہو۔ میں بشرط سمجھ میں آجانے کے دل وجان سے اسی پر عمل کروں گا، والسلام۔

یہ تو عرض کلی تھی، اب بعض جزئیات خود الطاف نامہ کے حواشی پر عرض کرتا ہوں اور یہ حواشی وہی ہیں جو پچھلے نمبر میں سلسلہ وار نقل ہو چکے۔

دنیا بھی ایک عجیب وغریب جگہ ہے، عجیب سے عجیب واقعات جن کا سمجھ میں آنا مشکل ہوتا ہے، مولانا حمید الدینؒ خود ایک بڑے متقشف عالم تھے۔ کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ نوبت ان کی تکفیر کی آئے گی لیکن آئی اور بالکل بلا وجہ بھی نہیں، خلاف احتیاط اور قابل گرفت الفاظ بیشک ان کی ایک یادداشت میں نکلے، جسے ان کے شاگرد مولوی امین احسن صاحب اصلاحی (1) نے بجنسہٖ اسی صورت میں چھاپ دیا تھا۔ رہے مولانا شبلی تو ان کی الکلام میں قابل گرفت عبارتیں برسوں پیشتر سے لکھی چلی آرہی تھیں، میرے یہ دونوں بزرگ بڑے محسن اور عملاً استاد تھے، ان کی جائز حمایت ونصرت میں (جو اس وقت عین حق والنصاف کی حمایت تھی) جو کچھ بھی عاجزانہ کوششیں بن پڑیں، کی گئیں اور شکر ہے کہ حضرت کے ہاں حضرت ہی کی انصاف پسندی اور اعتدال دوستی کی بنا پر بڑی حد تک کامیاب ومقبول ہی ہوئیں۔

مولوی شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری اور مولانا سید سلیمان ندوی آج 1948 میں ماشاء اللہ دونوں ایک دوسرے کے دوست ومحب اور حضرت ہی کے دونوں خلیفہ مجازین ہیں، 1936 میں صورت حال اس کے برعکس تھی، مولوی شاہ عبدالغنی صاحب مع ساری جماعت اشرفیہ کے اس طبقہ کے شدید مخالف تھے جس کی سیادت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی غازی مسعود علی ندوی کے ہاتھ میں تھی! سید صاحب کی متعدد تحریریں اس زمانہ میں شائع ہوئیں اور غازی صاحب کے خانگی خطوط میرے نام داد وتحسین کے آتے رہے، ان سب کی تفصیل الگ کی جائے تو یہ بحث خود

---

(1) یہ وہی صاحب ہیں جو اس وقت (50 میں) پاکستان میں مولانا مودودی کے نائب کی حیثیت سے مقیم ہیں، اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں استاد اور ماہنامہ الاصلاح کے ایڈیٹر تھے۔

ایک رسالہ کی ضخامت اختیار کر لے اور پھر حکیم الامت کی ذات سے براہ راست اس کا تعلق بھی نہیں، حضرت سے تفصیلی مراسلت اس موضوع پر کچھ روز تک جاری رہی اور مولانا حمید الدین مرحوم کی صفائی ایک بڑی حد تک ہوگئی۔

4/ جولائی کا عریضہ اسی بحث سے پیدا ہونے والے حالات سے لبریز ہے۔

م۔ ''گرامی نامہ نیز مفصل کلی تحریر نے سرفراز کیا، بحمد اللہ ایک بڑی بار قلب سے ہٹ گیا، میں نے دونوں تحریریں جناب کا انتظار کیے بغیر مولانا مناظر احسن صاحب (1) کی خدمت میں بھیج دی ہیں۔

ا۔ درکار خیر حاجت اذن واشارہ نیست۔

م۔ اب جو کچھ عرض کرنا ہے، انشاء اللہ موصوف ہی کریں گے۔

ا۔ ٹھنڈے دل سے دیکھوں گا۔

م۔ اس کے بعد بھی کچھ ضرورت باقی رہی تو یہ نامہ سیاہ بھی عرض کردے گا۔

ا۔ بہتر۔

م۔ آج دو امور اور عرض کرنا چاہتا ہوں جن کا اس موضوع سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں البتہ وہ خیالات پیدا اسی سلسلہ میں ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ بے احتیاط مصنفین بارہا اپنے قلم کی رو میں بالکل بے خیالی سے ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جو بجائے خود نہایت گستاخانہ بلکہ ملحدانہ ہوتے ہیں لیکن ان بیچاروں کی کبھی بھی یہ نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو اس کے برعکس عین خدمت اسلام ونصرت دین ہی کی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص کے ساتھ میری فہم ناقص میں معاملہ ہمیشہ نرمی وآشتی کا رکھنا چاہیے، یعنی صرف یہ تنبیہ کافی ہو جانا چاہیے کہ ایسے الفاظ سے خوف کفر کا ہے نہ یہ کہ انھیں واقعتاً کافر بنا کر دشمنان دین ومعاندین اسلام کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔

ا۔ بعض اوقات یہی طرز نافع ہوتا ہے لیکن بعض اوقات مضر بھی ہوتا ہے، اگر ان کو نہیں تو دوسروں کو، غرض یہ ایک امر اجتہادی ہے، پھر جب ان کی نیت کی بنا پر ان کے ساتھ نرمی مناسب

(1) کہ انھیں بھی میری ہی طرح مولانا حمید الدین مرحوم کی صفائی کی فکر تھی۔

ہوسکتی ہے، اسی طرح زجر کرنے والوں کی نیت بھی خدمت دین وحفاظت کی ہوسکتی ہے ان کو بھی معذور سمجھنا چاہیے، حق تعالیٰ کے نزدیک دونوں مستحق رحمت ہوسکتے ہیں، کسی کی شخصی مصلحت پر نظر ہوتی ہے کسی کی جمہوری مصلحت پر۔

م۔ دوسری چیز میرے ذاتی تجربہ کی ہے، انگریزیت کے اثر سے مدتوں ملحد رہ چکا ہوں، سرکار رسالتؐ سے نعوذ باللہ ایک عناد کی کیفیت تھی، مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ کی جلد اوّل اس وقت شائع ہوئی، عبارت، اسلوب بیان وغیرہ بالکل ہم انگریزی خوانوں کے مذاق کے مطابق تھا اسی دور میں اس کا مطالعہ میرے حق میں اکسیر ہوگیا۔

ا۔ بالکل تصدیق کرتا ہوں مگر بہت سے آزاد لوگوں کو ضرر بھی پہنچ رہا ہے کہ تمام اکابر امت اوران کی روایات کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اوران تصانیف کو تائید تمسخر بناتے ہیں۔

م۔ فرنگی شیاطین نے جتنے الزامات عائد کیے تھے سب کی تردید ہوگئی اور دل نے کہا کہ یہ صاحب بیشک ملک عرب بلکہ نوع انسان کے بڑے مصلح تھے، نہ معاذ اللہ ڈاکو اور ظالم تھے اور نہ عیش پرست وطالب جاہ بلکہ بڑے اچھے انسان تھے قابل تعظیم۔ آج اپنے ان خیالات پر بھی ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت کے لحاظ سے یہی بڑی نعمت تھی، آپ حضرات کی تصانیف کی طرف تو اس وقت میں رخ بھی نہیں کرسکتا تھا، نام ہی سے نفرت وبیزاری اور بدعقیدگی تھی، اس منزل میں دستگیری شبلی ہی جیسے مصنفین کے ذریعہ ہوئی۔

ا۔ مسلّم ہے مگر اس کی دوسری جانب بھی مسلّم ہونا چاہیے"۔

(90)

م۔ "مقصد گزارش یہ کہ اس قسم کے حضرت کا بھی وجود کفر والحاد کے مقابلہ میں ایک بڑی سپر کا کام دیتا ہے۔

ا۔ مگر دوسرے زخمی بھی ہورہے ہیں، ان پر شمشیر کا کام دیتا ہے، اب اس کا فیصلہ محض نیت واجتہاد پر ہے، تسامح کرنے والا بھی معذور اور تشدد کرنے والا بھی۔

م۔ اور یہ سب اپنی اپنی فہم وبصیرت کے مطابق اسلام کے خادم بھی ہیں، دشمن یا مخالف نہیں دوست کیسا ہی نادان سہی بہرحال ہوتا دوست ہی ہے۔

ا۔ یہ قاعدہ تو قادیانی کے حق میں بھی جاری ہوتا ہے، آخر اس کی کوئی حد ہونا چاہیے۔

م۔ آپ حضرت جس معیار سے گرفتیں کرتے ہیں وہ بجائے خود بالکل صحیح لیکن ہم انگریزی خوانوں کی، اس منزل میں، نظر ان مفاسد پر تو پڑتی نہیں، ہمیں تو اسلام سے قریب لانے میں یہ تحریریں بہرحال معین ہی ہوجاتی ہیں۔

ا۔ تو اس بنا پر اعتزال وارجاو جبر وقدر واخراج ورفض سب محل سکوت رہیں گے۔

م۔ مجھ سے کئی سال ہوئے ایک اردوخواں شخص نے جو محض ناول افسانے وغیرہ پڑھنے کا عادی تھا، قرآن مجید کا اردو ترجمہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، میں نے صلاح دی کہ شروع ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے کرو لیکن دو ایک سال بعد جب اسے دو ایک بار پڑھ چکو تو بس اس کے بعد اسے بالکل چھوڑ دو، پھر مولانا تھانوی کا ترجمہ رکھو، صحیح ومستند وہی ہے لیکن وہاں تک تمھیں لانے کے لیے یہ زینہ کا کام دے گا۔

ا۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ تدبیر کہیں نافع بھی ہے کہیں مضر بھی، تو یہ مشورہ مجھ جیسے قاصر النظر ضعیف القلب کو تو دیا جاسکتا ہے اور اکثر مواقع پر نری میرا طریق بھی ہے مگر عام مشورہ دینا مصالح انتظامیہ کو برباد کرنا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، جیسا کہ ہر جج کو رائے دی جائے کہ مجرم کو بری کردیا جائے اس سے اس کے اندر اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ یہی کہے گا کہ شریف طبیعت کا تو یہی خاصہ ہے مگر لئیم تو زیادہ جسور ہوجائے گا اس لیے ہر جج ایسا نہیں کرسکتا''۔

حضرت کی بہت زیادہ تحریروں سے تو اطمینان ہوجایا ہی کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس ارشاد سے پوری تشفی اب تک بھی نہیں ہوئی ہے اور نہ جج کو ہر مجرم کے علی الاطلاق بری کردینے کی تمثیل سمجھ میں آئی جج کو مشورہ تو صرف یہ دیا گیا تھا کہ مجرم کو سزا محض صورت جرم پر نہ دے دی جایا کرے بلکہ پہلے حقیقت جرم کی بھی خوب تحقیق کرلی جائے کہ بہت سے جرم صرف صورتاً ہوتے ہیں اور ان کے مرتکب کی تو بعید نیت بھی قانون شکنی ونافرمانی کی نہیں ہوتی۔

اس والا نامہ کا آخری ٹکڑا:۔

''اطلاع کارروائی متعلق فتویٰ:۔ ارادہ تھا کہ اس کارروائی کی تکمیل کرکے اطلاع عرض کروں مگر ایسے موانع پیش آئے کہ اب تک قاصر رہا، ان موانع کی اجمالی فہرست یہ ہے کہ مجھ کو

ایک روز بخار آ گیا جو اتر تو گیا مغرب ہی کے وقت مگر اس میں ایسی سمیت تھی کہ مدتوں تک کے لیے ناکارہ کر دیا، اب بفضلہ تعالیٰ قریب قریب اصلی حالت ہونے لگی، پھر مہمانوں کا ہجوم متواتر رہا، پھر اس کی بھی تدبیر سوچتا رہا کہ مستفتی کی رائے کو بھی بقدر جائز نرم کیا جائے، خط کے جواب کا انتظار ہے، ان موانع سے جواب میں دیر ہوگئی اور ابھی غالباً پانچ چار روز کی اور دیر لگے، پھر آج خیال ہوا کہ خلاف معمول توقف ہونے سے آپ کو انتظار کی تکلیف ہوگی، موجودہ حالت ہی کی اطلاع کر کے رفع انتظار کر دوں، پھر بعد فراغ اس وقت کی حالت کی اطلاع دوں گا اس لیے آج یہ خط بھیج رہا ہوں، عنقریب مکمل اطلاع کروں گا، اسی کے ساتھ ساتھ جون کا رسالہ واپس کر دوں گا"۔

اللہ اللہ! حضرت کو اپنے خوردوں کا بھی کس درجہ لحاظ رہتا تھا۔

اسی کے چند روز بعد ذیل کا والا نامہ جس پر تاریخ درج نہیں موصول ہوا:-

"مکرمی! السلام علیکم، حسب وعدہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کے مرسلہ رسالہ کو دیکھ کر جو مضمون لکھا، پھر جولائی کا جو رسالہ جو مدرسہ سے آیا تھا دیکھ کر اس کا ضمیمہ لکھا، یہ سب ملاحظہ کے لیے مرسل ہیں، دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ اوّل علالت کا اضمحلال رہا، جواب بالکل نہیں، پھر اضیاف کے ہجوم سے خلوءِ ذہن کے ساتھ مطالعہ یا سوچنے کا وقت نہ ملا، پھر مستفتی صاحبوں کو اطلاع کر کے متوقع موافقت فی الرجوع کا رہا مگر زیادہ انتظار کو پسند نہ کر کے آج بھیجتا ہوں۔

یہاں ترتیب سے اپنے لمبر (2) پر یہ مضمون النور میں شائع ہوگا جس کی مدت کا اندازہ نہیں ہوسکتا غالباً کئی مہینے ضرور لگیں گے، اگر وہاں جلدی اشاعت میں مصلحت ہو میری طرف سے عام اجازت و آزادی ہے، والسلام، اشرف علی عفی عنہ"۔

اس مکتوب گرامی کے پہنچنے کی تاریخ میرے قلم کی لکھی ہوئی، 26/جولائی ہے۔(3)

مناظرہ شروع ہو چکا تھا، تحریریں فریقین کی طرف سے نکلنے لگی تھیں، اپنی والی حقیر کوشش برابر یہ تھی کہ آگ زیادہ پھیلنے نہ پائے اور کم از کم حضرت تھانویؒ تو ضرور اس سے باہر نکل آئیں۔

---

(1) یعنی رسالۃ الاصلاح (2) غالب کے اتباع میں حضرت بھی انگریزی کے "نمبر" کو اردو میں "لمبر" لکھتے تھے۔
(3) پاکستانی اضافہ۔(قاسمی)

مولانا فراہیؒ کی طرف سے صفائی پیش کرنے والے علاوہ اس خاکسار کے حضرت فاضل گیلانی بھی تھے اور مولانا سید سلیمان ندوی کی حالت عجیب نازک سی اور حسرت انگیز تھی، ایک طرف ان کی عقیدت حضرتؒ کے ساتھ بڑھ رہی تھی اور ندویت سے نکل کر وہ دیوبندیت (یا تھانویت) کی طرف آرہے تھے کہ درمیان میں ایسی ناخوشگوار تکلیف دہ رکاوٹ پیش آگئی۔ مولانا فراہیؒ کے اور ان کے ایک عمر کے گہرے تعلقات تھے، سید صاحب کی طرف سے معتقدانہ، انھیں وہ نظر انداز کر کے کیسے خاموش رہ سکتے تھے، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین اپنے دونوں بزرگوں کی طرف سے صفائی اور دفاع میں قدرتاً ان کا قلم حرکت میں آچکا تھا اور میں اپنے دل میں کڑھ ہی کڑھ رہا تھا، یہ تھی صورت حال جب حسب ذیل عریضہ 26رجولائی 36 کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا گیا، ''م'' سے اشارہ میری طرف ہے اور ''ا'' سے حضرت تھانویؒ کی جانب۔

م۔ سیدی ومطاعی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ا۔ والسلام علیکم

م۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن صاحب کی مطبوعہ تحریریں بہ غرض ملاحظہ ارسال خدمت ہیں۔

ا۔ میں اپنا مضمون جو اس لفافہ میں ملفوف ہے روانہ کرنے کو تھا کہ آپ کا یہ مقالہ آگیا جو اس لفافہ سے مقصود ہے وہ پہلے ہی میں لکھ چکا، یہ آپ کی محبت ہے کہ سب واقعات پیش کر دیے مگر الحمدللہ مجھ کو نہ اخبار کا انتظار نہ اخبار کا کوئی اثر، حق جب طریق سے ثابت ہو جاتا ہے، الحمدللہ اس کا اتباع کرتا ہوں۔

م۔ مشیت میں جو کچھ ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے، میں نے بہت چاہا کہ قبل اس کے کہ ادھر سے سلسلۂ تحریر شروع ہو، آپ کا اور مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کا بیان شائع ہو جائے(1)

ا۔ یہ آپ کی محبت ہے مگر مجھ کو مستفتی کے خط کا اس لیے انتظار رہا کہ شاید وہ کوئی سہل سبیل نکالیں، مجھ کو تو سب ہی کے مصالح پر نظر رہتی ہے مگر جب انتظار کی حد ہو گئی تو میں نے جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا، جو ملاحظہ سے گزرا ہوگا، پھر کل مولانا سید سلیمان صاحب کا مضمون دیکھا اس پر جو کچھ لکھا

---

(1) دونوں حضرات اس وقت تک اپنے فتویٰ تکفیر سے رجوع کر چکے تھے۔

گیا وہ آج ملاحظہ سے گزرے گا۔

م۔فتویٰ تکفیر کی زد میں میرا تو خیر ذکر ہی کیا، مولانا سید سلیمان، مولانا سید مناظر احسن، حضرت مولانا حسین احمد، تمام علماندوہ اور بہت سے علماء دیوبند سب ہی آرہے ہیں۔

ا۔مفتی کیا کرے، اس کا ذمہ دار تو مستفتی ہے۔

م۔ایک اہل علم نے جو میری ہی طرح جناب والا اور حضرت مولانا دونوں(1) سے یکساں اخلاص وعقیدت رکھتے ہیں، بڑی حسرت ودلسوزی سے کہا کہ اب تک تو ہم اسی کو رورہے تھے کہ دیوبند اور تھانہ بھون کی سیاسیات الگ الگ ہیں، اب دنیا پر اس کا بھی اعلان ہوکر رہا کہ دونوں کا دین بھی الگ الگ ہے۔

ا۔ان خیالات کا تو کچھ بھی علاج نہیں، یہ سب ناحقیقت شناسی کی شاخیں ہیں۔

م۔منصب مفتی سے جناب نے جو ارشاد فرمایا وہ ضابطہ سے بالکل درست سہی لیکن پھر آخر بریلی والے کیوں بدنام ہیں، وہ بھی تو آخر یہی کرتے ہیں کہ صاحب تقویۃ الایمان، حفظ الایمان وغیرہ کے اور سارے عقائد سے اوران کے تقویٰ وتقدس سے قطع نظر کرکے درمیان سے ایک آدھ فقرہ یا ایک آدھ لفظ لے لیتے ہیں اور اسی پر تکفیر کر ڈالتے ہیں۔

ا۔ان کے سامنے تو سب واقعات ہیں پھر قصداً تلبیس کرتے ہیں اور بعد اطلاع حقیقت کے بھی رجوع نہیں کرتے، کیا خدانخواستہ یہاں ایسا ہوا ہے۔

م۔رسالہ الاصلاح(2) نے اب کی یہ کیا ہے کہ خود جناب ہی کے وعظ کا بڑا طویل حصہ جو احتیاط در بارۂ تکفیر میں ہے، نقل کردیا ہے، میں نے خود بھی کلید مثنوی میں یہ مضمون پڑھا تھا (اصل الفاظ نہیں خلاصتاً لکھ رہا ہوں) کہ مولانا کا کوئی ایک شعر جو خلاف شریعت نظر آئے اس پر رائے نہ قائم کی جائے بلکہ سارے کلام کو ملحوظ رکھ کر کی جائے۔

ا۔میں اپنے مسلک پر بفضلہٖ تعالیٰ قائم ہوں، اس کی تفصیل مع رفع شبہات ترسوں کے رجسٹری شدہ مضمون میں عرض کرچکا ہوں امید ہے کہ ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

---

(1) یعنی مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔(2) یہ اسی مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڑھ) کا ماہنامہ تھا، جس پر تکفیر کی یورش تھی، مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

م۔ابھی دو ہی چار مہینہ کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اپنی شدید علالت کے دوران میں(1) جناب کو خواب میں دیکھا تھا اور کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے یہ حضرت مجھے چھوڑیں گے نہیں یعنی بغیر اپنے حلقہ ارادت میں لیے نہ رہیں گے۔

ا۔اچھا ہوا خواب غلط ہو گیا، اللہ نے انھیں دھوکے سے بچالیا۔

م۔کہاں میرا دل اس سے باغ باغ ہو رہا تھا، کہاں آج یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے والسلام محتاج دعا۔عبدالماجد۔

ا۔غور نہیں فرمایا میں تو اترسوں کے مضمون میں ثابت کر چکا ہوں کہ میرے اصلی مسلک اور دستخط جدید میں تعارض ہی نہیں، باقی کجا حلقہ ارادت کجا میں، اس کی اہلیت تو پہلے ہی سے نہیں، یعنی قبل دستخط بھی، نجات ہی ہو جائے تو غنیمت ہے، جس کی دعا کا سب احباب اور بزرگوں سے امیدوار ہوں۔

میں نے جو کچھ کیا، یا جو کچھ کر رہا ہوں الحمد للہ کسی کے معتقد بنانے یا معتقد رکھنے کے لیے نہیں، نہ کسی کے کم ہو جانے سے کوئی افسوس، اپنے نزدیک حق کی غلامی کی نیت ہے، خواہ کوئی معتقد رہے یا نہ رہے، جتنے معتقد کم ہوں اتنا ہی ہلکا رہوں گا جو کہ ضعفا کے لیے عین مطلوب ہے، والسلام۔

سید صاحب نے اس کے چار ہی پانچ سال بعد جس والہانہ انداز سے حضرت کی بیعت قبول کی اور پھر اپنی آخر عمر تک جس انتہائی حد تک حضرت سے عقیدت قائم رکھی، اس کے پیش نظر ان کا ایک زمانہ میں ان منزلوں سے گزرنا کتنا سبق آموز اہل بصیرت کے لیے ہے۔

اس والا نامہ کی آخری سطریں میرے لیے ایک نئی خلش واضطراب کا باعث بن گئیں، ان سے یہ صاف مترشح ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے حضرت کے اخلاص نیت پہ کچھ شبہ کیا ہو، اس کا احتمال بھی میرے لیے نا قابل برداشت تھا وہ والا نامہ 28، 29 جولائی کو ملا ہوگا۔

یکم اگست کو ادھر سے عریضہ روانہ ہوا، کچھ توضیحی کچھ شکایتی۔

''م'' اور ''ا'' کی وہی علامتیں بدستور قائم ہیں۔

---

(1) سید صاحب اس زمانہ میں مرض قلب میں بہت سخت بیمار ہو گئے تھے۔

م۔ سیدی و مطاعی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

ا۔ مکری محترمی دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

م۔ پچھلا والا نامہ ملفوف ہے، آخر کی سرخ نشان زدہ عبارت سے شبہ (1) ایسا ہو رہا ہے کہ گویا میں نے جناب کے کسی عمل کے اخلاص میں اشتباہ ظاہر کیا تھا اور اسے لوگوں کے معتقد رکھنے بنانے پر محمول کیا تھا۔

1۔ یہ شبہ بھی محبت سے ناشی ہوا ہے، محبت کی عینک عشق کے رنگ میں سرخ اور خونیں ہے، جس سے بعض سادہ رنگ کی چیزیں بھی خونیں نظر آتی ہیں۔

عشق ست و ہزار بدگمانی

اسی کی شرح ہے اور وہی عینک اس تحریر کے وقت میری آنکھوں پر تھی، اس لیے عنوان ناکافی ہوگیا، میرا مقصود اشتباہ کا گمان نہ تھا بلکہ میں بھی حسرت ہی سمجھا تھا، البتہ اس حسرت کے نقل کرنے میں یہ ضرور سمجھا تھا کہ آپ کا محبت سے جی چاہتا ہے کہ اس حسرت کا کوئی علاج ہو جائے، سو وہ علاج بدوں خاص اہتمام کے ہو نہیں سکتا اور وہ اہتمام میرے ذوق میں مرادف تھا تدبیر ابقاء اعتقاد کا اس لیے آزاد الفاظ صادر ہو گئے جس سے اب شرمندہ ہوں۔

م۔ استغفر اللہ! یہ خیال تو آپ کے ادنیٰ خدام کے لیے بھی نہیں رکھتا چہ جائیکہ خود جناب سے متعلق اس تصور ہی سے تکلیف ہو رہی ہے کہ میری کسی عبارت سے ایسا سمجھا ہی کیوں گیا، مولانا سلیمان کے خواب کا ذکر اور دوسرے تذکرے تو انتہائی حسرت کے اظہار کے لیے تھے کہ دین کے دو مخلص خادموں میں تعلقات یگانگت کی بنیاد پڑ کر پھر رکاوٹ پیدا ہوگئی اور "ونزعنا ما فی صدورھم من غل" کا نظارہ بجائے دنیا کے پھر آخرت پر اٹھ رہا، کوئی شخص باپ اور بڑے بھائی کے درمیان ایک مدت تک ان کے بچھڑے رہنے کے بعد خوشگواری دیکھے گا تو طبعاً مسرت ہوگی اور جب پھر انقباض پائے گا تو اپنا دل بھی حسرت سے مرجھا جائے گا اس کا تو یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ باپ کو کسی درجہ میں بھی منافقت برتنا چاہیے، والسلام محتاج دعا

عبدالماجد

---

(1) یہ اسی پچھلے والا نامہ کی آخری سطریں ہیں، جن پر میں نے سرخی سے خط کھینچ دیا تھا۔

ا۔ممکن ہے کہ میری لفظی کوتاہی اس شبہ کا منشا ہوا ہو، میں حقیقت عرض کر چکا، باقی انقباض ورکاوٹ، یہ راویوں کی عنایت کا ثمرہ ہے اور میں جرات یا جسارت کر کے یہ بھی عرض کر سکتا ہوں کہ راویوں کا اثر خوش اخلاق بزرگوں پر زیادہ ہوتا ہے خشک اخلاق پر نہیں ہوتا، یا کم اور کم بھی کالعدم ہوتا ہے وجہ ظاہر ہے کہ خوش اخلاقی جب عام ہوتی ہے راویوں کی بھی ہمت ہوتی ہے اور خوش اخلاقی مانع جرات ہوتی ہے اصلی ضمیر کے اظہار سے اور خشونت باعث ہوتی ہے اس اظہار کی چنانچہ میرے دل میں جو تھا وہ میں نے مولوی طیب(1) کی زبانی جب مولانا(2) یہاں تشریف لاکر واپس ہوئے پھر مولوی طیب مکرر آئے بہت صاف دیہاتی الفاظ میں عرض کر بھیجا کہ آپ کا مذاق خاص آپ کے لیے تو مجھ کو محل نکیر نہیں لیکن طالب علموں کے لیے مجھ کو پسند نہیں ان کے لیے میں اس کو ان کے اصلی مقصد میں مضر اور مخل سمجھتا ہوں، پس اگر میری رائے گنجائش قبول رکھتی ہے تو مدرسہ(3) میں اس کے لیے قواعد بنا دیے جائیں اور جو طالب علم اس کے خلاف کرے اس کو مدرسہ سے خارج کر دیا جائے اور اگر یہ رائے یقیناً غلط ہے اور وہ مذاق مدرسہ اور طلبہ کے لیے نافع ہے تو پھر مجھ کو چھوڑ دیا جائے(4) تاکہ دونوں طرف یکسوئی ہو اور یہ چھوڑنا خدانہ کرے شقاق کا سبب نہ ہوگا بلکہ انشاءاللہ تعالیٰ سبب وفاق کا اور رافع روزمرہ کی کشاکش اور اختلاف کا ہو جائے گا اور عوام الناس کو درجہ وفاق کا معلوم ہو کر ان کو دھوکے سے بچالے گا، کیا یہ صفائی غل کو چھوڑ سکتی ہے مولانا

درصفا غش کے ہلہ پالودگی

تمام نیاز نامہ کے متعلق مولانا نیاز(5) کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اے خامۂ نیاز نہ چلنے سے تو مچل | یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

نیاز مند اشرف علی عفی عنہ"

---

(1) یعنی مولانا محمد طیب دیوبندی موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

(2) یعنی مولانا حسین صاحب مدنی۔

(3) یعنی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ میں جو سیاسی رنگ پیدا ہو گیا تھا، یہ حضرت کو بہت گراں گزر رہا تھا۔(دریابادی) مدارس وجامعات کو سیاسیات سے الگ تھلگ رکھنا چاہیے (قاسمی)

(4) یعنی دارالعلوم کے منصب سرپرستی سے آزاد کر دیا جائے۔

(5) یعنی مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی قدس سرہٗ۔

اتنی مفصل تحریر کسی مکتوب میں حضرت کی شاذ ونادر ہی ہوتی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کی نظر میں اس موضوع کو اہمیت بھی خصوصی حاصل تھی لیکن میرے قلم کی کوتاہی نے حضرت کو ایک غلط فہمی میں ڈال دیا، میں نے اپنے اس عریضہ میں اس شدومد سے جس حسرت کا اظہار کیا تھا وہ حضرت اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑھتے ہوئے مخلصانہ تعلقات میں وقتی رکاوٹ پیش آجانے کے سلسلہ میں تھا، حضرت اس کو اپنے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ناشگفتہ تعلقات کی جانب لے گئے اور اس کا جواب اتنی تفصیل سے عنایت فرمایا۔(1)

دو ہی چار روز گزرے تھے کہ حضرت کا ایک اور والا نامہ مع ایک مضمون کے ملا، والا نامہ:-

''از اشرف علی عفی عنہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

چونکہ معاملہ جاریہ کے متعلق ایک اور مضمون لکھا گیا دل چاہا کہ آپ سے وہ بھی مخفی نہ رہے، اس لیے مرسل ہے، اس کو ضمیمہ سابقہ کے بعد ہی ملحق کردیجیے، جس مضمون پر یہ لکھا گیا وہ مولانا محمد سلیمان صاحب کو لکھا ہوا ہے، وزنی ہونے کے سبب لفافہ میں نہیں رکھا، یہ بھی خیال تھا کہ آپ کے پاس ہوگا لیکن اگر ضرورت ہو میں بھیج دوں گا، اس وقت احتیاط کے لیے لفافہ کو آٹھ آنہ کا بیرنگ کردیا، رجسٹری کی ہمت نہ ہوئی۔

بعد تحریر ان سطور کے آپ کا لفافہ آگیا۔

اگر کوئی صاحب میرے سب مضامین کو یا بعض کو چھاپنا چاہیں تو میری طرف سے کوئی امر مانع نہیں، ورنہ یہاں تو چھپے ہی گا مگر دیر میں، بالخصوص میری وہ تحریر جو بطور قول کلی کے ہے غالباً وہ اوروں سے زیادہ مفید اور دائم الضرورۃ ہے، اگر سب مضامین چھپیں اس کو بھی نہ بھولا جائے آئندہ جو مصلحت ہو، والسلام اشرف علی از تھانہ بھون''۔

اب اس کے بعد وہ اصلی مضمون جس کا اس خط میں حوالہ ہے، ملاحظہ ہو:

ضمیمہ ثانیہ رسالہ الایضاح لما فی الافصاح

رسالہ مذکورہ کے ضمیمہ اولیٰ کی تحریر سے تقریباً ایک ہفتہ بعد میرے پاس سرائے میر ضلع اعظم گڑھ سے (جیسا ڈاک خانہ کی مہر سے معلوم ہوا) ایک جدید و مطبوع مضمون معنون بعنوان فلاں

---

(1) پاکستانی اضافہ مکمل۔(قاسمی)

فلاں حضرات پر غوغائے تکفیر مرقوم یکم جمادی الاولیٰ جس میں زید وعمرو(1) دونوں کے تبریہ کے متعلق توجیہات تھیں پہنچا، چونکہ میں عمرو کے متعلق خود اصل رسالہ الاصلاح میں اپنے دستخط سے رجوع کر چکا ہوں اس حصہ کے متعلق تو مزید تحقیق کی ضرورت نہیں، البتہ اس ضمیمہ میں زید کے متعلق بنابر کسی تاویل یا تبریہ کے معلوم نہ ہوسکنے کے رجوع سے معذوری ظاہر کی تھی اور اس جدید مضمون کو خود زید کی ایک تحریر سے نقل کیا گیا ہے کہ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں وہ ملحد اور زندیق ہے الیٰ قولہ الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کیے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے، جو ان کے تبریہ پر دال ہے، اس لیے اس وقت اس حصہ کے متعلق مختصراً بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں، یہ کہ زید کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ایسے عقائد خود زید کے نزدیک بھی الحاد اور زندقہ ہیں مگر زید اپنے کو ان عقائد سے بری کہتے ہیں اور الکلام میں ان کے لکھنے کا ایک عذر کرتے ہیں، تو اس تقدیر پر فتویٰ الافضاح کے مجیب اور خود زید ان عقائد کے عقائد کفریہ ہونے میں تو متفق ہوئے اس لیے اہل جواب کی یہ شکایت تو ہو نہیں سکتی کہ غیر کفر کو کفر کہہ دیا، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل جواب نے جدید مضمون تبریہ کا کیوں نہیں دیکھا سو ظاہر ہے کہ یہ عدم احاطہ بنظر محل ملامت نہیں، اب صرف کلام اس میں باقی رہا کہ یہ عذر الکلام کے کسی مقام سے کلیاً یا جزئیاً معلوم ومفہوم ہوتا ہے یا نہیں، پھر اس تنقیح کے بعد جو حکم شرعی ہو اس کا اتباع سب پر واجب ہے مگر یہ موقوف ہے رسالہ الکلام کے بالاستیعاب دیکھنے پر، چونکہ میرے پاس نہ وہ رسالہ نہ مجھ کو اتنی فرصت اس لیے میں قصر مسافت کر کے اپنے مسلک توسع محاط بالحدود الشرعیہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ اگر اس رسالہ میں یہ عذر کلیاً یا جزئیاً مذکور بھی نہ ہو تب بھی زید کے اس انکار انتساب کو توبہ پر محمول کر کے زید کے متعلق بھی اپنے دستخط سے رجوع کرتا ہوں مگر اسی کے ساتھ زید کی جماعت کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ امت محمدیہ پر رحم کر کے نہ زید کی ایسی تصنیفات کو شائع کریں نہ ان کی حمایت کریں اور مدرسۂ اصلاح کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے موہم موحش اقوال اور ان کے قائلین من حیث القائلین اور اشتہار مضمون بعنوان ''ایک دینی درسگاہ کی خدمت'' کے مضمون سے براءت کا اعلان کردیں جیسا کہ احقر نے رسالہ الایضاح اور اس کے

---

(1) زید سے مراد مولانا شبلی اور عمرو سے مراد مولانا حمید الدین ہیں۔

ضمیمہ اول کے جزء چہارم میں عرض کر دیا ہے اور جب تک ایسا نہ کیا جائے باوجود زید وعمرو کے متعلق اپنے دستخط سے رجوع کر لینے کے خود مدرسہ کے متعلق میں اسی رائے پر قائم ہوں جو میں نے رسالہ الا یضاح میں عرض کیا ہے، بقولی بہرحال مدرسہ جب تک ایسے اقوال سے ائی قولی اس مدرسہ کی امداد کسی طرح کی جائز نہیں اور چونکہ میں اس رائے کو حق سمجھتا ہوں اگر اس میں مجھ کو بدنام بھی کیا جائے (جس سے مجھ کو اب تک غایت تہذیب کے سبب بچایا گیا ہے جس کی مجھ کو خاص قدر ہے جزاہم اللہ تعالیٰ) تب بھی یہی عرض کروں گا۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　　مانمی خواہیم ننگ ونام را

والسلام خیر ختام ولیکن ہٰذا آخر الکلام فی ہٰذا المرام وافوض امری الی اللہ فی کل قال ومقام آخر الاسبوع الاوّل من جمادی الاولیٰ 55''۔

(91)

خدا خدا کر کے یہ تکفیر رجوع عن التکفیر وغیرہ کا یہ ناخوشگوار گو یقیناً بعض اعتبارات سے نہایت مفید سلسلہ ختم ہوا اور اب پھر مراسلت کا عام موضوع وہی قرآنیات لوٹ آیا۔ 11 راگست کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م۔''تفسیر بیان القرآن سے متعلق آج چند امور اطلاعاً واستفادتاً عرض ہیں۔

جلد 4 ص 122۔س 1۔ یحلفون باللہ، باللہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔لفظ''سامنے'' کے بعد یہ بنادیا''اللہ کی''

م۔جلد 5،ص 8،س 1 من ربہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔لفظ''معجزہ'' کے بعد یہ عبارت بنادی''ان کے رب کی طرف سے''۔

م۔جلد 5،ص 3، حصہ تفسیری، سطر 1،''اس وقت تو مصر کے مالک ہوگئے''محل نظر ہے۔ مسئلہ تاریخ کا ہے اور تاریخ سے مطلق تائید نہیں ہوتی۔

ا۔جلد 3،ص 20،س 3، آیت کے متعلق ایسا ہی سوال کیا گیا تھا اور اس کا بہت مفصل جواب لکھا گیا تھا(1)، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تفسیر ایک قول پر ہے، اگر آپ کے کاغذات میں مل جائے

---

(1) ملاحظہ ہوں 76و77

ملاحظہ فرمالیں، اس وقت اس مقام پر بھی حاشیہ لکھ دیا گیا ہے۔

م۔جلد 5،ص 38،س 1، نزعنھا، ہا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔''جھکا کر'' کے بعد لفظ ''اس کو'' بڑھا دیا۔

م۔جلد 5 ص 41،س 1،علٰی بینة من ربه. بینة کی تفسیر میں تو گفتگو نہیں لیکن ترجمہ لفظ ''قرآن'' سے کرنا محل تردد ہے۔

ا۔اب یوں کر دیا۔''جوایک روشن دلیل (یعنی قرآن) پر''۔

م۔جلد 5،ص 48،طوفان نوحؑ کا عموم دل کو زیادہ نہیں لگتا۔

ا۔دل کو نہ لگنے کی بنا میں نظر کرنا چاہیے۔

م۔ جب بعثت صرف الیٰ قومہ تھی اور غرق ہونے والے حسب تصریح سورۂ یونس صرف مکذبین اور منذرین تھے تو طوفان کو قوم نوحؑ تک یوں نہ محدود رکھا جائے۔

ا۔ اوّل ایک مقدمہ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ بعثت خاصہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی باعتبار مجموعہ اصول وفروع کے ہے باقی محض اصول کے اعتبار سے سب کی بعثت عام ہے کیونکہ وہ سب شرائع میں متحد ہیں، اسی لیے بعض آیات میں وارد ہے کذب قوم نوح المرسلین حالانکہ انھوں نے صرف حضرت نوح کی تکذیب کی تھی، اس کی وجہ وہی ہے کہ اتحاد اصول کے سبب ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے، بہرحال جب اصول میں بعثت عام ہے تو قومہ میں قوم کی تخصیص اس اعتبار سے ہے کہ مخاطب اوّل وہی تھے اور دوسرے ان کے واسطے سے اور جب بعثت عام ہے تو مکذبین اور منذرین بھی سب کو عام ہوگا اس لیے سب اہل ارض پر عذاب آنا مستبعد نہ ہوگا، ہاں یہ ممکن ہے کہ خود ارض پوری اس وقت آباد نہ ہو، غرض جتنی آباد تھی اس کو طوفان عام تھا، چنانچہ **لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا** ظاہراً اس پر دال ہے۔ نیز اگر بعض کفار اس وقت بچ جائیں تو ان کی نسل منقطع ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور آیت **وجعلنا ذریۃ ھم الباقین** سے یہ امر یقینی ہے تو کیا عدم عموم کے شق میں یہ بعد نہیں، نیز اگر طوفان عام نہ ہوتا تو جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھنے کی کیا وجہ، اگر ایک بھی نہ رکھا جاتا تب بھی نسل منقطع نہ ہوتی، کیا یہ سب نہیں بعد کا عدم عموم کے قول میں۔

م۔ اہل جغرافیہ وطبقات الارض نے عموم طوفان کا انکار شد ومد سے کیا ہے لیکن وطن نوحؑ میں اس کا وقوع بھی اسی شد ومد سے تسلیم کیا ہے۔

ا۔ اہل جغرافیہ کے اس دعویٰ پر جو دلیل قائم کی گئی ہو اس کے مقدمات دیکھنے چاہیے تا کہ ان میں نظر کی جائے ورنہ تخمین محض تو قابل التفات نہیں، نیز اگر طوفان عام نہ ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام کو بجائے کشتی بنانے کے ہجرت ارض بعیدہ کا حکم کیا جانا کافی تھا''۔

تفسیر مقامات قرآنی کی داستان اتنی لذیذ ہے کہ جی چاہتا ہے، بس یہی مسلسل چلی جائے۔ خیر ابھی کچھ عرصہ تک تو انشاء اللہ یہی لطف قائم رہے گا، 15/ اکتوبر کا نیاز نامہ ملاحظہ ہو:

م۔ ''تفسیر بیان القرآن ملاحظہ ہو۔

جلد 6، ص 3، س 1، لقد کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ ترجمہ وتفسیر دونوں میں لکھ دیا ''بالتحقیق''، اور بھی چند مقامات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان میں بھی اس کا ترجمہ رہ گیا، غالباً اس کو مضر نہیں سمجھا کیونکہ یہ تاکید وتحقیق کے لیے ہے، سو جب ہمارے محاورات میں بدوں اس کے خاص ترجمہ کے بھی کلام اپنے سیاق وسباق سے تحقیق کو مفید ہو تو اس کے مستقل ترجمہ کی حاجت نہیں سمجھی گئی ہوگی لیکن ترجمہ ہونا زیادہ احوط ہے، میں نے احتیاطاً حضرت شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ترجمہ کے کئی مقام کو دیکھا، کہیں بھی اس کا ترجمہ نہیں کیا۔

م۔ جلد 6، ص 3، س 1، بـاٰیـٰتـنـا کے ترجمہ میں بھی مجھے شک رہا، یعنی آیا ترجمہ رہ گیا، یا ''یہ حکم'' کافی سمجھا گیا۔

ا۔ رہ ہی گیا، اب اس طرح بنا دیا ''اپنی نشانیوں کے ساتھ''۔

م۔ جلد 6، ص 17، متن سطر آخر، یو مئذ کا ترجمہ رہ گیا۔

ا۔ یہ انتخاب کنندہ کی غفلت ہے چنانچہ تفسیر میں ہے ''اس روز'' اب ترجمہ بھی لکھ دیا۔

م۔ جلد 6، ص 21، متن س 3، کـانـوا بـه یـسـتـهـزؤن ''استہزانہ کیا ہو'' مفہوم آیا اس میں آ گیا، یا یوں بہتر ہوگا ''استہزا کرتے رہے ہوں''۔

ا۔ پورا مفہوم دوسری عبارت میں ہے، میں نے بنانا چاہا تو بنا ہوا ملا، کسی وقت تنبہ ہوا ہوگا۔

م۔ جلد 8، ص 5، متن س 3، شـهـدات بـالله، باللہ کا ترجمہ نہ ملا۔

ا۔اب لکھ دیا، ''اللہ کی قسم''۔

م۔جلد 8 ص 7 متن سطر آخر، ولیعفوا ولیصفحوا، پورے فقرہ کا ترجمہ نقل ہونے سے رہ گیا۔

ا۔واقعی بہت بڑی فروگزاشت ہوئی، اب ترجمہ وتفسیر میں بنا دیا، ترجمہ میں تو یہ عبارت لکھ دی ''ان کو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کر دینا چاہیے'' اور تفسیر میں اس ترتیب سے لکھ دیا (''مہاجر بھی ہیں'') اور (آگے معافی اور درگزر کا حکم فرماتے ہیں کہ) ان کو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کر دینا چاہیے آگے ترغیب کے لیے الخ۔

جزاکم اللہ علی ھذا التنبیہات

م۔اپنا ایک تازہ خواب بھی عرض کیے دیتا ہوں، شاید کہ کوئی خیال ذہن مبارک میں آجائے۔دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑا وسیع میدان تنہا اور پاپیادہ قطع کر رہا ہوں، جابجا برساتی گھاس کثرت سے اُگی ہوئی، پیر میں محض معمولی چپل ہے خیال گزرا کوئی زہریلا جانور پیر میں کاٹ نہ لے، اتنے میں نظر آیا کہ کچھ فاصلہ پر میرے راستہ سے الگ ایک لمبا سیاہ سانپ ہے، میں پہلے تو خوش ہوا کہ راستہ سے الگ ہے لیکن معاوہ سانپ میری طرف دوڑا، دل نے کہا یہ تو بڑی موذی قسم کا ہے کہ جھپٹ کر حملہ کرتا ہے، میرے ہاتھ میں کوئی چھڑی وغیرہ بھی نہیں، ہراس ایک آناً فاناً پیدا ہوا اور مٹ گیا، دل میں کہا کہ مجھے تو قرآنی عمل معلوم ہے معاً یہ آیت کریمہ ''انھم یکیدون کیدا واکید کیدا'' کا استحضار ہو گیا پس کہاں تو وہ افعی لپکتا ہوا آرہا تھا اور مجھ سے فاصلہ وہی چارفٹ کا رہ گیا تھا، کہاں بس جہاں تھا، وہیں دبک کر اور سکڑ کر اور اپنا سر اپنے جسم میں چھپا کر رہ گیا۔ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا اور میں باطمینان خوش خوش اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ذہن میں تعبیر یہ آئی کہ شیطان کا حملہ شدید ہونے والا تھا، اللہ نے قرآن مجید کی برکت سے روک دیا۔

ا۔ظاہراً بالکل کافی ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے اور عجب نہیں کہ یہ شیطان شیطان الانس ہوں اور عجب نہیں کہ اہل تقیہ ہوں کہ ان کا تقیہ مشابہ ہے سانپ کے زہر خفی کے۔ شاید اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اہل حق کو ان کے کید وشر سے محفوظ رکھے گا۔واللہ اعلم''۔

(92)

دن اور تاریخ تو اب کا ہے کو یاد رہنے لگے تھے، شروع نومبر کی کوئی تاریخ تھی، جب تھانہ بھون حاضری ہوئی، اطلاعی کارڈ حسب معمول قبل سے روانہ کر دیا تھا جواب حسب ذیل آیا جس پر مہر 29/ اکتوبر کی ہے:-

''واق نظر چشم من آشیانۂ تست کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

انشاء اللہ تعالیٰ اسٹیشن پر اور شبیر علی کے مکان پر سب انتظام سہولت سے ہو جائے گا۔

اعتراض کا جواب تو دینے کو دل نہیں چاہتا، اسی کا جی خوش ہو گیا مگر کشف حقیقت خود ایک مطلوب چیز ہے، وہ یہ کہ افعل التفضیل کا مفہوم کبھی حقیقی ہوتا ہے اور کبھی اضافی، نصوص میں امت کے لیے بکثرت ایسے صیغے وارد ہیں، علما کے کلام میں بھی بکثرت مستعمل ہیں''۔

یہ اعتراض حضرت ہی کے ایک سر پھرے مرید نے کیا تھا، کہتے تھے کہ کتاب کے ''اشرف السوانح'' نام سے لازم آتا ہے کہ یہی تمام سوانح عمریوں سے ''اشرف'' ہے، یہاں تک کہ پیمبروں کے بھی سوانح سے۔

قیام یقیناً ہی مختصر رہا، وہی دو چار دن، کاغذات کے مجموعہ میں ایک چھوٹا سا پرزہ ملا، جس پر کوئی تاریخ وسنہ تو درج نہیں لیکن دل کہتا ہے کہ عجب نہیں اسی زمانہ سے متعلق ہوا:

''مکرمی، السلام علیکم، جس مضمون کے دکھلانے کا میں نے وعدہ کیا تھا وہ حاضر ہے، یہاں دیکھنے کے لیے فارغ وقت نہ ملتا، اگر نقل کو دل چاہے دیر تک کتاب رکھنے کی گنجائش ہے ورنہ ہمراہ لیتے آیئے، صفحہ ہذا کی سطر اخیر سے شروع ہوا ہے''۔

یہ پرزہ اس کتاب یا رسالہ کے اسی صفحہ پر لگا ہوا تھا دوسرے کی سہولتوں کی رعایت کس بلا کی حضرت کے ہاں رہتی تھی!

یہ مختصر قیام اب کی بار بڑا قیمتی نکلا، ایک روز اپنے ہاں بے خبر بیٹھا ہوا تھا کہ یک بیک حضرت کے ایک خادم ایک بند ڈبیا اور ایک دستی والا نامہ لے کر پہنچے، ڈبیا کے اندر کیا تھا یہ اس والا نامہ کے پڑھنے ہی سے ظاہر ہو جائے گا:

''مکرمی، السلام علیکم۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میری کوئی یادگار آپ کے پاس رہے، اتفاق سے مجھ کو ایک تسبیح یاد آ گئی، جس پر میں نے مدتوں پڑھا ہے مگر وزنی ہونے کے سبب اب دوسری ہلکی تسبیح پر پڑھنے لگا ہوں جو ہر وقت ہاتھ میں نہیں رہ سکتی ہے، تو گویا وہ رکھی ہوئی تسبیح میری حاجت سے زائد ہے، وہ پیش کرتا ہوں، قبول فرمالیجیے، اس تسبیح میں ایک اور برکت بھی ہے، یہ امیر عبدالرحمٰن خان نے اپنے کمانڈر انچیف کو دی تھی، انھوں نے میرے ایک پیر بھائی کو جو ان کے مہمان تھے دی، انھوں نے مجھ کو دی، یہ سنگ مقصور کہلاتا ہے، سنا ہے اس وقت نایاب ہے واللہ اعلم۔ اشرف علی، 20 شعبان 55۔

20 رشعبان 1355 جنتری میں دیکھا، تو 5 نومبر 1936 کے مطابق نکلی۔

غالب نے ''خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال'' میں تو ایک شاعرانہ مضمون باندھا ہے، یہاں البتہ یہ ''خدا کی دین'' اپنے حق میں شاعری نہیں، حقیقت تھی، حضرت کا عطیہ کچھ بھی ہوتا ایک تبرک ہی ہوتا، چہ جائیکہ ذکر حق کی تسبیح! اور وہ بھی ایسی جس کو حضرت کی متبرک انگلیاں ایک مدت تک مس کر چکی تھیں، پھر غازی ومجاہد امیر عبدالرحمٰن خان والیٔ افغانستان (متوفی 1901) اور ان کے غازی سپہ سالار کی دہری دہری نسبتیں! نور علیٰ نور ہی نہیں، مجموعۂ انوار۔

17 رنومبر 36 (یکم رمضان 55) کا عریضہ ایک اہم مسئلہ کے متعلق سوال رکھتا ہے:

م۔ ''تھانہ بھون سے واپس ہوتے ہی ایک دوسرے سفر میں لگ گیا، آج ذرا فرصت ملی تو حسب ارشاد والا اپنی بخیریت سعادت کی اطلاع عرض کرتا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ!

م۔ پچھلے شب جمعہ کو آپ کے شاگرد اور مخلص مسترشد شیخ حسن الرحمٰن قدوائی (1) (رئیس بڑا گاؤں ضلع بارہ بنکی) نے وفات پائی۔ تدفین جمعہ کے دن ہوئی۔

ا۔ اناللہ۔

م۔ غفلت اور بدحواسی کی حالت میں بھی نماز اور تلاوت آیات قرآنی اور درود خوانی سے غفلت نہ تھی۔

---

(1) بڑے مخلص مسلمان تھے اور مولانا کے شیدائی، وطن میں محسن میاں کے نام سے مشہور تھے، ان کے لڑکے شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی، بی، اے جامعہ ملیہ (دہلی) کے مشہور کارکن ہیں۔

ا۔سبحان اللہ۔

م۔انتقال سے دو ہی چار منٹ قبل کلمۂ شہادت پڑھا پھر تین بار اللہ اللہ کہا، زبان اسی پر بند ہوئی۔

ا۔سبحان اللہ۔

م۔ایسی موت پر رشک آرہا ہے۔

ا۔ بیشک میں نے بکثرت ایسے واقعات سنے ہیں اور اہل بصیرت سے سنا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے متوسلین بواسطہ بلاواسطہ کو حسن خاتمہ کی دولت عطا کی جاتی ہے۔رزقنا اللہ تعالٰی و ایاکم ھٰذہ النعمۃ"۔

وہ اہم مسئلہ اب آتا ہے۔

''ایک سوال بہت روز سے کرنا چاہتا تھا، اب کی زبانی بھی موقع نہ ملا، وہ یہ کہ عدالتی عہد سے مثلاً منصفی، سب ججی، تحصیلداری، خواہ وہ عہدے بلاتنخواہ ہوں مثلاً آنریری مجسٹریٹی، غیر مسلم حکومت کے تحت میں قبول کرنا جب کہ فیصلے لامحالہ غیر اسلامی قانون کے ماتحت کرنے پڑیں گے کہاں تک جائز ہے؟

بظاہر تو حکم عدم جواز ہی کا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مسلم ان عہدوں پر نہ رہ جائے تو امت اسلامی ہی کے دوسرے مصالح فوت ہوئے جاتے ہیں، جناب کی کسی تحریر میں کوئی قول اس بات میں دیکھنا یاد نہیں پڑتا ورنہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

ا۔ میں نے اس کے متعلق لکھا تو ہے مگر اس وقت مقام مجھ کو بھی یاد نہیں، اس لیے اس وقت جو ذہن میں حاضر ہے، مختصراً عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض افعال ایسے ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں لیکن ضرورت میں شرعاً بھی اس کی اجازت دے دی جاتی ہے خواہ نصاً خواہ اجتہاداً جیسے اکل میتہ، تناول خمر مخمصہ میں یا اکراہ میں یا اساغۃ لقمۂ غاصبہ کے لیے، ایسے ہی افعال میں باقتضاء قواعد یہ مناسب مسئول عنہا بھی داخل کیے جاسکتے ہیں اگرچہ کوئی نقل جزئی اس وقت میری نظر میں نہیں، مگر کلیات ونظائر سے تمسک ممکن ہے چنانچہ اس کی ایک نظیر فقہا نے ذکر کی ہے۔

دفع الغائبۃ و الظلم عن نفسہ اولیٰ الٰی قولہ ویوجر من قام بتوزیعھم بالعدل وان

کان الاخذ باطلا قوله ویوجر من قام بتوزیعها بالعدل ای بالمعادلة کما عبر فی النفسیة ای بان یحمل کل واحد بقدر طاقته لانه لو ترک توزیعها ای الظالم ربما یحمل بعضهم مالا یطیق فیصیر ظلماً علیٰ ظلم ففی قیام العارف بتوزیعها بالعدل تقلیل الظلم فلذا یوجر وهذا الیوم کالکبریت بل هو اندر (در مختار ورد المختار قبیل باب المعرف من کتاب الزکوٰة)

نظیر ہونا ظاہر ہے کہ مقصود کا فی نفسہٖ غیر مشروع ہونا اور اہل کے ہاتھ میں ہونے سے اشد المفسد تین سے متبدل ہو جانا دونوں میں مشترک ہے، البتہ کلام ضرورت میں ہے اور یہی اہم ہے، سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں، ایک تحصیل منفعت خواہ دینی ہو یا دنیوی خواہ اپنی ہو یا غیر کی، دوسری دفع مضرت اسی تعمیم کے ساتھ، سو تحصیل منفعت کے لیے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں مثلاً محض تحصیل قوت ولذت کے لیے دوائے حرام کا استعمال یا اجتماع لاستماع الوعظ کے لیے آلات لہو وغنا کا استعمال و مثل ذالک، اور دفع مضرت کے لیے اجازت ہے جب کہ وہ مضرت قواعد صحیحہ منصوصیہ یا اجتہادیہ سے معتد بہا ہو اور شرعی ضرورت یہی ہے، مثلاً دفع مرض کے لیے دوائے حرام کا استعمال جب کہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہو گیا ہو، کیونکہ بدوں اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا اور مثلاً مسئلہ منقولہ مذکورہ میں یہ ضرورت دفع ظلم اشد کے توزیع کی کہ وہ بھی ظلم اخف ہے اجازت دی گئی، پس یہی تفصیل واقعۂ مسئول عنہا میں سمجھنا چاہیے کہ یہ مناسب فی نفسہٖ شرعاً حرام ہیں جس کی وجہ خود سوال میں بھی مذکور ہے اور اگر عمل کے ساتھ خاص یہ فساد عقیدہ بھی ہو کہ حکم قانون کو بمقابلہ حکم شرعی کے مستحسن وراجح سمجھا جائے تو کفر ہے جس کو میں نے بیان القرآن سورۂ مائدہ آیت ''وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ'' کی تفسیر میں بیان بھی کیا ہے (1)۔

مگر اس وقت کلام صرف اسی درجہ میں ہے جو محض معصیت اور حرام ہے، پس فی نفسہٖ حرام ہونے کے بعد ان کو اگر جلب منفعت مالیہ یا جاہیہ کی غرض سے اختیار کیا جائے تو کسی حال میں جائز

---

(1) اس خاکسار کی تفسیر میں سورۂ مائدہ کی ان تینوں آیتوں کے تحت میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے ناظرین کرام براہ کرم اسے بھی ضرور دیکھ لیں۔

نہیں اور اگر دفع مضرت کی غرض سے اختیار کیا جائے کہ امت مسلمہ پر کفار کی طرف سے جو مظالم ومضرات پہنچتے یہ اہل مناسب بقدر امکان ان کو اگر دفع نہ کر سکیں تو کم از کم تقلیل وتخفیف کر سکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے، واللہ اعلم۔

نوٹ:- میں نے کسی نقل جزئی سے نہیں لکھا، استدلال سے لکھا ہے جس پر مجھ کو اعتماد نہیں اس لیے مناسب بلکہ واجب ہے کہ دوسرے علمائے محققین سے بھی اطمینان کر لیا جائے اور پھر بھی عمل کے وقت حضرت امام مالکؒ کے ارشاد نفعل ونستغفر کو محمول رکھیں''۔

(93)

درس تفسیری کا تحریری سلسلہ جاری ہے، ساتھ ہی دوسرے دینی حقائق ومعارف کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ 37ء شروع ہو چکا ہے، 26رجنوری کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔ ''تفسیر بیان القرآن سے متعلق آج معروضات ذیل پیش کرنے ہیں۔

جلد اوّل ص 93، س 1۔ من شھد منکم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ ترجمہ وتفسیر میں بنا دیا، ''شخص'' کے بعد ''تم میں سے'' لکھ دیا۔

م۔ جلد 9 ص 9، ''فاولٓئک ھم المضعفون'' کے ترجمہ میں ''خدا تعالیٰ کے پاس'' تفسیری اضافہ ہے نہ کہ ترجمہ۔

ا۔ واقع میں ایسا ہی ہے میں نے اس طرح درست کر دیا کہ ترجمہ میں سے حذف کر دیا اور تفسیر میں اس کو بھی قوسین کے درمیان کر دیا۔

م۔ جلد 9، ص 89، ''ما یبدی الباطل وما یعید''۔ اصل ترجمہ کے بجائے صرف اس کا ماحصل ایک اردو محاورہ میں ملا۔

ا۔ واقعی ظاہراً یونہی معلوم ہوتا ہے لیکن میں نے جو حاشیۂ عربیہ میں توجیہ کی تقریر کی ہے اس سے یہ حاصل قریب قریب ترجمہ کے ہو گیا ہے مگر اس کے بعد جو میں نے حضرت مولانا دیوبندی قدس سرہٗ کا ترجمہ دیکھا اور اس پر فوائد بھی دیکھے تو اب میری رائے میں یہ مناسب معلوم ہوا کہ ترجمہ تو حضرت کی موافقت میں اس طرح کیا جائے کہ ''اور باطل کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے'' مگر چونکہ اس سے مقصود واضح نہیں ہوا اس لیے تفسیر میں اس طرح کر دیا جائے ''یعنی نہ

وہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا محض گیا گزرا الخ بس لفظ ''یعنی'' سے پہلے قوس بنائی جائے اور پہلا لکھا ہوا لفظ ''یعنی'' کاٹ دیا جائے اور دوسری قوس اپنے حال پر رہے جہاں پہلے سے ہے، غالباً اس میں سب رعایتیں محفوظ اور نمایاں رہیں گی، میں نے مدرسہ کے نسخہ میں اسی طرح کر دیا ہے۔

م۔'' جلد 9، ص 92، س 1، بعد موتھا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنا دیا ''زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے''۔

م۔جلد 10، ص 36 آخری سطر متن، اشد العذاب میں ''عذاب'' ہی کیوں نہ رکھا گیا ''آگ'' سے ترجمہ کیوں فرمایا گیا؟

ا۔یہ عقلمندی اہل مطبع کی ہے، میری تفسیر میں عذاب کا لفظ ہے، آگ نہیں۔

م۔جلد 10، ص 76، س 1۔ذکر الرحمٰن میں رحمٰن ہی یا خدائے رحمٰن کیوں نہ رکھا گیا؟ ''اللہ'' سے ترجمہ کیوں فرمایا گیا؟

ا۔خدائے رحمٰن بنا دیا، مصلحت یاد نہیں۔

م۔جلد 10، ص 77، س 2 متن، ذکر کا ترجمہ بجائے نصیحت وغیرہ کے ''شرف کی چیز'' سے پوری طرح دلنشین نہ ہوا۔

ا۔دوسرے مفسرین نے بھی ایسا کیا ہے کمافی الجلالین وغیرہ۔حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ بھی اسی طرف مشیر ہے، قاموس میں ذکر کے معنی شرف کے بھی لکھے ہیں اور اس کو اسی لیے ترجیح ہوسکتی ہے کہ یہ حضور کی شان کے زیادہ لائق ہے۔

م۔جلد 10 ص 91، عذاب الجحیم کے ترجمہ میں لفظ عذاب چھوٹ گیا۔

ا۔ترجمہ چھوٹا نہیں، لفظ تکلیف دینے والا، عذاب ہی کا ترجمہ ہے کیونکہ عذاب کے لغوی معنی یہی ہیں اور گو حضرت صاحب دہلوی نے جلتے پانی کا عذاب ترجمہ میں لکھا ہے مگر لفظ ''ڈالو'' عذاب کے ساتھ محاورہ میں بے ربط ہے، اس لیے نہیں لیا گیا۔

م۔کچھ روز سے موت بہت یاد آنے لگی ہے مگر شوق واشتیاق کے ساتھ نہیں بلکہ خوف ودہشت کے ساتھ۔

ا۔نہ شوق مقصود بالذات ہے نہ خوف، دونوں مقصود بالعرض ہیں اور مقصود بالذات تعلق

آخرت اور تقلیل تعلق عن الدنیا ہے جو دونوں طریق سے حاصل ہے۔

م۔خیال بار بار یہ آتا ہے کہ وہ وقت تو تمام مالوفات ومرغوبات سے یکسر انقطاع کا ہوگا۔ دنیا میں جو پاکیزہ ترین موانست حاصل ہے وہ رجال ہی کے ساتھ ہے جو بہرحال اپنے ہی ہم جنس انسان ہیں اور موت کے وقت سابقہ ان سے نہیں بلکہ براہ راست حق تعالیٰ سے پڑے گا جن کی ذات سے حقیقتاً قلب کو ذرا بھی تعلق الفت وانس نہیں، اگر تعلق ہے تو وہی عظمت وجلالت کا ہے۔

ا۔مرنے سے پہلے مومن کو انس ہو جاتا ہے۔

م۔اس وقت یک بیک کیا گزر کر رہے گی۔

ا۔وہی گزرے گی جس کی خبر دی گئی ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ لَھُمْ مَغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ"۔

م۔اعمال جو بدترین ہیں وہ تو ہی ہیں، جو بظاہر بہترین معلوم ہوتے ہیں وہ بھی جب خود اپنی ہی جرح کے بعد خالصتاً اللہ نہیں ٹھہرتے تو پھر وہاں کی جرح کا کیا ذکر ہے۔

ا۔یہ سب صحیح ہے مگر عفو ورحمت کی امید بھی تو دلائی گئی ہے۔

م۔بار بار یہی تمنا کرنے کا جی چاہتا ہے کہ کاش پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔

ا۔یہ بھی صحابہؓ کی سنت ہے، اس کی برکت سے بھی امید فضل ہے۔

م۔حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری ماشاءاللہ اپنے سولھویں حج کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔

ا۔ماشاءاللہ تعالیٰ۔

مکرمی۔السلام علیکم، سب مقامات کو دیکھ کر لکھ دیا گیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ فروگزاشتوں کی اطلاع فرما دیتے ہیں، آئندہ اس کا نفع انشاءاللہ جاری وباقی رہے گا۔

ان مقامات کی تعیین سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید آپ کا انگریزی ترجمہ یہاں تک پہنچ گیا، اگر ایسا ہے تو نہایت خوشی اور مبارکباد کا محل ہے، خصوصیت کے ساتھ تو اس کے جواب کی ضرورت نہیں لیکن اگر اتفاقاً پھر کوئی خط آئے اور بے تکلف یاد بھی رہے تو اس کی بھی اطلاع دیجیے، اکثر احباب مشتاقانہ پوچھتے ہیں"۔

استحضار موت وغیرہ کے سلسلہ میں امام غزالیؒ اور بعض دوسرے اکابر نے بہت کچھ لکھا ہے

اور داد تحقیق دی ہے لیکن حضرت سے مراسلت کر کے براہ راست جو تسکین قلب حاصل ہو سکتی تھی وہ اور کسی طریقہ سے نصیب ہو نا ممکن ہی نہ تھی اور حضرت کے جوابات کی مثال ابھی اوپر گزر ہی چکی۔
بعض لمبے لمبے خط انہی تفسیری استفسارات سے بھرے ہوئے، 7/فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو۔

م۔ ''تفسیر بیان القرآن جلد 11 و 12 سے متعلق معروضات ذیل ہیں۔
جلد 11، ص 10، سطر 3 متن، بین یدیه کا ترجمہ ''اپنی سی'' سمجھ میں نہ آیا۔
ا۔ غلط نامہ میں اس کی تصحیح چھپ چکی ہے۔ ''اپنی سے پہلی'' الخ

م۔ جلد 11، ص 13، س 1 متن ''ان الذین کفروا'' کا ترجمہ جو لوگ کافر ہوئے، یا جن لوگوں نے کفر کیا اور ''ان الذین آمنوا'' کا ترجمہ جو لوگ ایمان لائے، اگر کیا جاتا تو شاید الفاظ قرآنی سے قریب تر رہتا۔
ا۔ بیشک اس میں یہ ترجیح ہے اور ترجمہ موجودہ میں سلیس اور مختصر ہونے کی ترجیح ہے اہل ذوق کو اختیار ہے۔

م۔ جلد 11، ص 57، س 2 متن، یومهم میں ضمیر ہم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔
ا۔ حاصل کے محفوظ رہنے سے مضر تو نہیں لیکن اگر ترجمہ ہو تو اولیٰ ہے، جیسے شاہ صاحب دہلوی نے لفظ ''اپنے'' اور حضرت دیوبندیؒ نے لفظ ''ان کے'' سے ترجمہ کیا ہے۔

م۔ جلد 11، ص 58، س 1 متن، وکتب اور والبیت اور والبحر میں جو واؤ ہے اس کے متعلق سوال ہے کہ یہ واؤ قسم ہے یا واؤ عطف۔
ا۔ اکثر نے واؤ عطف ہی لیا ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی، بقوله والواؤ الاولٰی للقسم وما بعدها علٰی ماقال ابو حیان للعطف، و تفسیر شاہ صاحب دہلویؒ و حضرت دیوبندیؒ مگر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے واؤ قسم لیا ہے اور دونوں کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں، ''والصّٰفّٰت صفا والمرسلات عرفا فالعاصفات عصفا'' میں۔ اسی طرح ''والنازعات غرقا'' الخ اسی طرح ''والذاریات'' الخ میں واؤ عاطفہ ہے بقرینہ فا کے کہ فا قسم کے لیے نہیں آتی اور ''والشمس وضحاها'' الخ میں ظاہراً سب واؤ قسم کے لیے ہیں اور عطف بھی محتمل ہے اور یہ

تعدد قسم یہاں تو صریح نہیں مگر سورۂ قیامہ میں تکرار لااقسم سے یہ تعدد صریح ہے۔

م۔جلد 11، ص37، س1۔نذیر اور نذر کا ترجمہ بجائے ڈرانے والے اور ڈرانے والوں کے پیغمبر اور پیغمبروں سے کیوں فرمایا گیا ہے۔

م۔جلد 11، ص76، س2۔وہی سوال بالا۔

ا۔روح المعانی میں اس مقام پر اس تفسیر کی تصریح کی ہے کذبت ثمود بالنذر بالرسل علیهم السلام، گو دوسرے احتمال کو بھی بعد میں لکھا ہے مگر راجح اول ہی کو سمجھا ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں مقصود خاص قید انذار نہیں، اس لیے مقید بول کر مطلق مراد لیا گیا۔

م۔جلد 11، ص82، س2۔"جن وانس" تو ثقلٰن کی تفسیر ہوئی نہ کہ ترجمہ۔

ا۔مگر شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جن وانس ہی سے ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں ایسے توسعات سب کے کلام میں ہیں۔

م۔جلد 11، ص97، س3۔جاء امر الله، ترجمہ میں "تم پر" اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

ا۔واقعی معلوم نہیں یہ کیوں لکھا گیا۔اب حذف کر دیا گیا۔

م۔جلد 12، ص6 س1۔انّ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔لکھا نہیں گیا، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ میں بھی نہیں لکھا گیا مگر ہونا بہتر ہے اب بنا دیا تحقیقاً۔

م۔جلد 12، ص15، س2۔عنہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اب لکھ دیا "اس سے"۔

م۔جلد 12، ص، س5۔اجورھن ضمیر ھن کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اب لکھ دیا "ان کی"۔

م۔جلد 12، ص15، س6۔تو ضع لهٗ، لهٗ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔واقعی ضروری چیز کی فروگزاشت ہوئی، شاہان دہلی نے "بہ فرمودہ او" اور "اس کی خاطر" سے ترجمہ کیا ہے جن میں اشارہ ہے کہ لهٗ کا مرجع باپ ہے، چنانچہ جلالین میں اس کی تصریح ہے۔ میں نے ترجمہ اس طرح درست کر دیا ہے "تو باپ کی تجویز سے" الخ میری رائے میں اس میں

سب ضروریات کی رعایت ہوگئی۔

م۔جلد 12،ص 18،س 5۔احسن لہٗ، لہٗ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔تفسیر سے انتخاب میں کوتاہی ہوئی،لفظ ''ان کو'' کو چھوڑ دیا۔

م۔جلد 12،ص 20،س 5۔ عَبدٰت کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔تفسیر میں موجود ہے، یہاں بھی انتخاب میں کوتاہی ہوئی''۔

(94)

خط یوں ہی طویل ہو گیا لیکن متعلقات تفسیر ابھی باقی ہیں:۔

م۔''بحمد اللہ نفس ترجمہ کا سرسری مسودہ 28 پاروں تک ہو گیا، انشاء اللہ ماہ مارچ تک پورا قرآن مجید ہو جائے گا۔

ا۔بیحد مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ قبول اور آپ کی سعی کو مشکور فرمائے۔

م۔لیکن ترجمہ تو میں بیان القرآن اور ایک آدھ انگریزی ترجمہ سامنے رکھ کر گھسیٹتا جاتا ہوں اور کبھی کبھی لغت اور بعض تفاسیر کی جانب بھی مراجعت کرنی پڑتی ہے، باقی اصل وقت حواشی تفسیری میں لگتا ہے۔

ا۔واقعی وہی اہم بھی ہے اور وقتی ضروری، دل سے دعاء تائید و رفع موانع کرتا ہوں۔

م۔اور وہ پندرہ پاروں کے تو ابھی بالکل ہی باقی ہیں اور ابتدائی پندرہ پاروں کے بھی ابھی بہت زیادہ نظر ثانی کے محتاج ہیں، بس حضرت دعا برابر فرماتے رہیں۔

ا۔دل سے دعا ہے اور امید قبول بھی۔

م۔مسائل کے سمجھنے میں تو کوئی ایسی زائد دشواری آپ حضرات کی برکت سے پیش نہیں آئی لیکن نفس عبارت ہی کے سمجھنے میں لوہے لگ جاتے ہیں، محذوفات و مقدرات کے کھولنے، معطوف و معطوف علیہ کے متعین کرنے، ضمائر کا مرجع قرار دینے، اس قسم کے نحوی اشکالات کے حل میں تو ہمت ہی ہار گیا ہوتا اگر بیان القرآن قدم قدم پر دستگیری کے لیے موجود نہ ہوتی۔

ا۔یہ سب توفیق الٰہی ہے خواہ نام کسی چیز کا ہو جائے''۔

مفسر محقق کے ساتھ ساتھ شیخ و عارف کی حیثیت بھی حضرت کی مراسلات میں غائب نہیں

ہونے پاتی تھی، اسی مکتوب کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

م۔ ''گھر میں پرسوں خواب دیکھا کہ خانہ کعبہ کا طواف بڑے ذوق وشوق سے کر رہی ہیں، کعبہ کا سیاہ غلاف اترا ہوا ہے، نفس عمارت بیحد نورانی نظر آرہی ہے، شدت شوق کی کیفیت کی کوئی مثال بیداری میں نہیں ملتی، کسی طرح کے خوف وہراس کا نام نہیں، تمام تر وجہ ہی وجہ ہے، اسی حالت طواف میں بعض اور عورتوں کو جدید فیشن کے غیر ساتر لباس میں دیکھا، پہلے غصہ آیا کہ یہاں بھی یہ بے حجابی لیکن پھر خیال آ گیا کہ کیسی ہی ہوں، ہر حال ان کی زبانوں پر اللھم لبیک تو ہے، جناب کی خدمت میں خواب عرض کر دینے کو مجھ سے کہا ہے۔

ا۔ پراسرار خواب ہے۔

سر اوّل۔ عبادت کی مشغولی اور عبادت بھی عاشقانہ جو روح ہے ارکان حج کی۔

سر دوم۔ بیت اللہ عالم رویا میں مثال ہے دین کی، انشاءاللہ دین صحیح سے تعلق راسخ رہے گا۔

سر سوم۔ منکرات پر غیظ جو علامت ہے ایمان کامل کی۔

سر چہارم۔ اس میں اعتدال کہ مساوی کے ساتھ محاسن پر بھی نظر ہوئی، یہی مجموعہ حق ہے مسلمانوں کا۔

ستر پنجم۔ اس کا مشاہدہ کرادیا گیا کہ دین میں اپنے اہواء نفسانیہ سے لوگوں نے تصرف کر لیا ہے۔

بہر حال صلاح واصلاح دونوں کا یہ خواب جامع ہے، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور آثار وبرکات عطا فرمائے''۔

یہ مکتوب 7ر فروری کا تھا، مارچ، اپریل اور خود باقی حصہ فروری کے خطوط خدا معلوم کیا ہو گئے، آج اپنی اس غفلت اور بے احتیاطی پر کتنا غصہ اور افسوس ہو رہا ہے اور طبیعت اپنے اوپر کیسی جھنجھلا رہی ہے! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اتنے اتنے دن تک میں نے خط لکھا نہ ہو، بہر حال اب جو مکتوب محفوظ ملا وہ 7ر مئی کا ہے اور وہ حاضر ہے:

م۔ ''تفسیر بیان القرآن کے سلسلہ میں آج حسب ذیل عرض ہے:-

جلد 12، ص 35، فتری القوم فیھا، فیھا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح ''اس قوم کو ان (ایام) میں اس طرح الخ۔

م۔جلد 12، ص 35۔ یحمل عرش ربک فوقھم، فوقھم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔اس طرح بنادیا ”آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے“۔

م۔جلد 12، ص 36۔ فلیس الیوم ھٰھنا کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔اس طرح بنادیا: ”اس شخص کا وہاں (یعنی آخرت میں کذا فی الخازن)

م۔جلد 12، ص 39۔فی اموالھم حق معلوم۔معلوم کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔اس طرح بنادیا ”حق مقرر“ ہے۔

م۔جلد 12، ص 72۔ قالوا تلک اذا کرۃ خاسرہ، قالوا کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔جدید مطبوع میں اس طرح چھاپا، (استیعاب ہے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو الخ)

م۔جلد 12، ص 90، الا ماشاء اللہ کا ترجمہ ”مگر جس وقت“ چھپا ہے۔ یہاں لفظ ”وقت“ بجائے ”قدر“ کے غلط چھپ گیا ہے، جیسا کہ آگے چل کر تفسیر میں ”جس قدر“ ہی درج ہے۔

ا۔جی ہاں، تفسیر سے کسی نے انتخاب میں غلطی کی۔

م۔جلد 7، ص 46۔ بل متعنا کے ترجمہ میں ضمیر جمع متکلم کا ترجمہ واحد متکلم سے چھپا ہے۔

ا۔اب لفظ ”ہم نے“ بنادیا ہے۔

م۔جلد 7، ص 65۔آیت بینات کے ترجمہ میں ”جس میں“ اصل پر اضافہ معلوم ہوا۔

ا۔لیکن اگر اس کو ترجمہ سے زائد مانا جائے تو اس صورت میں کلمہ ”ہیں“ کو بھی زائد ماننا پڑے گا تو بقیہ عبارت ترجمہ کی سلیس نہ رہے گی، میں نے سلاست و وضاحت کی غرض سے حاصل سے ترجمہ کیا ہے، صرف لفظی ترجمہ نہیں ہے اور ایسے توسعات ترجمہ میں سب محققین کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

م۔جلد 6، ص 125۔وعرضنا جھنم الخ، جو ترجمہ فرمایا گیا آیا اس میں عرضنا کا زور بھی آگیا ہے۔

ا۔نہیں آیا، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ سے بھی غالبًا یہ زور ادا نہیں ہوا۔ میں نے اس طرح بنادیا ہے۔ ”سامنے خاص طور پر (جس میں مصیبت ہی مصیبت نظر آئے) پیش کردیں گے“۔ اس میں اس سوال کا جواب بھی ہوجائے گا جس کا جواب حاشیۂ عربیہ میں تحت

عنوان بلاغت دیا گیا ہے۔

م۔جلد 6، ص 124۔ سدِ ذوالقرنین کے جو اوصاف قرآن وحدیث سے درج ہوئے ہیں، ان میں نمبر 5 پر جو وصف درج ہے یعنی ''دیوار کے اس طرف جویاجوج وماجوج ہیں وہ ابھی باہر نہیں نکل سکے''۔ اس باب میں شرح صدر نہیں ہوا، یعنی ان کے اس وقت تک نہ نکل سکنے پر قرآنی یا حدیثی دلیل سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔سورۂ انبیا میں جو آیت ہے حتٰی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون۔ میرے نزدیک وہ اس کی واضح دلیل ہے، فتحت کی تخصیص بالوقت الخاص سے صاف معلوم ہوا کہ وہ اس وقت تک نہیں نکل سکے اور یہ عادتاً موقوف ہے اس پر کہ دوسری طرف راستہ نہیں ہے۔

م۔جلد اوّل، ص 103۔ فی الحج کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔یوں بنادیا ''حج (کے زمانہ) میں''۔

م۔جلد اوّل، ص 104۔ واذکروہ میں ضمیر کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔اس طرح بنادیا ''اور اس کو اس طرح''۔

م۔جلد اوّل ص 105۔ ومن تاخر کے ترجمہ میں ''دودن'' اصل پر اضافہ معلوم ہوا۔

ا۔واقعی اور غالباً ترجمہ کے وقت میرے ہی ذہن میں یہ رہا کہ تاخر کے بعد بھی قرآن مجید میں فی یومین ہے۔ اب اس کو خطوط وحدانیہ کے اندر کردیا ہے۔

م۔جلد اوّل، ص 111۔ ام حسبتم کے ترجمہ میں ''دوسری بات سنو'' اصل ترجمہ پر اضافہ معلوم ہوا۔

ا۔نہیں ایسا نہیں بلکہ اس ام کو منقطعہ قرار دیا گیا ہے، پس اس کی توجیہ اس ترجمہ سے ہوگئی تو گویا یہ ترجمہ مدلول ہے ام کا۔ عربی ملحقات الترجمہ میں اس کی تصریح کردی گئی ہے''۔

تفسیری حصہ ختم ہوا، ابھی دوسرے اجزا باقی ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں:

م۔''تفسیر سے متعلق معروضات ختم ہوچکے۔ اب ایک دوسری بات عرض کرنا چاہتا ہوں، ادھر کچھ عرصہ سے خواب اپنی موت سے متعلق بار بار دیکھنے لگا ہوں خواب ہوتے بہت واضح ہیں مگر

صبح تک تفصیل حافظہ سے نکل جاتی ہے، کبھی اپنے کو کفن پہنے دیکھتا ہوں، کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ آمد اجل کا علم ہوگیا ہے اور اس کے انتظار میں ہوں، کچھ زیادہ ہراس محسوس نہیں کرتا (جیسا کہ بیداری میں اس کے فرض کرتے اور خیال کرنے سے ہوتا ہے) بلکہ ایک آدھ بار تو کسی قدر اشتیاق بھی محسوس ہوا، بعض خوابوں میں جناب والا کو بھی دیکھا، مثلاً ایک بار کا اتنا دیکھنا یاد ہے کہ جیسے میرا وقت موعود آگیا ہے، میں لیٹا ہوا ہوں اور آپ وہیں قریب ہی کی مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے بڑی خندہ روئی کے ساتھ دلاسا دے رہے ہیں۔

ا۔ مجھ کو تعبیر سے کوئی خاص مناسبت نہیں، باقی قواعد سے ایسے خوابوں کے چند محمل ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اشارہ ہو فنائے نفس کی طرف اور بشارت ہو اس درجہ کے عطا ہونے کی عاجلاً یا آجلاً، دوسرے یہ کہ حسی آنے والی موت سے وحشت رفع کرنا ہو، تیسرے یہ کہ کبھی کوئی غفلت طاری ہوگئی ہو وہ بشکل موت نظر آئی ہو، ایک احتمال کی تعیین تو معبر کامل کر سکتا ہے یا صاحب مقام اپنی حالت کا اندازہ کر کے۔

م۔ ابھی کل رات کو یہ دیکھا کہ ایک صاحب میرے سامنے شہید ہوئے اور بعد انتقال مجھ سے ملے ہیں، میں نزع روح کی کیفیت دریافت کرتا ہوں، وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تکلیف جو کچھ بھی ہوئی ہے وہ اس سرعت کے ساتھ گزر جاتی ہے کہ انسان اس کا احساس بھی نہیں کرنے پاتا، احادیث میں جو مضامین ترہیب آئے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن مومن کے ساتھ یہ خاص رحمت کا معاملہ رہتا ہے کہ قبل اس کے کہ وہ اذیت محسوس کر سکے اذیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ا۔ یہ تو کھلی بات ہے، تعبیر کی حاجت نہیں، مسئلہ کی تعلیم کی گئی ہے، اکثر مومنین کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے خصوص شہدا کے ساتھ جیسا حدیث میں ہے کہ صرف چیونٹی کے کاٹنے کے برابر تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ اعلم"۔

(95)

تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں، مدت دراز سے بالکل واضح و غیر مخفی تھا لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے، نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانویؒ کی جانب سے تھی اور نہ احترام و بزرگداشت میں

کوئی فرق مولانا حسین احمد صاحبؒ کی طرف سے۔مثالوں اور نمونوں کے لیے ملاحظہ ہوں خود اسی رسالہ کے ابتدائی نمبر بلکہ کچھ وسطی نمبر بھی۔

لیکن دیکھنے والے یہ بھی برابر دیکھ رہے تھے کہ رفتہ رفتہ یہ شگفتگی گھٹتی جارہی ہے اور بشاشت کی جگہ گرانی لیتی جارہی ہے(1)۔تا آنکہ شعبان 55 کے رسالہ النور میں حضرت کے قلم سے ایک مستقل مقالہ المانعیة عن بعض الجامعیة کے عنوان سے شائع ہوگیا،جس نے ان نیاز مندوں کو جو طرفین سے تعلق رکھنا چاہتے تھے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ایک عالم ومخلص جن کو باضابطہ بیعت دیوبند سے تھی مگر جنھیں بعد کو سند خلافت تھانہ بھون سے ملی اور جو سلسلۂ عالیہ اشرفیہ کے ایک بڑے کارگزار اور اہم رکن ثابت ہوئے ان کا خط مجھے اپنے کاغذات میں 22/اپریل 37 کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا:

''شعبان 55 کے النور میں'' المانعیة عن بعض الجامعیة '' تو آپ نے ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا، میں نے ابھی اسی عشرہ میں تھانہ بھون کی حاضری کے بعد جب دیوبند حاضر ہوا تو وہاں دیکھا، آپ نے اس ''مانعیة'' سے کیا سمجھا اور کیا کیا؟ کوئی امر مانع نہ ہوا تو اس معاملہ میں رہنمائی کا محتاج ہوں''۔

بیشک حیرانی بالکل قدرتی تھی، مقالہ میں اشارے نہیں، تقریباً صراحتیں ہی ایسی موجود تھیں اب نیچے اصل مقالہ ملاحظہ ہو:-

المانعیة عن بعض الجامعیة

''اخبار استقلال دیوبند بابتہ 20 ستمبر 36، 3/رجب 55 کے صفحہ 5 میں یہ خبر پڑھ کر طلبائے دارالعلوم دیوبند نے ایک ایسے شخص کا اسٹیشن پر پرعظمت استقبال واحترام کیا نیز بعض اکابر دارالعلوم نے اس کی فرودگاہ پر جاکر اس سے ملاقات کی اور اس کی معیت میں جلسہ گاہ میں آئے جس سے عام مسلمانوں پر جو اثر ہوسکتا ہے، ظاہر ہے(جو علاوہ غیر مسلم ہونے کے احکام اسلام کی اہانت وانہدام کی سعی کرتا ہے)چنانچہ اخبار الامان دہلی 21 ستمبر 36، 4/رجب 55 کے صفحہ 3 میں

---

(1) ملاحظہ ہوں 85، 86

اس شخص کا ہندو مسلم کی باہمی ازدواج کے متعلق تمام ہندوستان کے لیے عام قانون بنانے پر زور دینا مذکور ہے اور یہ محض ایک نمونہ ہے (ولک افرین امثالها) اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کی برداشت کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ میں آج ہی سے اپنے کو ایسے حضرات کی زیارت وصحبت سے محروم کردوں کیونکہ ان تعلقات سے اس صدمہ کی تجدید ہوگی جس کا تحمل میری ہمت سے خارج ہے اور اگر ایسے طلبا کو یہاں آنے سے منع کر دیا جائے تو میں اس کو اپنی اعانت علی الراحت سمجھ کر ممنون ہوں گا، پس مقصود اس تحریر سے اپنے خاص ضعف کا علاج ہے نہ کہ تقوئ کا دعوی بقول ایک حکیم کے۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں　　　کنجے گرفت و ترس خدارا بہانہ ساخت

اسی طرح میں ایسے حضرات کو جو دونوں طرف سے خصوصیت کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیں، یہ برزخیت یا جامعیت دینی دنیوی مصالح کے بالکل خلاف ہے، اسلم یہی ہے کہ ایسا تعلق ایک ہی طرف رکھیں خواہ ضعفا سے خواہ اقویا سے اور سہل یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیں، باقی عام اسلامی تعلقات یا ضابطہ کے معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں، اسی طرح دارالعلوم سے جو بلاواسطہ تعلق ہے اس پر بھی اس بے تعلقی للعارض کا کوئی اثر نہیں۔ عوارض تو انشاءاللہ تعالیٰ بہت جلد فاما الزبد فیذھب جفاء کا منظر ثابت ہوں گے اور دارالعلوم اپنی ذات وبرکات میں واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کا مظہر رہے گا۔

اخیر میں یہ دعا بھی کرتا ہوں اور یہی چاہتا بھی ہوں۔

اللھم اجعلنا جمیعا کما تحب وترضی واجعل اخرتنا خیرا من الاولی

5 رجب 55

خط خاص) السلام علیکم، آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کی زبانی مجھ کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ ہم طلبا میں کانگریسی اثر نہیں پھیلاتے کیا یہ کانگریسی اثر نہیں، کیا ان کی شرکت اور طلبا کو سختی سے نہ روکنا اس کا سبب قریب دموثر نہیں، پھر قول وفعل میں تطابق کہاں، یہ اس لیے ظاہر کیا گیا کہ اب تو اس اعلان میں مجھ کو معذور سمجھا جائے گا۔ آپ اس اعلان کو کسی منظر عام پر چسپاں کر دیجیے۔ اشرف علی

5 / رجب 1355 از تھانہ بھون

28 کیا معنی 29 بلکہ اس کے بھی بہت بعد تک طرفین میں باوجود اختلاف مسلک کے جو ارتباط قائم رہا، اس کے نمونے ان اوراق میں بار بار گزر چکے ہیں، لیکن اب 36، و37 تھا، اور اب جو دیوار اختلاف کی اٹھی وہ مستقل تھی اور مجھ نادان کے علم میں تو آخر تک قائم رہی، یہ تذکرہ ناخوشگوار و تکلیف دہ جتنا بھی ہو، بہر حال حقیقت نگاری کے لحاظ سے تھا ضروری ہی۔

(96)

جملۂ معترضہ، اہم سہی، بہر حال ختم ہوا۔ اب پھر اسی سلسلۂ مراسلت کی طرف واپس آجائیے 27/مئی کا نیاز نامہ ایک خواب نامہ ہے، اب وہ ملاحظہ ہو، پہلے اصل اور پھر اس کا جواب۔

''ایک ندوی دوست کا خط ملاحظہ عالی کے لیے ارسال ہے(1)''۔

ایک اپنا بھی خواب پرسوں شب کا دیکھا ہوا عرض کر دینا چاہتا ہوں۔(1) اپنے ایک مرحوم دیندار دوست کو اچھی حالت میں دیکھا، بڑھ کر ان سے پوچھا کہ آپ کی حالت تو خود ہی کہے دیتی ہے کہ بہت اچھی گزری یہ بتائیے کہ عام طور پر کیا گزرتی ہے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے چلتے جاتے تھے اور وہاں کے متعلق ہر طرح کی تسلی دلاسے دیتے جاتے تھے۔ خلاصہ ان کی گفتگو کا یہ تھا کہ مومن کو کچھ ڈر نہیں، خطرے کے مقامات آتے ضرور ہیں، لیکن بس آتے ہی گزر جاتے ہیں، شدائد صرف کافروں کے لیے ہیں(2) یہ باتیں کرتے ہوئے شکل وصورت تو ان ہی دوست کی سی ہے لیکن معلوم ایسا ہونے لگا کہ گفتگو ایک دوسرے مرحوم فرما رہے ہیں، جنھیں میں دوست نہیں بلکہ بہت بڑا بزرگ سمجھتا تھا(3) خیر، باتیں کرتے کرتے ایک خاص مقام تک وہ مجھے لے گئے اور بولے کہ یہی سرا پردۂ احدیت ہے(4) دیدار تو ابھی ہم لوگوں کو نصیب ہوا نہیں، البتہ آواز یہیں سے آتی ہے(5) میں نے دیکھا تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ برف کی شفاف بڑی بڑی چٹانیں ہیں اور ایک بالکل ہو کا عالم ہے، معاً ایسا محسوس ہوا کہ آپ وہاں تشریف فرما ہیں، شکل دیکھنے میں نہ آئی لیکن تسکین قلب کو بہت زائد رہی(6) خواب اوّل شب میں دیکھا تھا، اس وقت خوب تفصیل سے یاد تھا اور طبیعت بہت ہی بشاش تھی، جی میں آیا کہ اسی وقت اٹھ کر قلمبند کر لوں مگر پھر یہ خیال غالب

---

(1) اب بالکل ذہن میں نہیں کہ خط کن صاحب کا اور کس مضمون کا تھا، حضرت نے یقیناً اس کے متعلق اسی خط پر لکھ دیا ہوگا اور میں نے اسے بجنسہٖ ان مکتوب نگار کے پاس بھیج دیا ہوگا۔

آ گیا کہ خوب یاد ہے، بھولنے والا نہیں ہے، جب صبح سو کر اٹھا تو بیشتر حصہ بھول چکا تھا، اتنا بھی حافظہ پر خوب زور ڈالنے کے بعد لکھ سکا ہوں، بڑا افسوس رہا، اسی شب میں سونے سے قبل طبیعت بہت ہی افسردہ تھی کچھ تو افکار خانگی کی بنا پر اور کچھ اضاعت عمر پر''۔

جوابات نمبروار ملاحظہ ہوں:

(1) ''بے تکلف جواب تو یہ ہے کہ ؎

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور تکلف کا جواب ہر جز کے ساتھ معروض ہے۔

(2) بالکل صحیح اور صریح ہے، اہل ایمان کی غالب حالات میں نجات ومغفرت ہی ہو جاتی ہے، کسی کسی پر خفیف عقوبت بھی ہوتی ہے جس سے زیادہ مقصود تطہیر ہے۔

(3) شاید یہ اشارہ ہو کہ اہل برزخ کے درجات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

(4) شاید مراد ہو کہ توحید کی برکت سے حجاب قریب تک رسائی ہوتی ہے۔

(5) یہ واقعہ ہے کہ دیدار کی دولت تو آخرت میں موعود ہے، اس وقت وراحجاب کلام ہو سکتا ہے، وفیہ قال الشیرازی ؎

کس نہ دانست کہ منزل گہ آں یار کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

(6) حدیث میں ہے اللھم اغسل خطایای بالماء والثلج والبرد، یہ تمثل ہے اعمال مامور بہا کا جس سے راحت ہی راحت ہے جو کیفیات نفسانیہ سے منزہ ہے، محمودہ سے بھی، الحمدللہ آپ نے اس نااہل کو وہاں دیکھا، شاید بشارت ہو صحت طریق کی، باقی مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں''

مولانا جن علوم اور جن مسائل سے اپنی زیادہ مناسبت نہ ہونا بتاتے تھے، اس میں بھی یہ عالم رہتا تھا، پھر جن علوم سے انھیں واقعی مناسبت تھی مثلاً تفسیر وفقہ وسلوک وکلام ان میں ان کے پایہ ومرتبہ کا کہنا ہی کیا!

آخر مئی کے بعد پھر مکتوب ایک دم سے وسط اگست کا ہے۔ اس مکتوب میں اس درس تفسیر قرآنی کا سلسلہ تو نہیں، البتہ اور کچھ چیزیں کام کی ہیں، تاریخ اس پر 17/ اگست کی پڑی ہے:

م۔ ''مدت سے دریافت خیریت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی، انشاء اللہ ہر طرح عافیت ہی ہوگی۔

ا۔ الحمدللہ، بدعائے احباب بعافیت ہوں۔

م۔ ایک روز مشکوٰۃ کے مطالعہ میں باب النکاح والخطبہ کی فصل ثانی پر نظر پڑی۔ آیت قرآنی بسلسلۂ خطبۂ نکاح، ان الفاظ میں منقول ملی۔ ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا'' لیکن آیت ان الفاظ کے ساتھ تو قرآن مجید میں ہے نہیں، سورۃ النساء کی مشہور آیت میں ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا'' نہیں بلکہ ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ'' ہے، پھر اس کے متصل اور جو الفاظ ہیں(1)، وہ روایت مشکوٰۃ میں غیر منقول ہیں۔ مزید حیرت اس پر ہے کہ اصحاب سنن سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں اور کسی شارح کے ہاں اس سے تعرض نہ ملا حالانکہ یہ حضرت تو بڑے محقق محتاط گزرے ہیں۔

ا۔ ماشاء اللہ نہایت ضروری سوال ہے جس کی طرف کبھی التفات نہیں ہوا، جزاکم اللہ کہ آپ نے متوجہ کیا، یہاں کتابیں کم ہیں مگر احتیاطاً مظاہر حق (2) میں دیکھا تو انھوں نے برفرع اس سے تعرض کیا ہے اس عبارت سے۔ ''اور دوسری آیت میں جو لفظ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا کا سب مشکوٰۃ کے نسخوں میں ہے شاید ابن مسعودؓ کے مصحف میں (جو کہ اس حدیث کے راوی ہیں) اسی طرح ہوگا، والا اس مصحف مجید میں وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ بدون يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا کے ہے''۔

م۔ ایک فقہی مسئلہ بھی دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، ایک غیر شادی شدہ عزیزہ سو ڈیڑھ سو کے زیور کی مالک ہیں لیکن کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں رکھتیں، معمولی خورد ونوش ایک دور کے عزیز کے ذمہ ہے، باقی دوسری ضروریات زندگی کے لیے بڑی تنگی رہتی ہے اور اسی سے وہ اپنے

---

(1) پوری آیت یوں ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا.

(2) ترجمہ اردو شرح مشکوٰۃ، چار جلدوں میں۔

زیور کی بھی زکوٰۃ نہیں نکال پاتیں۔ ان عزیزہ کو زکوٰۃ دینے سے آیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟

الجواب: نہیں، اس لیے کہ وہ صاحب نصاب ہیں۔

ایک صورت ان کی امداد کی ہوسکتی ہے کہ کوئی مسکین مستحق زکوٰۃ کسی سے قرض وغیرہ لے کر بقدر زکوٰۃ واجب ان کو ہدیتاً دے دے، پھر وہ اس کو اپنی زکوٰۃ میں دے دیں خواہ اسی مسکین کو خواہ اور کسی کو، اگر کسی اور کو دیں تو پھر کوئی غنی اپنی زکوٰۃ اس مسکین کو دے دے کہ وہ اپنا قرض ادا کر دے''

دوسرا مکتوب اسی اگست ہی کی 31 تاریخ کا ہے، حسب معمول دینیت کا ایک کشکول:

م۔ ''تفسیر بیان القرآن ملاحظہ ہو:

جلد 9، ص9۔ بما کانوا بہ یشرکون. بہ کا ترجمہ نہیں ملا، بعض مفسرین نے ضمیر کا مرجع حق تعالیٰ کو رکھا ہے۔

ا۔ اب بنا دیا، ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ'' جیسا کہ بعض مفسرین سے سوال میں نقل کیا گیا ہے۔

م۔ جلد 9، ص9۔ فاولئک ھم المضعفون، ترجمہ میں خدا تعالیٰ کے پاس کے الفاظ اصل سے زائد معلوم ہوئے۔

ا۔ واقعی، چنانچہ مدرسہ کے نسخہ میں ترجمہ وتفسیر میں کیے ہوئے ہیں۔

م۔ جلد 9، ص123۔ ان لھم علیھا لشوبا من حمیم، علیھا کا ترجمہ نہ ملا۔

ا۔ اب ترجمہ وتفسیر میں اس طرح بنا دیا، ''ان کو اس پر''۔

م۔ پچھلے عریضہ میں عرض کیا تھا کہ مشکوٰۃ (باب خطبۃ النکاح) میں سورۃ النساء کی پہلی آیت قرآنی کسی قدر غیر قرآنی لفظوں میں، بحوالہ سنن اربعہ نقل ہوئی ہے اس سے ذہن کو قدرتاً تشویش تھی کہ اکابر محدثین سے الفاظ قرآنی میں یہ سہو وتسامح کیونکر ہو گیا، اس کے بعد میں نے اصل سنن کا مطالعہ کیا، سو ابوداؤد میں تو بیشک وہی الفاظ منقول ہیں لیکن ترمذی وابن ماجہ میں ایسا نہیں بلکہ آیت کا جزاوّل یکسر حذف کر کے اسے شروع ہی یہیں سے کیا ہے۔ اِتَّقُوْا اللّٰہَ الَّذِیْ تساء لون بہ الخ. اس سے کم از کم ان دو اصحاب سنن کی طرف سے تو تساہل کا شبہ رفع ہو گیا۔

ا۔ میں نے بھی دیکھا، بہت دل خوش ہوا، ایک توجیہ اور ذہن میں آئی تھی کہ آیت کا نقل کرنا مقصود نہ ہو بلکہ آیت سے اقتباس مقصود ہو اور اقتباس میں بہت توسع ہے۔

م۔ایک بات اور اس وقت دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن کے مسودات کا ایک بڑا ذخیرہ کٹا پٹا ہوا جمع ہوگیا ہے جواب بیکار ہی ہے۔ایک پوری الماری اس سے لبریز ہے۔عرض یہ ہے کہ ان کاغذات کو اب کیا کروں۔

ا۔دفن اولیٰ ہے۔

م۔ایک خیال یہ دل میں آتا ہے کہ سردست انھیں محفوظ رہنے دوں اور وصیت یہ کر جاؤں کہ میرے غسل میت کے لیے پانی ان ہی کاغذات کو جلا کر گرم کیا جائے، پھر سوئے ادب کا خیال مانع آتا ہے۔

ا۔بیشک سوئے ادب اور ابتذال ہے۔

م۔امام بخاریؒ سے متعلق یہ روایت پڑھنے میں آئی کہ آپ کے غسل میں آپ کے حسب وصیت آپ کے قلم کے تراشے پانی میں ڈال دیے گئے تھے۔

ا۔اگر یہ منقول ہوتو اس پر ایقاد کا قیاس مع الفارق ہے۔

م۔بہرحال اسی قسم کے کسی مصرف میں لانے کا دل چاہتا ہے۔اب آگے جیسا ارشاد ہو۔

ا۔اوپر عرض کر چکا ہوں''۔

(97)

شروع اکتوبر کے لیے تھانہ بھون کی حاضری کا پروگرام تھا اور اب کی حاضری ایک طویل عرصہ کے بعد ہو رہی تھی، اس طرح اطلاع ناموں یا اجازت ناموں کے لیے عموماً جوابی کارڈ ہی استعمال کرتا تھا، اب کی حسن اتفاق سے لفافہ بھیجا (اور اب کی سفر ذرا زیادہ اہتمام چاہتا بھی تھا) جو محفوظ رہ گیا اور اس سے اپنے الفاظ اور ادھر سے حضرت کا جواب دونوں مل گئے، اس عریضہ پر تاریخ 26 ستمبر کی ہے:-

م۔''سال بھر بعد اب پھر حاضری کا قصد ہے۔

ا۔اللہ تعالیٰ سہولت وراحت سے ملا دے۔

م۔گھر میں بھی اب کی ہمراہ چلنے پر اصرار ہے۔

ا۔گھر میں بہت خوش ہوئیں اور نہایت اشتیاق کے لہجہ میں کہا کہ بہت ہی دنوں میں آرہی ہیں۔

م۔ان کے علاوہ ایک چھوٹی لڑکی ہوگی۔

ا۔بچیاں خوش ہوئیں۔

م۔اور ایک ملازم۔

ا۔میں خوش ہوا کہ آپ کو راحت دے گا۔

م۔یہ ساڑھے تین آدمیوں کا قافلہ انشاءاللہ 5 راکتوبر سہ شنبہ کی دوپہر تھانہ بھون حاضر ہوگا

ا۔خدا تعالیٰ خیریت سے ملادے۔

م۔اسٹیشن پر اگر ایک ڈولی کا انتظام فرمادیا جائے تو زہے کرم۔

ا۔ضرور ایسا ہی ہوگا(1)۔

م۔واپسی کی اجازت چوتھے دن یعنی جمعہ کے سہ پہر کو طلب کروں گا۔

ا۔فاترک ما اریدلما ترید۔

م۔مکان جو بھی مناسب سمجھا جائے مرحمت ہو، مجھ سے دریافت فرمانے کی حاجت نہیں۔

ا۔گھر میں یہ رائے قرار پائی کہ چار دن کے لیے جدا گھر کیا ہوگا، اپنے ہی گھر میں ٹھہرایا جائے گا۔ بالا خانہ کا ایک حصہ ایسا ہے کہ اس کا راستہ دہلیز میں ہوکر ہے، وہاں سے آپ کی آمد ورفت بے تکلف ہوسکتی ہے(2)۔

میرا حاشیہ اتنا اور ہے کہ آنے پر جو آپ کی رائے ہوگی ویسا انتظام ہو جائے گا۔

م۔اب کی آدمی کئی ہیں، اتنوں کی مہمانداری کا بار ڈالنا مجھے طبعاً گراں گزر رہا ہے، اس لیے کھانے کے بطور خود انتظام کی اجازت مرحمت ہو۔

ا۔صلاح ماہمہ آنست کان صلاح شماست(3)۔

بڑی لڑکی کی شادی عنقریب ہی ہونے والی تھی، اور گھر میں جو اس سفر میں ساتھ چلیں، اس

---

(1) بعد کو خدا معلوم کیا اسباب پیش آئے (غالباً یہی ہوا ہوگا کہ لکھنؤ والی گاڑی سہارنپور اتنی لیٹ پہنچی ہوگی کہ وہاں سے تھانہ بھون کی ٹرین چھوٹ چکی ہوگی) کہ پہنچنا دوپہر کو نہیں بلکہ گیارہ بجے شب کو ہوا، ڈولی مع حضرت کے ایک خادم کے اس وقت بھی موجود ملی۔

(2) گھر میں وہیں یعنی حضرت ہی کے مکان میں اتریں اور میں مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر۔

(3) لیکن واقعتاً یہ نہ ہوا، مہمانداری مولانا ہی فرماتے رہے۔

سے ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت سے دعائے برکت کرائی جائے اور کشائش رزق کی بھی کہ زیور وغیرہ کا انتظام کسی مناسب حد تک تو ہو جائے، خیر وہ بہت خوش خوش لوٹیں اور حضرت نے ان کی خاطر خواہ دعائیں کر دیں، چار دن کی بساط ہی کیا ہے، ہم لوگ جب لوٹے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی خزانہ کما کر ساتھ لا رہے ہیں اور یہ احساس اب کی ہی دفعہ نہیں، بلا استثنا ہر حاضری تھانہ بھون سے واپسی میں ہوتا رہتا۔

شادی بحمد اللہ دلخواہ طریقہ پر ہو گئی، اس کے کچھ روز بعد ذیل کا عریضہ لکھا، علاوہ اس اطلاع دہی کے ایک مستقل تفسیری مذاکرہ، خط پر تاریخ 8 نومبر 37 (مطابق 3/رمضان 56) پڑی ہے:

م۔ ''لڑکی کا عقد بحمد اللہ 11/شعبان کو ہو گیا تھا۔

ا۔ مبارک۔

م۔ ایجاب وقبول حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بجنوریؒ نے کرایا۔

ا۔ دوسری بار مبارک۔

م۔ خدمت والا میں عرض کرنے کی نوبت آج جا کر آ رہی ہے۔

ا۔ کیا مضائقہ۔

م۔ دعا حسن معاشرت کی فرمائیں۔

ا۔ دل وجان سے۔

م۔ ''بیان القرآن جلد 10، ص 91۔ ووقٰهم عذاب الجحيم، عذاب کا ترجمہ رہ گیا۔

ا۔ اب لکھ دیا۔

م۔ اسی صفحہ پر وزوجنٰهم بحور عين میں زوجنٰهم کا ترجمہ ''ہم بیاہ کر دیں گے'' درج ہے۔ شاہ صاحب وغیرہ نے بھی یہی کیا ہے لیکن اہل لغت نے یہاں تصریح ''تزویج'' کے معنی قرآن یا ملانے کے قرار دیے ہیں نہ کہ نکاح متعارف کے۔ چند عبارت حاضر ہیں۔

قاموس، زوجناهم بحور عين اے قرناهم.

مفردات راغب۔ اے قرناهم بهن ولم يجی فی القرآن زوجناهم حوراً كما يقال زوجته امرأة تنبيها ان ذلک لايكون علٰى حسب المتعارف فيما بيننا من

المناكحة.

لسان العرب۔قال الفراء، زوج الشئ بالشئ وزوجه اليه قرنه وفي التنزيل وزوجناهم بحور عین اے قرناهم

تاج العروس۔قال شيخنا فيه الباء الٰى ان الأية تكون شاهدا لماحكاه الفراء لان المراد منهما القران لا التزويج المعروف لانه لاتزويج في الجنة، وقيل قرنت باعمالها وليس في الجنة تزويج ولذٰلک ادخل الباء في قوله تعالٰى وزوجناهم بحور عين.

ا۔واقعی ان عبارات کا مقتضا یہی ہے جو آپ نے لکھا لیکن مختصر تتبع سے مشہور ترجمہ کی بھی اصل ملی فی تفسیر الجلالین۔زوجناهم من التزويج او قرناهم في الكمالين ولذلک عدى بالباء اما التزويج فانما يتعدى بنفسه لا بالباء وانه لا عقد نهاک ومن فسره بالتزويج قال الماء زائدة علٰى انه نقل عن الاخفش تعدية بالباء ايضا وفي روح المعاني بعد نقل القول بانه متعد بنفسه وفيه بحث فان الاخفش جوز الباء فيه فيقال زوجتُه بامرأة فتزوج بها وازد شنوءة يعدونه بالباء ايضاء وفي القاموس (قبل العبارة المنقولة في السوال) زوجتُه امرأة قلت واليه اشير بقولي في الحاشية وهذا احد القولين واما نفي التزويج فلا دليل عليه سوران الجنة ليست دار التكليف وقد ذكرت جوابه في تفسيرى تحت هذه الأية فليراجع"۔

(98)

نمبر 88و 89و 90 پر ایک بار پھر نظر کر لی جائے، تکفیر مولانا فراہی والی بحث مہینوں گزر جانے پر بھی ملک میں چل رہی تھی، آخر جنوری 38 میں ہفت روزہ اہل حدیث (امرتسر) میں مولانا فراہی کی حمایت میں ایک مضمون نکلا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا نے اگر بعض الفاظ قرآنی کو غیر مترتب لکھ دیا تو کیا ہوا بہت سے اکابر یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح کے اقوال منقول ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ وہ تراشہ حضرت کی خدمت میں بھیج دیا جائے، 26 جنوری 38 کے نیاز نامہ میں ایک ذکر یہی ہے اور دوسرا ذکر اپنے ایک خواب کا ہے، جزو اوّل کا

جواب بہت ہی مفصل ومطول آیا، پہلے اصل عریضہ حاضر ہے:

پرچہ اہل حدیث کا تراشہ ملفوف خدمت ہے، حسب فرصت اس مضمون سے متعلق اجمالی رائے عالی سے مطلع فرمادیا جائے، محض اپنے اطمینان خاطر کے لیے چاہتا ہوں، کسی اخباری بحث ومباحثہ سے تعلق نہیں۔

کئی دن ہوئے خواب میں زیارت ہوئی تھی، یہ دیکھا کہ آپ میرے ہاں مہمان تشریف لائے ہیں اور میں انتہائی مسرت کے ساتھ ساتھ اس پر فخر بھی کررہا ہوں کہ برسوں کے معمول عدم سفر میں میرے لیے استثنا فرمادیا گیا، پھر دیکھا کہ آپ واپس تشریف لے گئے ہیں اور معاً بعد حکیم محمد مصطفیٰ صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ان سے بڑے فخر کے ساتھ حضرت کی تشریف آوری بیان کرکے ان سے داد ومبارک باد کی توقع کررہا ہوں، کچھ چپ سے ہوگئے۔ اس پر ذرا گرانی محسوس کررہا ہوں"۔

جواب جزاوّل کا ملاحظہ ہو:

"الجواب: **قال اللہ تعالٰی فی الکھف انزل علٰی عبدہ الکتٰب ولم یجعل له عوجا.** عوج مقابل ہے استقامت کا، کسی شے کی استقامت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلال نہ ہو، پس عوج عام ہوگا ہر اختلال کو اور یہ نکرہ ہے تحت نفی کے۔ پس ہر قسم کا عوج منفی ہوا، اسی بنا پر روح المعانی میں اس کی یہ تفسیر کی۔ **ای شیئا من العوج باختلال اللفظ من جھة الاعراب ومخالفة الفصاحة وتناقض المعنی وکونه مشتملا علٰی ما لیس بحق او داعیا بغیر اللہ، وقال متحدیا وَاِنْ كُنْتُمْ فِی رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ.** ان نصوص قطعیہ سے قرآن مجید کا ہر قسم کے نقص سے منزہ ہونا اور اس تنزیہ میں اس کا معجز ہونا مصرح ہے۔ نیز اس پر تمام امت کا ایسا اجماع ہے کہ اس عقیدہ کو اس درجہ ضروریات دین سے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے انکار پر بالاتفاق کفر کا حکم کیا جاتا ہے اور اہل ایمان تو بجائے خود رہے قرآن کے اس اعجازی کمال کا اقرار ہمیشہ کفار کو بھی رہا، اگر نعوذ باللہ اس میں شائبہ بھی کسی قسم کے نقص کا ہوتا تو کیا وہ خاموش رہتے اور جس طرح اس کے اعجاز پر یہ نصوص ودلیل عقلی قطعی ہیں ثبوتاً بھی ودلالتاً بھی اور قاعدہ متفق علیہ بین اہل ملت وبین اہل عقل ہے کہ ایسے قطعی کا معارض ایسا ہی

قطعی تو ہو نہیں سکتا۔ لاستلزامه الجمع بين النقيضين اگر عارض ظنی ہو تو اگر معصوم سے منقول ہو تو ثبوت کا انکار رواۃ کی غلطی سے واجب ہے اور دلالۃ کی تاویل واجب ہے اور اگر غیر معصوم سے ہو اگر وہ محل حسن ظن نہیں تو رد وابطال واجب اور اگر محل حسن ظن ہے تو سند میں جرح یا تاویل مستحسن ہے۔ اس مقدمہ کی تمہید کے بعد جتنی روایات واقوال موہم معارض پائے جائیں، یا تو وہ معارض ہی نہیں جیسے بعض کلمات کا اصول کے خلاف ہونا، کیونکہ درحقیقت وہ مطلق اصول کے خلاف نہیں صرف اصول مشہورہ کے خلاف ہیں، تو اصول کا انحصار مشہورہ میں یہ خود غلط ہے، اکثر تو ان کے مقابل دوسرے اصول بھی پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض مطلقاً اصول کے خلاف ہونا بھی ثابت ہو جائے اگرچہ یہ فرض تقریباً باطل ہے لیکن اس کو فرض کر لینے کے بعد بھی اصول کی تدوین کو ناقص کیا جائے گا۔ اصول کی مخالفت سے ایراد نہ کیا جائے گا کیونکہ اصول خود فصحا اہل لسان کے کلام کے تتبع سے جمع کیے جاتے ہیں، فصحاء اہل لسان ان کے تابع نہیں ہوتے اور اس کے تسلیم میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا، جیسے اصول فقہ مجتہدین کے فروع سے مستنبط ہوتے ہیں، مجتہدین اپنے فروع کو ان پر مبنی نہیں کرتے یا اگر معارض ہیں تو واجب الرد یا ماؤل۔

اس تحقیق کلی سے تمام جزئیات کا فیصلہ ہوتا ہے، بعض جزئیات بطور مثال کے ذکر بھی کی جاتی ہیں، مثلاً فواصل کی رعایت سے اصول کی مخالفت، یہ محض بعض اصول کی مخالفت ہے، مطلق اصول کی مخالفت نہیں کیونکہ اس رعایت کی تقدیم یہ بھی ایک صحیح اصل ہے، کما صرح بہ فی الاتقان نوع 59 فصل 2 اور یہ اس وقت ہے جب صرف یہی رعایت موجب ہو مگر خود اسی میں کلام ہے، قرآن مجید میں بیشمار مواقع ایسے ہیں کہ فواصل میں سجع کا سلسلہ شروع ہو کر ایک آیت میں سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس کے بعد پھر عود کر آیا، اس سے معلوم ہوا کہ صرف رعایت فواصل کی اس مخالفت کی داعی نہیں بلکہ اس میں اور بھی اسباب غامض ہوتے ہیں، چنانچہ اتقان کی نوع تاسع وخمسون میں ایسے امثلہ کے بعد بعنوان تنبیہ ابن الصائغ کا قول نقل کیا ہے لا يمتنع في توجيه الخروج عن الاصل في الأيات المذكورة امور اخرىٰ مع وجه المناسبة فان القرآن العظيم كما جاء في الاثر لا تنقضي عجائبه اور مثلاً ابن عباسؓ سے ایک ایسی ہی روایت منقول ہے اس کی نسبت ابوحیان کہتے ہیں۔ روى عن ابن عباس انه قال ذلك فهو

طاعن فی الاسلام ملحد فی الدین وابن عباس بریٔ من ذٰلک القول کذا فی روح المعانی تحت قوله تعالٰی حتّٰی تستانسوا مع ابن حیان اورمثلاً ایک ایسی ہی روایت کے متعلق روح المعانی تحت آیت افلم یائس الذین آمنوا کہا ہے اما قول من قال انما کتبه الکاتب وهو ناعس فسوی اسنان السین فهو قال زندیق بل ملحد علی ما فی البحر وعلیه فروایة ذالک کما فی الدر المنثور عن ابن عباس غیر صحیحة اوراس کے غیر صحیح ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اتقان نوع سادس وثلاثون کی فصل سوال عاشر کے جواب میں خود ابن عباسؓ سے اس کے خلاف منقول ہے، اسی طرح پر مقام کے متعلق خاص خاص تحقیقات ہیں جن کا ذکر موجب تطویل اوراجمال مطلوب فی السوال کے خلاف ہے اورایک ان سب روایات کا مشترک جواب ہے جس کو اپنی تفسیر بیان القرآن حاشیہ عربیہ متعلقہ آیت حتّٰی تستانسوا سے نقل کرتا ہوں۔ والذی تقرر عندی فیه وفی ماورد من امثاله علٰی تقدیر ثبوت هٰذه الروایات ان هٰؤلآء رضی الله عنهم سمعوا القراأت التی اختاروها من رسول الله صلی الله علیه وسلم ولم یسمعوا القراأت الموجودة ثم ان تلک القراأت نسخت ولم یبلغهم الخبر فداوموا علیها وانکروا غیرها لمخالفته ظاهرا القواعد وعدم سماعه کما کان ابو الدرداء یقرأ والذکر والانثٰی وکانت عائشةؓ تقرأ خمس رضعات.

اوراسماء سور کے تعدد کا اس بحث میں کچھ دخل ہی نہیں، ان میں تعارض ہی کیا ہے مگر ان اسما میں سے کسی کو غیر مناسب کہنا بدعت شنیعہ ہے کیونکہ بعضے اسما خود احادیث صحیحہ مرفوعہ میں وارد ہیں، علٰی ہٰذا احادیث کے ایسے مقامات کا جواب ہی ان ہی اصول سے معلوم ہوسکتا ہے، مثلاً معزورات کی جگہ مازورات فرمانا یہ بھی ایک اصل میں داخل ہے اس اصل کا اصطلاحی نام ہے ازدواج کذافی القاموس۔

(ونسم هٰذا المجموع ملاحة البیان فی فصاحة القرآن) اشرف علی، السادس والعشرین من ذی القعدہ56۔

اب حضرت کی عمر 77، 78 سال کی تھی اورقویٰ پر پیرانہ سالی کا اثر بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔

اس سن وسال میں اتنا مفصل جواب وہ بھی مراجعت کتب کے بعد، لکھنے میں ظاہر ہے کہ کتنا تعب برداشت کرنا پڑا ہوگا، اس لیے ذیل کے اس ضمیمہ پر تعجب بالکل نہ کیجیے۔

''اطلاع خاص بنا بر بے تکلفی، مدت سے دماغی کام سے قاصر ہوگیا ہوں اور اکثر ایسی خدمات سے عذر کرکے دوسرے اہل علم کا پتہ دے دیتا ہوں چنانچہ استفتے عموماً واپس ہوجاتے ہیں مگر آپ کے خط کے جواب میں عذر کرنے کو جی نہ چاہا، چونکہ طبع میں اضمحلال محسوس ہوتا تھا اس کے نفع کے انتظار میں رہا، کل قدرے نشاط معلوم ہوا جواب لکھا مگر تعب اس قدر ہوا کہ اس وقت تک دماغ میں درد اور طبیعت میں کسل غیر معمولی موجود ہے۔ اس تجربہ کے بعد صرف اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی جواب سے تقاعد کا اتفاق ہوجائے تو اسی عذر پر محمول فرمالیا جائے، لیکن سوال میں آپ بالکل آزاد ہیں''۔

خود اس مختصر سی اطلاع کے اندر عمومی اور خصوصی جتنے پہلوؤں کی رعایت ہے، یقین ہے کہ خوش فہم ناظرین کی نظر خود ان تک پہنچ جائے گی، اس کے ساتھ ساتھ ایک اور ''ضمیمہ موضحہ''، نفس مسئلہ کے متعلق مفتی صاحب مدرسہ کے قلم سے تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اس کتاب سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

(99)

بڑوں کی بات بڑے ہی سمجھیں، اس ناچیز کی سمجھ میں تو یہ بات اب آتی ہے (لفظ 'اب' خیال میں رہے، یعنی 48 میں جب کہ یہ کتاب لکھی جارہی ہے، نہ کہ 37، 38 جب کہ یہ بحث جاری تھی) اور ایک موٹی بات کی طرح بالکل صاف آتی ہے کہ مفسر فراہی کا مقصود لفظ ''غیر انسب'' کے لانے سے ہرگز ہرگز کسی قسم کا اعتراض یا قرآن مجید کی منقصت کسی درجہ میں بھی نہ تھا، معاذ اللہ، جس کتاب جلیل وعزیز کی خدمت کرنے اور جس کے اوپر سے اعتراضات دفع کرنے ہی میں ان کی عمر گزری تھی، اس پر وہ اعتراض کا خیال بھی دل میں لاسکتے تھے! ان کا مقصد تحریر صرف یہ تھا کہ جس طرح ہر لفظ بجائے خود ایک موزونیت ومناسبت رکھتا ہے اور اس کا خیال رکھنا ادب وانشا میں ضروری ہے، اسی طرح عربی فن بلاغت میں قافیہ یا سجع کی رعایت بھی بہت اہم ہے، چنانچہ قرآن مجید نے حسن انشا کے اسی مقتضا سے بعض جگہ سجع (قافیہ) کو لفظی موزونیت پر مقدم رکھا ہے اور قصداً

ایسے الفاظ لایا ہے جو بجائے خود چاہے زیادہ مناسب وموزوں نہ ہوتے لیکن قاعدہ حسن سجع کو بہرحال پورا کرنے والے تھے اور یہ عربی انشاوادب کا عیب نہیں، عین ہنر ہے۔

لفظ ''غیرانسب'' عاشق قرآن وعاشق اسلام مفسر مرحوم ٹھیک اسی مفہوم میں لائے تھے اور وہ بھی اپنے نج کے مسودہ میں۔ طبع واشاعت کے لیے جب وہ اپنی یادداشت پر نظرثانی کرتے تو گمان کیا معنی یقین ہے کہ اس لفظ ''غیرانسب'' کو بھی موہم نقص سمجھ کر ضرور بدل دیتے، شاگردوں نے عقیدت کے جوش وغلو میں مسودہ کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھا اور پھر اس کے بعد سخن پروری تو وہ بلا ہے جس سے اچھے اچھے باکمالوں اور مخلصوں کا بھی پیچھا نہیں چھوٹتا، خفیف لفظی ترمیم قبول کرلینے سے ساری بحث چشم زدن میں ختم ہوسکتی تھی۔

جملۂ معترضہ اتنا لمبا، سیرت اشرفی سے غیر متعلق سہی لیکن بہرحال اس بحث کے چھڑ جانے کے بعد لانا تھا ضروری، شاید کہ بہت سے پڑھنے والوں کی ذہنی الجھن کچھ اس سے دور ہوجائے۔

اب پھر ایک پیراگراف چھوڑ امضمون کا سلسلہ نمبر 98 سے ملایئے۔

اتنا مفصل جواب یاد ہوگا کہ عریضہ کے صرف جز اوّل ہی کا ہوا، باقی جز دوم جو خواب سے تعلق رکھتا تھا وہ تو ابھی رہ ہی گیا، وہ اب حاضر ہے:

''اوّل تو مجھ کو تعبیر سے بالکل مناسبت نہیں، دوسرے خواب خود اپنی ذات میں وجوہ متعددہ کو محتمل ہوتا ہے، یہ بھی احتمال ہے کہ میں کئی روز ہوئے آپ کو خود بخود یاد کررہا تھا اور زیادہ یاد کررہا تھا، ممکن ہے یہ خواب اس کی صورت مثالیہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعد ذی الحجہ کے چھوٹے گھر میں سے اپنی چھوٹی ہمشیرہ سے ملنے کے لیے بلیا جانے کا خیال کررہی ہیں، کہتی تھیں کہ اگر وقت میں گنجائش ہوئی اور سہولت سے پہنچنا ممکن ہوا تو آپ کی اہلیہ محترمہ کے یہاں بھی مہمان ہوں گی، ممکن ہے کہ یہ خواب اس کی خیالی شکل ہو واللہ اعلم اور بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ سب آثار قلبی توجہ اور تعلق کے ہیں جو اسلام میں مطلوب ہے''۔

یہ حضرت کی چھوٹی بیوی صاحبہ کی تشریف آوری کی اطلاع گویا بالکل ضمناً اور ایک تعبیر خواب کے ذیل میں ہوئی۔ ہم میاں بیوی کے لیے انتہائی نشاط طبع کا باعث ہوئی اور آنکھوں کے سامنے خیالی سماں''۔

امروز شاہ شاہان مہمان شد ست مارا

کا پھرنے لگا، ساتھ ہی ساتھ قلب پر بڑا اثر انفعال کا تھا کہ خواہ مخواہ تفسیری سوال کر کے حضرت کے لیے اتنی زحمت کا موجب بنا۔

5 رفروری کو عریضہ لکھنے بیٹھا، تو کل یہی دو مضمون سامنے تھے، چنانچہ:

م۔ ''سوال کا اتنا مفصل و مبسوط جواب پا کر شرمندگی ہوئی کہ خواہ مخواہ اس قدر تعب کا باعث بنا، آئندہ کے لیے میری طرف سے مستقل درخواست ہے کہ میرے کسی سوال پر ہرگز ایسی مشقت نہ گوارا فرمائی جائے، کامل نشاط طبع کے ساتھ بے تکلف جو کچھ بھی افادات ہو جائیں انشاء اللہ بالکل کافی ہو جائیں گے، ہم نیاز مندوں کا کام خدمت کرنا اور راحت پہنچانا ہے نہ کہ کسی حیثیت سے بھی بار خاطر ثابت ہونا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اس رعایت پر جزائے خیر عطا فرمائے، میں تو خود یہی تجویز کر کے اطلاع کر چکا ہوں، آپ اطمینان فرمایئے، انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی عمل ہوگا، خصوص جب کہ آپ سے کسی قسم کا تکلف نہیں تو اس کے خلاف کا احتمال نہ فرمایئے، اس وقت تک تجربہ سے یہ محسوس ہوا کہ جس جواب میں مراجعت کتب کی ضرورت نہ پڑے اس کا بے تکلف تحمل ہو جاتا ہے اور کتاب دیکھنے میں بعض اوقات تکلف ہوتا ہے۔

م۔ گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس طرح خود ایک مستقل تحقیق وجود میں آ گئی۔

ا۔ مجھ نادان کی تحقیق ہی کیا، البتہ دوسرے محققین کے لیے ایک موقع یاد دہانی کا نکل آیا۔

م۔ چھوٹے گھر کے قصد سفر بلیا سے بے پایاں مسرت ہم سب کو ہوئی اور باشتیاق تمام دن گنے جا رہے ہیں، وقت و تاریخ سے جس قدر بسہولت ممکن ہو مطلع فرما دیا جائے، لڑکیاں اور ان کی والدہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مشتاق ہیں، گھر میں امید کرتی ہیں کہ رشیدہ سلمہا بھی ضرور ساتھ ہوں گی، یہاں اترنے اور زیادہ قیام فرمانے کے لیے عرض کرنا تو سوءادب میں داخل ہے، تاہم اپنی طرف سے تو جی یہی چاہتا ہے کہ جتنا بھی زیادہ وقت نکل سکے مرحمت فرمایا جائے۔

ا۔ میں نے ان کو مطلع کر دیا، انشاء اللہ تعالیٰ بقدر امکان سب ارشادات کی رعایت رکھی جائے گی سب کو مطمئن فرما دیجیے''۔

مہمانداری کی سعادت نصیب میں نہ تھی، عید چاند نظر آ جانے کے بعد بھی نہ ہوئی، جب سفر کا موعودہ زمانہ قریب آ گیا اور کوئی اطلاع اُدھر سے موصول نہ ہوئی تو مارچ کے تیسرے ہفتہ میں کارڈ لکھ کر خود دریافت کیا، جواب میں یہ مایوس کن کارڈ ملا، جس پر مہر 20/ مارچ کی پڑی ہوئی ہے:

''الحمدللہ بہ برکت دعائے احباب ہر طرح عافیت سے ہوں، چھوٹے گھر میں سے اپنی ہمشیرہ کے ملنے کو سفر کرنے والی تھیں مگر وہ اپریل میں خود آ رہی ہیں اور چار مہینے کے لیے آ رہی ہیں، اس لیے سفر ملتوی کر دیا آج وہ اپنے میکہ گئی ہیں ورنہ وہ بھی شاید کچھ لکھواتیں جس کا تاسف ان پر محسوس بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ پھر کوئی موقع نکال سکتے ہیں''۔

ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی، کوئی چیز جیسے ہاتھ سے آ کر نکل گئی، ہو ہی کیا سکتا تھا۔

دوسرا خط 24 اپریل کا لکھا ہوا محض ضابطہ کا ہے، شادی شدہ بھتیجی کو آثار حمل کے معلوم ہوئے، اس کے لیے تعویذ کی طلب تھی اور تعویذ آ گیا۔

حضرت کی صحت جسمانی مدتوں قابل رشک رہی، ایک تو جثہ قدرتاً قوی تھا، کاٹھی اچھی تھی اور پھر حضرت کی احتیاط، خوئے اعتدال اور ہر بد پرہیزی سے پرہیز، میلوں پیدل چلنے اور خوب تیز چلنے کی عادت، نتیجہ قدرتاً یہ تھا کہ اپنے اصل سن سے 10-15 سال کم معلوم ہوتے تھے اور مدتوں بیماری پاس بھی نہیں پھٹکنے پائی لیکن آخر کہاں تک اور کب تک اب سن 78 سال کا تھا اور اب ضعف نمایاں ہو چلا تھا، وسط 38 سے علالت مزاج مسلسل رہنے لگی اور اس کی خبریں مختلف ذرائع سے آتی رہیں، سن سن کر ہول بڑھتا رہا اور دعائیں اضطراب و اضطرار کے ساتھ ہونٹوں پر آتی رہیں، کسی کسی نے یہ بھی خبر دی کہ علاج کے لیے رائے سفر لکھنؤ کی ہو رہی ہے، 8/ اگست کو عریضہ حسب ذیل لکھا:

''حالات مزاج گرامی سن کر قلب پر جو کچھ گزرتی رہتی ہے بس عالم الغیب ہی کو اس کا علم ہے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ ایسے وجود گرامی کی بقائے صحت کے لیے مضطرانہ دعا کرنا اس کے حق میں نہیں خود اپنے

حق میں دعا کرتا ہے۔

ا۔آپ کی محبت ہے۔

م۔مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا اس وقت وہاں موجود ہونا میرے حق میں ایک آیۂ رحمت ہے، مجھے اطلاعیں ان ہی کے ذریعہ پہنچتی رہیں، یہ عریضہ بڑے تذبذب و تامل کے بعد لکھ رہا ہوں، عرصہ تک ڈرتا رہا کہ کہیں یہ طبع والا پر مزید بار کا باعث نہ ہو جائے۔

ا۔خدا نہ کرے۔کیا آپ کا ایسا تعلق ہے، احباب کے متفقہ مشورہ سے لکھنؤ کا سفر معالجہ کے لیے طے ہوا ہے، امید ہے کہ پرسوں جمعرات کی شام تک لکھنؤ پہنچ جاؤں گا''۔

(100)

حضرت کی تشریف آوری لکھنؤ میں! دل اس خبر پر کیسے یقین لائے، حضرت اور لکھنؤ! کیا صورت اب اس سفر کی رہ گئی تھی، حضرت تو اپنے عذرات جسمانی کی بنا پر معمولی اور ہلکا سا سفر دو ایک اسٹیشنوں کا بھی ترک کر چکے تھے، چہ جائیکہ اتنا بڑا سفر! مژدہ وجد میں لے آنے کے لیے کافی تھا لیکن دل کہاں دل بھر خوش ہو پایا! ذہن سفر کے ساتھ ہی سبب سفر کی طرف بھی تو معاً پہنچ گیا، بیماری کی کوئی ایسی ہی مجبور کن نوبت آگئی ہوگی جب تو اتنا بڑا سفر اختیار کیا جا رہا ہے۔تھانہ بھون اور شہر سہارنپور کی طبی کوششیں ختم و ناکام ہو چکیں، جب تو لکھنؤ کی ضرورت پڑ رہی ہے! لکھنؤ کے مشہور خاندان جھنوائی ٹولہ کے مشہور حاذق طبیب تو خود تھانہ بھون جا کر علاج کر چکے ہیں، یہ صورت کافی اور کارگر نہ ہوئی جب تو حضرت کے بنفس نفیس لکھنؤ آنے اور طویل قیام کرنے کی ٹھہری! خیالات و اوہام کے اس ہجوم نے مسرت کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ہی کب دیا! امور پر پھیلا کرنا چنے جا ہی رہا تھا کہ نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی، طبیعت جز بز ہو کر رہ گئی، غالب کا مصرع یاد پڑ گیا۔

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں!

حضرت اپنے پروگرام کے مطابق وارد لکھنؤ ہوئے، قافلہ اچھا خاصا ساتھ تھا، قیام محلہ مولوی گنج (بھیڑی منڈی) میں حضرت کے مرید با اخلاص و اختصاص مولوی محمد حسن کاکوروی (1) مالک

---

(1) اب پاکستانی ہیں۔

انوار بک ڈپو وانوار المطابع کے وسیع مکان میں ہوا، ایک حصہ زنانہ کردیا گیا، ایک مردانہ یہ مکان ہمارے لکھنؤ والے مکان، خاتون منزل (محلہ قبر ماموں بھانجے، مرزا حیدر مرزا روڈ) سے کل 3، 4 فرلانگ کے فاصلہ پر تھا اور لکھنؤ کے دور دراز فاصلوں کے لحاظ سے یہ تین چار فرلانگ کیا چیز تھے، کہنا چاہیے کہ ہمارے مکان سے متصل ہی تھا، علاج یونانی جھنوائی ٹولہ کا شروع ہوا، لکھنؤ سے دم بدم خبریں دریاباد پہنچتی رہیں، سہ شنبہ 16 اگست کو حسب ذیل دستی عریضہ دریاباد سے روانہ کیا:-

''خیریت بحمداللہ دریافت ہوتی رہتی ہے، انشاء اللہ پرسوں جمعرات کو نو بجے صبح لکھنؤ پہنچوں گا اور عیادت کی اجازت جس حد تک اور جتنے منٹ کے لیے اطبا دیں گے یہاں تک کہ دور سے محض زیارت ہی، اسی کو کافی سمجھوں گا(1)۔

ازواج محترم کی آمد سن کر گھر میں بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہیں، میں خود تو بعد زیارت پہلی ٹرین سے واپس چلا آؤں گا، انھیں لکھنؤ چھوڑے آؤں گا کہ وہ زیادہ اطمینان کے وقت مل سکیں، گو زیادہ فرصت ظاہر ہے کہ تیمارداروں کو بھی کہاں حاصل ہو سکتی ہے(2)۔

یہ عریضہ محض اطلاعی ہے، جواب طلب نہیں لیکن اس احتمال کی بنا پر کہ شاید کچھ زبانی یا تحریراً فرمایا جائے، حامل عریضہ کچھ دیر رکے رہیں گے''۔

جواب لکھنؤ پہنچتے ہی حسب ذیل موجود ملا:

''یاد فرمائی ودعا گوئی کا ممنون ہوں، معلوم ہوا یہ رقعہ آپ کو لکھنؤ پہنچ کر ملے گا، اس کی رعایت سے جواب عرض کرتا ہوں۔

(1) کا جواب یہ ہے کہ حد تو ہے مگر وہ نہیں جو جناب کے ذہن میں ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جب راحت کی مصلحت ہوگی میں از خود عرض کردوں گا بے تکلف۔

(2) اگر ترمیم موجب جرح ہو۔

(3) الحمدللہ اتنی تیمارداری کی احتیاج نہیں، زیادہ حصہ فراغ کا ہے''۔

زیارت جتنی دیر کی بھی رہی، حسب معمول دل کو پوری تسکین دینے والی رہی اور اگلے ہفتہ پھر سفر کی ٹھہری اور دل بے اختیار چاہا کہ اب کی کچھ ہدیہ بھی ضرور پیش کیا جائے۔ لکھنؤ آنا گویا ہمارے جوار وطن میں آنا ہوا، خدمت مہمانی کا حق کسی ادنیٰ درجہ میں تو ادا ہو۔

انتظامات حضرت کی اس علالت کے زمانہ میں بھی قابل دید تھے نشست کے اوقات مقررہ، ہر آنے والے کے لیے حصول اجازت کی ضرورت، چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام۔

23 راگست کو عریضہ اجازت کے لیے لکھا۔

م۔''انشاء اللہ نرسوں جمعہ کو پھر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ا۔اللہ تعالیٰ بخوشی ملائے۔

م۔گاڑی وہی صبح نو بجے پہنچتی ہے، اب کی وقت کی ذرا زیادہ گنجائش رکھ کر یعنی شام تک حاضر رہوں گا، ممکن ہے کہ دوسرے وقت پھر شرف نیاز حاصل ہو جائے۔

ا۔انشاء اللہ تعالیٰ۔

م۔اب کی دو رفیقوں کے لیے بھی اجازت چاہتا ہوں۔

ا۔آپ کی رفاقت ان کے لیے کافی ہے۔

م۔حضرت موسیٰ کے زمانہ کے چرواہے کی طرح تمنا تو ہم دونوں (میاں بیوی) کی یہ تھی کہ شرف قدوم سے اپنے سیہ خانہ کو منور کرتے لیکن یہ تو نصیب ہی میں نہیں۔

ا۔نصیب تو مشترک ہے، میں بھی یہی حسرت کر سکتا ہوں مگر اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ جب تجھ کو تحمل نہیں تو اس نصیب پر راضی رہنا چاہیے۔

م۔اس لیے وہیں اگر کچھ قدرے قلیل ہدایا مثلاً انڈے یا گھی کی شکل میں پیش ہوتے رہیں تو از راہ کرم انھیں شرف قبول سے محروم نہ رکھا جائے۔

ا۔تبرک ہونے کی حیثیت سے خود ہی مانگ لینا عجب نہ تھا اب تو بے مانگے ملتا ہے''۔

مریضوں کی نازک مزاجی اور چڑچڑاپن مشہور و مشاہد ہے طبیبوں سے مختلف غذاؤں کی فرمائشیں عام ہیں اور پھر اپنی طرف سے تجویزوں کی تو گنتی ہی نہیں رہتی، آنے جانے والے جو ہوتے ہیں ان میں کے مخلص و تجربہ کار اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق کچھ مشورے ضرور دے جاتے ہیں، یہاں آنے والوں کی کیا کمی تھی، اچھے اچھے طبیب اور ڈاکٹر بھی حاضری دینے، زیارت کرنے آتے اور جو صاحب بھی آتے اپنے اخلاص ہی کے تقاضا سے کوئی نہ کوئی دوا یا غذا یا تدبیر بھی بتا جاتے، حضرت کی کیفیت اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی، آنکھیں نیچی کر کے بڑے نرم

وملائم انداز میں فرما دیتے، جی بہت اچھا، اپنے حکیم صاحب سے اس کا ذکر کردوں گا، آگے وہ جیسا مناسب خیال فرمائیں'' اور اپنی تو نازبرداری کسی سے کیا کراتے، الٹے خود ہی حکیم صاحب کی نازبرداری کرتے رہتے، اپنے کو ان کے ہاتھ میں تمامتر دے کر خود مجسم تسلیم ورضا بنے رہتے اور طبیب سے فرمائشیں کرنے کی جگہ ان کی چھوٹی بڑی ہر ہدایت کی پوری پیروی کرتے، تھانہ بھون چھوڑنے سے حضرت کے معمولات میں جو فرق آرہا تھا اور جتنا حرج ہو رہا تھا، بالکل ظاہر ہے اور اس کی بنا پر جتنی بھی عجلت حضرت کو واپسی، وطن کی ہوتی، کم تھی لیکن طبیب کے سامنے اشارتاً بھی یہ ذکر نہ آنے دیتے۔ فرماتے کہ یہ بھی ایک صورت تقاضا کی اور منصب طبیب میں مداخلت کی ہے۔ اللہ اللہ! فطرت بشری اور شریعت اسلامی کے کن کن حقائق ودقائق پر نظر حکیم الامت کی رہتی تھی، کاش کسی صاحب نے حضرت کی کیفیات کو جو بحیثیت مریض کے وارد ہوتے رہتے تھے ذرا غور کرکے نوٹ کرلیا ہوتا، پورا ایک رسالہ آداب مریض پر تیار ہوسکتا تھا، ہمیشہ کے لیے نافع، آئندہ نسلوں کے حق میں شمع راہ!

(101)

صحت خدا کے فضل سے برابر حاصل ہو رہی تھی اور ظاہر ہے کہ بلاضرورت خاص ایک دن کے لیے بھی قیام لکھنؤ کا سوال نہ تھا۔ دریافت کرنا تھا کہ عزم روانگی کب تک ہے تاکہ ایک بار پھر رخصتی سلام کو حاضر ہولوں۔ مریض ہونے کے باوجود افادیت مجلسی کی گرم بازاری اسی طرح تھی، صبح کی مجلس کہنا چاہیے کہ خواص تک محدود تھی، سہ پہر کی مجلس گویا عام تھی، کلمات حکمت ومعرفت کی بارش تھانہ بھون ہی کی طرح ہوتی رہتی، اس کا لالچ تو تھا ہی، ادھر مولانا گیلانی کے مکتوب گرامی کے بھی بعض فقرے خدمت والا تک پہنچا دیتے تھے، 20 ستمبر کو ذیل کا عریضہ ڈاک سے روانہ کیا:

م۔ ''خیریت مزاج گرامی دوسرے ذرائع سے برابر معلوم ہوتی رہتی ہے، فالحمدللہ

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ سرورکم بعافیتی۔

م۔ اگر بسہولت ممکن ہو کہ تاریخ روانگی سے دو ایک روز قبل مجھے اطلاع کردیا جائے تو غایت کرم سمجھوں گا، ایک کارڈ اسی اطلاع کی غرض سے ملفوف ہے۔

ا۔ امانت رکھ لیا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کروں گا، لفظ کوشش اس لیے عرض کیا کہ

حکیم صاحب نے باوجود ایک جماعت کے پوچھنے کے کوئی صاف بات نہیں بتلائی اور میرا پوچھنا موہم ہے تقاضے کو اگر دو تین روز قبل معلوم ہوگیا فوراً اطلاع عرض کر دوں گا''۔

شرافت اس آخری دقیقۂ اخلاق پر، کہ طبیب سے اجازت چاہنا بھی گویا اس سے تقاضا کرنا ہے، لوٹ لوٹ گئی ہوگی، علماء صوفیہ کو انسانی اخلاق سے محروم اور خشک مزاجی سمجھنے والوں نے کاش ایک بار بھی حضرت کی زیارت کر لی ہوتی!

خط ابھی چل رہا ہے:۔

م۔''مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ایک تازہ گرامی نامہ کا اقتباس درج ذیل ہے:

حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے تو آج کل آپ سے خوب خوب ملاقاتیں ہوتی ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو ملت اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملاح کو اتنا تو وقفہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے (1) علما میں افسوس ہے کہ سب ادھر ہی چلے گئے جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ایک حضرت ہی ہیں جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے (2)، موقع تو کیا ملے گا لیکن اگر مل جائے تو کسی کی صحت کی دعا دعاسحر گاہی میں کرنے والے کا سلام پہنچا دیجیے گا، یہ سن کر افسوس ہوا کہ ہمارے مولانا سلیمان ندوی ایسے وقت جاگے جب جگانے والا خود نیند میں تھا، خداوند تعالیٰ حضرت کو تازہ قوت کے ساتھ پھر مسند تھانہ بھون پر جلوہ گر فرمائے''۔

ا۔مولانا کے حسن ظن اور عنایت و محبت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس غیر واقعی خیال کو واقعی کر دے کلاً او بعضاً کما قال القائل

مرا از زلف تو موئے پسند است — ہوس را رہ مدہ بوئے پسند است

مولانا سید سلیمان صاحب کو حضرت کی جانب التفات خصوصی اب ادھر تھوڑے دن سے پیدا ہوا تھا، مولانا گیلانی کا اشارہ اسی جانب ہے، طلب صادق نے ماضی کی تلافی بڑی سرعت

---

(1) کانگریسی حکومتیں صوبوں میں نئی نئی قائم ہوئی تھیں اور بعض صوبوں (مثلاً بہار) میں مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

(2) مولانا گیلانی کا یہ اندازہ صحیح نہ تھا، علما کی ایک اچھی خاصی جماعت حضرت کے ساتھ بھی تھی۔

سے کردی اور مولانا ندوی کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے ''اصحاب الیمین'' ہی میں نہیں ''مقربین میں ہونے لگا۔

1939 دیکھتے دیکھتے آ گیا، مہینہ غالباً فروری کا، ٹھیک یاد نہیں، بہرحال جاڑے ختم ہو رہے ہیں اور میں تھانہ بھون دو چار روز کے لیے آیا ہوا ہوں، قیام اب کی مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر نہیں بلکہ خانقاہ کے بالائی مہمان خانہ میں ہے، ایک روز دو پہر کا وقت ہے، صبح کی مجلس دیر ہوئی برخاست ہو چکی ہے، دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت صحن مسجد و خانقاہ میں حوض کے اوپر پتھر کے فرش پر دھوپ میں لیٹے ہوئے ہیں، میں کوٹھے سے ٹکٹکی لگائے اسی طرف دیکھ رہا ہوں، جسم مبارک پر صرف کرتا ہے جس سے لاغری پوری طرح نمایاں ہو رہی ہے اور میرا دل اندر سے ابلتا چلا آ رہا ہے! ہا یہ جسم کتنا گھل چکا ہے اور اب کب تک ساتھ دے گا! ابھی چند ہی سال اُدھر کی بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں حضرت کرتا اتارے ہوئے کھڑے تھے، ناف سے اوپر کا جسم کھلا ہوا، اس وقت ماشاء اللہ جسم کتنا توانا و تنومند تھا، چند ہی برس کی مدت میں کتنا تغیر ہو گیا! پہچاننا مشکل! پہلے بار بار یہ سوچا کرتا تھا کہ حضرت کی وفات کسی مرض سے ہو گی کیونکر؟ اور ایسے صحت مجسم و احتیاط مجسم کے لیے اس کی نوبت ہی کبھی کیسے آنے پائے گی؟ اب قدرت یہ منظر دکھا رہی ہے، اب سوچ یہ ہونے لگا ہے کہ اتنا لاغر و نزار جسم زندہ و سلامت کب تک رہ سکے گا! کیا قدرت کے کرشمے ہیں اور کیسی شان حکمت کی انقلات آفرینیاں ہیں۔

دیر تک یہی منظر دیکھتا اور دل یہی سوچ سوچ کر اندر ہی اندر روتا رہا، ضعف پیری کے آثار اب پوری طرح نمایاں تھے، دھوپ میں مضمحل ہو کر استراحت فرماتے اور کسی خادم سے جسم کو دبواتے ہوئے پہلی بار دیکھا اور یہی دیکھنا آخری بار کا بھی تھا۔

خیال نہیں کہ اب کی تھانہ بھون میں کتنا ٹھہرنا ہوا، بہرحال اب کی جب لوٹا تو بہت ہی مغموم و دل شکستہ۔

(102)

مراسلت کی نوبت اب کی مدت دراز کے بعد آخر جون میں آئی، خط پر تاریخ 28/جون 39 کی درج ہے:-

م۔"آج ایک مدت دراز کے بعد یہ عریضہ دریافت خیریت کے لیے لکھ رہا ہوں۔

ا۔آپ کئی بار یاد آئے مگر کچھ فطری امر ہے کہ خود ابتدا کرتے ہوئے جی شرماتا ہے، جزاکم اللہ تعالیٰ کہ آپ نے میرا انتظار رفع فرمادیا جس سے راحت ہوئی۔

م۔وجہ تاخیر کچھ تو کاہلی رہی اور کچھ یہ بھی کہ خیریت مزاج والا دوسرے ذرائع سے دریافت ہوئی اور پھر کچھ یہ خیال بھی کہ حضرت کے اوقات پر حتی الامکان بار نہ پڑنے پائے۔

ا۔یہ سب آپ کی محبت ہے۔

م۔اب ادھر چند روز ہوئے ایک صاحب سے یہ سن کر دل بے چین ہوگیا کہ مسجد خانقاہ میں پنج وقتہ نماز و امامت کے معمول میں اب فرق آگیا ہے۔

ا۔فرق بھی انتہائی کہ میں ایک وقت کی بھی امامت نہیں کرتا، اقتدا کی راحت اب مشاہد ہوئی۔

م۔میرا تو اس تصور ہی سے دل بھرا آتا ہے کہ وہ محراب کسی وقت بھی حضرت کی امامت سے خالی ہوتی ہوگی۔

ا۔"بھرنے" اور "خالی ہونے" میں صنعت تقابل بھی پر لطف ہے(1)۔

اس میں بھی بلا قصد ایک حکمت ودیعت ہے کہ بعض احباب جو قرات سننے سے لطف حاصل کرتے ہیں ان کو اب اخلاص میسر ہوگیا کہ محض اصلاح مقصود ہوگئی، لطف کی شرکت بھی حذف ہوگئی"۔

اسی اپریل میں ایک خاص واقعہ گھر میں حالت سفر میں پیش آچکا تھا، اس کا ایک شرعی پہلو بھی حضرت کی خدمت میں پیش کرنا تھا:

م۔"گھر میں سلام عرض کررہی ہیں۔

ا۔میرا بھی سلام۔

م۔ایک خاص مسئلہ بھی ان کے سلسلہ میں دریافت طلب ہے، لکھنؤ سے شام کی گاڑی سے آرہی تھیں، زنانہ انٹر کلاس میں صرف یہی تھیں، لکھنؤ سے معاً بعد نماز مغرب گاڑی چلی اور ابھی چند ہی گز چلی تھی کہ ایک لمبا تڑنگا مردانہ کے درجہ سے پائدان پر آگیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا

---

(1) یہ ہیں خشک مزاج و متقشف مولانا اشرف علی!

چاہا، یہ ٹھہریں اختلاجی اور خفقانی لیکن اللہ نے عین وقت پر اتنی ہمت دے دی اور انھوں نے بلند آواز سے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

ا۔ یہ قوت ایمانی تھی جو ضعف طبعی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔

م۔ اور معاً گاڑی کی زنجیر اپنی پوری قوت سے کھینچنے لگیں، گاڑی اگرچہ ڈاک تھی(1) فوراً رک گئی اور وہ شخص (غالباً مع اپنے ساتھیوں) کود کر اندھیرے میں فرار ہو گیا، بیان کرتی ہیں کہ زبان اور ہاتھ تو میرے مشغول تھے۔

ا۔ قوت ایمانی سے۔

م۔ لیکن دل برابر دھڑک رہا تھا۔

م۔ اور دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ اگر گاڑی کے رکنے میں دیر ہوئی اور یہ شخص اندر داخل ہی ہو گیا تو معاً کھڑکی سے کود پڑوں گی۔

ا۔ اپنے منشا کے اعتبار سے جہاد عظیم تھا۔

م۔ سوال یہ ہے کہ جو خودکشی اس خاص صورت کے ساتھ ہو، کیا اس کے لیے بھی اسی عام خودکشی کا حکم ہے؟

ا۔ الجواب۔ ضعیف بیویوں کو اس وقت اکثر حیا وعفت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وقوع ہلاکت سے بتقدیر وقوع ذم ہلاکت کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا، اس لیے ایسی حرکت بطریق اضطرار ہوتی ہے، نیز ہلاکت یقینی بھی نہیں، بہت لوگ اس طرح کود کر بچ بھی گئے ہیں، البتہ چوٹ ضرور لگی ہے سو ایسے غلبہ کے وقت امید ہے کہ معذور ہوگی، اس لیے اس کو خودکشی نہ کہا جائے گا، وقریباً من ہذا احباب استادی مولانا محمد یعقوب حسین سئل عن النسوة اللاتی القین انفسھن فی البیر حین خفن علی عفتھن فی الزمان المعروف بالغدر لکن اذا فات الشرط فات المشروط، یعنی شعور واختیار کے رہتے ہوئے بقدر قدرت مدافعت ومقاومت کرے۔

جواب حسب توقع بالکل صحیح ومحققانہ تھا۔

39 کے خطوط خدا معلوم میرے ذخیرہ میں اتنے کم کیوں ہیں؟ کارڈ اور لفافے ملا کر کل چار

---

(1) کلکتہ پنجاب ایکسپریس۔

ہی نکلے، اتنی کم مراسلت سال بھر میں تو ہو سکتی ہی نہ تھی، اب اللہ جانے باقی خط کہاں گم ہو گئے۔
بہر حال اس کے بعد کا عریضہ 3 ستمبر کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا:

م۔ ''شب کو ایک متوحش خواب جناب والا کے متعلق دیکھا کہ جیسے میرے سامنے آپ بہت سخت علیل ہو گئے ہیں، گو دماغ پوری طرح کام کر رہا ہے، لوگوں میں خبر یہ مشہور ہو گئی، صبح اٹھتے ہی پہلی تعبیر بے تکلف ذہن میں یہ آئی کہ خدانخواستہ دین میں کوئی سخت فتنہ برپا ہونے والا اور امت کے لیے کوئی سخت ابتلا پیش آنے والا ہے لیکن ابھی یہ عریضہ شروع کرتے وقت خیال یہ آیا کہ شاید مجھ ہی سے کوئی شدید معصیت سرزد ہو چکی ہو یا ہونے والی ہو۔

ا۔ میرے خیال میں بے ساختہ اور تعبیر آئی، وہ یہ کہ آج کل حال سے زیادہ مسلمانوں کے مستقبل کو سوچ سوچ کر جس قدر صدمہ وقلق قلب پر ہے اس کو بیان نہیں کر سکتا (1)، وہ حزن واضمحلال بصورت سقم واعتلال مشاہد ہوا، واللہ اعلم باسرارہ۔

م۔ خواب اس لیے میرے لیے اور بھی وحشت ناک ہے کہ اس کے قبل جب آپ کی زیارت نصیب ہوئی تھی ہمیشہ شان جمالی کے ساتھ اور تسکین وتشفی دینے والی۔

ا۔ اس وقت یہ حوادث سامنے نہ تھے، خدمت دین کی امنگ ہوتی تھی اس لیے دوسری صورت نمایاں ہوتی تھی۔

م۔ مزاج والا خدا کرے مع متعلقین بخیر وعافیت تمام ہو۔

ا۔ بحمد اللہ بعافیت ہوں''۔

آپ بیتی کے سلسلہ میں ایک مسئلہ کی کھٹک دل میں مدت سے تھی، اب کی عریضہ میں اسے بھی لکھ ڈالا:

م۔ ''خیر یہ تو خواب تھا، ایک مسئلہ بھی مدت سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا، نوبت آج جا کر آرہی ہے خیال یہ رہ رہ کر آتا ہے کہ اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی پوست کندہ، من وعن لکھ ڈالوں، پھر اگر ہمت ہو تو زندگی ہی میں چھاپ دوں، ورنہ بعد والوں کے لیے چھوڑ ے جاؤں، اس میں اپنی بدعقیدگی، بدعملی، معاصی سب ہی کی تصریح ہوگی، گو مقصود اس سے انشاء اللہ دوسروں

---

(1) یہ ذکر 1939 کا ہے، اچھا ہوا جو 47، 48 کے قیامت خیز مصائب ملت کے دیکھنے کو حضرت زندہ نہ رہے۔

کی اصلاح وعبرت ہی رہے گی لیکن پھر بھی دل ڈرتا ہے کہ حدیث میں تو اظہار فسق واعلان معصیت کی ممانعت آئی ہے، کہیں اس کی خلاف ورزی نہ ہو، اب جیسا جناب والا کا ارشاد ہو۔

ا۔الجواب۔غور کرنے سے اس کے متعلق یہ اجزا ذہن میں آئے:

(1) جن معاصی کے اظہار سے ممانعت ہے مراد اس سے وہ ہیں جن کو مرتکب بھی معصیت سمجھتا ہے ان کا اظہار صورتاً جسارت ووقاحت ہے اس لیے ممنوع ہے۔

(2) عقائد فاسدہ کا اظہار اس میں داخل نہیں کیونکہ ان کا ارتکاب دین اور حق سمجھ کر کیا تھا اس لیے وہ علت اس میں نہیں۔

(3) پھر معاصی مذکورہ کا اظہار بھی اگر ضرورت دینیہ سے ہو، جیسے مصلح کے سامنے بغرض اصلاح، اس میں وہ علت نہیں پائی جاتی اس لیے وہ ممنوع نہیں، جیسے بدن مستور کا کشف معالج کے سامنے جائز ہے اوروں کے سامنے نہیں۔

(4) اور جہاں یہ ضرورت نہ ہو، محض اپنے نقص کے اظہار دوسروں کی تحذیر کی مصلحت ہو، چونکہ یہ مصلحت عنوانات کلیہ سے بھی حاصل ہوسکتی ہے، مثلاً مجھ سے بہت سے معاصی سرزد ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، دوسرے حضرات بھی میرے لیے استغفار کریں، اس لیے جزئیات کا اظہار جائز نہیں۔

امید ہے کہ جواب کافی ہوگیا ہو اگر کوئی ضروری چیز رہ گئی ہو، پھر سوال کرلیا جائے۔

مزید سوال کی نوبت اب یاد نہیں پڑتا کہ آئی یا نہیں، بہرحال یہ کھٹک تو باقی ہی رہ جاتی ہے کہ اپنے نقص کے اظہار یا دوسروں کی اصلاح وعبرت کے لیے عنوان کلی یا ذکر اجمال ہرگز ہمیشہ کافی وموثر نہیں ہوتا، بہت دفعہ ایک ایک جزئیہ کو کھول کر کہنا پڑتا ہے، جب جا کر مخاطب متاثر ہوتا ہے، معصیت جس طرح آہستہ آہستہ وبے پاؤں اور زینہ بہ زینہ آتی ہے اسی کو کھولنا تو مقصد اصلاح میں موثر ہوتا ہے۔

(103)

منجھلی لڑکی کا عقد 7 راکتوبر کو ہونے والا تھا، چاہیے یہ تھا کہ حضرت کو بہت قبل سے اطلاع دے کر دعائے خیر وبرکت کراتا، اس میں دیر خدا معلوم کیوں ہوگئی، 5 کو کارڈ بہرحال لکھ دیا اور

اس میں یہ واقعہ بھی عرض کر دیا کہ گھر میں ناخوش ہو رہی ہیں کہ دعا کی درخواست تو قبل نکاح پہنچ جانی چاہیے تھی، حضرت کا جواب 6 اکتوبر کا لکھا ہوا حسب ذیل موصول ہوا:

''آپ کا کارڈ 5 کا لکھا ہوا آج 6 کو پہنچ گیا اور عقد 7 کو لکھا ہے، بہر حال عقد سے پہلے پہنچ گیا، دل سے دعا ہر طرح کی خیر و فلاح کی کرتا ہوں، گھر میں کی ناخوشی بھی فضول ہے، دعا تو پہلے ہی ہوگئی گو اطلاع مابعد میں ہو، مقصود تو پہلی چیز ہے نہ کہ دوسری۔ اللھم اصلحنا و اصلح شانھما و وافق بینھما بالخیر و البرکۃ''۔

اسی زمانہ میں غالباً بچیوں میں سے کوئی بیمار بھی زیادہ ہوگئی تھی، طلب دعا کے کارڈ کے جواب میں صرف ذیل کا عنوان جوابی کارڈ میں ملا:

''دل و جان سے دعا کرتا ہوں، اللھم اشفھا اللہ عافھا، میں بحمد اللہ ہر طرح خیریت سے ہوں''۔

1940 کے شروع مارچ میں پھر تھانہ بھون کا قصد کیا، اطلاعی کارڈ کے جواب میں کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا 26 فروری کو موصول ہوا:

رواق منظر چشم من آشیانہ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

اب یہ تو خیال نہیں آتا کہ کب گیا اور کب واپس آیا، اتنا یاد ہے کہ اب کی حضرت کے ضعف و اضمحلال کو دیکھ کر بہت ہی زیادہ مغموم و دلگیر واپس آیا اور یہ منظر تو قیامت کا تھا کہ نماز بجائے حضرت کے کوئی اور صاحب پڑھا رہے ہیں، گھر آ کر شدت تاثر میں حضرت کے لیے بہت بہت دعائیں کیں، 11 مارچ کو یہ عریضہ لکھا، آج تک یاد ہے کہ قلم لکھنے میں مشغول تھا اور آنکھیں آنسو بہانے میں:-

''اللہ آپ کی عمر میں اور صحت و قوت میں بہت بہت برکت عطا فرمائے۔ اب کی حاضری تھانہ بھون کے وقت بہت ہی متاثر رہا، نماز جماعت کے وقت محراب کو جناب والا سے خالی پا کر دل کی عجیب کیفیت ہوتی تھی، مسجد سونی معلوم ہوتی تھی، جماعت کا لطف ہی گیا، مجلس میں جتنی دیر بیٹھتا، نظر بار بار آپ کی انگلیوں پر جمی رہتی کہ اللہ اکبر، دین کی کیسی کیسی خدمات یہی انگلیاں انجام

دے چکی ہیں، بہت ضبط سے کام لیا، ہر دفعہ بے اختیار یہی جی چاہتا تھا کہ آپ کے ہاتھ کو لے کر خوب آنکھوں سے ملتا اور ہونٹوں سے لگاتا جاؤں اور دل کھول کر روتا جاؤں، محض اس تصور سے طبیعت میں ایک کیف پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی شبیہ مبارک چشم تصور کے سامنے ہے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں ہیں۔

صحت اور درازئ عمر کے لیے یوں تو دعا بارہا کی ہے لیکن ایک روز اسی حالت میں یہ یاد آیا کہ اپنی عمر کا کچھ حصہ پیش کر دینا بھی بعض روایات میں آیا ہے، اسی وقت اپنے دل کو ٹٹولا تو ایک سال کی مدت کے لیے اپنے کو بخوشی آمادہ پایا اور عقلاً تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سال کیا معنی، دس بیس سال بھی اگر پیش کر دوں جب بھی کم ہی ہے اور حق اخلاص ادا کرنے کو بالکل ناکافی''۔

اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی بساط ہوتی ہے، خواجہ صاحب وغیرہ حضرت کے عاشقوں کو دیکھا کرتا تھا کہ چہرۂ مبارک کی طرف برابر نظر جمائے دیکھ رہے ہیں اور اس سے لطف حاصل کر رہے ہیں، اپنی اتنی ہمت ہی نہ ہوتی، اپنی نظر تو بس حضرت کی انگلیوں ہی تک رہتی اور ان ہی کو بے اختیار چومنے اور آنکھوں سے لگانے کا جی چاہا کرتا۔ مدینہ منورہ جب جب حاضری ہوئی تھی تو مواجہ مبارک کی طرف جانے کی ہمت ہی نہ ہوتی، ہمیشہ بائیں ہی طرف جاتا اور وہیں دور سے ادب کے ساتھ کچھ عرض معروض کرنے کو جی چاہا کرتا۔

بہر حال اس عریضہ کا جواب آیا، تو حسب دستور توڑ توڑ کر نمبر وار نہیں بلکہ ایک مسلسل عبارت میں:

''سارا خط پڑھا، کس کس کلمہ کا کیا جواب دوں، بجز اس کے کہ یہ دعا کروں۔

باقی مجھ میں تو اس کی بھی اہلیت نہیں کہ کسی صالح کا مخاطب بنوں چہ جائیکہ محبوب بنوں تو ایسی حالت میں میرے ساتھ ایسا برتاؤ اس شعر کا مظہر ہے

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خورسند است

باقی بجز دعا طلب دعا کے کیا عرض کروں''۔

اپنی زبوں حالی اور سیہ کاری کا احساس تو اکثر ہی رہا کرتا تھا، اس زمانہ میں ذرا اور زیادہ

ہوگیا، جرح کر کے دیکھا تو اپنے سارے دفتر اعمال میں سفیدی ایک جگہ بھی نظر نہ آئی، مداوا حکیم الامت کے مطب کے سوا اور کہاں نصیب ہو سکتا تھا، 21 جون کے عریضہ میں دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا:

م۔ ''مزاج گرامی خدا کرے کہ بالکل بعافیت ہو۔

ا۔ جناب کی دعا سے بعافیت ہوں۔

م۔ حضرت اپنے متعلق جب تک بے خیالی میں پڑا رہوں جب تک تو خیر لیکن غور وفکر کے بعد ایک عجیب اضطراب اور شدید خلجان میں پڑ جاتا ہوں، عام عبادات وفرائض کا تو ذکر ہی نہیں کہ وہ تو تمامتر عادت کے ماتحت محض رسم کے طور پر جوں توں ادا ہوتے رہتے ہیں نہ کوئی تازگیٔ ایمان نصیب ہوتی ہے اور نہ کوئی بیداریٔ تعلق مع اللہ میں پیدا ہوتی ہے، خود اُن اعمال پر بھی جنھیں اپنے نزدیک خاص ولولۂ دینی اور حرارت ایمانی کے ماتحت انجام دیا تھا، جب بھی بعد کو غور کرتا ہوں، مثلاً ملاحدہ کا رد یا قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر تو انھیں بھی اخلاص سے معرا ہی پاتا ہوں اور ان کی تہ میں بھی رضائے خالق سے کہیں زیادہ رضائے مخلوق ہی کا جلوہ نظر آتا ہے، بار بار یہ جرح کرتا ہوں کہ اگر کہیں سے بھی قبول اور داد کی توقع نہ رہے، جب بھی ان خدمات کا عزم وحوصلہ باقی رہے گا؟

بار بار دل میں الجھن اور حسرت بلکہ یاس تک پیدا ہو جاتی ہے کہ کہیں یہ سب اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کا مصداق نہ ٹھہر جائے اور میں کہیں کا بھی نہ رہوں؟

جب بھی جناب والا کے قلم سے ریا وغیرہ کا بیان دیکھ لیتا ہوں تو اس وقت تسکین ہو جاتی ہے لیکن پھر یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی تو دھوکا نہیں کہ خواہ مخواہ صالحین کا حال اپنے اوپر منطبق کر رہا ہوں، کئی دن سے اس کیفیت کا زور زیادہ ہے، اس لیے بے اختیار اس عرض حال پر مجبور ہوگیا۔

ا۔ الجواب۔ کسی ایسے شخص کو طبیب سمجھ کر اپنا مرض بتانا جو خود اپنے کو اسی مرض میں مبتلا دیکھتا ہو یا سمجھتا ہو گو اس کے الوان کسی قدر مختلف ہوں، اس معنی کر تو کم مفید ہے کہ راے العلیل علیل لیکن اس معنی کر زیادہ مفید ہے کہ ایسا شخص اپنے لیے بہت ہی خوض وفکر واہتمام سے تدبیر تجویز کرے گا تو دوسرے کو وہ تدبیر بلا تکلف ہاتھ آئے گی، اس وقت اسی حاصل کے ماتحت عرض کر رہا ہوں۔

میرے نفس نے مجھ سے بھی یہی شکایت کی، میں نے جواب دیا کہ ان سب مقدمات کو تسلیم کر کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ آیا اس کوتاہی کا تدارک اختیاری ہے یا غیر اختیاری، ظاہر ہے کہ اختیاری ہے، ورنہ شکایت اور قلق ہی بے معنی ٹھہرتا ہے۔ جب اختیاری ہے تو اب ماضی پر حسرت انفع واہم ہے یا مستقبل میں تدارک، سو ظاہر ہے کہ شق ثانی ہی متعین ہے، بس تو اس کے اہتمام میں مشغول ہونا چاہیے اور شاید کسی کو پریشانی میں یہ وہم ہو کہ کوتاہی کی عمر تو اتنی دراز، اگر تدارک کے لیے اتنا دراز وقت نہ ملا تو تدارک کیسے ہوگا، حل اس کا یہ ہے کہ تدارک کا کیت میں تماثل ضروری نہیں، قوت میں تماثل کافی ہے اور وہ بھی اختیاری ہے اور اختیاری کے ساتھ سہل بھی، اب اس تدارک کی تعیین باقی رہی اور اس میں کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا کہ عدم اخلاص کا تدارک صرف اخلاص ہے، پس ماضی پر استغفار کر کے مستقبل میں اخلاص اختیار کیا جائے جو نہایت سہل تدبیر ہے، بلا ضرورت مشقت وتعب میں کیوں پڑا جائے۔ یہ جواب ہو گیا تمام سوالات کا۔ اب اگر اخلاص کے متعلق کوئی سوال ہو تو بے تکلف ظاہر فرمایا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اس میں سہولت مشاہد ہوگی، وفی مثل ہذا قال الحافظ

گفت آسان گیر بر خود کارہا کز روئے طبع

سخت می گیرد جہان بر مردمانِ سخت کوش

تحدث بالنعمۃ، میں نے تو جواب لکھنے کے بعد بتوفیق حق کام شروع کر دیا جو بالکل سہولت سے ہونے لگا اور چونکہ آپ اس کا واسطہ بنے آپ کے لیے بھی خوب دعا کی تحصیل کی بھی تعدیل کی بھی تکمیل کی بھی تسہیل کی بھی ومن اللہ التوفیق''۔

(104)

جواب بجائے خود بالکل کافی بلکہ شافی تھا لیکن اصل مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا، یعنی خود اخلاص ہی کا معیار کیا ہے؟ اور اس کا اطمینان کیسے ہو کہ فلاں عمل مخلصانہ ہے بھی دوسرا عریضہ جانا ناگزیر تھا، چنانچہ جلد ہی یعنی 28/جون کو گیا:

''جواب گرامی جامع بھی تھا اور شافی بھی، اب عرض یہ ہے کہ خود اخلاص کا معیار کیا ہے یعنی قلب کو یہ اطمینان کیسے ہو کہ فلاں عمل خالصاً لوجہ اللہ صادر ہوا ہے''۔

جواب اب کی بھی خوب مفصل آیا اور یاد رہے کہ یہ لمبی تحریریں اپنے ہاتھ سے وہ لکھ رہا ہے جس کی عمر اب اسی سال کی ہو چکی ہے اور پھر ایسی ایسی تحریریں تنہا میرے ہی نام نہیں خدا معلوم کتنوں کے نام اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھی ہیں۔

''جواب کے پسند آنے سے جی خوش ہوا، اس کے ساتھ ہی اخلاص و معیار اخلاص کے متعلق سوال کرنے سے ایک مشہور شعر یاد آ گیا

عشق ست و ہزار بدگمانی　　　　باسایہ ترانمی پسندم

انطباق کی تقریر یہ ہے کہ اخلاص کی حقیقت معلوم ہے، چنانچہ خود سوال میں بھی اس کو ظاہر کر دیا گیا ہے کہ فلاں عمل خالصاً لوجہ اللہ صادر ہوا ہے، پھر وہ حقیقت چونکہ مثل صفات نفس کے ہے جن کا علم حضوری ہوتا ہے، ادنیٰ التفات سے اس کا اثباتاً ونفیاً علم ہو سکتا ہے، اس لیے یہ سوال ایسا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ میرا مسلمان رہنا خالصاً لوجہ اللہ ہے یا کسی غرض و مصلحت سے، سو جو اس کا جواب ہوگا وہی اس کا جواب ہے، وہ جواب یہی ہوگا کہ ایمان کی نہ حقیقت مخفی نہ اس کا داعی مخفی پھر سوال کیسا۔ ایسے سوال کا منشا صرف غلبۂ ہیبت ہے کہ شوائب موہومہ پر حقائق واقعیہ کا شبہ و وسوسہ ہو جاتا ہے اور اس کا خیالی وجود بھی ناگوار ہوتا ہے، جیسے سایہ کوئی معتد بہ وجود نہیں رکھتا مگر کوئی بدگمان عاشق اپنے وہم سے اس کو معتد بہ سمجھ کر مقصود کا مصاحب دیکھ کر اس سے کراہت کرتا ہے اسی طرح یہاں غلبۂ ہیبت سے جو کہ اثر ہے محبت و عشق کا، غیر مقصود کے درجۂ وسوسہ کو مشابہ حقیقت کے سمجھ کر اس پر شبہ مشوب ہونے کا کرنے لگتا ہے اور گو یہ ہیبت بھی بجائے خود محمود بلکہ مطلوب کما اشیر الیہ بقولہ تعالیٰ یوفون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ الآیۃ لیکن جس طرح ضعیف المعدہ غذائے قوی کا تحمل نہیں کر سکتا، اس کے نافع ہونے کے لیے کسی ایسے جز کے ساتھ اس کو مرکب کرنے بلکہ غالب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو موافق بنا دے، ایسی ہی اس ہیبت کے ساتھ رجا و انس کے منضم بلکہ غالب کرنے کی ضرورت ہے جس سے اس میں اعتدال ہو کر مفید ہو اور اس انضمام کا طریقہ یہ حکم لگانا ہے کہ جب ہم اپنے اختیار سے اس عمل میں کسی غرض مذموم کا قصد نہیں کرتے تو بس وہ خالص لوجہ اللہ ہے اور یہ حکم لگانا ہے کہ اگر بلا قصد ایمان کسی دوسری غرض کے مشوب کا خطرہ محسوس ہو اور منشا اشتباہ کا اسی خطرہ کا احساس ہے تو وہ محض

وسوسہ ہے، جس پر ذرا مواخذہ نہیں بلکہ ناگواری کے سبب اجر بڑھ جاتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جب کسی غرض کا وسوسہ ہو اسی کے ساتھ فی الفور ابتغاء مرضات اللہ کی نیت کی تجدید کر لی جائے پھر وہ وسوسہ خواہ رفع ہو یا نہ ہو اس کے درپے نہ ہو وہ مدفوع ہی کے حکم میں ہے۔ واللہ اعلم"

سارا جواب جواہرات میں تولنے کے قابل ہے اور ایک محقق و عارف حکیم کے شایان شان، خصوصاً وہ حصہ جسے یہاں نقل میں زیر خط کر دیا گیا ہے اللہ اللہ کیا شان تحقیق تھی۔

اصلاح و تزکیۂ نفس، معارف دینی وحقائق ایمانی کے علاوہ ضرورت کبھی کبھی تصوف اصطلاحی کے بھی مسائل ومضامین سے متعلق استفسار واستفتا کی پیش آتی تھی، یکم اگست کا عریضہ اسی کا ایک نمونہ ہے:۔

''مثنوی شریف میں لفظ ارتقا ایک جگہ تو تصریحاً آیا ہے

تو از آن روزے کہ در ہست آمدی ‌‌ ‌ آتشے یا خاک بابا دے بدی
گر بدان حالت تر ابودے بقا ‌ ‌ کے رسیدے مر ترا این ارتقا

بعض دوسرے مقامات پر انسان کی ترقی درجات وتبدیل احوال کو بیان کیا ہے۔

از جمادی مردم وناحی شدم ‌ ‌ وز نما مردم بہ حیوان سرزدم
مردم از حیوانی وآدم شدم ‌ ‌ بس چہ ترسم کے زمردن کم شدم

اور اس کے دوشعروں کے بعد

بار دیگر ملک قربان شدم ‌ ‌ آنچہ اندر دہم ناید آن شدم

اس قسم کے مضامین والفاظ سے آج کل کے بعض کج فہموں نے دو طرح کے نتائج اخذ کیے ہیں، ایک گروہ نے ان سے ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کی تائید نکالی ہے اور دوسرا گروہ فرنگیوں کے مسئلہ ارتقا کی طرف گیا ہے، یعنی اس مسئلہ کی طرف کہ انسان ابتداءً محض حیوان تھا، ترقی کرتے کرتے انسان بنا ہے۔

جناب کے اوقات عزیز سے کوئی مطالبہ کرتے مجھے خود بڑا تامل رہتا ہے، اگر سائل کی خوش قسمتی سے جناب والا کو کچھ فرصت میسر آجائے اور طبیعت پر بار بھی کسی طرح کا نہ پڑے تو التماس ہے کہ اس بارہ میں اشارتاً رہنمائی فرمادی جائے"۔

مثنوی کی شرح بہت سے حضرات لکھ چکے ہیں لیکن حضرت کے مرشد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے املا کیے ہوئے حواشی کی شان ہی کچھ اور ہے، دلنشین، مختصر، حشو وزوائد سے پاک، جامع ومانع اور کوئی شرح اسی شان کی اگر مفصل ومبسوط موجود ہے تو وہ حضرت ہی کی کلید مثنوی ہے، عارف رومیؒ کا صحیح ترجمان وشارح اس دور میں عارف تھانوی سے بڑھ کر اور ہو کون سکتا تھا، جواب جو آیا، عین انہی توقعات اور اسی معیار کے مطابق:

''کسی خطاب میں تامل کی تو جب ضرورت ہو جب بار کا احتمال ہو جس کا تحمل کرنا پڑے۔ یہاں تو محبت کے اثر سے آپ کا ہر خطاب تزئین وتجمل لے کر آتا ہے کہ اس میں مشغول ہونے سے لذت وراحت ہی ہوتی ہے۔

اب اصل مقصود عرض کرتا ہوں، اگر ان اشعار کا موقع بھی لکھ دیا جاتا تو ان کو مع سیاق وسباق دیکھنے سے شرح میں بہت اعانت ہوتی، نیز یہاں پوری مثنوی کی شرح موجود ہے، دفتر اول وسادس خود میرا لکھا ہوا ہے اور بقیہ دفاتر میرے لکھوائے ہوئے، اس شرح میں بھی دیکھ لیا جاتا، اب گو اس شان کا تو نہیں مگر انشاءاللہ تعالیٰ کافی معروض ہے۔

جو مدعی ان اشعار کو ارتقا مصطلح یا تناسخ پر محمول کرتا ہے وہ غلط فہمی یا غلط اندازی میں مبتلا ہے، وہ یا تو ارتقا وتناسخ کو نہیں سمجھا یا ان اشعار کو نہیں سمجھا اور اگر دونوں کو سمجھ کر ایسا کیا تو وہ قابل خطاب نہیں(1)۔ ان اشعار میں جن انقلابات وتطورات انسانی کا ذکر ہے وہ معتاد اور عام ہیں، مدعیان ارتقا ان کو ارتقا مزعوم کب سمجھتے ہیں، ان انقلابات کا حاصل تو یہ ہے کہ عناصر کی ترکیب سے اوّل غذا بنتی ہے اور غذا تناول کے وقت جماد ہوتی ہے، پھر بعد ہضم اس کا ایک حصہ مادۂ منویہ بن کر رحم میں علقہ مضغہ کی صورت میں جسم نامی ہوتا ہے پھر روح طبی اس کے متعلق ہو کر وہ جسم حی ہوتا ہے پھر روح قدسی کے نفخ سے وہ انسان ہو جاتا ہے پھر اعمال صالحہ سے اس سے دنیا ہی میں شان ملکیت پیدا ہوتی ہے پھر آخرت میں کمال قرب سے مشرف ہو کر مـــالا عیـــن رأت ولا اذن

---

(1) حضرت نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا، مثنوی میں لفظ ارتقا کو دیکھ کر انیسویں صدی مسیحی کے اصطلاحی ارتقا پر استدلال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا قرآن مجید میں لفظ ''شراب'' کو دیکھ کر کوئی اردو کی چلی ہوئی شراب (خمر) پر اور قرآن مجید کے لفظ ''حدیث'' سے اصطلاحی حدیث نبویؐ پر استدلال کرنے لگے۔

سمعت و لا خطر علیٰ قلب بشر کا مصداق ہوجاتا ہے، پھران ہی تطورات پر تفریع کے طور پر فرماتے ہیں کہ جب ہمیشہ تجھ کو ترقی ہی ہوتی رہی ہے، تو پھر حوادث غیر اختیاری سے نقص کا کیوں خوف کرتے ہو، سواس سے ارتقا مصطلح کا کیا تعلق، باقی لفظ ارتقا سے استدلال یہ محض مضحکہ ہے، کیا یہ لفظ ہمیشہ معنی اصطلاحی ہی میں مستعمل ہوتا ہے کبھی معنی لغوی یعنی مطلق ترقی میں مستعمل نہیں ہوتا، اگر یہی ہے تو سورۂ ص کے شروع میں فلیرتقوا فی الاسباب میں کیا کہیں گے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ حامیان متعہ جہاں بھی م، ت، ع کا مادہ دیکھتے ہیں ان کو اپنا ہی متعہ نظر آنے لگتا ہے۔

رہ گیا تناسخ اس کا تو یہاں جھوٹ موٹ بھی نام نہیں لے سکتے، اس کا حاصل تو روح کا مفارقت بدن کے بعد اعمال کی جزا وسزا میں دوسرے اچھے یا برے جسد کے ساتھ متعلق ہوجانا ہے، یہاں اس کا نام ونشان بھی نہیں اور اگر کھینچ تان کر بتکلف بلکہ بتصلّف اس کو یا اسی طرح ارتقا کو چسپاں بھی کر دیا جائے تو غایت مافی الباب محتمل کے درجہ میں ہوگا تو دوسرا محمل بھی اسی طرح محتمل ہوگا، اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، پھر مولانا مسلمان ہیں، مسلمان ہوکر کافروں کا عقیدہ کیوں اختیار کرتے، خاص کر جب کہ مولانا نے دفتر پنجم کے تقریباً ایک ثلث پر تحت عنوان بیان خلقت آدم الخ اس خلقت کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی ہے:

چونکہ صانع خواست ایجاد بشر　　از برائے ابتلائے خیر وشر

جبرئیل صدق را فرمود رو　　مشتے خاکے از زمین بستان گرو

اہل ارتقا آدم علیہ السلام کی خلقت بایں کیفیت کے کب قائل ہیں اور قیامت کے روز جزا وسزا میں جنت ودوزخ میں جانا اور رہنا یہ تو خدا جانے مثنوی میں کتنی جگہ مذکور ہے، پھران کے کلام کو ارتقا یا تناسخ پر محمول کرنا تاویل القول بمالا یرضی بہ القائل نہیں تو اور کیا ہے، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم"۔

(105)

تفسیر اور قرآنیات سے متعلق استفتا اور استفادہ کا سلسلہ ادھر عرصہ سے چھوٹا ہوا تھا 12 رنومبر کا عریضہ پھر اسی رنگ میں ہے:

م۔"قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کی زبان سے شاہ مصر کی خدمت میں وزارت مال کی

درخواست کے باب میں عرصہ سے یہ سوال دل میں کھٹک رہا ہے کہ مصری حکومت تو غیر مسلم تھی اس کے ماتحت عہدہ قبول کرنے چہ جائیکہ اس کی خود فرمائش کرنے کی صورت جواز کیا تھی؟ تفسیروں میں بھی اس مسئلہ سے تعرض خیال میں نہیں آتا۔

ا۔الجواب۔آیت **وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ** الأية اورآیت **قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ** اورآیت **رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ** سے متبادر ہوتا ہے کہ آپ برائے نام وزیر تھے،اسی لیے آیات میں یا ایہا العزیز بھی آیا ہے،لیکن باعتبار اکثر اختیارات کے بادشاہ تھے،البتہ رعایا کے غلبہ سے شرعی قوانین جاری نہ کر سکے تھے،**يدل عليه قوله تعالىٰ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ**،مگر اس سے ماتحتی لازم نہیں آتی،کیونکہ یہ بھی ثابت نہیں کہ قانون غیر شرعی پر آپ کا عمل تھا،سو اس عہدہ کے قبول کرنے میں یا فرمائش کرنے میں کوئی معذور عقلی یا نقلی تو تھا نہیں،مصالح ہی تھے گونا تمام سہی۔**واعظمها ايصال الارزاق الىٰ اهل الجدب** اور ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تبلیغ بھی فرماتے تھے۔**يدل عليه قوله تعالىٰ ولقد جآء كم يوسف من قبل بالبينات فمازلتم**۔البتہ آپ کے بعد پھر سلطنت اہل قبط میں چلی گئی،اور یہ اس وقت ہے جب مطلقاً عقد اجارہ حربی ناجائز ہو **ولا دليل عليه لا سيما اذا اختلفت الشرائع** اور جائز کی درخواست بھی جائز ہے **لاسيما اذا اشتمل على المصالح العامة خصوصاً**"۔

آیت قرآن مجید کی مشکل آیات میں سے ہے اور خوارج کے اس عقیدہ کی جڑ کاٹ رہی ہے کہ غیر مسلم حکومت میں کسی قسم کا بھی عہدہ قبول کرنا مطلق صورت میں حرام ہے اور ہیر پھیر جتنا بھی کیا جائے،یہ حقیقت تو اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ اختیارات کامل بھی آپ کو ایک غیر مسلم ہی کے دیے ہوئے تھے۔

اسی عریضہ میں ایک مضمون اور بھی تھا:

"یہ تو ایک علمی استفتا ہوا،اب دوسری بات بغرض تصویب پیش کر رہا ہوں۔

کل بعد دوپہر دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا اور آج صبح حالت نماز میں اس کی مزید تفصیلات ذہن میں آتی رہیں کہ ایک مستقل کتاب قرآن مجید سے متعلق متفرق مفید معلومات پر مشتمل تالیف کر دی

جائے، مثلاً یہ کہ قرآن مجید میں اعلام جتنے بھی آئے ہیں، خواہ انذاری حیثیت سے ہوں یا تبشیری حیثیت سے جیسے

انبیاء کرام، حضرت مریمؑ، لقمانؑ، زیدؓ، جبرئیلؑ، میکائیلؑ، ہاروت ماروت، یاجوج وماجوج، ذوالقرنین، ابلیس، فرعون، ہامان، قارون، ابولہب وغیرہم۔

یا جن حیوانات کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے مثلاً

حمار، ابل، جمل، سلویٰ، خنزیر، کلب، نحل، نمل، ذباب، عنکبوت، فیل، بقر، نعجہ، معز، غنم، ضفدع، قمل، فیل، بقرۃ وغیرہا۔

یا نباتات مذکورہ فی القرآن مثلاً

بقل، فوم، قثا، حطہ، عدس، بصل، نخل، رمان، عنب، زنجبیل، یقطین، زیتون، زقوم، تین وغیرہا۔

ان سب پر مفصل معلومات خود قرآن مجید اور حدیث اور تاریخ و دیگر علوم سے لے کر یکجا کردیے جائیں، کام ذرا تلاش و کاوش کا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی دعاؤں کی برکت سے انشاء اللہ آسان ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ خیال جناب والا ہی کی خدمت میں بغرض مشورہ ورہنمائی ودعائے برکت پیش کررہا ہوں، ساتھ ہی کوئی موزوں نام (ایک یا زائد) بھی بے تکلف ذہن مبارک میں آجائے تو اس سے بھی ایما فرمایا جائے''۔

جواب توقع کے خلاف حسب ذیل آیا:

''میں نے بہت غور کیا، اس کی کوئی مصلحت معلوم نہیں ہوئی کہ اس کو پیش نظر رکھ کر غور کرتا، اگر آپ کے ذہن میں کوئی معتدبہ مصلحت ہو تو ظاہر فرمایئے، اس وقت نام میں غور کروں گا''۔

حضرت کے پیش نظر بیسویں صدی کے افرنجی المذاق ناظرین کہاں تھے اور کیسے ہو سکتے تھے اس طبقہ کے ہاتھوں تک تو نسخۂ شفاء اصلاح پہنچانے کی یہی صورت ہے کہ ''ڈکشنری آف دی بائبل'' اور ''انسائیکلو پیڈیا آف دی بائبل'' وغیرہ کی طرح ہمارے ہاں بھی علوم القرآن اور اعلام القرآن وغیرہ پر مستقل قاموس تیار ہوں، یہ کام بہرحال کر ڈالنے کا ہے اور یہاں پہنچ کر میں

وصیت کیے جاتا ہوں کہ یہ بے علم وکم سواد اگر اس کے لیے زندہ نہ رہا تو کوئی اور اللہ کا بندہ اس ارادہ وہمت کو لے کر اٹھے اور یہ کام کر کے رہے۔

نومبر قریب تھا کہ ایک خاص تقریب سے حضرت کی تشریف آوری لکھنؤ کی خوشخبری سنائی دی 28/ نومبر کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔ ''گھر میں بعد سلام عرض کرتی ہیں کہ بڑی لڑکی کے عقد کو اب خاصا عرصہ ہو چکا، جی چاہتا ہے کہ اس کے کوئی اولاد بھی ہو جاتی، حضرت دعا فرمائیں۔

ا۔ دل سے دعا کرتا ہوں۔

م۔ اور اگر اس کے لیے کوئی تعویذ بھی دیتے ہوں تو مرحمت فرمائیں گو میں اپنے تجربہ کی بنا پر آپ کی دعا ہی کو کافی سمجھتا ہوں۔

ا۔ تعویذ آتا ہی نہیں۔

م۔ یہ مضمون تو گھر والی کی طرف سے ہوا، اب آگے میری طرف سے عرض ہے، سنا ہے کہ جناب چھوٹی بیوی صاحبہ لکھنؤ دانت بنوانے کی غرض سے تشریف لا رہی ہیں اور شاید جناب والا بھی ہمراہ ہوں، روایت اگر صحیح ہے۔

ا۔ درجۂ ارادہ میں تو صحیح ہے وقوع کی خبر اللہ تعالیٰ کو ہے۔

م۔ تو خدا معلوم کب تک اور کے دن کے لیے عزم مبارک ہے۔

ا۔ یکم دسمبر کو خیال ہے، مدت قیام دندان ساز کی رائے پر ہے جس کا علم نہیں۔

م۔ ہم نیاز مندان کے لیے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مسرت کی خبر اور کیا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ جناب کو بھی اس سفر سے راحت رہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ دے''۔

لکھنؤ میں ڈاکٹر ''شاہ صاحب'' ایک پنجابی مسلمان (غالباً یورپ اور امریکہ کے سند یافتہ) بڑے ماہر فن دندان ساز ڈاکٹر تھے اور حضرت کے بھی بڑے معتقد، ان کی یہ مہارت فن اور خوش عقیدگی دونوں اس موقع پر بڑی کام آئیں۔

حضرت محض رفاقت سفر کی خاطر تو شاید اتنا بڑا سفر نہ اختیار فرماتے لیکن اور بھی متعدد

ضرورتیں نکل آئیں، خواجہ صاحب اپنے مکان نوتعمیر کے سلسلہ میں حضرت کو اپنے وطن لے جانا چاہتے تھے ادھر کانپور کے لیے بھی مخلصین کانپور کا اصرار تھا۔

غرض حضرت کی تشریف آوری کی خبر دریاباد 3 ردسمبر کو پہنچی اور 3 دسمبر کو دستی خط لکھنؤ حسب ذیل لکھا:۔

''ابھی ورود لکھنؤ کی خوشخبری معلوم ہوئی، جمعہ کو 9 بجے صبح کی گاڑی سے لکھنؤ حاضری کا قصد رکھتا ہوں، گھر میں بھی انشاء اللہ ہمراہ ہوں گی۔

اگر قیام اس سے بھی مختصر ہو تو اطلاع ملنے پر اس سے بھی قبل حاضر ہو جاؤں گا''۔

جواب لے کر آدمی پہلی گاڑی سے آیا:

''سفر میں دوسروں کا قبضہ ہوتا ہے، نیز اپنی ضروریات کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے، دونوں امر کے لحاظ سے ایک خاص نظام سفر و قیام کا مرتب کرنا پڑا جس کی رو سے پنج شنبہ کی صبح کو ادرئی خواجہ صاحب کا مہمان بن کر جانا ہوگا اور جمعہ کو وہاں قیام کر کے سہ شنبہ کو وطن کی روانگی ہے، اب گنجائش اور موقع خود ملاحظہ فرما لیا جائے، میں اتوار کو یہاں آگیا تھا، دوشنبہ سہ شنبہ چہار شنبہ قیام رہا، غالباً خبر ملنے میں دیر ہوئی، والسلام''۔

لکھنؤ کی حاضری اب بجائے جمعہ کے اتوار ہی کو رکھی اور ایک ٹرین قبل سے پہنچ کر لکھنؤ پلیٹ فارم پر حضرت کو کانپور ٹرین سے اترتے ہوئے دیکھا، خادموں کی ایک جماعت ہمراہ تھی، اسباب قدرتاً بہت زائد تھا، قلیوں نے ہجوم کیا، ایک قلی نے کچھ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنی چاہیں، اجنبی معتقدین میں سے ایک صاحب نے اسے للکارا، معاً وہ خود حضرت کی گرفت میں آگئے، ''میں اپنے معاملات طے کر لینے کے لیے خود کافی ہوں، آپ کو یا کسی صاحب کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت''؟ تعلیم حضرت کی بات بات میں ملتی تھی۔

گاڑی جہاں رُکی تھی، وہاں سے باہر پہنچنے کی بڑی لمبی مسافت تھی، حضرت نے رفیقوں کے ساتھ پیدل ہی چلنا چاہا، ضعف و ناتوانی کی بنا پر ممکن نہ ہوا، اسٹیشن پر جو کرسی بیماروں کے لیے رہتی ہے وہ لائی گئی اور اس پر حضرت باہر تشریف لائے۔

قدرت کے انتظامات بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں، نادان انسان کو دنگ و حیران بنا دینے

کے لیے کافی لکھنؤ محلہ جھنوائی ٹولہ کے ایک نامور اور خاندانی طبیب شفاء الملک حکیم حاجی عبدالحمید تھے، سرخ وسفید، توانا وتندرست، حضرت کے مخلص ومعتقد، چند سال ہوئے جب حضرت علیل ہوئے تھے تو یہ خود زحمت سفر اٹھا کر تھانہ بھون پہنچے تھے، اپنے شہر میں موٹر کے عادی، وہاں یہ سواریاں کہاں، اسٹیشن شروع آبادی تک کھیتوں کی پگڈنڈی پر اور پھر حضرت کے مکان تک کئی فرلانگ پیدل گئے، اب مشیت کی کارفرمائی دیکھیے کہ یہ ''مسیحائے وقت'' حکیم صاحب خود بیمار پڑے، پہلے ذیابیطس ہوا اور پھر دق اور دق کے جو شدائد ہوتے ہیں، ہر جاننے والے پر روشن ہیں، ان ہی شدائد سے ایک ایک منزل سے ہفتوں نہیں مہینوں گزرتے رہے، جسم کے اعتبار سے گھٹتے رہے اور روح کے لحاظ سے ڈھلتے رہے، ان کے عین اشتداد مرض کا زمانہ تھا کہ حضرت کا لکھنؤ آنا ہوا اور خود ان کی عیادت کو تشریف لے گئے، کتنا پر اثر اور عبرتناک تھا یہ منظر، ابھی کل تک جو طبیب حاذق تھا، ہزارہا کی صحت اور زندگی کا گویا زندہ ضامن، وہ آج بستر مرگ پر تھا، حقیر سے حقیر مریض کی طرح ہی بے بس اور بے کس اور حضرت جو کل تک اسی کے مریض وزیر علاج تھے، آج اس کے سرہانے تلقین کر رہے ہیں، اس کی ٹوٹی ہوئی آس بندھا رہے ہیں، جنت کی بشارتیں دے رہے ہیں، تسنیم وکوثر کا مشتاق بنا رہے ہیں، آہ خوش قسمت حکیم عبدالحمید!

بہ چہ ناز رفتہ باشد زجہان نیاز مندے

کہ بہ وقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

طبیب بیچارہ کو کیا خبر تھی کہ سفر تھانہ بھون میں جو تھوڑی بہت مادی زحمتیں اٹھانی پڑی تھیں، اس کا معاوضہ اور اتنی جلد اسی عالم ناسوت میں برزخ سے قبل ہی مل جائے گا۔

حضرت تو شرافت کے بادشاہ تھے، تسکین وتسلی ہی کی باتیں نہیں فرمائیں بلکہ اسی وقت اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا، اللہ اللہ! دوسروں کے لیے کتنی شرطیں، کتنی قیدیں لگی ہوئی تھیں، یہ حکیم صاحب طالب ہونے کی جگہ اس وقت عین مطلوب ہو گئے! لفظاً مرید، معناً مراد!

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت

مرگے کہ زاہدان بہ دعا آرزو کنند

اس حکمت تکوینی کی کسے خبر کہ حضرت تھانہ بھون سے لکھنؤ بھیجے ہی گئے تھے اس ضرورت سے۔

(106)

1941 میں مراسلت کی ابتدا ایک دلکش خواب سے ہوئی اور یہ ایک بار پھر مستحضر کر لیجیے کہ جہاں تک حضرت کے ساتھ عقیدت کا تعلق ہے میرے گھر میں مجھ سے بڑھی ہی ہوئی تھیں، گو میری ہی طرح وہ بھی ضابطہ سے مرید حضرت کی نہ تھیں، بہر حال اب 25 رفروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔''عافیت مزاج کا طالب و دعا گو ہوں۔

ا۔الحمدللہ خیریت سے ہوں۔

م۔ پرسوں شب میں گھر میں ایک عجیب خواب دیکھا، دیکھا کہ مدینہ منورہ کی مسجد قبا میں حاضر ہیں، وہیں جناب کی چھوٹی بیوی صاحبہ (1) بھی ہیں، یہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، انھوں نے دریافت فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دیکھو گی؟ انھوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا کہ ضرور، اتنے میں کسی نے کہا کہ یہ تو عائشہ صدیقہؓ ہیں، اب یہ بڑے غور اور حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ صورت وشکل، وضع ولباس چھوٹی بیوی صاحبہ کا ہے، یہ حضرت صدیقہؓ کیسے ہو گئیں، اتنے میں پھر کسی نے کہا کہ نہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہو ہیں، اب یہ اپنے دل میں اور بھی حیرت کر رہی ہیں کہ حضورؐ کے تو کوئی صاحبزادہ ہی نہ تھے، تو بہو کیسی؟ اتنے میں پھر آواز آئی کہ ہر کلمہ گو حضورؐ کی اولاد ہے اور مولانا اشرف علی جیسے بزرگ تو خاص الخاص اولاد حضورؐ کی ہیں، ان کی بیوی حضورؐ کی بہو ہی کہلائیں گی، اس کے بعد صحن مسجد میں انھیں ہمراہ لے کر چھوٹی بیوی صاحبہ مسجد کے اندرونی درجہ میں داخل ہوئیں، وہاں ایک دروازہ سا کھلا اور اس کے اندر سے بجائے تصویر کے خود حضورؐ کا جلوۂ مبارک نظر آیا۔

آگے بیان کرتی ہیں کہ نورانیت اس غضب کی تھی کہ میں چہرہ پر نظر نہ جما سکی، گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکا کر دست بستہ درود شریف باواز بلند پڑھنے لگی، حضورؐ کی پشت مبارک کی طرف انھیں اپنے حقیقی چچا بھی کھڑے ہوئے نظر پڑے جو ان کے بچپن میں اجمیر کے تالاب میں غرق ہو چکے تھے، ان کو دیکھ انھیں ذرا ڈھارس ہوئی اور یہ ان کے ہاتھ سے لپٹ گئیں، حضور انورؐ نے تبسم کے ساتھ شفقت و ولدہی کے لہجہ میں فرمایا ''دل کی صاف ہے''۔

---

(1) یعنی حضرت کی محل خورد۔

اس کے بعد یہ کہتی ہیں کہ مجھے اپنی ماں اور بہن یاد پڑیں کہ انھیں بھی دوڑ کر بلا لاؤں اور زیارت کرادوں، بس اسی میں آنکھ کھل گئی۔

تعبیر جو کچھ بھی ہو میرے لیے تو ایسا مجرد خواب بھی باعث رشک ہے۔

ا۔ مجھ کو اس رشک پر رشک ہے، یہ رشک دلیل ہے عشق کی، اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی ایسا عشق نصیب کرے۔

برین خواب گر جان فشانم کم ست

خواب کوئی حجت شرعیہ نہیں مگر رویاء صالحہ کا مبشرات میں سے ہونا یہ حجت شرعیہ سے ثابت ہے، اس لیے اس کو بشارت سمجھنا اور اس پر مسرور ہونا شرعاً ماذون فیہ ہے، کسی کا حضرت عائشہؓ بننا اشارہ ہے وراثت فی بعض الاوقاف کی طرف، اس کا ذکر ایک خاص عنوان سے اصلاح انقلاب میں بھی ہے، اس کے بعد جو بھوکھا گیا اس کی توجیہ خود خواب میں ظاہر کر دی گئی، جس میں ایک گندہ کو طاہر بنانے کی بھی بشارت ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے راست لائے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلی تو پوری ہی دولت ہے اس کا کیا پوچھنا اور صفائی دل کی بشارت جس درجہ کی فال نیک ہے ظاہر ہے ومبارک ہے، غرض اس خواب سے جس جس کا تعلق ہے سب محل مبارکباد ہیں اور ساتھ ہی آپ بھی کہ ایسی مقبول بندی کے آپ مالک ہیں، نعمت کا مالک ہونا بھی کم نعمت نہیں''۔

عریضہ ابھی ختم نہیں ہوا، ایک نازک فقہی مسئلہ باقی ہے:

م۔ ''اصل غرض جو عریضہ کی تھی وہ تو ختم ہو گئی، ایک فقہی مسئلہ عرصہ سے دریافت کرنا چاہتا تھا اس وقت یاد پڑ گیا، وہ یہ کہ آیا حرام کمائی سے بھی انتفاع کی کوئی صورت ہے؟ ایک پیشہ ور دولتمند عورت اب اپنے پیشہ سے تائب ہو کر نکاح میں آنا چاہتی ہیں ان کے لیے دریافت طلب ہے کہ نقد و جائداد کو کیا کریں؟ سب خیرات کر ڈالیں، یا پاس رکھنے کی بھی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔

ا۔ ''معذرت، مسئلہ فقہیہ نازک تھا اس میں دیر لگی۔

الجواب۔ مسئلہ از بس نازک است خصوص بدین وجہ کہ اگر تسہیل نہ کردہ شود ہمت توبہ کنندگان می شکند، نیز محتمل ست کہ این زن تائبہ خود بر توبہ تاسف خورد کہ نتیجہ اتباع شریعت ابتلاء این چنیں مصائب است، واگر از قواعد طریقے تجویز کردہ شود ظاہر است کہ آن قواعد را شرعی گفتن

ضرورست ،ممکن است کہ بعضے جہلاء یا طاغان از شریعت بدگمان شوند یا اعتراض کنند کہ شریعت حیلہ ہامی آموزد وحرام را برائے تکمیل اغراض نفسانی حلال می سازد بنا بریں این چنیں تحقیقات قابل زبانی فہمیدن باشد مگر شاید درزمان قریب موقع مکالمہ میسر نہ شود وحادثہ مقتضی تعجیل باشد نظر برین توقف روانہ داشتم واحتیاطاً درفارسی نوشتم کہ اگر اخفاء کامل نہ شود ناقص غنیمت است واجمالاً جواب طاعنان این ست کہ در ہر مقام استعمال این چنین تدابیر ماذون فیہ نیست ،صرف درمحل ضرورت شدیدہ گنجائش دادہ می شود ، پس این تسہیل غایت رحمت ورعایت است از شریعت ، اکنون آن تدبیر را بہ قلم می سپارم ، ایجادہ دو چیز ست ، جائیداد ونقد ، پس در جائداد قصہ نہایت سہل ست زیرا کہ عادت غالب در جائداد این است کہ اول عقد مکمل می شود واز ان بعد زرثمن پیش کردہ می شود از ین جہت خبث زرثمن در بیع اثر نمی کند کما حققہ الکرخی واگر در محل مسئولہ ثمن اول حاضر کردہ شدہ باشد در سوال ظاہر کردہ شود آن را جواب دیگر است ، اما اگر زرخبث نقد باشد آن را دو تدبیر است ، یکے سہل الوقوع لیکن معذوری در بغل دارد ، صورتش آن ست کہ مالک چنین مال این قدر از کسے قرض گیرد باز آن قرض را از ین مال سحت ادا کند وخرابی کہ در بر دارد آن ست کہ دیگر کس را درین نجاست مبتلا گردانید وتدبیر دیگر آن ست کہ مساکین کہ مصارف چنین اموال غیر مباحہ مستند بمقدار نقد موجود از کسے قرض گرفتہ این مبتلا را بہ طور ہبہ دہند باز این شخص ایشان را آن اموال بطور تصدق بخشد وآنان بدو قرض خود ادا کنند چون چنین اموال این مساکین را حلال ہستند لہٰذا آن خرابی مذکور درینجا متقدم ست برائے مقرض ہم حلال خواہد بود''۔

مولانا کی احتیاط وژرف نگاہی کا کیا کہنا ، فقہی اور باطنی سب پہلوؤں کی رعایت کرلی ، باقی نفس ''حیلۂ شرعی'' پر لوگوں کا اعتراض اور محض لفظ ''حیلہ'' کے آجانے سے اس کے استعمال سے بدکنا محض جہل کی راہ سے ہے ، حیلۂ شرعی کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ایک چیز شریعت کی اصل روح ومغز کے لحاظ سے تو درست نہیں لیکن بہرحال ظاہر لفظ سے اس کے لیے گنجائش نکل آتی ہے تو صریح نافرمانی کے مقابلہ میں اس درجہ کی اطاعت بھی اطاعت ہی کہی جائے گی۔

شریعت کا مغز تو مغز ہی ہے لیکن شریعت کا قشر یا خول یا غلاف بھی مہمل اور سرے سے ناقابل التفات نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ کہتی ہیں کہ مجھے اپنی ماں اور بہن یاد پڑیں کہ انھیں بھی دوڑ کر بلا لاؤں اور زیارت کرادوں، بس اسی میں آنکھ کھل گئی۔

تعبیر جو کچھ بھی ہو میرے لیے تو ایسا مجرد خواب بھی باعث رشک ہے۔

ا۔ مجھ کو اس رشک پر رشک ہے، یہ رشک دلیل ہے عشق کی، اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی ایسا عشق نصیب کرے۔

بریں خواب گر جان فشانم کم ست

خواب کوئی حجت شرعیہ نہیں مگر رویاء صالحہ کا مبشرات میں سے ہونا یہ حجت شرعیہ سے ثابت ہے، اس لیے اس کو بشارت سمجھنا اور اس پر مسرور ہونا شرعاً ماذون فیہ ہے، کسی کا حضرت عائشہؓ کہنا اشارہ ہے وراثت فی بعض الاوقاف کی طرف، اس کا ذکر ایک خاص عنوان سے اصلاح انقلاب میں بھی ہے، اس کے بعد جو بھوکا گیا اس کی توجیہ خود خواب میں ظاہر کردی گئی، جس میں ایک گندہ کو طاہر بنانے کی بھی بشارت ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے راست لائے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلی تو پوری ہی دولت ہے اس کا کیا پوچھنا اور صفائی دل کی بشارت جس درجہ کی فال نیک ہے ظاہر ہے و مبارک ہے، غرض اس خواب سے جس جس کا تعلق ہے سب محل مبارکباد ہیں اور ساتھ ہی آپ بھی کہ ایسی مقبول بندی کے آپ مالک ہیں، نعمت کا مالک ہونا بھی کم نعمت نہیں"۔

عریضہ ابھی ختم نہیں ہوا، ایک نازک فقہی مسئلہ باقی ہے:

م۔ "اصل غرض جو عریضہ کی تھی وہ تو ختم ہوگئی، ایک فقہی مسئلہ عرصہ سے دریافت کرنا چاہتا تھا اس وقت یاد پڑ گیا، وہ یہ کہ آیا حرام کمائی سے بھی انتفاع کی کوئی صورت ہے؟ ایک پیشہ ور دولتمند عورت اب اپنے پیشہ سے تائب ہوکر نکاح میں آنا چاہتی ہیں ان کے لیے دریافت طلب ہے کہ نقد و جائداد کو کیا کریں؟ سب خیرات کر ڈالیں، یا پاس رکھنے کی بھی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔

ا۔ "معذرت، مسئلہ فقہیہ نازک تھا اس میں دیر لگی۔

الجواب۔ مسئلہ از بس نازک است خصوص بدین وجہ کہ اگر تسہیل نہ کردہ شود ہمت توبہ کنندگان می شکند، نیز محتمل ست کہ این زن تائبہ خود بر توبہ تاسف خورد کہ نتیجہ اتباع شریعت ابتلاء این چنیں مصائب است، و اگر از قواعد طریقے تجویز کردہ شود ظاہر است کہ آں قواعد را شرعی گفتن

ضرورست، ممکن است کہ بعضے جہلاء یا طاغان از شریعت بدگمان شوند یا اعتراض کنند کہ شریعت حیلہ ہای آموزد وحرام را برائے تکمیل اغراض نفسانی حلال می سازد بنا بریں این چنیں تحقیقات قابل زبانی فہمیدن باشد مگر شاید درزمان قریب موقع مکالمہ میسر نہ شود وحادثہ مقتضی تعجیل باشد نظر برین توقف روانہ داشتم واحتیاطاً در فارسی نوشتم کہ اگر اخفاء کامل نہ شود ناقص غنیمت است واجمالاً جواب طاغنان این ست کہ در ہر مقام استعمال این چنین تدابیر ماذون فیہ نیست، صرف در محل ضرورت شدیدہ گنجائش دادہ می شود، پس این تسہیل غایت رحمت ورعایت است از شریعت، اکنون آن تدبیر را بہ قلم می سپارم، انجادہ دو چیز ست، جائیداد ونقد، پس در جائداد قصہ نہایت سہل ست زیرا کہ عادت غالب در جائداد این است کہ اول عقد مکمل می شود وازان بعد زرثمن پیش کردہ می شود ازین جہت خبث زرثمن در بیع اثر نمی کند کما حققہ الکرخی واگر در محل مسئولہ ثمن اول حاضر کردہ شدہ باشد در سوال ظاہر کردہ شود آن را جواب دیگر است، اما اگر زر خبث نقد باشد آن را دو تدبیر است، یکے سہل الوقوع لیکن معذوری در بغل دارد، صورتش آن ست کہ مالک چنین مال ایں قدر راز کسے قرض گیرد باز آن قرض را ازین مال سحت ادا کند وخرابی کہ در بر دارد آن ست کہ دیگر کس را درین نجاست مبتلا گردانید وتدبیر دیگر آن ست کہ مساکین کہ مصارف چنین اموال غیر مباحہ مستند بمقدار نقد موجود از کسے قرض گرفتہ این مبتلا را بہ طور ہبہ دہند باز این شخص ایشان را آن اموال بطور تصدق بخشد وآنان بدو قرض خود ادا کنند چون چنین اموال این مساکین را حلال مستند لہٰذا آن خرابی مذکور درینجا متعقدم ست برائے مقرض ہم حلال خواہد بود"۔

مولانا کی احتیاط وژرف نگاہی کا کیا کہنا، فقہی اور باطنی سب پہلوؤں کی رعایت کرلی، باقی نفس "حیلہ شرعی" پر لوگوں کا اعتراض اور محض لفظ "حیلہ" کے آجانے سے اس کے استعمال سے بدکنا محض جہل کی راہ سے ہے، حیلہ شرعی کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ایک چیز شریعت کی اصل روح ومغز کے لحاظ سے تو درست نہیں لیکن بہرحال ظاہر لفظ سے اس کے لیے گنجائش نکل آتی ہے تو صریح نافرمانی کے مقابلہ میں اس درجہ کی اطاعت بھی اطاعت ہی کہی جائے گی۔

شریعت کا مغز تو مغز ہی ہے لیکن شریعت کا قشر یا خول یا غلاف بھی مہمل اور سرے سے ناقابل التفات نہیں ہے۔

اپنے ایک بڑے مخلص وکرم فرما سید مقبول حسین وصل بلگرامی تھے، بڑے خوش ذوق اور ایک پیکر خدمت واخلاص، اپنے زمانہ میں عالمگیر، مرقع وغیرہ کئی ادبی ماہنامے نکالے، حضرت سے نسبت بیعت وارادت تو بہت قبل سے تھی، آخر زمانہ میں سب طرف سے کٹ کے تھانہ بھون ہی کے ہو رہے تھے، مارچ میں ان کے خط اور بعض خطوط سے معلوم ہوا کہ حضرت کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوگئی تھی، معمولات موقوف اور مسجد میں آنا بند ہوگیا تھا، کچھ روز بعد اتنا افاقہ ہوگیا کہ پھر دونوں وقت خانقاہ تشریف لانے لگے، حضرت کی صحت اب مستقل طور پر گر گئی تھی اور طبیعت برابر خراب رہنے لگی تھی، کبھی افاقہ اور کبھی پھر زیادتی، اور آہ کہ جو مجسمۂ صحت تھا وہ اب فطرت کے ان قوانین طبعی کے آگے جو ولی اور نبی کسی کی بھی رعایت نہیں کرتے، روز بروز بے بس ہوتا جارہا تھا، وصل صاحب کے وہاں موجود ہونے سے بڑا کام یہ نکلتا تھا کہ حالات ان کے ذریعے سے معلوم ہوتے رہتے اور حضرت کو براہ راست زحمت دینے کی ضرورت نہ پیش آتی۔

(107)

اپریل 41 کا مہینہ تھا کہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، جواب تک حضرت کے خاص اثر میں تھا صدر مدرس کی جگہ خالی ہوئی، مشورہ یہ ہوا کہ میرے خاص عنایت فرما مولانا......فرنگی محلی بھی اس جگہ کے لیے اپنا نام دے دیں، ان کی بلکہ کسی کی بھی کامیابی کی توقع بغیر حضرت کی امداد خاص کے دشواری تھی، مشکل یہ آپڑی کہ اُن سے اور حضرت سے کسی قسم کا تعارف سابق موجود نہ تھا، جرات کر کے میں نے اپنی طرف سے تحریر ذیل مولانائے فرنگی محلی کے متعلق لکھ حضرت کی خدمت میں پیش کردی۔

''مولانا......فرنگی محلی کی خدمت میں مجھے سالہاسال سے نیاز حاصل ہے، ان کے علم وتحقیق اور وسعت نظر ومطالعہ سے متعلق تو میری تحسین تحسین ناشناس ہوگی، البتہ اپنی محدود وناقص بصیرت کے ماتحت ان کی سلامت طبع کا مدت سے قائل ومعتقد ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان کا سا سلیم الطبع استاد کسی مدرسہ کو ہاتھ آجانا اس مدرسہ کے لیے باعث فلاح وبرکت ہوگا''۔

حضرت کی وسعت اخلاق کا یہ عالم تھا کہ اسی تحریر پر مجھے تو سطور ذیل لکھ بھیجیں:

''از اشرف علی عفی عنہ، میں ممنون ہوں کہ اس خدمت کے لیے مجھ کو یاد فرمایا گیا، میں نے

تمام شقوں پر نظر کر کے مولانا کی خدمت میں جو عرض کیا ہے ملاحظہ کے بعد اگر ترمیم کی حاجت ہو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں''۔

اُدھر خود مولانائے فرنگی محلی نے جو مکتوب روانہ خدمت کیا تھا اس پر ذیل کا جواب انھیں عنایت ہوا:

''مولانا دامت برکاتہم السلام علیکم، ایک ہی مکاتبت میں دل ایسا مل گیا اور کھل گیا کہ اب اختصار معروضہ بھی خلاف تہذیب نہیں معلوم ہوتا، اس لیے بعد حذف تمہید عرض ہے کہ میں نے ایک قطعہ الطاف نامہ کا اپنے پاس رکھ لیا ہے اور بہت جلد جامع العلوم میں مع اپنے خط کے بھیج دوں گا اور جواب آنے پر مطلع کروں گا، میرے سرخ رو ہونے کی دعا فرمائیں''۔

یہ تھے حضرت تھانوی بہت سے معاصرین کی نظر میں ''خشک مزاج''۔

افسوس ہے کہ حضرت کی وہ اصل تحریر محفوظ نہ ملی جو ایک اجنبی عالم دین کے حق میں جن کا مسلک فقہی بھی حضرت کے مسلک سے کسی قدر الگ تھا، ارکان جامع العلوم کے سامنے پیش ہوئی تھی، البتہ اسے دیکھ کر اس وقت تو زبان پر عش عش آہی گیا تھا اور فرط تاثر سے اس وقت زبان قلم پر بے اختیار جو لفظ آگئے تھے وہ کاغذات میں نکل آئے، اس سے کچھ اندازہ حضرت کی اصل تحریر کا ہو سکے گا:

م۔ ''جناب والا کے حسن اخلاق، حسن توجہ، جامعیت تحریر، احاطۂ جزئیات کا معتقد تو میں مدت سے تھا لیکن مولانا...... فرنگی محلی کے مکتوب کے جواب میں ان اوصاف کی اتنی نمایاں مثال دیکھ کر دنگ رہ گیا، فارسی کی ایک مشہور نعت کا مصرع ہے۔

اے در کمال حسن عجب تر ز ہر عجیب

اسے دہرا دینے کی جرات تو نہیں کر سکتا، البتہ اتنا عرض کر دینے کو تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کمالات اشرفی کے باب میں میرا تجربہ کچھ اسی نوعیت کا یعنی ہر تازہ مثال پہلی مثال سے بڑھی ہوئی، **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔

ا۔ اس جوش شفقت کے جواب میں بجز اس کے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا کہ

گر ہنرے باشد وہفتاد عیب   دوست نہ بیند بجز آن یک ہنر

اشرف برائے نام''

اور مولانائے فرنگی محلی کا خط حضرت کے اس مکتوب کے متعلق یہ آیا کہ اس کے چند مختصر مگر جامع لفظ دلچسپی کے ساتھ ساتھ دلکشی کی صفت بھی اپنے اندر رکھتے تھے۔

ان سب خطوط پر تاریخیں اپریل کے آخری ہفتہ کی ہیں۔

اسی اپریل کے تیسرے ہفتہ میں، مجھے خانگی زندگی میں جو بڑے سے بڑا صدمہ ہوسکتا تھا پیش آیا، یعنی والدہ ماجدہ کی وفات، جو ایک پختہ مومنہ، صالحہ، حاجیہ تھیں، 7 رمئی کے معروضہ میں حضرت کو حسب ذیل لکھا:

م۔''15 ربیع الاوّل (مطابق 16 راپریل 41) کو عین غروب آفتاب کے وقت کہ شب دوشنبہ شروع ہونے کو تھی کہ میری والدہ ماجدہ نے 85 سال سے اوپر کی عمر میں بخار کے مرض میں وطن سے باہر فیض آباد میں انتقال فرمایا اور ہم لوگ ان کی دعاؤں کی برکتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نماز کی اس درجہ شائق بلکہ حریص تھیں کہ فرائض کیا معنی، اشراق وچاشت بلکہ تہجد بھی کسی موسم میں ناغہ نہ ہونے پاتی، روزے آخر تک پابندی سے رکھے گئیں، محرم، ذی الحجہ، شعبان وغیرہ کے بھی روزے نہ چھوڑتیں، داد و دہش اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ بعض اوقات ہم لوگوں کو طبعاً گرانی گزرتی، 28، 29 سال قبل حج کرنے گئیں، کفن اسی وقت زمزم میں غسل دیا ہوا سفر وحضر میں برابر ساتھ رہتا، وہی اس وقت پردیس میں کام آیا۔

آخری بات جو مجھ سے کی وہ یہ فرمائش تھی کہ الجھن بڑھی ہوئی ہے، سورۂ یٰسین پڑھ دو، اس کے بعد ادھ کٹے لفظوں میں اور پھر محض اشاروں میں تیمم، وضو، نماز کے لیے کہتی رہیں، اذان کی آواز کی عاشق تھیں، گھر کے اندر اذانیں دلوایا کرتیں، وصیت بار بار یہ کی تھی کہ مسجد کے دروازہ پر یا قریب ہی دفن کرنا کہ اذان کی آواز برابر سنتی رہوں، اللہ نے آرزو پوری کردی، ہم لوگ وطن لے آئے اور خاندانی مسجد کے متصل ہی کی قبر مل گئی۔

وقت نزع شروع ہوا تو اور سب عزیزوں نے تو کلمۂ شہادت اور میں نے سورۂ یٰسین شروع کی، جب سلام قولا من رب رحیم پر پہنچا ہوں تو اسے ان کے کان کے پاس جا کر تین تین بار پڑھا اور جب فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون پر پہنچا ہوں معاً روح

پرواز کرگئی، اب جناب والا سے التماس دعا ہے۔

ا۔ اولیاء اللہ کی سی موت ہوئی، تعزیت کے ساتھ ایسی موت پر شکر کی رائے دیتا ہوں"۔

اس عریضہ میں ایک اور موضوع بھی اہم تھا:

م۔ "اب ایک دوسری بات عرض کرنا ہے، ایک صاحب علم اور صاحب قلم دوست (1) کو میں نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ اپنی اصلاح وتزکیہ کے لیے کسی صاحب باطن خصوصاً حضرت والا سے رجوع کرنا بہتر ہوگا اس پر ان کا جو جواب آیا وہ خلاصتاً عرض ہے:

"مجھے خود اس ضرورت کا پورا احساس ہے لیکن مولوی شاہ عبدالقادر رائے پوری (2) اور شاہ وارث حسین صاحب مرحوم کا میں تجربہ کر چکا ہوں، ہر جگہ کوئی نہ کوئی ایسی بات مجھے نظر آ گئی کہ زیادہ استفادہ نہ کر سکا، رہے مولانا تھانوی تو ان کے ہاں کے آداب وضوابط بجائے خود جیسے بھی ہوں میری طبیعت کو ان سے بہت بعد ہے، پھر مولانا کے طریق تربیت کو جہاں تک میں تربیت السالک کی مدد سے سمجھ سکا ہوں، شرعاً بھی مجھے اس میں کلام ہے، مثلاً ازالہ کبر کی یہ تدبیر کہ وہ شخص نماز جماعت کے بعد علی الاعلان اپنے لیے دعا کرائے، مجھے تو احادیث وآثار سے یہ اظہار واعلان معیوب ہی نظر آتا ہے، غرض یہ کہ مناسبت کے بغیر رجوع کرنے میں اندیشہ مزید بعد کا ہے، کوئی حل آپ اس دشواری کا نکالیے تو میں دل سے شکر گزار ہوں گا"۔

میں تو اپنے ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی جناب والا کی ہدایت کا طالب ہوں۔

ا۔ خدمت سے عذر نہ تھا مگر اپنا تبرہ یہ خلاف غیرت ہے نیز احتمال ہے کہ ولا تــزکــوا انفسهم کے بھی خلاف ہو، اگر کسی دوسرے کے متعلق یہ شبہ ہوتا تو اس کا جواب میرے ذہن میں ہے، اب اسلم یہی ہے کہ بعد کو قرب سے مبدل نہ کریں"۔

ہم لوگ آج کی بولی میں جسے خودداری سے تعبیر کرتے ہیں حضرت کی اصطلاح میں اسی کا نام "غیرت" تھا، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت ان شبہات کا جواب بڑی آسانی سے تحریر فرما سکتے

---

(1) یہ صاحب اس وقت تک اتنے بڑے آدمی اور مشہور نہ تھے، اب پاکستان میں ایک مستقل فرقہ کے بانی وداعی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان میں بھی ان کی تحریک بڑے زبردست پیمانہ پر چل رہی ہے۔

(2) یہ رائے پور یوپی کے ضلع سہارنپور میں ایک مشہور قصبہ ہے۔

تھے، جس شے کی حدیث میں ممانعت ہے وہ بلا وجہ اپنے عیبوں کی تشہیر کرتا ہے، جس سے یا خواہ مخواہ اپنی فضیحت ہوتی ہے اور یا اس عیب کی شناعت کا درجہ بھی لوگوں کی نظر میں گھٹتا جاتا ہے، اس کو اس اصلاحی اور بامقصد اعلان معصیت پر قیاس کرنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی باعفت خاتون شوہر کے سامنے بھی بے حجاب ہوتے انکار اس بنا پر کرتی رہے کہ عورت کے لیے بے حجابی غیر مشروع ہے۔

(108)

تفسیر قرآنی کے متعلق مذاکرے ابھی ناظرین کی یاد میں تازہ تازہ ہوں گے، چند نمبر اُدھر مکتوبات انہی تفسیری مباحث سے بھرے رہتے تھے، اب ادھر سلسلہ ٹوٹ گیا تھا، وسط جون 41 کے مکتوب میں پھر یہ سلسلہ قائم ہوا، اس عریضہ پر تاریخ 17 جون کی ہے:

م۔سورۃ البقرہ کی آیۂ کریمہ "فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا "۱ الخ کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ چاروں پرندوں کا جسم بعد ذبح مخلوط کر کے اس کا ایک ایک جز الگ الگ چار پہاڑوں پر رکھ دیا جائے، اس پر جناب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہ تفسیر تو بلا مدد روایات خود الفاظ قرآنی ہی سے نکلتی ہے نہ کہ وہ جو بعض جدید فرقے اس وقت کر رہے ہیں کہ مراد اس مجموعہ کے اجزا یعنی چار الگ الگ افراد ہیں۔اس ارشاد کی تفصیل میرے ذہن سے نکل گئی از راہ شفقت وکرم مکرر ارشاد فرما دیا جائے۔

میرے ذہن ناقص میں یہ آتا ہے کہ اسم جز کے معنی لغت میں قطعة من الشیء کے ہیں اور فعل جز کے معنی پارہ پارہ کردن کے۔ منهن میں اشارہ اگر اسی طرف نکل آئے کہ مراد ''ان میں سے ہر ایک کے'' ہے نہ کہ ''ان کے مجموعہ کے'' تو قول جمہور کی بڑی تقویت ہو جائے۔

ا۔اس وقت کی بات تو یاد نہیں، باقی اس وقت جو ذہن میں ہے معروض ہے۔

اصل مقصود اہل حق کا ان طیور کی حیات بعد الممات ہے اور اہل زیغ اسی کے منکر ہیں اور یہ حیات بعد الممات خواہ اجزا بمعنی قطعات کے متعلق ہو جیسا کہ جز کے لغوی اور حقیقی معنی بھی ہیں چنانچہ کتب لغت میں تصریح ہے اور خواہ مطلق ابعاض کے متعلق ہو جیسا کہ مجازاً جز اس معنی میں بھی مستعمل آیا ہے کہ قال تعالیٰ لکل باب منهم جزء مقسوم، و کما فی الحدیث

الرویا الصالحة جزء من ستة اربعین جزء من النبوة او کما قال. اگر آیت میں حقیقی معنی قرار ہوں جیسا اصل بھی ہے اور اپنے محل میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ بدوں تعذر معنی حقیقی کے مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں، تب تو مقصود پر دلالت ظاہر ہے کہ تقطیع کے بعد عروض موت یقینی ہے اور اگر آیت میں حقیقی معنی مراد نہ ہوں تب بھی مقصود عقل سے ثابت ہے کیونکہ اہل زیغ کی تفسیر پر یہ اہتمام ہی عبث ٹھہرتا ہے، کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانوس جانوروں کا بلانے سے چلا آنا کبھی نہ دیکھا تھا، یا اب نہ دیکھ سکتے تھے اس صورت میں اس کی تذکیر اور اس پر تنبیہ کافی تھی اور ان دونوں دلیلوں کے ساتھ اگر اجماع کو جو کہ آثار واخبار منقولہ عن السلف اور عدم نقل خلاف سے ثابت ہے ملالیا جائے تو مقصود میں اور قوت بڑھ جاتی ہے، ان ہی وجود مذکورہ میں سے بعض کی طرف روح المعانی میں بھی باختلاف عنوان اشارہ ہے۔ اس کی عبارت ملخصا یہ ہے۔

فصرهن قرأ حمزة ويعقوب بكسر الصاد والباقون بضمها مع التخفيف من صاره يصوره ويصيره لغتان بمعنى قطعة او اما له لانه مشترك بينهما كما ذكره ابو علي (قلت ويتعين معنى القطع بحمل جزو على المعنى الحقيقي) وقال الفراء الضم مشترك بين المعنيين والكسر بمعنى القطع فقط وقيل الكسر بمعنى القطع والضم بمعنى الامالة وعن الفراء ان صاره يصوره صراه عن كذا قطعه (قلت لما كان الاشتراك خلاف الاصل يترجح كون الكسر بمعنى القطع فقط وقد قرى به متواتر او القراء تان في حكم الأيتين فترجح وقوع الامالة والقطع كليهما) واعظم منه فساداً ما قيل انه عليه الصلوٰة والسلام جعل على كل جبل منهن طيراً حياً ثم دعاها فجاء ت فان ذلك يبطل فائدة الطلب ويعارض الاخبار الصحيحة فان اكثرها ناطق بانها دعاها ميتة متفرقة الاجزاء الى قوله ومال الى هذا القول ابو مسلم فانكر القصة ايضاً وقال ان ابراهيم عليه السلام مطلب احياء الموتٰى من ربه سبحانه واراه مثالا محسوسا قرب الامر عليه والمراد بصرهن املهن ومرهن على الاجابة اي عدود الطيور

(1) یہاں اور آگے بھی قوسین کے اندر جتنی عبارتیں ہیں، حضرت مولانا کی ہیں۔

الاربعة بحيث اذا دعوتها اجابتک سال الحيوة والغرض منه ذکر مثال محسوس لعود الارواح الى الاجساد على سبيل السهولة ولا يخفى ان هذا خلاف اجماع المسلمين فضرب من الهذيان لايركن اليه ارباب الدين وعدول مما يقتضيه ظاهر الأية (قلت اي مجموع سياقها خصوصا كلمة الفاء فى فخذ اربعة الخ فانها للترتيب والاصل ترتب المطلوب على الطلب لاترتب غير المطلوب والمطلوب مشاهدة احياء الموتٰى فدلت الأية على هذا الاحياء) المويد بالاخبار الصحيحة والأثار الراجحة الٰى ماسمعه الا سماع ولا يدعوا اليه فالحق اتباع الجماعة ويدالله معهم.

عربی تفسیروں میں حضرت کی خاص توجہ کا مرکز روح المعانی تھی جیسا کہ ان مکتوبات اور خود تفسیر بیان القرآن دونوں سے ظاہر ہے کہ اکثر جون میں کوئی لڑکی معلوم ہوتا ہے زیادہ بیمار پڑی، حضرت کے کارڈ 2/جولائی کے چلے ہوئے پر کل یہ عبارت ملی:

''السلام علیکم، برخورداری کے لیے دعا کرتا ہوں یہاں ہر طرح خیریت ہے''۔

لیکن سب خیریت کہاں تھی، سب کے لیے صحت وعافیت ومغفرت کی دعائیں کرنے والا خود اپنی صحت کے لیے دوسروں کی دعاؤں کا محتاج ہورہا تھا، 27/اگست کو ایک عزیز نے لکھنؤ سے اطلاع دی کہ ''حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کل شام کو تشریف لے آئے اور مولوی محمد حسن صاحب کے ہاں مقیم ہیں، مرض میں بفضلہٖ تعالیٰ کمی ہے مگر ضعف بہت ہے''۔

80، 82 سال کے سن میں خود ضعف ہی سب سے بڑا مرض ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مرض کی حاجت ہی کیا تھی، حضرت کے لیے قریب کے مقام کا سفر چہ جائیکہ لکھنؤ کا دور دراز کا سفر، معمولی نہیں، غیر معمولی بات تھی، جب دشواریاں ایسی ہی بڑھ جائیں اور سارے مقامی علاج بے اثر رہ لیتے جب کہیں خدام سفر لکھنؤ کا مشورہ دیتے اور صدہا کے مصارف سے کہیں یہ سفر ہو پاتا۔ سفر اور پھر دوران جنگ عظیم 40، 41، 42 کے سفر! معاذ اللہ! مبالغہ کے بعد واقعی ''نمونۂ سقر''۔

حضرت ایک پورے قافلہ کے ساتھ لکھنؤ آ گئے، حضرت کا آنا کسی ''لیڈر'' کا آنا نہ تھا، نہ پوسٹر چھپے نہ اشتہارات تقسیم ہوئے، نہ ڈگی پٹی، نہ رضا کاروں نے نعرے لگائے، نہ مقامی

اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا، اس کے باوجود خلقت کا ایک میلہ صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا، کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا، کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹا پڑتا اور کسی کو محض شوق زیارت کھینچ کر لاتا، اولیاء الٰہی میں جو ایک خاص قسم کی کشش، محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور بار بار دیکھا۔ 38 میں بھی 40 میں بھی اور اب پھر 42 میں بھی، جب حضرت بہت زیادہ معذور ہو چکے تھے، تنا ہوا قد کمان بن چکا تھا، چال اور گردن پر اثر ضعف و پیرانہ سالی کا بہت زائد تھا۔

وصل بلگرامی کا ذکر ابھی دو ہی ایک نمبر اُدھر پھر آ چکا ہے، لکھنؤ میں ان کا مستقل قیام قیصر باغ، کوٹھی نمبر 9 میں رہتا تھا۔ اپنا لکھنؤ جانا 24 یا 25 اگست کو ہوا تھا، حضرت کی آمد کی بن گن مل چکی تھی، وصل صاحب سے زیادہ کارآمد خدام میں کوئی نہ تھا، ٹہلتا ہوا ان کی طرف بھی گیا اور جب وہ نہ ملے اور یہ معلوم ہوا کہ ابھی تھانہ بھون سے آئے نہیں ہیں صبح و شام میں آنے والے ہیں تو ان کے نام ایک پرچہ لکھ کر وہیں چھوڑ آیا تھا، مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔ ''آج تلاش ''وصل'' میں آیا، ناکام واپس جا رہا ہوں، ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم، حضرت کے ہاں کے معمولات اور اوقات مجلس خدا معلوم یہاں کیا رہیں گے، آپ تو مجسم وصل ہی ہیں، رہبر آپ سے بہتر کون مل سکتا ہے''۔

وصل صاحب کا 29 کا لکھا ہوا کارڈ 30 کو موصول ہوا:

''میں حضرت اقدس مدظلہم العالی کے ہمراہ 26 راگست کی شام کو آیا، لیٹر بکس میں آپ کا گرامی پرچہ ملا، حضرت اقدس کو سنایا اور لطف اٹھایا۔

کل شام کو آپ کا پوسٹ کارڈ باعث اعزاز و کاشف حالات ہوا، آج صبح کو وہ کارڈ حضرت اقدس کو سنایا، آپ کے الفاظ، عبارت، مضمون اور بالخصوص طرز ادا سے حضرت کو بیحد مسرت ہوئی اور بہت دیر تک بہت کچھ فرمایا۔

جواب ملاحظہ ہو، (آگے حضرت اقدس مدظلہم العالی کے الفاظ ہیں)

''اجنبیوں کے لیے قواعد ہیں، اپنوں کے لیے نہیں، جب آپ تشریف لائیں، اپنے نظام اوقات سے مطلع کر دیں، اس کے لحاظ سے وقت مقرر کر دیا جائے گا''۔

''یوں تو بعد نماز فجر چند خاص لوگ آجاتے ہیں اور حضرت کی اجازت سے ان کو باریابی ہوجاتی ہے قریب نو بجے تک یہ نشست رہتی ہے، سہ پہر کو تین بجے سے مجلس عام ہے مگر ان لوگوں کی جن سے حضرت اقدس واقف ہیں، علاج حکیم عبدالمعید صاحب کا شروع کر دیا گیا ہے، خدا کرے کامیابی ہو''۔

یہ حکیم عبدالمعید صاحب جھوائی ٹولوی ان ہی شفاء الملک حکیم عبدالحمید مرحوم کے بھائی تھے (1) اور خود بھی شفاء الملک کے خطاب سے ملقب اور ویسے ہی طبیب حاذق ونامور۔

15 رستمبر کے صدق میں ''حکیم الامت کی علالت'' کے عنوان سے نوٹ حسب ذیل نکلا'':

''حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ وطول اللہ عمرہٗ کا سلسلۂ علالت عرصہ سے چل رہا تھا، خدام کے مشورہ اور گزارش پر آخر اگست سے قیام لکھنؤ میں ہے اور علاج شہر کے نامور طبیب حکیم عبدالمعید صاحب (جھوائی ٹولہ) کا ہو رہا ہے، تھانہ بھون سے لکھنؤ کے طویل سفر میں خدام کی طرف سے راحت وآسائش کی ہر کوشش کے باوجود جو تعب لازمی طور پر اٹھانا پڑا ظاہر ہے، تاہم بحمد اللہ یہاں آکر مرض بہت کچھ قابو میں آگیا ہے اور حکیم صاحب اور ان کے مشیروں کی رائے میں مرض بڑھ نہیں رہا ہے بلکہ گھٹ رہا ہے، البتہ افاقہ کی رفتار بہت ہی سست ہے اور ضعف بہت ہی زائد ہے۔

اس شدید ضعف، نقاہت ولاغری کے باوجود افادات عالیہ جاری ہیں، صبح سویرے کی نسبتاً مختصر اور بعد ظہر کی طویل اور بڑی دونوں مجلسوں میں گویا حکمت وعرفان کا دریا جاری رہتا ہے اور حکیمانہ وعارفانہ مسائل ومضامین مسلسل بیان ہوتے رہتے ہیں، مصلح ملت وحکیم امت کی کوئی بات اصلاحی شان سے خالی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہیں، عیادت کرنے والوں کو جو جوابات مرحمت فرماتے ہیں، اپنے کو جس شان تسلیم ورضا کے ساتھ طبیب حاذق ومشفق کے سپرد کیے ہوئے ہیں ان سب میں اصلاحی پہلو اور بہت سے سبق ہر دیکھنے والے کو ہر وقت ملتے رہتے ہیں اور لطائف وظرائف کا سلسلہ طبیعت کے اس قدر بے کیف ومضمحل

---

(1) یہ ''تھے'' صیغۂ ماضی میں محض روایات ماضی کے لحاظ سے ورنہ حکیم صاحب ماشاء اللہ اور بفضل خدا اس وقت تک ہر طرح بخیریت ہیں۔

ہونے پر بھی منقطع نہیں، اللہ ایسے وجود کا سایہ امت کے سر پر مدتوں قائم رکھے"۔

(109)

حاضری لکھنؤ کی ہوئی اور چند صحبتوں میں جتنا بھی استفادہ ممکن تھا، ہوا، حضرت کی مجلسوں کا رنگ اب بھی وہی تھا وہی تفسیری، فقہی، کلامی نکتے، وہی عارفانہ نکتہ سنجیاں، وہی مسائل اصلاح وتربیت کا زور، وہی علوم کے حقائق ودقائق، بس فرق جو کچھ بھی ہو گیا تھا وہ بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی میں کہ اب وہ پہلی سی نہیں رہی تھی اور ضعف کی تو حد ہی نہ تھی، اکثر حضرت چارپائی ہی پر تکیہ کے سہارے تشریف رکھتے اور لوگ نیچے فرش پر بیٹھے رہتے ورنہ اس سے قبل یہ کہاں ممکن تھا، ہر صاحب نظر کو یہ نظر آرہا تھا، حسرت وغم ویاس کے ساتھ نظر آرہا تھا کہ نسیم سحر اب چلنے کو اور چراغ بجھنے ہی کو ہے، پروانے دور دور سے دوڑ دوڑ کر چلے آرہے تھے اور شمع تھی کہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر تیزی کے ساتھ گھلتی ہی جارہی تھی، قیام لکھنؤ میں عرصہ تک رہا، کھنچتا ہی چلا گیا اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کا باضابطہ تعلق بیعت یہیں غالباً شروع اکتوبر میں ہوا۔

6 ستمبر کو وصل صاحب نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا:-

"کل شام کو آپ کا جوابی پوسٹ کارڈ باعث عزت افزائی ہوا، حضرت اقدس مدظلہم العالی کا مزاج بظاہر ابھی ویسا ہی ہے جیسا آپ دیکھ گئے تھے لیکن ورم میں کمی ضرور ہے اور حکما بتاتے ہیں کہ مزاج بحمد اللہ رو بہ صحت ہے، اس طرف کچھ دست آگئے تھے، اب بفضلہ تخفیف ہے، میں نے آپ کا سلام عرض کر دیا، ارشاد ہوا کہ میرا بھی سلام لکھ دو اور دعا کے لیے بھی۔

نہ معلوم کہیں سے حضرت اقدس نے سنا کہ نصیب اعدا آپ کا کچھ مزاج ناساز ہو گیا، براہ کرم اپنی خیریت اور مفصل حال سے اطلاع دیجیے کہ اطمینان ہو"۔

سوء مزاج میں اتار چڑھاؤ جاری رہا، اپنا پھیرا لکھنؤ کا باوجود ماہ رمضان کے آجانے کے جلد جلد ہوتا رہا، کچھ اطلاعیں دوسروں سے بھی ملتی رہیں، یہاں تک کہ شروع اکتوبر میں حضرت بظاہر صحت مند ہو کر لکھنؤ سے وطن واپس تشریف لے گئے اور آہ کہ کون جانتا تھا یہ حضرت کا آخری سفر اس عالم ناسوت میں تھا۔

23 اکتوبر (یوم عید الفطر) کو جو عریضہ لکھا، وہ اپنی اندرونی اور باطنی حالت کا بالکل فوٹو تھا،

سب کچھ اس میں اگل ڈالا:

م۔ ''خدا کرے اب افاقہ میں اضافہ اور قوت وتوانائی مزید حاصل ہوگئی ہو۔

ا۔ الحمدللہ بہ برکت دعائے احباب ایسا ہی ہے۔

م۔ اس ماہ مبارک میں خدا معلوم جناب والا کی عمر وصحت میں برکت کی دعائیں دل وزبان دونوں پر آتی رہیں اور یہ سب اپنی خودغرضی کی بنا پر۔

ا۔ کیا ہر خودغرضی غیر محمود ہے، مولانا نے اس کا خوب فیصلہ فرمایا ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین خاک بر فرق قناعت بعد ازیں!

م۔ اپنی تفسیری خدمات میں نفع سب سے زیادہ بیان القرآن ہی سے حاصل کرتا ہوں، اگرچہ پیش نظر اور بہت سی تفسیریں رہتی ہیں، اکابر کی بھی۔ ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

ا۔ پسند کا مدار مناسبت پر ہے اور مناسبت کبھی چھوٹے سے بھی ہو جاتی ہے۔

م۔ ابھی پرسوں ہی سورۃ النسا میں آیت "**من قبل ان نطمس وجوها فنردها علٰی ادبارها**" میں **من قبل** کی جو تقریر بیان القرآن میں نظر آئی وہ کہیں نہ ملی۔ **ذالک فضل الله یوتیه من یشآء**۔

ا۔ فضل کا بیشک کوئی قاعدہ نہیں بجز مشیت کے جو آیت میں منصوص ہے۔

م۔ عین ختم رمضان پر شب گزشتہ میں خواب یہ دیکھا کہ جناب والا کہیں سفر میں مقیم ہیں، اپنے مجمع کے اور بہت سے حضرات ساتھ ہیں، خواجہ صاحب سب سے پیش پیش ہیں، شب کا وقت ہے، میں بھی ایک طرف سونے لیٹ گیا ہوں، جناب نے مجھے سوتا ہوا خیال فرما کر خواجہ صاحب سے میرا ذکر شروع فرمایا، نام میرا نہیں آنے پایا لیکن اشارے سب اپنی جانب سمجھ رہا ہوں پہلے بہت سے کلمات حسن ظن اور عزت افزائی کے فرمائے، اس کے بعد کپڑوں کی ایک بڑی گٹھری کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ کاش یہ اس کو لے کر بازار میں بیچنے کو نکلتے تو بہت خوب ہوتا (یا یہ کہ یہ اپنی مراد کو پہنچ جاتے) اس فقرہ کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا، روتا جاتا ہوں اور اپنے دل میں کہتا جاتا ہوں کہ مولانا نے ارشاد فرمادیا کہ محض علمی خدمات کافی نہیں، اپنی اصلاح اگر واقعی مقصود ہے تو

اپنے پندار کا بت توڑنا چاہیے اور خلق کی نظر میں اپنے کو گرانا اور معتبر بنانا چاہیے اس کے بعد آپ اٹھ کر تشریف لے گئے، میں خواجہ صاحب سے لپٹ کر خوب رو رہا ہوں، ان کی داڑھی کو بوسہ دیتا جاتا ہوں اور اپنے حال پر نفریں کر رہا ہوں، خواجہ صاحب تشفی اور دلدہی کر رہے ہیں، آخر میں دیر کے بعد ہمت کر لیتا ہوں اور بوجھ اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہوں، بس آنکھ کھل گئی۔

ا۔ ہدایت اور بشارت ہے اور خواب میں محض صورت مقصود نہیں ہوتی، معنی مقصود ہوتے ہیں، معنی اس کے اصلاح ہے عجب کی جس کا طریق صاحب معاملہ کے اجتہاد سے یا کسی شیخ کی تعلیم سے متعین ہوسکتا ہے"۔

خط کا ایک اہم ٹکڑا ابھی باقی ہے:

م۔ "لکھنؤ میں اب کی جتنی بار خدمت والا میں حاضر ہوا، خواجہ صاحب وغیرہ کو دیکھتا تھا کہ بار بار جناب کے چہرہ کی طرف دیکھتے اور اس میں لذت محسوس کرتے تھے، اپنے میں اس کی تو ہمت ہی نہیں پائی، البتہ نظر جناب والا کے ہاتھوں اور انگلیوں پر جمائے رکھتا تھا اور دل میں کہتا جاتا تھا کہ اللہ اللہ دین کی کیسی کیسی خدمات ان انگلیوں نے انجام دی ہیں۔

ا۔ یہ سب غلبۂ حسن ظن سے ناشی ہے، ورنہ میں اس کی پرانی مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی بچہ کے ہاتھ میں قلم دیجیے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیجیے اور کریما کے دو شعر لکھیے، بچہ فخر کرتا ہے کہ دیکھو میں نے کیسا لکھا ہے، اور واقعہ یہ ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں

مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

م۔ مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت بھی نظر نہ گنبد خضرا کی طرف اٹھتی تھی نہ مواجہہ مبارک میں جانے کی ہمت کرتا تھا، مسجد نبویؐ میں قدم رکھتا تو گویا در و دیوار سے یہ صدائے ملامت و نفریں سنتا کہ یہ وقت دین کی نصرت کا ہے اور یہ بیہودہ محض لفاظی میں پڑا ہوا ہے، زیادہ سے زیادہ کبھی ہمت ہوئی تو جا کر روضۂ انور کے پائیں میں بیٹھ گیا اور جو کلام آنحضورؐ لے کر آئے تھے وہی کچھ دیر کے لیے انھیں سنا دیا۔

ا۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے فنا کا جو مجاہدات سے بھی میسر نہیں ہوتا، جو بلا تعب میسر ہو گیا کتنی خوش قسمتی

ہے۔

م۔ مجھے تو یہ سبق جو مدینہ منورہ کی حاضری میں ملا تھا بس اسی سے ملتا جلتا ہوا آپ کی مجلسوں میں ملتا ہے، یعنی بجائے ذوق وشوق بڑھنے کے اپنی ہی گندگی، ابتری اور تباہ کاری کا اور زیادہ احساس۔

ا۔ خردبین کی یہی خاصیت ہے کہ رائی گنبد نظر آتا ہے، سوار دورائی کامل نہیں عربی رائی (1) کا کمال ہے۔ رزقنا الله جميعاً۔

خدا جانتا ہے کہ حضرت کے قلم سے نکلے ہوئے ایسی ہمت افزائی کے کلمات نقل کرتے ہوئے آج بھی شرم سے گڑا جاتا ہوں اور اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ ایسے تمام موقعوں پر حضرت خود بھی افراط حسن ظن سے مغلوب ہو گئے ہیں، کیا اجتہاد میں غلطی بڑے سے بڑے مجتہد سے بھی نہیں ہوجاتی؟ لیکن اگر ان سب مقامات کو حذف کردیا جائے تو پھر ''حکیم الامت'' کے نقوش وتاثرات نگاری کا آخری حق دیانت کیونکر ادا ہوگا۔

15 ر دسمبر کا عریضہ بھی بعض ضروری مضامین کا حامل ہے، محض توفیق خداوندی تھی کہ ایسے ایسے مسئلے جلدی جلدی پوچھ لیے، جو نہ یاد پڑے یا نہ پوچھے جاسکے، آج ان کے لیے بس حسرت ہی حسرت ہے۔

م۔ ''ایک مسئلہ بہت مدت سے کھٹک رہا ہے، گزارش کی نوبت آج آرہی ہے، سوال فارسی اور اردو شاعری کے بڑے حصہ سے متعلق ہے، شاعروں نے کس کس طرح کفریات بکے ہیں اور اپنے اعمال فاسقانہ پر کیسا کیسا فخر کیا ہے، جنت پر، حور وقصور پر، ملائکہ پر مضحکہ شراب کی مدح اور شراب خواری کی ترغیب،، اپنی میخواری وحرامکاری پر فخر، ساری عبادت وتقویٰ کی قیمت، ایک ساغر کو ٹھہرانا، صنم، بت، طفل ترسا، بغچہ اس قبیل کے الفاظ کو موقع مدح پر لانا، ان خرافات کو مجاز کہہ دینے کی آخر سند کیا ہے؟ کتاب وسنت نے ان اقوال کے قائلوں کو آخر کہاں مستثنیٰ کیا ہے چہ جائیکہ ایسے شاعروں کو بزرگ اور عارف باللہ سمجھنا''۔

ا۔ شاعری کی کیا تخصیص ہے، نثر میں بھی اگر ایسے مضامین ہوں ان سے بھی ایسا انقباض

(1) رائی عربی میں دیکھنے والے، نظر کرنے والے کے معنی میں ہے۔

ہونا لوازم ایمان سے ہے مگر جس طرح اس پر انقباض ضروری ہے اور لوازم ایمان سے ہے اسی طرح قائل کے ساتھ اگر کوئی صریح دلیل خلاف نہ ہو حسن ظن بھی ایسے ہی لوازم سے ہے(1) سب سے زیادہ منتظم اور دین کے محافظ اور شاعروں کے مقابل گو وہ صوفیہ ہی ہوں فقہا ہیں، مگر انھوں نے دلائل شرعیہ سے یہ حکم فرمایا ہے کہ اگر کسی کلام میں ننانوے محمل کفر کے ہوں اور ایک ایمان کا، تو اس کو محمل ایمان ہی پر محمول کریں گے اور ضرورت اس کی ان کے ایمان کی حفاظت نہیں بلکہ اپنے ایمان کی حفاظت ہے کہ دلائل شرعیہ کی مخالفت نہ ہو جس کی توفیق بلا قصد آپ کو بھی عطا ہوگئی۔

م۔ ان کی شخصیتوں سے بحث نہیں، عنداللہ وہ جیسے بھی ہوں سوال صرف ان کے کلام کی بابت ہے۔

ا۔ اس قول میں کہ ان کی شخصیتوں سے الخ اس طرح آپ کا اختلاف خود اٹھ گیا"۔

مسئلہ بجائے خود یہی صحیح ہوگا لیکن اپنی فہم ناقص کو کیا کیا جائے خلش آج تک بدستور باقی ہے، کلام اگر فاسقانہ و کافرانہ ہے، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کلام پر حکم بھی فسق و کفر کا لگنا چاہیے۔

---

(1) حضرت کا یہ ارشاد میری سمجھ میں اب تک نہیں آسکا ہے۔

ضمیمہ نمبر (1)

منقول از صدق مورخہ 3 / نومبر 1941 مطابق 12 شوال 1360

حکیم الامت کی صحت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ لکھنؤ میں ایک طویل قیام کے بعد آخر رمضان میں وطن واپس تشریف لے گئے، صحت خدا کے فضل سے بڑی حد تک درست ہوگئی، یعنی اسہال وغیرہ کی جو شکایتیں تھیں، وہ بحمد اللہ جاتی رہیں، ضعف میں بھی خاصی کمی ہوگئی، البتہ پشت پا پر ورم کی شکایت ابھی باقی ہے، جو اس سن میں اکثر ہو ہی جاتی ہے، علاج لکھنؤ میں جھوائی ٹولہ کے مشہور وحاذق طبیب حکیم عبدالحمید صاحب ناظم مدرسہ تکمیل الطب کا جاری رہا، اللہ اس آفتاب ارشاد وہدایت کو مدتوں روشن رکھے، لکھنؤ میں باوجود اس ضعف ومعذوری کے سلسلۂ فیض زوروں سے جاری رہا اور خدا جانے کتنے اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے، مجلس کی کیفیت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی، بعض بہت نامور اور ممتاز ہستیوں نے بھی اب کی بار اپنا تعلق اصلاح اسی مرکز رشد وہدایت سے پیدا کیا۔

ضمیمہ نمبر (2)

صحبت شیخ

(منقول از صدق 26 / جنوری 1942 مطابق 8 / محرم 1361)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ کا قیام پچھلے ستمبر، اکتوبر میں بسلسلۂ علالت لکھنؤ میں عرصہ تک رہا، کبھی کبھی اس نامہ سیاہ کو بھی توفیق دریاباد سے لکھنؤ کا سفر کر کے

حاضری ملتی رہی، باہر کے ایک بزرگ نے کہ وہ اہل دل بھی ہیں اور صاحب علم وصاحب تصانیف بھی اور باوجود اس کے بھی کہنا چاہیے کہ گمنام ہی ہیں(1) فرط شفقت سے اسے توجہ دلائی کہ حاضری کا اہتمام زیادہ رکھنا چاہیے، جواب میں کچھ معذوریاں اور طویل قیام لکھنؤ کی خرابیاں عرض کی گئیں، اس جواب کے جواب میں ادھر سے جو کچھ ارشاد ہوا، وہ اس قابل ہے کہ اس میں ناظرین صدق کو بھی شریک کرلیا جائے۔

''میرا مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کے یہ مبارک اوقات بہترین مشغلہ میں نہ گزرتے ہوں گے اس کا تو مجھے خود ہی خیال تھا، میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے اس قرب سے انتفاع کی طرف آپ کی توجہ خاص طور پر مبذول کراؤں، اپنے خیال ناقص میں حضرت کا یہ سفر درحقیقت کسی اہم تربیت ہی کے لیے ہے، اس لیے بمقتضائے الطاف دل چاہا کہ جناب کی خدمت میں لکھنے کی جرات کروں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ دریاباد سے قریب ہونے کے باعث کسی خاص حرج یا دقت کا موجب نہ ہوگا لیکن جناب نے جو وہاں کے قیام کے خصوصی موانع اور کثرت احباب واعزا کی بنا حرج کا تحریر فرمایا ہے تو یقیناً حرج کا رمقصود نہیں ہوسکتا، البتہ جناب کا یہ ارشاد کہ ''طویل ملفوظات جو چھپے ہوئے بھی دیکھے جاسکتے ہیں'' ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا میرے نقطۂ خیال سے مقصود تو زیارت اور ملفوظات دونوں نہیں بلکہ اصل مقصود صحبت ہے، اہل اللہ کی صحبت اعمال کی پختگی، دین کی صلابت، ایمان کی حرارت وغیرہ میں ایک مستقل حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے جس کی نظیر صحابۂ کرامؓ کا حضور کی خدمت میں حاضر رہنا ہے، مشبہ اور شبہ میں گو فرق زمین وآسمان سے بھی زائد کا ہو لیکن نوع بہرحال ایک ہے، اس کے لیے اہمیت نہ ملفوظات کی نہ خلوت کی، میں اصرار نہیں کرتا، آپ خود ہی اپنے قلب سے استفتا کرلیں، استفت قلبک ولو افتاک المفتون، تفسیر بیان القرآن کے اوصاف جو آپ نے بیان فرمائے بالکل صحیح ہیں، مجھے بھی بسا اوقات اس کی زیارت کی نوبت آتی رہتی ہے لیکن اس میں مشغول رہنا تو انتفاع مولانا کے علوم سے ہوا، مولانا کی ذات یا قرب سے نہ ہوا، قرب مجلسی میں آخر کوئی چیز تو ہے جس کی طرف واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم الخ میں اشارہ ہے اور حضور اقدسؐ کا اس آیت پر یہ ارشاد کہ الحمدللہ الذی

---

(1) مراد مولانا الحاج محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے تھی۔

جعل فی امتی من امر فی ان اصبر معهم اور جو حضورؐ کا یہ عمل چھوٹوں اور امتیوں کے ساتھ ہو تو اس کے عکس کو خیال فرمالیں"۔

زمانہ کے شدید فتنوں میں سے ایک فتنہ صحبت صالحین سے بے نیازی کا ہے۔ کتابوں سے اس میں شبہ نہیں کہ معلومات بہت سی حاصل ہو جاتی ہیں لیکن زندہ شخصیت کی تاثیر ہی کچھ اور ہے، پیر پرستی کی منزل سے یقیناً بچنا چاہیے لیکن بزرگوں کی صحبت سے بے نیازی بھی کچھ کم مہلک نہیں اور عجب و نخوت، خود رائی و خود پسندی کا بت تو بغیر اس کے ٹوٹتا ہی نہیں۔

(110)

مکتوب کا بقیہ اب ملاحظہ ہو:

م۔ "اب ایک گزارش اپنی ذات خاص سے متعلق ہے، ایک زمانہ تھا کہ بزرگوں کے کمالات و کرامات اور ان کے مناقب کے کلام سے بڑی دلچسپی تھی اور توحیدی مضامین خشک و بے مزہ معلوم ہوتے تھے، اب ایک عرصہ سے صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، اب توحید ہی کے مضامین سننے اور پڑھنے کا دل چاہتا ہے اور بڑے سے بڑے بزرگ کے لیے ان کی بشریت کا تصور اتنا غالب آجاتا ہے کہ ان کے کرامات و مناقب میں اب زیادہ جی ہی نہیں لگتا حد یہ ہے کہ نعتیہ کلام میں بھی اب اگلی سی دل بستگی باقی نہیں اور دل لطف اس فقرہ سے لیتا ہے جو اکبر الٰہ آبادی مرحوم کی زبان سے ایک بار سنا تھا کہ ہمارے اللہ میاں کا کیا کہنا، دیکھیے ایک بشر محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا جامع کمالات پیدا کر دیا، طبیعت بس ایسے ہی مضامین کو ڈھونڈتی ہے۔ خدا معلوم یہ حالت کیسی ہے۔ اگر قابل اصلاح ہو تو للہ اصلاح فرمائی جائے۔

جناب والا کے ضعف و سوء مزاج پر نظر کر کے اب کسی طویل مسئلہ کے چھیڑنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ یہ عریضہ بھی کئی ہفتہ کے تردد و تامل کے بعد ہی لکھ سکا ہوں، اللہ ایسے وجود گرامی کو مدتوں افادۂ خلق کے لیے ہر طرح صحیح و تندرست رکھے۔

ا۔ یہ حالت جو لکھی ہے اس میں بلا کسی زائد تفصیل کے میں خود متفق ہوں، میرا خود یہی مذاق ہے لیکن اس کا حاصل نمک اعتدال سے کھانا ہے جس کو خود تو حق ہے کہ زیادہ تیز نمک کا کھانا نہ کھائے لیکن زیادہ نمک کھانے کی مذمت کرنا اتنا نمک کھانے والے پر اعتراض کرنا اس کا حق

نہیں، البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ زیادہ حد اصول سے نہ نکل جائے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں دلچسپی یا عدم دلچسپی غیر اختیاری ہے۔ فلا یلوم من بعضهم بعضا۔

افسوس ہے کہ اس جواب سے بھی تشفی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی نہ ہوئی، یہ کھٹک برابر قائم رہی کہ جو لوگ حق توحید کے ادا کرنے میں تفریط و تساہل سے کام لے رہے ہیں اور مخلوق کی تعظیم و ارادت میں افراط سے ان پر مومنین صادقین ہی کا اطلاق کہاں تک جائز ہے؟

43ء ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ سفر پیشاور کی ٹھہری۔ اسلامیہ کالج پیشاور کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ 18 رجنوری کو پیشاور پہنچ کر طلبہ کے سامنے کسی دینی موضوع پر کوئی مقالہ پڑھو(1) سہارنپور سے ہو کر آمد و رفت دونوں میں ہو کر گزرتا تھا، جی نہ مانا کہ تھانہ بھون اتنا قریب رہ جائے اور میں بالا بالا گزر جاؤں، وقت بہت کم مل رہا تھا لیکن یہ تو حضرت کی ایک مستقل کرامت تھی کہ چند منٹ کی صحبت بھی بڑے فراغ خاطر اور دلجمعی کی صحبت ہو جاتی تھی، پیشاور و لاہور سے واپسی پر 21 رجنوری کو دن ہی دن میں سہارنپور سے تھانہ بھون کی آمد و رفت میں وہاں قیام کا موقع کل ڈیڑھ دو گھنٹہ کا ملتا تھا، بے تکلف حضرت کو بھی لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھ دیا کہ اتنی دیر کے لیے مہمان وصل صاحب کا رہوں گا حضرت کو زحمت ذرا بھی نہیں دینا چاہتا، چائے کی مہمانداری ان ہی کے سر رہے گی۔ حضرت نے جواب میں کارڈ پر صرف یہ شعر لکھ بھیجا۔

"ادائے حق محبت عنایتے ز دوست
وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خورسند ست"

خیر 21 رجنوری (چہارشنبہ) کی دوپہر کو جب تھانہ بھون پہنچا، تو وصل صاحب حسب توقع اسٹیشن ہی پر ملے اور حضرت کا یہ پیام پہنچایا کہ چائے میرے ہاں پیجیے، اس کو وصل صاحب ہی کی طرف سے سمجھیے، مجھ پر یہ بار مطلق نہ ہوگا، یہاں سے اسٹیشن واپس جائیے اور اگر بسہولت اور کسی انتظام میں خلل پڑے بغیر مزید گنجائش قیام کی نکل سکے تو نکالیے ورنہ اپنی مصلحت کو مقدم رکھیے"۔

آج وصل صاحب کی رہنمائی میں بجائے خانقاہ و مہمان خانہ کے حضرت کے چھوٹے زنانہ گھر میں لایا گیا، پردہ ہوا اور پہلی بار وہاں بیٹھ کر چائے پی، جاڑوں کا شباب تھا، حضرت دھوپ

---

(1) یہ وہی مقالہ ہے جو پہلے "نئی قصص الانبیا" کے نام سے الگ شائع ہوا اور پھر "قصص و مسائل" کا جز بن کر۔

میں صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، وہیں نشست رہی، حضرت کے اخلاق وکرم کا کیا کہنا، کوئی پون گھنٹہ مجالست ومکالمت رہی، خانقاہ ہوتا ہوا اور مولوی شبیر علی صاحب سے ملتا ہوا وصل صاحب کی معیت میں اسٹیشن آیا اور گاڑی پر بیٹھ روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر کوئی عریضہ ضرور لکھا ہوگا، افسوس ہے کہ کاغذات میں دستیاب نہ ہوا، اس کے بعد کا لکھا ہوا خط 23 مارچ کا حسب ذیل ملا:

م۔ ''النور، بابت ذی الحجہ 60 میں امداد الفتاویٰ کے ذیل میں ص 9 کے نصف آخر میں جو سوال درج ہے، اس میں ایک جگہ یہ عبارت ہے کہ'' دنیاوی موجودہ قانون میں نیت پر دار ومدار رکھا گیا ہے، اگر کسی کو قانونی غلط فہمی ہوجائے اور نیک نیتی سے سمجھ کر کرے تو قانون اس شخص کے ساتھ رعایت کرتا ہے''۔ حضرت نے اصل سوال کا جو جواب مرحمت فرمایا ہے، وہ بالکل کافی ہے لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ سائل صاحب کی عبارت بالا واقعہ کے خلاف ہے۔ خدا معلوم انھیں کیا غلط فہمی ہوگئی، دنیوی موجودہ قانون (نہ انگریزی حکومت کا اور نہ میرے علم میں کسی اور حکومت کا) تو قانون کی لاعلمی یا غلط فہمی کو کسی درجہ میں بھی عذر نہیں قرار دیتا بلکہ بعض کتب متعلقہ کے تو شروع ہی میں درج رہتا ہے کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر شمار نہ ہوگا۔

ا۔ مجیب کے ذمہ واقعہ کی تحقیق نہیں، واقعہ کا اثر بیان کرنا اس کا منصب ہے، جیسے طبیب سے کسی مریض کا حال بیان کیا جائے کہ اس کے سر میں درد ہے، اس کا کام یہ ہے کہ دردِ سر کا نسخہ بتلادے نہ یہ کہ کسی خاص ذریعہ سے اس کی بھی تحقیق کرے کہ کیا واقع میں اس کے سر میں درد ہے، یا یہ جواب علیٰ سبیل التنزل ہے کہ اگر ایسی نیت کو موثر بھی مان لیا جائے تب بھی اعتراض اس لیے واقع نہیں ہوتا کہ ایسی نیت ہی محقق نہیں(1)

م۔ اب دو عبارتیں تفسیر بیان القرآن کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جلد 2، ص 20 و جعلکم ملوکا کے تحت میں یہ عبارت درج ہے:

تم کو صاحب ملک بنادیا (چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہوچکے ہو)

لیکن فرعون کے ملک پر تو اس وقت بنی اسرائیل کا قبضہ ہوجانا تاریخ سے ثابت نہیں ملک

---

(1) یہ ساری بحث اس کے قبل بھی گزر چکی ہے۔

کے معنی اگر غلامی، محکومی سے نجات پا جانے والے آزاد و خود مختار کے لیے جائیں (جیسا کہ اکابر سلف کے متعدد اقوال میں پایا جاتا ہے)(1) تو یہ عبارت حسب ذیل ہو سکتی ہے:

تم کو خود مختار بنا دیا (چنانچہ فرعون کی غلامی سے ابھی ابھی نجات پا چکے ہو)

اسی طرح اسی صفحہ پر فانها محرمة علیهم اربعین سنة کے تحت میں درج ہے کہ:

''یہ ملک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا (اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا رستہ ہی نہ ملے گا)''۔

اس میں ''گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کا ملک کوئی اور تھا اور بنی اسرائیل کا وطن کوئی اور، حالانکہ دونوں ایک ہی تھے، اس لیے ان چند الفاظ ''اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا'' کو اگر حذف کر دیا جائے تو کوئی الجھن باقی نہ رہے گی''۔

ا۔ یہ دو سوال تاریخ سے متعلق ہیں، اگر فتح مصر مقدم ہے تو تفسیر موجود صحیح ہے اور اگر موخر ہے تو آپ کی تفسیر صحیح ہے، میں نے قرائن سے تقدم فتح مصر کو راجح سمجھا، باقی احتیاطاً میں نے آپ کی تحقیق کو شائع کرنے کے لیے دے دیا، جو جس کو راجح سمجھے گا اختیار کر لے گا۔

علی ہذا دوسرا سوال اتحاد تغائر کا بھی تاریخی ہے، جس سے کسی مقصود میں خلل نہیں پڑتا، اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ مجھ سے یقیناً ادائے مفہوم میں کمی رہ گئی ورنہ ظاہر ہے کہ عدم تقدم فتح مصر تو ایک بالکل کھلا ہوا اور غیر اختلافی تاریخی مسئلہ ہے اور فلسطین اور وطن اسرائیل کو مغائر سمجھنے کی تو اتنی بنیاد بھی کسی جغرافیہ خوان مبتدی کے سامنے نہیں، میرا مفہوم اگر پورا واضح ہو گیا تھا تو حضرت نے بلا تامل اپنی عبارتوں میں ترمیم قبول فرمائی ہوتی جس کی نظیریں چند نمبر قبل تفسیر قرآن ہی کے سلسلہ میں متعدد گزر چکی ہیں۔

(111)

تفسیری مذاکرے اب پھر چل نکلے تھے، 19 / اپریل کا مکتوب اصلاً انہی کی نذر رہے:

م۔ ''تفسیر بیان القرآن جلد 3، ص 42، سورۃ المائدہ کی آیت وجعل منهم القردة والخنازير کا ترجمہ ''ان کو بندر اور سور بنا دیا'' درج ہوا ہے مگر یہ ترجمہ تو جعلهم کا ہوا نہ کہ

(1) یہ ساری بحث اس کے قبل بھی گزر چکی ہے۔

جعل منهم کا۔من کی رعایت ''شاہان دہلی'' کے تینوں ترجموں میں ملتی ہے۔

ا۔یہی صحیح ہے۔اگر چہ اس پر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا بعضے باوجود لعن وغضب کے اس سزا کے محفوظ رہے اور کیوں اور گو میرا ترجمہ من کے زائد مان لینے پر صحیح ہوسکتا ہے لیکن میں اس توجیہ کو اپنے ترجمہ کے لیے اس لیے پسند نہیں کرتا کہ اس وقت اگر یہ بنیاد میرے ذہن میں ہوتی تو حسب عادت تفسیر میں اس سے تعرض ضرور کرتا،رہا سوال مذکور سو اس کا جواب کافی روح المعانی میں مل گیا،اے مسخ بعضهم قردة وهم اصحاب السبت وبعضهم خنازير وهم كفار

اب اس کا ترجمہ اس طرح بدلتا ہوں۔''ان میں سے بعضوں کو بندر اور سور بنادیا''۔

م۔ایک دوسری بات اس سے اہم تر عرض کرنی ہے،مفسرین نے لکھا ہے کہ قردۃ سے اشارہ اصحاب السبت یعنی یہود کی جانب ہے اور خنازیر سے مراد اصحاب مائدہ یعنی عیسائی ہیں،سو اب اگر یہی مراد لی جائے کہ کچھ عیسائی کسی زمانہ میں انسان سے سور بن گئے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ کب اور کہاں پیش آیا ہے؟ اصحاب السبت کے لیے تو یہ سوال ہلکا رہتا ہے،اس لیے کہ اس دور کی تاریخ اتنی منضبط نہیں لیکن عیسائیوں کا دور تو عین تاریخی دور ہے اور حضرت مسیحؑ کے بعد سے تاریخ مرتب اور مدون موجود ہے کیسے ممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کا ذکر تاریخ میں درج نہ ہو۔

ا۔اگر اس شبہ کو وقعت دی جائے تو قرآنی خوارق کا سب کا انکار کرنا پڑے گا،کس کس کو تاریخ سے ثابت کیا جائے گا۔(1)

میں نے اپنے حاشیہ میں پہلے تو وہی قول جمہور نقل کیا ہے اس کے بعد راغب کے مفردات القرآن کے حوالہ سے عبارت ذیل لکھ دی ہے:

''لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا،صوری نہیں،یعنی اخلاق وخصائل خنزیری پیدا ہوگئے لیکن اجسام وابدان انسان ہی رہے،جیسا کہ اسی طرح کی روایت حضرت مجاہد

---

(1) حضرت کا یہ ارشاد نہایت حیرت انگیز ہے،جب سے اور جس حد تک تاریخ مدون ہے،ہم تو ہر واقعہ کا جو قرآن میں مذکور ہے،خواہ خارق ہو یا غیر خارق،تاریخی ثبوت اسی درجہ کا رکھتے ہیں جو درجہ اس وقت کی تاریخ کا ہے اور پھر یہاں تو ثبوت مفسرین کے بیان کا مانگا جارہا ہے نہ کہ کسی نص قرآنی کا۔

تابعیؒ سے اصحاب السبت کے متعلق یہی منقول ہے، راغب، صاحب مفردات القرآن زیرعنوان ''خنزیر'' لکھتے ہیں ''قوله تعالٰی وجعل منهم القردة والخنازیر قیل عن الحیوان المخصوص وقیل من اخلاقه وافعاله مشابهة لاخلاقها لا من خلقته خلقتها والامران مرادان بالأیة فقد روی ان قوما مسخوا خلقة وکذا ایضا فی الناس اذا اعتبرت اخلاقهم وجدوا کالقردة والخنازیر وان کانت صورهم صور الناس'

بس اس قدر لکھ کر چھوڑ دیا ہے، خواہ کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے، ارشاد ہو کہ یہ عمل کیسا ہے۔

ا۔ ایسے اقوال تو ہر واقعہ میں ملیں گے (1)، تو کیا ایسے اقوال سے ان صحیح ومسلم اور عقلی قواعد کو (2) مثلاً النصوص تحمل علی ظهورها، اور مثلاً لا یصد الی المجاز الا اذا تعذرت الحقیقة اور مثلاً الناطق یقضی علی الساکت اور علاوہ ان قواعد کے خود الفاظ قرآن اس تاویل کو مستبعد بتلا رہے ہیں، مثلاً لفظ جعل لغة تصییر پر دال ہے تو اس کا مفعول ثانی ایسی ہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے کے خلاف ہو اور قردۃ وخنازیر بالتاویل تو وہ خود ہی ہو چکے تھے، اس میں جعل کے کیا معنی اس جعل کا تو یہ حاصل ہوا کہ جعل القردة وجعل الخنازیر خنازیر، یا بہ عبارت دیگر جعل الخبیثین خبیثین۔ کیا اس کلام میں بے معنی ہونے کا شبہ تو یہ نہیں ہو سکتا جو کلام اللہ سے نہایت مستبعد ہے، نیز وہ جب خود خبیث ہو چکے تھے ان کو خبیث بنانے کے کیا معنی، نیز سورۂ بقرہ میں ہے فجعلناها نکالا لما بین یدیها وما خلفها وموعظة للمتقین۔ سو سزا پر تو نکال اور موعظت صادق آتا ہے مگر عقائد اور اخلاق فاسدہ خود موجب سزا ہیں نہ کہ سزا۔ غایت مافی الباب ایسی تاویل کو نص کی تکذیب نہ کہیں گے لیکن کیا بدعت بھی نہ کہیں گے، اگر شبہ کیا جائے کہ بعض سلف کو بدعتی کہنا لازم آتا ہے، سو بدعت اجتہادی محل وعید نہیں ہے، ورنہ اگر اس تاویل کو سنت میں داخل کیا جائے تو جمہور کو بدعتی کہنا لازم آئے گا۔ اب دیکھ لیا جائے کون اسہل ہے۔ میری تفصیل مذکور سے فیصلہ خود بھی کر لیا جائے۔

---

(1) لیکن اسی لیے تو بڑے بڑے محتاط و متقی حضرات مثلاً امام ابن جریر طبری نے سب ہی اقوال کو نقل کر دینا ضروری سمجھا۔ (2) یہ فقرہ اصل خط میں یونہی ناتمام رہ گیا ہے، ''پس پشت ڈال دیا جائے گا'' یا ''چھوڑ دیا جائے گا''، لکھنے سے رہ گیا۔

م۔لڑکی کے ہاں زچگی آج ہی کل میں ہونے والی ہے، دن لگ چکے ہیں، پہلا معاملہ ہے، تسہیل کے لیے التماس دعا ہے۔

ا۔دل سے دعائے سہولت وحفاظت کرتا ہوں''۔

غایت ضعف سے اب حضرت کے ہاتھ میں کسی قدر رعشہ پیدا ہو گیا تھا، اس کا اثر پچھلے ایک آدھ خط پر بھی تھا اور اس خط میں تو یہ اثر نمایاں تھا، بعض لفظوں کے چلانے میں خاصی دشواری پیش آئی۔

مسئلہ مسخ میں ایک درمیانی راہ اختیار کرنے کی روشنی مل گئی، اس لیے معاً بعد، یعنی 24/اپریل کو معروضہ ذیل لکھا:

م۔''والا نامہ بصیرت افروز ہوا، اس سے بھی وہی نفع حاصل ہوا جو عموماً جناب کے والا ناموں سے حاصل ہوتا رہتا ہے، یعنی مسئلہ کے وہ اطراف و جوانب بھی نظر کے سامنے آگئے جن پر نظر از خود نہیں جا سکتی تھی۔

ا۔آپ کی قدر دانی ہے جو چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے۔

م۔اب صورت یہ خیال میں آئی ہے کہ پہلے تو وہی قول جمہور نقل ہو پھر قول راغب اور پھر اس کی تضعیف کے لیے آگے یہ لکھ دیا جائے کہ

''لیکن محققین کا قول یہ ہے کہ...... (یہاں جناب والا کی عبارت ملخصاً دے دی جائے)''۔

ا۔ماشاءاللہ تعالیٰ نہایت جامع حدود و رعایات تجویز ہے۔

م۔اس سے انشاءاللہ وہی قول جمہور کا راجح و قوی ہونا ظاہر ہو جائے گا۔

ا۔بالکل صحیح۔

م۔کیا سب پہلوؤں کی رعایت کے لیے یہ کافی نہ ہوگا؟

ا۔اوپر عرض کر دیا گیا۔

م۔مقصد تو صرف اس قدر تھا اور ہے کہ مسلک حق کے ترک ہوئے بغیر کوئی سہارا ان لوگوں کو بھی ہاتھ آجائے جن کے ایمان ضعیف ہیں۔

ا۔واقعی“۔

تفسیری مذاکروں کا سلسلہ جو عرصہ ہوا چھوٹ چکا تھا، اب پھر بدستور سابق چل رہا تھا۔

21 مئی کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔”تفسیر بیان القرآن جلد 3 ص 60 یا اولی الالباب کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا،”ڈرتے رہو اے عقل والو“۔

م۔جلد 4، ص 87، انذر بہ کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا”ایسے لوگوں کو آئی ہوئی وحی (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے ڈرائیے“ اور تفسیر میں یہ عبارت لفظ”کفر“ سے پہلے بڑھادی گئی۔

م۔جلد 3، ص 57 یا قوم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا گیا”فرمایا اے میری قوم بیشک“۔

م۔جلد 3، ص 83 من ربہ کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا،”کوئی معجزہ ان کے رب کی طرف سے“۔

م۔ایک جگہ اور یہیں کہیں ربہ یا ربک کے ترجمہ میں بجائے رب یا پروردگار کے'اللہ' درج ہو گیا ہے، صفحہ اس وقت یاد نہ آیا اور سرسری دوبارہ تلاش میں وہ مقام نظر نہ پڑا لیکن اس کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔

ا۔ جب مقام ہی نہیں ملا پھر اصلاح کیونکر کی جائے لیکن اگر یہی رہے تو مصداق دونوں کا ایک ہی ذات ہے۔

م۔سورۂ بقرہ میں وما انزل علی الملکین کی تفسیر میں میں نے تمام تر بیان القرآن کا اتباع کیا ہے لیکن ایک شبہ رہ رہ کر پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے جب انسان کے قالب میں آئے تو منکرین نے ان پر بھی وہی اشکالات وارد کیے ہوں گے جو ان سے قبل انبیائے کرامؑ کی نبوت پر کر چکے تھے، ان کی نظروں میں تو کوئی فرق فرشتہ بشکل انسان اور نبی کے درمیان نہ ہوا۔

ا۔ میں اس عبارت کا حاصل اور مقصد نہیں سمجھا، نہ معذور کو سمجھانہ اس کی بنا کو“

(112)

7راگست کا معروضہ بھی ان ہی تفسیری مذاکروں سے لبریز ہے:

م۔''کوئی تین ہفتے ہوئے میرے بھتیجے (1) نے سفر تھانہ بھون سے واپسی پر مزاج والا کی خیریت بیان کی، اس سے بڑا دل خوش ہوا، فالحمدللہ۔

تفسیر بیان القرآن جلد 5 کے مقامات ذیل پیش کرتا ہوں۔

ص3، متن کی آخری سطر اللھم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اب اس طرح بنا دیا، ''سبحان اللہ یا اللہ''۔

م۔ص3، متن کی آخری سطر، فیہا کا ترجمہ دونوں جگہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس کے قبل معلوم نہیں کس وجہ سے میرے ہاتھ کا بنا ہوا تفسیر کے نسخہ میں ملا، دونوں جگہ لفظ ''وہاں'' لکھا ہوا ہے، اب عبارت یوں ہوگئی، ''ان کے منھ سے وہاں یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ یا اللہ اور ان کا باہمی سلام وہاں یہ ہوگا، السلام علیکم''۔

م۔ص15، متن کی آخری سطر، شیئا کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اب اس طرح بنا دیا، ''لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا''۔

م۔ص24، س2، متن نطبع کا ترجمہ بجائے ضمیر متکلم کے لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چھپا ہے

ا۔اس طرح بنا دیا ''مان لیتے ہم اسی طرح''۔

م۔جلد4، ص137، متن یحلفون لکم میں لکم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنا دیا ''یہ تمھارے لیے''۔

م۔جلد4، ص14، س1، متن من الاعراب کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔ حولکم کے بعد اس طرح بنا دیا، ''گرد و پیش والوں یعنی دیہاتیوں میں''۔

م۔ بیان القرآن کے مطالعہ سے جتنا نفع مجھ بے علم کو ہوا اور ہو رہا ہے اسے بس میرا ہی دل

---

(1) محمد ہاشم قدوائی، ایم، اے اور ہونے والے (پی ایچ ڈی) اُس وقت یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اس وقت 50 میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے سیاسیات کے استاذ ہیں۔(دریابادی) کچھ عرصہ قبل مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر تصنیف و تالیف اور پارلیمانی سیاست میں مصروف تھے۔ 10 جنوری 2017 کو دہلی میں انتقال ہوا۔(قاسمی)

جانتا ہے، مجھ سے تو اگر کوئی یہ فرمائش کرے کہ تفسیر ابن عباسؓ سے لے کر تفسیر حقانی تک جتنا ذخیرہ تفسیروں کا تمھارے پاس ہے، سب سے دست بردار ہو کر صرف ایک تفسیر اپنے پاس رکھو تو میرا انتخاب تو بیان القرآن ہی کے حق میں ہوگا۔

ا۔عشق بعض اوقات عقل کے خلاف فتویٰ دے دیتا ہے جس میں وہ معذور ہے مگر وہ فتویٰ حجت نہیں مانا جاتا''۔

سال کا ایک اور مفصل عریضہ 6/اکتوبر (24رمضان 61) کا لکھا ہوا ہے:

م۔''کل 23/رمضان کو ظہر کے فرض پڑھ کر حسب معمول مسجد سے گھر آیا ہی تھا اور سنتوں کی نیت باندھ رہا تھا کہ یک بیک بلا کسی سبب ظاہری کے جناب والا کی یاد آئی اور اس زور وقوت کے ساتھ کہ میں اس سے بالکل مغلوب ہو گیا۔تمثل یہ ہوا کہ آپ سامنے موجود ہیں اور اس ناکارہ کو اپنی نااہلی کا احساس انتہائی شدت کے ساتھ ہو رہا ہے اور میں پکار پکار کر کہہ رہا ہوں کہ کہاں مجھ جیسا نا قابل محض جس کی صرف ونحو بھی پوری طرح نہیں نکلی اور نہ جسے کسی استاذ سے باقاعدہ کسی دینی درسگاہ میں سبق لینے کی عزت حاصل ہوئی اور کہاں قرآن مجید کی تفسیر اللہ تعالیٰ جس سے جو کام چاہے لے لے، باقی یہاں تو جو کچھ بھی آیا، سب ان ہی تھانہ بھون کے بڑے میاں کا فیض ہے، زبان پر یہ الفاظ ہیں اور نظر آپ کی انگلیوں کی طرف جمی ہوئی ہے، (آپ کے چہرہ اور سر کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی) اور کہتا جاتا ہوں کہ اللہ اکبر دین کی کیسی کیسی خدمات ان ہی انگلیوں نے انجام دی ہیں! نیت اسی حالت میں باندھ لی، نماز میں بھی یہ کیفیت برابر قائم اور آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری، گریہ بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ کئی منٹ گزر گئے پھر کیفیت رفتہ رفتہ فرو ہوئی۔

یہ ذکر تو کل کا ہوا، آج دوپہر کو جب نماز ظہر کے لیے باوضو مسجد جا رہا ہوں اور یہ عریضہ لکھنے بیٹھ گیا، گریہ کی اسی کیفیت کا اعادہ پھر پورے طور پر ہو رہا ہے۔

ا۔الجواب، یہ سب حب فی اللہ کے کرشمے ہیں اور چونکہ اس کی فضیلت نصوص میں وارد ہے اس لیے مبارک حالت ہے۔

م۔آگے تفسیر بیان القرآن کے چند مقامات کے متعلق معروض ہے۔

جلد 5، ص 44، ختم متن کے قریب، ان کنت من الصادقین کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا "لے آؤ اگر تم سچے ہو"۔

م۔جلد 5، ص 52 آخر متن ارسلت به الیکم میں الیکم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا "مجھ کو تمھاری طرف"۔

م۔جلد 5، 38، س 3 متن، لو شاء ربک میں ربک کا ترجمہ "اللہ" چھپا ہے۔

ا۔اس طرح بنادیا، "اگر تمھارے پروردگار کو"۔

م۔جلد 5، ص 79 کے وسط میں عزیز کے سلسلہ میں ہے کہ "یہ سلطنت مصر کے مدار المہام کا لقب ہوتا تھا اور نام اس شخص کا قطفیر ہے"۔

یہ ناچیز اپنے حقیر مطالعہ کی رو سے عرض کرتا ہے کہ قطفیر تو مصری زبان میں عزیز ہی کا مرادف ہے، اور عزیز گویا عربی ترجمہ ہے اس مصری لقب مدار المہام کا۔ اردو توریت میں اس کا املا قوطیفار دیا ہوا ہے۔

ا۔الجواب، یاد نہیں میں نے کہاں سے لکھا مگر چونکہ مثبت مقدم ہوتا ہے نافی سے اس لیے آپ کی تحقیق کو ترجیح ہوگی میری تجویز پر"۔

سال کا آخری مفصل خط یہی تھا، سال ختم ہورہا تھا کہ ایک بار پھر حاضری کا موقع مل گیا اور آہ کہ یہ آخری حاضری (حضرت کی حیات میں) تھی، قیام یقیناً مختصر ہی ہوا ہوگا اب نہ مدت قیام ذہن میں، نہ متعین طور پر زمانہ قیام ذہن میں 26 نومبر 42 (15 ذی القعدہ 61) جو کارڈ (میرے اطلاع نامہ کے جواب میں) موصول ہوا وہ کل اس قدر ہے:

"السلام علیکم مسرور ہوا، اے وقت تو خوش کہ وقت ناخوش کردی، اللہ تعالیٰ موانع سے محفوظ فرمائے قیام و وداع سب آپ کی مرضی پر ہوگا"۔

اب کی سفر کی ایک غرض اپنے دیرینہ کرم فرما اور حضرت کے بڑے مخلص اور کارگزار خادم وصل بلگرامی کی قبر پر فاتحہ پڑھنا بھی تھا، بیچارہ ایک معمولی سی بیماری کے بعد 21 / اکتوبر 42 (28 / رمضان 61) کو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور حضرت ہی کے قبرستان میں دفن تھے، جنازہ بھی حضرت ہی نے پڑھایا تھا، باغ و بہار آدمی تھے اور لکھنؤ کی رنگین صحبتوں کا خوب مزا اٹھائے

ہوئے سناٹے کے مقام میں ان کی کچی تربت دیکھ کر دل بے اختیار ہو گیا اور قبر سے لپٹ کر ان کی محبتوں اور شفقتوں کو یاد کر کے خوب رویا۔

خیال ایسا پڑتا ہے کہ اب کی بجائے مولوی شبیر علی صاحب کے مکان کے، قیام مہمان خانہ کے بالائی حصہ میں رہا، حضرت سے رخصتی سہ پہر ہی کو ہولی اور روانگی صبح سویرے کی گاڑی سے ہوئی، سہارنپور میں اب ایک عزیز خاص ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صدیقی شہر کے ہیلتھ آفیسر ہو کر آ گئے تھے، قیام ان کے ہاں ہوا، ورنہ سہارنپور میں تو اب مستقل میزبان شہر کے نامور معالج (ڈاکٹر) محمد حنیف صاحب تھے، ملاقات حسب معمول مدرسہ مظاہر علوم والوں سے خصوصاً مولانا محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث سے خوب رہی۔

سال ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ بھوپال سے ایک مومنہ مخلصہ نے درخواست کی کہ ایک چادر حضرت کی خدمت میں تمہارے واسطہ سے پیش کرنا چاہتی ہوں، مجھ سے براہ راست حضرت کو تعارف حاصل نہیں تھا، تمہارے واسطہ اور ذریعہ سے نذر توقع ہے کہ قبول ہو جائے گی، ادھر کیا عذر و تامل ہو سکتا تھا، درخواست بارگاہ اشرفی تک پہنچا دی گئی، جواب 29 جنوری 43 کا لکھا ہوا حسب ذیل آیا۔

ہدیہ غالباً پارسل سے روانہ ہوا اور رسید آ گئی۔

(113)

انگریزی تفسیر سے تو مدت ہوئی، اگست 39 ہی میں فراغت ہو گئی تھی اور اب کام اردو تفسیر کا چل رہا تھا، اس میں حوالے بیان القرآن کے تو بکثرت اور اس کے علاوہ مسائل وسلوک من کلام ملک الملوک اور حضرت کے بعض دوسرے رسائل کے بھی لانے پڑتے تھے۔ تلاش اس کی ہوئی کہ حضرت کے لیے کوئی مختصر و موزوں لقب ہر جگہ کے لیے مل جائے اور کوئی لفظ ذہن میں آئے، مثلاً خالص تفسیری تحقیق کے موقعوں کے لیے، محقق تھانوی یا مفسر تھانوی اور نکات صوفیا کے مقامات پر مرشد تھانوی یا عارف تھانوی، کسی ایک لفظ پر دل نہ جما، آخر میں خود حضرت ہی سے رجوع کیا، مناجات مقبول (1) کا مطالعہ بھی ادھر کچھ روز سے شروع کر دیا تھا اور اس میں اتناجی لگا

---

(1) اس کا پورا صحیح نام قربات عنداللہ وصلوٰت الرسول ہے، حضرت کے وصال کے ایک عرصہ کے بعد اس کی ٹوٹی پھوٹی شرح بھی اس نامہ سیاہ کے قلم سے بن آئی اور مناجات مقبول مع شرح کے نام سے شائع ہو گئی۔

جواس سے قبل دعاؤں کی کسی کتاب میں نہیں لگا تھا، بعض کیا معنی اکثر دعائیں تو بالکل وجد آفرین تھیں، اسی کارڈ میں اپنے ان جذبات کا بھی اظہار کر دیا تھا، لیجیے وہ کارڈ ہی ملاحظہ فرمالیجیے۔

''اپنی اردو تفسیر میں حوالے جہاں جہاں دیتا ہوں کہیں تو کتاب کا اسم مشہور لکھ دیتا ہوں مثلاً کشاف، کبیر وغیرہ اور کہیں مصنف کا اسم مشہور مثلاً ابن کثیر، بیضاوی وغیرہ، اسی طرح جناب والا کی تفسیر کا جہاں حوالہ دینا ہوتا ہے، تھانوی لکھ دیتا ہوں، یا کہیں پوری عبارت میں مفسر تھانوی مدظلہٗ کر کے لکھ دیتا ہوں۔

لیکن خالص تفسیری مسائل کے علاوہ آپ کے افادات سلوک و تصوف کی جب کوئی چیز مسائل السلوک وغیرہ سے لینا ہوتی ہے تو اس کے لیے ابھی کوئی ایک لقب نہیں متعین کر پایا ہوں، کہیں مرشد تھانوی مدظلہٗ لکھ دیتا ہوں، کہیں عارف تھانوی اور کہیں محقق تھانوی۔

مناجات مقبول پہلے کی بھی دیکھی ہوئی ہے لیکن حال میں جب پڑھا تو اس درجہ دل کو لگی کہ اس وقت سے اس کی عربی عبارت کے روزانہ ورد کا التزام کر لیا ہے، اتنی جامع اور اتنی موثر دعائیں اب تک تو کہیں اور نظر سے گزری نہیں ہیں، جزاک اللہ و ماشاء اللہ میں تو کہتا ہوں کہ بالفرض جناب نے اپنی بیشمار مفید خدمات میں سے اور کچھ نہ کیا ہوتا تو صرف یہی ایک کارنامہ دوسرے مقبولین میں رشک پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا، کیا حد و حساب ہے آپ کے اجر کی''۔

5 رفروری کے جوابی کارڈ میں حضرت نے یہ لکھا:-

''مکرمی دام حبہم و عرفانہم، السلام علیکم، محبت نامہ نے محبت کا ممنون اور تلقیب (مرشد محقق مفسر عارف) سے بیحد تخجل فرمایا، میں بے تکلف اپنے لیے ایک لقب جس میں نہ تواضع ہے نہ ترفع خود تجویز کرتا ہوں یعنی مولف تھانوی، اگر سب جگہ یہی بدل دیا جائے تو اس سے بھی ممنون ہوں ورنہ ہمیشہ کے لیے آنکھ اونچی نہ ہوگی۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا

باقی مناجات مقبول کے متعلق جو کلمات اس کے امتیاز کے تحریر فرمائے ہیں وہ ادعیہ کے مادہ اور ترتیب کے اعتبار سے بالکل صحیح ہیں مگر میرا اس میں کیا دخل۔ اس کے جو دو ماخذ ہیں حصن حصین اور حزب الاعظم یہ سب ان کے جامع کلمات کا کمال ہے، باقی میرا درجہ تو صرف اتنا ہے۔

چو موش بر سر دکان روستا خرسند

مگر جب آپ کے حسن ظن کی دولت اس کے بدولت حاصل ہوئی اس لیے اس کو فال نیک سمجھوں گا اور درخواست کروں گا کہ میرے حال سقیم پر اسی طرح ہمیشہ توجہ رہے، زیادہ کیا عرض کروں''۔

یہ سارا مضمون ایک پوسٹ کارڈ پر بلکہ اس کے ایک ہی رخ پر آ گیا، حضرت کی تحریر میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ جگہ بہت کم گھیرتی اور پھر صاف پڑھ لی جاتی۔

آغاز کا انجام شروع ہو گیا، ہر آغاز کے لیے ایک انجام، ہر پیدائش کے لیے موت، ہر بچپن کے لیے بڑھاپا، اس دار ناپائیدار کا دستور ہی یہ رکھ دیا گیا ہے، ہائے کیسا مبارک و مسعود ایک دن وہ بھی تھا جب یہ متبرک مراسلت شروع ہوئی تھی اور 15 سال تک یہ پر انبساط نعمت جاری رہی اور کیسی منحوس اور پر قہر گھری اس دولت کے ختم ہو جانے کی آ گئی، مادی، روحانی، خانگی، ذاتی، دینی، اخلاقی کون سا موضوع ایسا تھا جس پر بے تکلف حضرت سے خط و کتابت نہ کر لیتا۔

28/اپریل 43 کا عریضہ اس ذات بابرکات جامع الصفات کے نام اس نامہ سیاہ کا آخری عریضہ تھا، آج کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بیٹھے ہوئے دل سے اسے نقل کرنا پڑ رہا ہے:

م۔'' حال میں ایک صاحب سے سننے میں آیا کہ خدانخواستہ مزاج والا پر کچھ نادرست ہو گیا ہے خدا کرے اس وقت تک افاقہ کامل ہو گیا ہو اور اب مژدۂ صحت بھی سننے میں آئے۔

ا۔ بجز ضعف کے کوئی معتد بہ شکایت نہیں، اطمینان فرمائیں۔

م۔ کل دن میں آنکھ لگ گئی تھی، دیکھا کہ کسی بڑی اور عالیشان عمارت میں ہوں، اردگرد انگریزی تعلیم یافتہ مجمع ہے، جیسے کوئی قومی جلسہ ہو رہا ہے، یک بیک زلزلہ آ گیا اور بہت شدید قسم کا۔ میز، کرسی، ہر چیز اپنی جگہ سے ہلنے لگی، اندھیرا گھپ ہو گیا، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ خود وہ سنگین عمارت زمین پر آ رہے گی، لوگ بدحواس ہو کر چیخیں مارنے لگے، بعض فرط ہیبت و دہشت سے زمین پر گر کر ختم بھی ہو گئے، اپنے کو دیکھا جہاں پر کھڑا تھا، وہیں قائم ہوں، زبان پر بسم اللہ جاری ہے، اسی کو بلند آواز سے پڑھتا جاتا ہوں اور گرتی ہوئی چیزوں کو حتی الامکان سنبھالتا جاتا ہوں اتنے میں ایک طرف بجلی چمک کر گری اور لوگ اور زیادہ فرط ہیبت سے بیہوش ہو گئے، اپنے اوپر ہر اس کا

اثر سب سے کم پاتا ہوں، بس آنکھ کھل گئی۔

ا۔قرآن مجید میں غزوۂ احزاب کے ذکر میں لـزلـزلـوا زلـزالا شـديـدا وارد ہے، ظاہراً مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت تھی کہ تمام قبائل عرب ان کی مخالفت پر متحد ہو گئے تھے، اسی طرح اس وقت سب غیر قومیں مختلف سمت سے مسلمانوں پر نرغے کیے ہوئے ہیں، نیز اس وقت منافقین ظاہراً مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن در پردہ ان کا ضرر کفار کے ضرر سے بھی اقبح واشنع تھا، یہی معاملہ اس وقت اہل حق کے ساتھ مدعیان اسلام کا ہے کہ ان کے دین کے اصول کا قلع قمع کر رہے ہیں اور جو اس وقت تدبیر فلاح کی بتلائی گئی تھی اس وقت بھی ایسے واقعات دکھلانے سے اسی تدبیر پر عمل کرنے کی رہنمائی مقصود ہے، وہ تدبیر ان آیتوں میں مذکور ہے۔"لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة" اورآیت "ومازادهم الا ايماناً وتسليما" اورآیت "من المومنين رجال صدقوا رحبة عليه، یہ چند سطریں بطور جہد المقل کے آپ کی خاطر سے لکھ دیں، ورنہ

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اگر آپ کے بھی جی کو یہ جواب لگ جائے، بنوشید و جوشید و مستی کنید، واللہ اعلم۔

م۔بارہا کا ایک تجربہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں سلوک وتصوف، خصوصاً مثنوی مولانا ئے رومؒ کا مطالعہ زیادہ رہا کرتا ہے، اچھے اچھے خواب بکثرت دیکھا کرتا ہوں۔کبھی زیارت صالحین کبھی خود اپنے کو حالت نماز میں دیکھنا قس علیٰ ہٰذا اور جب یہ مطالعہ ترک ہو جاتا ہے، ایسے خواب بھی بند ہو جاتے ہیں۔

ا۔یہ ارتباط محض شہود تخیل ہے، ورنہ بعض محققین نے منکر خوابوں کو نور قلب کا اثر بتلایا ہے، جیسے روشنی میں مضر چیزیں نظر آنے لگتی ہیں، بہر حال خواب کسی حالت میں موثر نہیں بلکہ خود اثر ہے اس وقت طبیعت کسلمند تھی، اس واسطے اپنے ہاتھ سے جواب نہیں لکھ سکا"۔

مکتوب گرامی کا یہ آخری فقرہ غضب کا تھا، بجز 42 کے ایک خط کے کہ اس میں دو ایک فقرے کسی دوسرے کے قلم سے لکھے ہوئے تھے، یہ بالکل پہلا اتفاق تھا کہ حضرت کا مکتوب اوّل سے آخر تک کسی اور صاحب کے قلم سے موصول ہوا، اور آہ کسے خبر تھی کہ یہی آخری خط بھی ہوگا!

اب ہفتوں اور مہینوں نہیں، عمر بھی آنکھیں ڈاک کا راستہ دیکھیں گی اور اس پرنور وبصیرت افزا بصارت نواز سواد وخط کی جھلک بھی نصیب نہ ہوگی۔

سورج اب ڈوبنے کو تھا، شفق پھول چلی تھی، عین اسی زمانہ میں اردو کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی ''زتشنہ لبی خوشم'' ''بوالعجبی خوشم'' کی زمین میں لکھ کر اور پانچوں شعر رنگین و پر بہار، حضرت کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر بھیجی، حضرت باضابطہ شاعر تو پہلے بھی نہ تھے اور اب اس وقت تو ضعف وانحطاط نے جسم ودماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا اس پر بھی جو شعر جواب میں لکھ کر بھیجا، وہ اپنی نظیر آپ ہے

نہ بہ نثر ناثر بے بدل، نہ بہ نظم شاعر خوش غزل
بہ غلامئ شہ عزوجل و بہ عاشقئ نبی خوشم (1)

مئی اور جون کے مہینے تو خیر جون توں کٹ گئے، جولائی سے پھر بڑی تشویشناک خبریں آنے لگیں لیکن مسلسل نہیں بلکہ افاقہ کے درمیانی وقفوں کے ساتھ اور آہ، انسان کی فریب خوردگی کہ طبیعت ان ہی عارضی اور وقتی افاقوں کا سہارا ڈھونڈتی رہی، علاج علاوہ دوسرے معالجوں کے لکھنؤ کے نامور اور حاذق طبیب حکیم عبدالمعید شفاء الملک کا تھا، جن کے علاج سے پہلے صحت ہوچکی تھی لیکن آہ کہ طبیب کے بس میں موت کا علاج ہے کب؟ مقابلہ وہ مرض کا کرسکتا ہے، وہ بھی اذن الٰہی سے، نہ کہ خود قضائے الٰہی کا۔ خدام نے آخر آخر مشورہ ایک بار پھر لکھنؤ لانے کا کیا لیکن اس مشورہ پر عمل کا وقت گزر چکا تھا، شدت ضعف ونقاہت سے نقل وحرکت ناممکن تھی چہ جائیکہ اتنا طویل سفر، تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کبھی بھی پیش پاسکی ہے؟

خدام خاص ایک آدھ نہیں، کئی ایک، پہلے ہی رخصت ہوچکے تھے، وصل صاحب کا وصال تو اسی پچھلے اکتوبر میں ہوا تھا اور حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی کی وفات چار سال قبل۔ بڑے حاکم جب کہیں کوچ کرنے والے ہوتے ہیں تو خدام ادب کی لین ڈوری پیشوائی کے انتظامات کے لیے پہلے ہی روانہ ہوچکتی ہے سماں کچھ ایسا ہی اس وقت بھی نظروں کے سامنے پھر رہا تھا۔

---

(1) اس شعر کے ساتھ جو مختصر خط حضرت نے جگر صاحب کو لکھا تھا، وہ بھی اپنی بلاغت اور رنگینی عبارت میں کچھ کم دلآویز نہ تھا۔

(114)

آگے جو کچھ ہوا اور جو کچھ گزری، اسی صدق ہی کی زبان میں سن لیجیے:۔

شیخ وقت کی علالت (صدق 19 / جولائی 1943)

ایک صاحب علم و صاحب قلم لکھتے ہیں۔

''حضرت مولانا تھانوی کے متعلق یہ معلوم کر کے فکر پیدا ہوگئی کہ اس طرف پھر علالت کا سلسلہ ہوگیا ہے، اللہ امت محمدیہ پر رحم فرمائے، یہ دم جتنی گھڑی بھی ہے، بس ایک رحمت ہے''۔

اس میں کیا شک ہے، حضرت مولانا کی علالت اس وقت تک بحمد اللہ کچھ ایسی زائد تو نہیں لیکن حضرت مدظلہٗ (اللہ ان کی عمر میں بیش از بیش برکت عطا فرمائے) ہیں عمر کی جس منزل میں، اس میں ہر معمولی سی علالت بھی ہر وقت خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر تشویشناک روز افزوں ضعف ہے بے بس بندوں کے اختیار میں بجز دعا کے اور ہے کیا لیکن دعا خود بھی بڑی پر قوت سے ہے، ہزار ہا ہاتھ اگر ایک ہی وقت میں مخلصانہ دعاؤں کے لیے بلند ہو جائیں تو ناممکن نہیں کہ جو وقت ہر انسان کے لیے اٹل ہے وہ بھی کچھ مدت کے لیے ٹل جائے۔

شیخ وقت کی علالت (صدق 26 / جولائی 1943)

عین جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ اشرف علی مدظلہٗ متع اللہ المسلمین بطول بقائہٖ کی شدید تشویشناک اطلاعیں برابر موصول ہو رہی ہیں اور اندیشہ برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے، انقطاع عن الخلق و توجہ الی اللہ کے سامان بڑی تیزی سے کرائے جا رہے ہیں اور اخبار اسی کو مادّی اصطلاحوں میں غفلت اور غنودگی کے دورے پڑنے سے تعبیر کرتے ہیں بہر حال شافی برحق سے دعا ہے کہ اب بھی امت محمدیہ پر رحم فرمائے اور اس کی اس سب سے زیادہ قیمتی بضاعت کو ابھی مدتوں افادۂ خلق کے لیے سلامت و محفوظ رہنے دے۔ آمین

قطب ارشاد کا وصال (صدق 2 / اگست 1943)

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر!

جولائی کی غالباً 13 رتھی کہ میرے بھتیجے کا خط تھانہ بھون سے حسب ذیل موصول ہوا:

''یہاں پہنچ کر واقعی حضرت کی طبیعت بہت زائد علیل پائی، نماز جمعہ کے قبل سے لے کر بعد

مغرب تک مسلسل غفلت وغنودگی طاری رہی اور حضرت اقدس مخصوص حضرات سے بھی مخاطب نہ ہوئے، اسہال کی شکایت قبل ہی سے تھی مگر پرسوں سے غفلت اور غنودگی بھی شروع ہوگئی ہے، میراذکر ایک بار مولانا کے خادم میاں سلیمان نے قبل نماز جمعہ کیا مگر حضرت غافل ہوگئے، نشست کے وقت مولوی جمیل صاحب نے میری اور دوسرے لوگوں کی اطلاع کرنا چاہی مگر اس وقت سے لے کر مغرب تک حضرت مسلسل غافل رہے، اس لیے حاضری سے محرومی رہی، اللہ صحت دے، بعد مغرب خواجہ صاحب نے میراذکر کیا، حضرت نے میرا نام لیا اور پوچھا کہ اس وقت موجود ہیں؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ نشست کے وقت تو تھے، فرمایا کہ میں اس قابل کہاں کہ کسی سے گفتگو کرسکوں یا متوجہ ہوسکوں، اس کے بعد پھر حضرت غافل ہوگئے"۔

دل نے خط پڑھتے ہی کہا کہ خدانخواستہ یہ بیماری ہی اور ہے۔

رنجش از سودا و از صفرا نبود | بوئے پرہیزم پدید آید زدود

طبیب اپنی ماڈی اصطلاحوں میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کر رہے ہیں، یہ تو سب سامان خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ ویکسوئی حاصل ہو رہے ہیں اور یہ عارضی ووقتی غیبت تمہید نظر آرہی ہے طویل اور ناسوتی معیار سے ابدی غیبت کی! صدق نمبر 12 میں ایک نوٹ اس کے قبل دیا جاچکا تھا، نمبر 13 میں دوسرا نوٹ اسی خط کی بنیاد پر دے دیا گیا۔

دل اور زبان دعاؤں میں لگ گئے، دعائیں اپنے ہی مفاد کی خاطر اور اپنی ہی خودغرضی کی بنا پر خود حضرت مولانا پر اب مراسلت کا بار ڈالنے کا کیا موقع تھا، وصل بلگرامی بہت یاد آئے، ایسے موقعوں پر بڑے کام کے نکلتے تھے، اب خود ہی مرحوم ہوچکے ہیں، خیر بعد غور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز (مولانا کے عاشق زار اور خلیفہ خاص) تھانہ بھون کی خدمت میں چند ٹکٹ بھیج کر درخواست کی کہ حالات کی جلد جلد اطلاع پہنچتی رہے، اپنے خط کی عبارت اب کہاں یاد البتہ ایک فقرہ یہ یاد ہے کہ "اللہ سے دعا ہے کہ حضرت کی مدت حیات ہم نیازمندوں کی مرضی پر چھوڑ دے" 19 رجولائی کی دوپہر کو عین انتظار میں خواجہ صاحب کا کارڈ 17 کا لکھا ہوا پہنچا:

"والا نامہ شرف صدور لایا، حضرت کی خدمت میں پہلے خلاصہ پھر بعینہ زبانی پیش کیا، فرمایا

یہ آپ کی محبت ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے"۔

جناب حکیم حافظ عبدالسعید صاحب لکھنوی کا علاج بدھ سے ہے، بفضلہ تعالیٰ افاقہ کی صورت معلوم ہورہی ہے، گو ابھی عوارض موجود ہیں، بالخصوص ضعف بے انتہا ہے، غذا عرصہ سے نہیں ہوئی تھی، کل سے بٹیر کا آبجوش شروع ہوا ہے، خدا کرے روز بروز صحت وقوت ہوتی چلی جائے، اس حالت میں بھی وہی احساسات، وہی انتظامات، وہی ضروری امور میں تنقیحات وتدقیقات موجود ہیں، جن سے سب کو حیرت ہے، اللہ تعالیٰ اس چشمۂ فیض کو ہمیشہ جاری رکھے، آپ نے اپنی دعا کا جو صیغہ ارقام فرمایا ہے وہ درحقیقت ہم سب کے قلوب کی ترجمانی ہے، ماشاء اللہ حسب ہدایت خیریت سے مطلع کرتا رہوں گا"۔

اس خط سے دل کو ڈھارس آن کی آن ہوئی، ٹوٹی ہوئی امید ذرا کی ذرا بندھی، شاید کہ امت محمدیہ کو اس نعمت عظمیٰ سے فائدہ اٹھانے کی کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔

کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا، ساعت موعود اتنی قریب آگئی تھی، آفتاب علم وعرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں، اللہ کی رحمت نااہلوں اور ناقدرے لوگوں سے واپس لی جارہی تھی، رسول اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک ومولیٰ کے دربار میں حضور کے لیے بیقرار ہورہا تھا، لشکر اسلام کا سب سے بڑا جرنیل، دین کے ہر ہر محاذ، ہر ہر معرکہ، ہر ہر مورچہ کا دلاور، اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چور چور کیے ہوئے، قلب خاشع ونفس مطمئنہ کے ساتھ عالم ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گزر رہا تھا، 23 جولائی کو لکھنؤ سے ایک عزیز کا خط 22 / جولائی کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا:-

شب کو بعد عشا خبر ملی کہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے جاملے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ادھر افاقہ کا حال معلوم کرکے اطمینان ہوگیا تھا کہ ہم بے راہ رووں کے سنبھالنے کا یہ ستون ابھی کچھ دنوں کے لیے قائم رہنے دیا گیا ہے مگر آہ کہ وہ کل مدت دو ہی تین دن میں ختم ہوگئی، عمر شریف اور ضعف کی زیادتی افاقہ کی خبر کے باوجود بھی علالت کی اطلاعیں خبر سننے کے لیے ایک حد تک تیار کرچکی تھیں، اس پر بھی واقعہ اتنا سخت تھا کہ قلب میں ایک دھچکا سا لگا اور کچھ دیر تک قلب ودماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہی، زبان سے تو حسب عادت انا للہ کہہ ہی دیا، لیکن دیر

تک سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کیا جائے، بعد میں دعائے مغفرت و بلندیٔ مراتب کے لیے کی لیکن بار بار یہی خیال آتا رہا کہ ایسی ہستی کے لیے یہ چیزیں تو گویا یقینی ہیں، پھر ان کی کیا ضرورت لیکن پھر اس کے اور ایصال ثواب کی دوسری صورتوں کے علاوہ کیا کیا جائے، چنانچہ کئی بار دعا کر چکا ہوں، چند اجزائے قرآنی پڑھ کر بھی ایصال ثواب کیا"۔

انا للہ وانا الیہ راجعون، آہ کہ طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی بنیاد کیسی ریت پر نکلی اور بشری تدبیر نے خداوندی تقدیر کے مقابلہ میں کس بری طرح شکست کھائی، مولانا میرے استاد تھے، مقتدا تھے، سردار تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے، آہ! کہ عقیدت و عظمت، محبت، تینوں ایک ہی وقت میں پگھل کر رہ گئیں، تعزیت کا مستحق میں خود ہوں کسی دوسرے سے تعزیت کیا کروں؟ اللہ نے ان کی ذات میں نور حق کی ایک جھلک دکھادی تھی، ولی کامل کا نمونہ بیسویں صدی عیسوی میں دکھادیا تھا

ما شمار انور مطلق دیدہ ایم نور مطلق را ہمہ حق دیدہ ایم

دین کے خادم اور بزرگ اور بھی اس وقت اچھے اچھے موجود ہیں، پر وہ ایک ہستی ان سب سے نرالی، ان سب سے انوکھی، اپنی نظیر بس آپ تھی!

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں!

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اللہ کے اس ولی کے حق میں دعائیں کرنا، اس کا نہیں اپنا مرتبہ بڑھانے کے لیے ہے۔

سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

درود خوانی سے مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بڑھتا، خود اپنا ربط و تعلق اس ذات اقدس کے ساتھ زیادہ گہرا اور راسخ ہوتا ہے۔

ماتم کے لیے اپنی عمر کا اب جتنا بھی حصہ باقی ہے، باقی ہے، مولانا قدس اللہ سرہٗ کے مناقب و فضائل کے بعض گوشوں پر انشاء اللہ حسب توفیق ان صفحات میں گزارشیں پیش ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو مقصود محض خبر کو ناظرین تک پہنچانا تھا۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز!

حکیم الامت (صدق 9 راگست 1943)

23 رجولائی 1943 وقت چاشت، آج جمعہ ہے، تفسیر قرآنی کا کام جلدی ختم کرنا ہے، بعد نماز ڈاک آجائے گی اور دوسرے کام شروع ہو جائیں گے، تفسیر کا کام یوں بھی آج کل بہت سرسری ہو رہا ہے اور آج تو جلدی ہی ہے روز کا معمول بہر حال کسی طرح پورا کر لینا ہے، لیجیے نماز کا وقت آ گیا، آج کا کام اس آیت پر ختم ہوا۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ.

یہ دنیا کی زندگی (تاوقتیکہ اسے بھی دین کا جز نہ بنالیا جائے) تو بس ایک کھیل تماشا ہے (اپنی بے ثباتی، زود فنائی کے اعتبار سے) اصلی (ومعتبر) زندگی تو بس عالم آخرت کی ہے (باقی رہ جانے کے لحاظ سے)

بعد دوپہر ڈاک آگئی، کیا بیان ہو، کیسی قیامت خیز خبر لائی، قلم کا جگر، حق تھا کہ شق ہو جاتا، قبل اس کے کہ اس جگر خراش، روح فرسا سانحہ کو صفحۂ کاغذ پر ثبت کرتا، ہندوستان کا مفسر اعظم چل بسا، سب سے بڑا عالم ربانی رخصت ہو گیا، شیخ وقت اٹھ گیا، آج کی آیت کتنی پر معنی تھی، اشارہ کیسا صاف تھا، آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہلے نہ سوجھا، اپنے مبلغ علم سے خوب واقف ہوں، اپنی تفسیر دانی، تفسیر نویسی کا بھرم تو اسی ذات سے قائم تھا، اپنا کام ہی کیا تھا، بجز اس کے کہ اس عالم و عارف کے افادات تفسیری، صفحہ کے صفحے، ورق کے ورق، نقل کر دیے، کہیں بجنسہٖ کہیں کتر بیونت کر کے، غالب نے شعر کہا تو ہے ایک بالکل دوسرے ہی معنی میں

کر رہا ہوں اسے میں نامۂ اعمال میں نقل
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی!

لیکن حق یہ ہے کہ حسب حال ہے اور اس معنی میں بھی خوب چسپاں ہو جاتا ہے۔

دکھے ہوئے دل، کانپتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ مسودۂ تفسیر میں یہ عبارت بڑھا دی۔

حسرت وعبرت

تفسیر یہاں تک پہنچی تھی کہ فاضل اجل، محقق وقت، مفسر اعظم، مجدد ملت حکیم الامت مولانا ومقتدانا اشرف علی تھانوی کی رحلت کی خبر موصول ہوئی، قلم فاتحۂ خیر پڑھ لے جب آگے بڑھے۔

19، 20 جولائی 43 (15، 16 ر رجب 1363) کی درمیانی شب میں اپنے وطن تھانہ بھون میں، تقریباً 83 سال کی عمر میں وفات پائی، اناللہ وانا الیہ راجعون، ''مرشد تھانوی'' ''عارف تھانوی'' وغیرہ کے حوالے جو بار بار آتے تھے، ان سے مراد یہی ذات تھی، آج تک جو ''مدظلہٗ'' تھا، اب کل سے وہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' اور قدس سرہٗ لکھا جائے گا۔

ایک خانگی مکتوب (صدق 9ر اگست 43)

(24 ر جولائی کو خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب ''اشرف السوانح'' کی خدمت میں تھانہ بھون روانہ کیا گیا)

کرم گستر، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کیا عرض کیا جائے، کن الفاظ میں عرض کیا جائے کہ سانحۂ عظمٰی کی خبر سن کر دل پر کیا گزر رہی دل پر میرے ہی نہیں، میرے گھر بھر کے۔ بیوی کے، لڑکیوں کے، لڑکوں کے، سب کے۔

تعزیت کروں تو کس سے کہ میں خود ہی مستحق تعزیت ہوں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عالم اسلامی میں اس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے، دنیائے اسلام میں سناٹا ہو گیا، وقت کا سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عارف، محمدؐ کی فوج کا سب سے بڑا کارگزار اور وفادار جنرل رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔

ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس پر نہیں کہ یہ نعمت عظمٰی اپنے وقت پر واپس لے لی گئی، حیرت اس پر ہے کہ اتنے دنوں ہم میں رہی کیسے؟

تو بہار عالم دیگری زکجا بہ این چمن آمدی

مصرع سنا جارہا تھا، علیٰ مصداق اسی ذات اقدس میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بڑے گھر اور چھوٹے گھر دونوں جگہ براہ کرم اس تباہ کار کا مخلصانہ پیام تعزیت پہنچا دیجیے۔ دونوں کی تو سلطنت ہی لٹ گئی! گو اس سلطنت فانی کے مقابلہ میں سلطنت باقی پر حق بھی قائم ہو گیا۔

آپ خود اور مولانا ظفر صاحب، مولوی شبیر علی صاحب، مولوی جمیل صاحب سب یقین فرمائیں کہ دل وجگر محض ان ہی کے دکھے ہوئے نہیں ہیں، امت کے بیشمار افراد ان ہی کی طرح مرغ بسمل ہو رہے ہیں، اللہ ہم سب کو صبر عطا فرمائے، تا آنکہ ہم سب اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں اس کے اسی مقبول بندہ کے واسطہ سے پہنچ جائیں۔

پرچۂ ملفوف از راہ عنایت چھوٹے گھر پہنچا دیجیے گا، والسلام

محتاج دعا: عبدالماجد

سچی باتیں (صدق 29/نومبر 43) ''مزار اشرف'' پر حاضری کی تمنا دل میں عرصہ سے تھی، جولائی کے مہینہ سے یہ قرض برابر چلا آرہا تھا، نوبت وسط نومبر میں آئی، 15 کی دوپہر سے ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا، تھانہ بھون کی حاضری اس 15 برس کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار ہو چکی تھی، آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا، ہر بار کتنا اشتیاق ہوتا تھا! کیسا قوی اور کامل یقین کہ دکان کھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھ میں ہوگا، ہر درد کی دوا، ہر فکر و غم سے تشفی! آج رت بدلی ہوئی تھی، آج قسمت ہی پلٹی ہوئی تھی، دکان بند، مطب اجاڑ، شفا کے بجائے حسرت شفا، دوا کی جگہ دوا کی یاد، مکین کے عوض صرف مکان، خوشگوار یادوں کا محفوظ رہ جانا بھی اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے۔

15 برس کا خوب جانا پہچانا ہوا پچاسوں بار کا چڑھا اترا ہوا، اسٹیشن آج کچھ اجنبی سا تھا، مانوس آج نامانوس تھا، ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر عزت افزائی کے لیے موجود ہوتا تھا اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کر دی تھی کہ بنفس نفیس تشریف لے آئے تھے! آج یہ سب خواب و خیال تھا، اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں، اور مزار؟ آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد، نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چاردیواری، نہ ''آستانہ'' نہ جنگلہ نہ کٹہرا، ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ، ایک سمت میں ایک مختصر پر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور

وہی اللہ کے اس شیر کی خوابگاہ! نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر، صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ! نہ لوح، نہ کتبہ، نہ پھول، نہ چادر، چند قدم کے فاصلہ پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی پہنچے ہوئے، شیخ کی قبران سب قبروں سے بھی پست، زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے۔

تصور کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا، تخیل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں کوئی کہے بھی تو کس زبان سے کہے۔

این حدیثے راہیان دیگرست!

مدت ہوئی ایک بار امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار کی زیارت ہوئی تھی، بس کہنا چاہیے کہ وہی نقشہ یہاں بھی ہو بہو موجود! وہی سوزش، وہی شورش، وہی سکینت، وہی ٹھنڈک، وہی ہیبت، وہی جلال، وہی اُنس، وہی جمال۔

مرآت کمال ذوالجلالی!

جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگایئے، عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا، روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا، اور اپنے کو خانقاہ تک پہنچایا، خانقاہ! آہ وہ روح بے جسد، وہ مکان بے مکین، وہ انگشتری بے نگین، مدرسہ چل رہا تھا لیکن سہ دری خاموش و ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہو کا عالم، سناٹے کا مقام، نہ دری، نہ جاجم، نہ تکیہ، نہ مسند، نہ ڈیسک، نہ قلمدان، یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی اور دل کو حسرت وعبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سناتی رہی، یوں آنا ہوتا تھا، یہاں بیٹھنا ہوتا تھا، کیا کیا سننے میں، کیا کیا دیکھنے میں آتا تھا۔

آہ، تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بیشک موت وفنا تو اس نامور خادم کے نامور آقا تک کے لیے مقدر کردی گئی تھی، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یہ ایک آیت امت کی تسلی وتعزیت کی کیسی پوری دنیا کی دنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے۔

(115)

اے تو افلاطون و جالینوس ما

اپنی اس 56 سال کی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے اور اللہ والیوں میں خود اپنی والدہ اور ہمشیر ہی کو دیکھا، بڑے بڑے عابد، زاہد، متقی، تہجد گزار نظر سے گزرے، یہاں تک کہ سرسری زیارت مکہ مکرمہ وقت کے مجاہد اعظم شیخ سنوسی ثانیؒ کی بھی نصیب رہی لیکن اصلاح وارشاد کی مسند نشینی کا حقدار اپنے 15، 16 سال کے تجربہ میں جیسا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو پایا، کسی اور کو نہ پایا۔

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں!

نہیں، کہ وہ معصوم تھے، نہیں، کہ وہ بشریت کے عنصر سے ماوراومنزہ تھے، جہاں جہاں ان کے مسلک میں کچھ باتیں اس نادان و کج بیں کو اپنی فہم سے بالا نظر آئیں، ان کے اظہار سے ان صفحات میں سکوت نہیں رہا ہے، اس پر بھی جتنے کمالات طویل سابقہ کے بعد اس ذات میں نظر آئے، اس کی نظیر سے اپنا خزانہ دماغ خالی ہے، ''طویل سابقہ کے بعد'' کی قید کو حقیر نہ سمجھیے گا، کتنے ہی بزرگ صورت، درویش نما، عالم لباس، خرقہ پوش، عمامہ بند ایسے ملے جن کی حقیقت چند ہفتوں یا چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ چند برسوں کے سابقہ کے بعد مخفی نہ رہ سکی، قرآن مجید کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے برادری اور قبیلہ والوں کو چیلنج کہ وقد لبثت فیکم عمراً بے معنی نہیں، بہت باوزن ہے۔

حضرت کے پرتو نظر سے زندگی بن گئی، زندگی بے معنی با مقصد ہوگئی، ورنہ خدا معلوم مقسوم کہاں کہاں مارا مارا بھٹکا تا پھراتا رہا، ''جور استاد بہ زمہر پدر'' مصرع لڑکپن میں پڑھا، یہ حقیقت حضرت ہی کی صحبت میں رہ کر کھلی کہ ان کا اختلاف بھی دوسروں کے اتفاق سے بڑھ کر نفع بخش و ہدایت آموز ہوتا تھا اور مجذوب نے جب در اشرفی سے ناکام جانے والوں کے حق میں کہا کہ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

تو شاعری نہیں کی صرف واقعہ بیان کر دیا۔

کاش اپنی جوانی حضرت کے سایۂ تربیت میں گزاری ہوتی! کاش اپنا بچپن ان ہی قدموں

پر لوٹ لوٹ کر بسر کر دیا ہوتا! کاش پوری ضعیفی کو اس در پر دربانی میں صرف کر دینے کا موقع مل جاتا۔ حسرتوں اور تمناؤں کی فہرست کوئی کہاں تک کھولتا جائے!

یک کاشکے بود کہ بہ صد جانوشتہ ایم!

بلا کسی استحقاق اور جہد وطلب کے یہ نعمت جان نواز کچھ کم شامل حال رہی کہ اتنے ہی دن کی خدمت وصحبت نصیب ہوگئی، یہ اور بات ہے کہ سکندر آب حیوان تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا واپس ہوا۔

حضرت کی سوانح نگاری کا حق اور لوگ ادا کریں گے، حضرت کی مجددانہ ومصلحانہ وحکیمانہ تعلیم وتربیت پر بھی وہ لوگ لکھیں گے جو اس کے اہل ہیں، ان صفحات میں تو اس نامہ سیاہ نے صرف وہی لکھی ہے جو کچھ اپنے تجربہ میں براہ راست آیا، یا دو چار ایسے واقعے جو شنیدہ مثل دیدہ کے تھے، اس ظلوم وجہول کے حق میں تو حضرتؒ ایک معظم ترین بزرگ ہی نہیں، شفیق ترین مخلص، داناترین مشیر، محبوب ترین عزیز سب کچھ تھے، عارف رومیؒ کی زبان میں

اے تو افلاطون وجالینوس ما!

یا خسرو دہلوی کی بولی میں

صد ہزاران عید قربانت کنم

اے ہلال ما خم ابروئے تو!

اپنی بھی بہت گزر چکی، اب تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے، حق تعالیٰ اسے بھی عافیت اور ایمان کی سلامتی وتحفظ کے ساتھ گزرا دے اور حشر میں اپنے تمام مقبول بندوں کے ساتھ سرخرو اٹھائے۔

آج جمعہ 20/ اگست 1945 مطابق 14/ شوال 1367 کو بوقت چاشت اس رسالہ کا مسودۂ اول ختم ہو رہا ہے، اب اس کی صاف کرائی اور پھر کتابت اور چھپائی میں جتنی مدت بھی صرف ہو جائے۔

مسودہ کی صفائی کے بعد نظر ثانی کی نوبت اپریل 1950 مطابق جمادی الثانی 1369 میں آئی، آج 25/ اگست 1951 مطابق 21 ذی قعدہ 1370 کو یہ اوراق پریس کو روانہ ہو رہے ہیں۔

عبدالماجد

ضمیمہ

ایک قدیم مکتوب اشرفی، حال میں ایک پرزہ پر لکھا ہوا ایک اور چھوٹا سا مکتوب پرانے کاغذات کے انبار سے نکل آیا یہ میرے ایک عریضہ کے جواب میں اسی کے حاشیہ پر ہے، تاریخ اس میں بجائے عیسوی کے میں نے ہجری درج کی تھی، 14 شوال 1343 ڈاکخانہ دریاباد کی مہر پر 16 مئی 1925 درج ملی۔

اس خط میں دو معمولی سے سوال عرض کیے گئے تھے جو مع جواب نقل ہو رہے ہیں اور یہ خوب یاد رہے کہ اس وقت تک خط کے کاتب کا تعلق حضرت سے ارادت وعقیدت کا بالکل نہ تھا تاہم مولانا کے علم وفضل کی عظمت اس وقت بھی قلب میں تھی، کاغذ کا آخری حصہ پھٹا ہوا ملا، اس لیے اس کی عبارت صرف اندازے سے یہاں دی جارہی ہے۔

حضرت والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ

باعث تصریح یہ امر ہے کہ بہشتی گوہر مطبوعہ انتظامی پریس کانپور 1925 کے صفحہ 139 پر جناب کی یہ عبارت درج ہے کہ ''پورا سر منڈا دینا سنت ہے'' اس کی بابت گزارش ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بجز موقع حج کے اور کبھی سر منڈانا حدیث یا سیر کی کس کتاب میں درج ہے؟

جواب:۔مطلب یہ ہے کہ اگر سر منڈائے تو سنت یہ ہے کہ پورا سر منڈائے، بعض کا منڈانا بعض کا نہ منڈانا خلاف سنت ہے، یہ مطلب نہیں کہ پورا سر منڈانا بمقابلہ سر نہ منڈانے کے سنت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسی رسالہ مذکور کے صفحہ 98 پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ خطبۂ جمعہ کا عربی ہی میں ہونا ضروری ہے اور کسی دوسری زبان میں خطبہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے لیکن مولانا محمد

علی شاہ مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلما) کے القول المحکم فی خطابۃ العجم میں اس کے برعکس آپ کی تائید فارسی خطبہ کے جواز میں درج ہے۔

جواب:- اس مضمون کی عبارت لکھیے تو دیکھوں اس کے معارض ہے یا کیا باقی بہشتی گوہر میں جو لکھا ہے اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔(1)

---

(1) خطبۂ اولی کے آغاز واختتام، عربی زبان میں بصورت خطبہ مسنونہ ہو اور درمیان خطبہ جمعہ غیر عربی یعنی مقامی زبان میں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اور ایسی صورت میں مذکورہ بالا اقوال کے درمیان تطبیق کی راہ نکالی جاسکتی ہے۔ (قاسمی)

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک مشہور عالم دین، مفسر قرآن، فلسفہ شناس، نفسیات داں، مترجم، نقاد، انشاپرداز، سوانح نگار، خودسوانح نوشت، خاکہ نگار، سفرنامہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، طنز نگار، مکتوب نگار اور محقق و مرتب تھے۔ مزید براں اپنے عہد کے عظیم صحافی بھی تھے۔ تحریک آزادی وطن اور تحریک خلافت سے بھی آپکا تعلق خاص تھا۔ آپ کی تحریروں میں اثر آفرینی، سحرانگیزی اور معنی آفرینی ونکتہ سنجی کے عناصر بدرجہ اتم موجود تھے۔ آپ اپنے اسلوب وطرز نگارش کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی تھے۔ مولانا دریابادی اپنے علمی وقار کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز ونمایاں تھے۔ آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں اور علمی وتحقیقی کاموں کی تحسین وستائش مولانا شبلی نعمانی، حضرت اکبرالہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور منشی پریم چند جیسے ماہرین زبان وادب نے کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی جملہ تصنیفات وتالیفات کی عصری معنویت واہمیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو نے کلیات ماجدی کی ترتیب وتدوین کا جامع منصوبہ بنایا ہے۔

اس کتاب کے مرتب عطاء الرحمٰن قاسمی علمی وادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نام سے قائم شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے بانی چیئرمین اور مولانا آزاد اکیڈمی کے سربراہ ہیں۔ اب تک ان کی دو درجن سے زائد تصانیف شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ان کی مقبول عام کتابوں میں دہلی کی تاریخی مساجد (دو جلدیں، اردو اور عربی)، پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد، الواح الصنادید (دو جلدیں)، ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو، ہندی) ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ، ۱۸۵۷ء اور ہریانہ، مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (۸ جلدیں) اور کلیات ماجدی (مرتب) قابل ذکر ہیں۔ وہ ایک علمی رسالہ ماہنامہ براہین اور روزنامہ قومی دنیا کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

ISBN:978-81-934243-5-3
9 788193 424353
NCPUL
New Delhi
₹ 230/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025